پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

خاکے

جون ایلیا

یہ ایتھنس ہے، یونان کا قابلِ احترام شہر ایتھنس۔ ہم چوک میں ایک الجھے ہوئے بالوں والے گلیم پوش بوڑھے کو دیکھتے ہیں جسے نہ اپنے لباس کا ہوش ہے اور نہ اپنے برے بھلے کا خیال۔ وہ شہر کے ذہین نوجوانوں کی ایک جماعت کے درمیان بحث و گفتگو میں مصروف ہے، یہ لوگ جانتے ہیں کہ حسن کیا ہے اور حقیقت کسے کہتے ہیں؟ یہ گفتگو بہت دن سے جاری ہے۔ شہر کے دو ذہین ترین نوجوان زینوفن اور افلاطون سر جھکائے ہوئے زیرِ بحث مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ آؤ پہلے لفظوں کے معنی طے کرلیں۔ سوچنا یہ ہے کہ صداقت سے ہماری کیا مراد ہے؟

اور یہ شہروں کا شہر بغداد ہے۔ جواں سال دانشور اور مورخ وزیرِ اعظم جعفر برمکی وقت کے سب سے بڑے فلسفی نظام سے ارسطو کے فلسفے پر بحث کر رہا ہے۔ نظام کو ارسطو کے نظریات سے شدید اختلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے ارسطو کی کتاب پر تنقید کی ہے جو آپ کی نظر سے گزرے گی۔

نظام! میرا خیال ہے کہ تم نے ارسطو کی کتاب کو اچھی طرح پڑھا نہیں ہے۔ نظام کا جواب یہ ہے کہ کہیے تو اس کتاب کو شروع سے سناؤں شروع کروں اور کہیے تو آخر سے۔

ان خاکوں کے ذریعے ہمارے ذہن میں ان سماجوں کی ایک تصویر بنتی ہے، ان کا مزاج سمجھ میں آتا ہے۔ یہی وہ سماج ہیں جن کے لیے قوموں اور قرنوں نے عقیدت و احترام کے سجدوں کی متاع جمع کی ہے۔ ہر سماج اپنے مسئلوں کی نوعیت اور اپنی مصروفیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔

اگر ہمارا سماج اپنی طفلانہ سرگرمیوں کے ذریعے پہچانا جائے تو یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔ سطحیت اور نمائش پسندی ہمارے سماج کے شعور میں شامل ہیں۔ ہمارا طبقۂ ذہن کی ناکردہ کاری کا شکار ہے۔ افسوس کہ اب قوم میں دانش طلبی مفقود ہوتی جارہی ہے۔ اب تو صرف بونے نظر آتے ہیں، جو اپنے کاندھوں پر کھڑے ہوکر بھی پست قد ہی رہیں گے، بہرحال یہی کیا کم ہے کہ انہیں دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آجاتی ہے۔ انہوں نے تو بڑی دلچسپ مصروفیات اختیار کررکھی ہیں۔ چند حضرات قوم کی ساری دولت کو لوٹنے کا عہد کیے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ صرف اظہارِ دولت کے خبط میں مبتلا ہے کچھ بزرگ دوسروں کے جرائم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مقدس کتابوں کے حوالے تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک برگزیدہ گروہ صرف شہرت حاصل کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس عہد کے مسئلے سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ سب سے زیادہ المناک واقعہ یہی ہے کہ دانشور دانشوری کے فرائض بھولتے جارہے ہیں۔ یہ لوگ سماج پر اپنا حق جتاتے ہیں، کاش وہ کبھی یہ بھی سوچیں کہ جس سماج کی انہیں کوئی پروا نہیں اس سے وہ کیا رعایت طلب کرسکتے ہیں۔ کیا کسی بھی عہد کے معقول اور پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ شہرت کس طرح حاصل کی جائے، ہمارے لوگوں نے بھی عجیب و غریب مسائل کو اپنایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے دور کی سماجی، تہذیبی اور فطری سطح سے بہت نیچے کھڑے ہیں۔ ہمارا سماج نابالغ لڑکوں کے شعور کی سطح پر سانس لے رہا ہے۔ ہم سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر عاری ہوچکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس قوم کو اپنے ذہن کی تربیت کے لیے درکار سنجیدگی اور متانت کی فضا میسر نہیں ہوئی۔

یہاں کبھی کوئی ایسی بات کہنا سخت دشوار ہے جس سے لوگوں کو ٹھیس پہنچتی ہو۔ ہم سب صرف ایسی باتیں کرنے کے عادی ہیں جو سب کو پسند آتی ہوں۔ کسی نے کہا تھا کہ جن کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہوں وہ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ لوگوں کو ان کے اصل مسائل کی طرف متوجہ کیا جائے تو انہیں غصہ آجاتا ہے۔ یہاں صرف ایک ہی معیار اور ایک ہی نسخے کو اپنایا گیا ہے اور وہ ہے ماضی۔ ماضی کا ایک حصہ قابلِ فخر اور ایک حصہ قابلِ ملامت۔ ان گانٹھ کے پورے آدمیوں نے قابلِ ملامت ماضی کو اختیار کرلیا ہے معلوم نہیں کہ لوگ اپنے آبا و اجداد کی زندگی کب تک بسر کریں گے؟ اگر قومیں اپنے آپ سے خلوص برتنے لگیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ تاریخ کتنی مہربان ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہم زندگی کے بارے میں کوئی سنجیدہ نقطۂ نظر نہیں رکھتے۔ یہاں صرف تہذیبی زندگی کا سب سے مقبول نظریہ ہے۔ ہم عقل ہی نہیں عقیدے کے ساتھ بھی انصاف نہیں کرسکے۔ اس قوم نے بستیاں تو بسالی ہیں لیکن ذہن و ضمیر کو ویران کرلیا۔ قوموں کی زندگی ان نظریات سے جنم لیتی ہے جو روزمرہ کی ضرورتوں میں بظاہر کبھی کام نہیں آتے۔ ہمارے یہاں ان نظریات کے ساتھ جو تعلق قائم کیا گیا ہے، وہ ناقابلِ عمل ہے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں بھی ماضی کا خیال آتا ہے لیکن وہ ماضی جس نے شعور و آگہی کے لیے قابلِ فخر راستہ چھوڑا تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اس ماضی سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہمارا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہم صرف دنیادار ہیں لیکن صرف دنیاداری سے کوئی قوم اپنی دنیا نہ بنا سکی ہے۔ قوم کے ذہن کو ایک نیم درویشانہ انداز اپنانا پڑے گا۔ اس کے بغیر بصیرت و دانش کی بخششیں کبھی حاصل نہ ہوں گی اور اس قوم کا وجود محض ایک غیر سنجیدہ تماشا رہے گا۔

زبردست تحریر ہے اور سابقہ تحریروں کی طرح بہت پسند آئی۔ ہاروان کی پرتجسس روداد جاری ہے۔ قبرزین او دنیا نے ان تازہ کر گئی۔ حضرت فخرالدین عراقی کی داستان حیات بہت اچھی لگی۔ محفل شعروسخن میں سب کے اشعار پسند آئے بالخصوص محمد صفدر معاویہ، اعجاز احمد راحیل، رمضان پاشا، قدرت اللہ نیازی کے انتخاب اچھے لگے۔''

✠ **جبیں سسٹرز**، بہاولنگر سے حاضر ہو رہی ہیں ''مئی 2015ء کا شمارہ نظر کے سامنے ہے۔ آج 4 سال بعد قریباً پھر سے سسپنس سے ذہنی کے رشتے کی تجدید کی ہے (بہت شکریہ) پچھلے دو تین ماہ سے اس کوشش میں تھی کہ سسپنس لوں اور دوبارہ سے ریگولر پڑھنا شروع کروں تو نتیجہ سامنے ہے۔ بہت اچھا لگا ہے۔ دل چاہتا ہے پھر وہی فرصتیں لوٹ آئیں جب ہم ہوتے تھے اور ہمارے ڈھیروں ڈھیر رسالے، خوابوں اور کتابوں کی دنیا، خیر۔ آتے ہیں سسپنس پر تبصرے کی طرف۔ تو جناب سب سے پہلے ٹائٹل دیکھا۔ جس پر وہی ایک تیکھے نقوش والی اسمارٹ حسینہ حسب معمول موجود ہے اور ہمارے معصوم بھائیوں کو اپنی نیلی آنکھوں سے ایک ادا سے دیکھ رہی ہے۔ اس کے بعد پہنچے خطوط کی محفل میں۔ خطوط سب پڑھے۔ بہت سارے لوگ غیر حاضر ہیں۔ صرف دو لوگ پرانے تھے باقی سب نئے۔ محترمہ بلقیس خان کو مبارک۔ باقی رضوان خولی کریزوی اور قدرت اللہ نیازی کے خطوط زبردست تھے اور جو لوگ بھی کسی بھی ڈسٹرکٹ جیل سے شامل محفل ہوتے ہیں ہماری ان کے لیے دعا ہے کہ اللہ ان کی تمام مشکلات حل کرے اور ان پر آسانی کرے (آمین) ہم نے کہانیوں کی فہرست میں ہی نام پڑھ لیا تھا۔ ہمارے موسٹ فیورٹ مجیوں کے قاتل مجیوں پر بہت محبت سے لکھنے والے جناب طاہر جاوید مغل صاحب کا۔ تو سب سے پہلے رات کا مسافر ہی پڑھی۔ باقی آئندہ پر اب کوئی تبصرہ نہیں۔ مکمل ہونے پر تبصرہ ہوگا انشاءاللہ۔ تسبیح ہمارے بے حس، خودغرض معاشرے کی تصویر تھی۔ پیسے کے سامنے رشتوں اور جذبوں کی قدر نہیں ہوتی۔ کنز۔ مکافات۔ تحریر ریاض کی بہت زبردست اسٹوری تھی۔ جب قدرت کسی بے بسی کا انتقام لیتی ہے تو کوئی بچ کے کہیں نہیں جا سکتا۔ ان نے کسی سے زیادتی کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کیونکہ بدلہ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ اس دنیا میں یا اس دنیا میں۔ محفل شعروسخن میں تو قیر عباس اور بلقیس خان کے اشعار زبردست تھے۔''

✠ **محمد حنیف گبول**، ہائی سیکیورٹی سینٹرل جیل ملتان سے محفل کی زینت بن رہے ہیں ''سسپنس کی محفل میں عاجز کا یہ پہلا خط ہے (خوش آمدید) روح کی تازگی کے لیے ضیا تسنیم بلگرامی کا تحریر کردہ سلسلہ ہر ماہ ایمان افروز اور زبردست معلومات سے مزین ہوتا ہے۔ سلسلہ وار کہانی ہاروی رفاقتوں اور رقابتوں کے نت نئے رنگ دکھا رہی ہے۔ ماشاءاللہ محی الدین نواب صاحب کی گرفت موضوع کے حساب سے لاجواب ہے۔ سلسلے تو سب ہی اچھے ہیں البتہ قطب الدین ایبک نے خاص لذت دی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا بہت شکریہ۔ جنہی سے ایسے واقعات ثابت کر کے سسپنس کی زینت بناتے رہیے۔ محفل شعروسخن میں مدحت اریاض بٹ، مسز اینڈ مسٹر محمد صفدر معاویہ، توقیر عباس ریجوکہ، چوہدری علی رضا گوندل، بلقیس خان، محسن معاویہ و دیگر، غالب حسین طلحہ، سعید عزیزی، ڈاکٹر علی صدیقی، رضیہ عمیر، ممتاز ہمدانی اور اطہر حسین کا انتخاب اچھا لگا۔ مختلف کونوں میں بہترین چوائس آتی ہے۔ برادرم محمد صفدر معاویہ اپنے خطوط میں بہت ہی اچھا تبصرہ فرماتے ہیں اور الفاظ کے موتیوں کو چن چن کر پروتے ہیں۔ خالق کائنات ان کو مزید صلاحیتوں سے نوازے۔ ایک محترمہ نے عاجز کو قید سے رہائی کے سلسلے میں کچھ وظائف ارسال کیے ہیں۔ ماشاءاللہ بہت بہترین وظائف ہیں۔ عاجز نے وظائف کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ وظائف بھجوانے اور دعاؤں میں یاد رکھنے پر عاجز ان محترمہ کا تہ دل سے شکرگزار ہے اور ان سے مزید درخواست ہے کہ جیسے پہلے ان بے کس قیدیوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں، مزید بھی یاد رکھیں۔ میں ان کا بہت شکرگزار ہوں۔ سب قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے۔''

✠ **سعدیہ بخاری**، ضلع اٹک سے محفل میں شریک ہوئی ہیں ''دعا گو ہوں کہ اللہ ادارے کے بانی معراج رسول کو صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ بدلتی رتوں، رنگارنگ پھولوں اور خوشبوؤں کے موسم کا سسپنس 18 اپریل کی ایک نیم گرم شام کو ملا اور آج 24 اپریل کی شام اپنی سالگرہ کے دن تبصرہ تحریر کر رہی ہوں کیونکہ کیک، اینڈ گفٹ کی امید میں کیا وقت ضائع کرنا۔ اسکائی جیولکل اسکیم کے ساتھ ٹائٹل گرل بھی پسند آئی۔ بس ایک کمی ہے ذرا گرل نے جیولری میک اپ سب جدید زمانے کے مطابق کرلیا پر حسینہ کا ہیر اسٹائل وہی 50 سال پرانا رکھا ہوا ہے۔ انشائیہ حسب موقع 28 مئی کے پاکستان کے جوہری دھماکوں کے حوالے سے بہت پراثر رہا۔ خاص طور پر یہ الفاظ کہ ہندوستان کے شاعر وزیراعظم نے نہایت غیرشاعرانہ رویے کا ارتکاب کیا ہے۔ بھارت کا جنگی جنون تا حال برقرار ہے۔ اداریہ میں ایڈیٹر کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اچھی تعلیم مہنگے اسکولوں کے بجائے بہترین اساتذہ کے توسط سے ممکن ہے نیز نصاب نئے زمانے کے تقاضوں پر پورا اترتا ہو۔ میاں بلمدتی غیر حاضری کے بعد جو خطوط کی محفل میں جھانکا تو پاکستان کے حالات کی طرح یہاں کے حالات بھی جوں کے توں نظر آئے۔ صدارت واہ کینٹ یعنی ہمارے پڑوس کی بلقیس خان کے حصے میں آئی۔ محترمہ نے جس دکھ بھرے انداز میں ہجی ڈاک کے ساتھ چٹکیاں لے لے کے اپنے خیالات کا اظہار کیا مجھے بہت پسند آیا۔ محمد قدرت اللہ نیازی حیرت ہے کہ آپ کو لب جاکے تحسین آیا کہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن گئی ہے۔ اتنا طویل تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی اگر اپنا ہوتا۔ طاہر مگزار کا تبصرہ دیکھ کر تحسین آیا کہ دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے۔ طاہرہ گلی آپ کی اس بات سے میں 101 فیصد متفق ہوں کہ ہمایوں سعید ایک پرانے نمبر دو تارہ ہیں۔ سدرہ یا اعجاز آپ دونوں آپ کی تعریف کر رہی تھیں تو اب بقیہ ویٹس میرے لیے بھی کر دیں۔ خواجہ مدنی اللہ آپ کے بڑے بھائی کی مغفرت فرمائے، آمین۔ رات کا مسافر میں مغل انکل ہمیں ایران کی سیر کرا رہے ہیں۔ اپنی روایت برقرار رکھتے ہوئے مغل صاحب کا یہی اسٹائل ہمیں پسند ہے کہ کہانی کے ساتھ ساتھ ملکوں کی سیر بھی ہو جاتی ہے۔ ہاروان کی اسٹوری دلچسپ جاری ہے۔ اندلوبائی میں مرزا امجد بیگ نے اس مرتبہ قارئین کی بھی ذہنی ایکسرسائز کرا دی۔ توفیق عمر صوی کی کہانی میں زرتاکہ یہ خود ہی اپنی کم عمری کو پھلانگتا ہوگا آزمانے کے لیے آخر میں جاکر سارے اندازے غلط ہو گئے۔ خیر وہ تو خود بیگ صاحب کی دعا کر گئے۔

سودائے جنوں، وقت کا مسافر، امداد اپنا ای سسپنس اور تجسس سے بھرپور تھیں۔ شہادت اور بے وفا اچھی رہیں۔ جہالت، ناب اور تیغ دلچسپ تھیں۔ ماروی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ رات کا مسافر خوب صورت کاوش ہے۔ چوٹ کے رنگ برنگے موتی جہاں بھی بکھریں، باعث مسرت ہوتے ہیں۔ اشعار کا انتخاب خوب صورت تھا۔ سسپنس سب اسٹالوں کی رونق اور اپنی انفرادیت کی علامت ہے۔''

⌘ **نوال اینڈ مشال، جہلم** سے محفل میں حاضر ہیں ''ڈیئر انکل ہمارا سسپنس میں پہلا خط ہے۔ (خوش آمدید) یوں تو سسپنس ڈائجسٹ بھی ہم کافی سالوں سے گھر میں دیکھ رہے ہیں اور میری آپی 8 سالوں سے پڑھ رہی ہیں اور میں بھی 2 سال سے سسپنس کی قاری ہوں۔ آپی نے دیوتا سلسلہ بھی پڑھ رکھا ہے۔ سسپنس بھی ہمیں لیٹ ملتا ہے اس بار 20 اپریل کو مل گیا تو سوچا محفل میں حاضری ہو جائے۔ اس بار سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ لڑکی کی چوڑیاں اور ہار اچھا لگا۔ اس کے بعد جون ایلیا کا رنگ چڑھا۔ دوستوں کی محفل میں بلقیس خان براجمان تھیں۔ بلقیس خان کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ بلقیس جی آپ کے بھائیوں کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک آپ کی امی کو صبر عطا فرمائے (آمین) اعجاز احمد راحیل آپ کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ منورہ حسین جی... معاذ کا سن کر خوشی ہوئی مبارک ہو..... بھائی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو نسب دیکھ کر سوچنے لگی کہ پہلے طاہر جاوید مغل کی طرف جاؤں یا محی الدین نواب کی طرف یا ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی طرف تو نوال آپی نے ڈائجسٹ لے کر پہلے طاہر جاوید مغل کی رات کا مسافر پڑھنی شروع کر دی۔ یہ تبصرہ بھی آپی بول رہی ہیں میں لکھ رہی ہوں۔ رات کا مسافر بہت پسند آئی۔ اگلی قسط کا انتظار ہے پھر سودائے جنوں پڑھی اور جب اپنے مجاہدین کو دیکھا تو کچھ حوصلہ ہوا کہ ابھی بھی دنیا میں اچھے لوگ باقی ہیں۔ امید ہے کہ عابد اور حمزہ مشکل سے نکل آئیں گے۔ ماروی میں مجھے سب کردار پسند ہیں سوائے ماروی کے۔ محبت ہوتی تو وہ محبوب کو چھوڑ کر نہ جاتی۔ مجھے ماروی میں بابا اور علی بہت اچھے لگے ہیں۔ ان کو کہانی میں ان رہنا چاہیے نواب انکل آپ اپنے خوب صورت الفاظ کہاں سے لاتے ہیں۔ چھوٹی کہانیاں بھی پسند آئیں کچھ ابھی باقی ہیں کیونکہ ڈائجسٹ 20 کو ملا ہے اور آج 21 ہے اس کے سبب یہ تبصرہ مکمل نہیں کر سکی۔ آئندہ ان شاء اللہ ضرور کریں گے۔ آخر میں یہی دعا کہ اللہ پاک سسپنس کو ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)''

⌘ **محمد یوسف سانول، ضلع خوشاب** سے حاضر ہوئے ہیں ''عرصہ 3 ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر محفل بہاراں میں لکھنے کی کچھ جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے سابقہ روایات کی پاسداری کرتے ہوئے انکل جی ہمیں بھی جگہ دے دیں گے۔ سب سے پہلے فہرست ملاحظہ کی اور اس کے بعد سیدھے محفل شعر و سخن میں رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ جہاں ایم عمران قاسم اور رمضان پاشا اپنے انتخاب کی وجہ سے منفرد نظر آ رہے تھے۔ اس کے بعد محفل یاراں کو دل کی نگاہ سے پڑھا۔ ادارے کی طرف سے لکھا گیا اداریہ ملک کی حالت زار پر آئینہ تھا۔ بہرحال کچھ سوچتے ہوئے بلقیس خان کے تبصرے کو پڑھا اور حیران ہوا کہ بابی صاحبہ کو کس طرح امتیازی تبصرہ دے کر پہلے تبصرے کو حق دار کیا گیا؟ بہرحال دل پر جبر کر کے ہم بھی بابی کو اول تبصرے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ محمد قدرت اللہ نیازی، ماروی اعجاز، رضوان تنولی، تریزوری، احمد خان توحیدی، محمد صفدر معاویہ، محمد خواجہ کے تبصرے بھی بہت جاندار اور پرلطف تھے۔ اس کے بعد کہانیوں کی ابتدا اپنے محبوب مصنف محی الدین نواب کی ماروی سے کی جو کہ عین شباب کی عمر کو پہنچ چکی ہے یعنی کہ 18 واں سیشن ختم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد تو دوا ہی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ ماروی کی یہ قسط شاندار اور جاندار رہی۔ تھرل، ایکشن اور سسپنس سے بھرپور رہی۔ اس کے بعد سودائے جنوں پڑھی۔ قسم سے بے اختیار دل سے دعا نکلی کہ یا اللہ جنرل مسلمان اسلام کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ان کو فتح سے ہمکنار کر۔ بہت ہی اچھی اسٹوری اور حقیقت پر مبنی حقائق کو آشکارہ کرتی یہ اسٹوری سسپنس کی جان ہے۔ اس کے بعد رات کا مسافر طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی نے تو اپنے سحر میں اس طرح جکڑا کہ جب چوری بے کا بور نظر آیا تو ہوش آیا۔ طاہر صاحب کے لیے ایک ہی دعا کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔ اس کے بعد امداد اپنا جو کہ مرزا صاحب کی عدالتی کہانی تھی اس کو پڑھنے کے بعد یہ تک سوچ رہا کہ مرزا صاحب کیس جیت کر بھی ہار گئے کیونکہ سسپنس کے صفحات پر بار بار مرزا صاحب نے انکشاف کیا کہ وہ ملزم کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ بے گناہ ہے یا گناہ گار۔ بہرحال اس بار اس کہانی پر کوئی تبصرہ نہیں۔ اس کے بعد جہالت ناب پڑھی۔ ابوضیا اقبال نے بہترین موضوع پر یہ کہانی لکھی اور میری طرف سے مبارک باد۔ المیہ یہ ہے کہ حکمرانوں کی خوبی اور خامیاں نہیں دیکھتے۔ بس اندھوں کی طرح منتخب کر کے اپنے گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ گستر ضیا! اچھی تھیں۔ آخر میں ادارہ سے گزارش ہے کہ 2004ء اگست میں میٹرک کا طالب علم تھا مجھ پر 302 کا الزام لگا۔ 2007ء تک اس جرم بے گناہی کی سزا پائی عدالتوں میں اور تھانوں میں خوار ہوتا رہا۔ بہت ہی المناک داستان جس میں میرے ابو کو بھی گاؤں حق کر... بھائی تک چھوڑ گئے۔ میں اپنی یہ داستان سسپنس کے اوراق کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔ آج الحمدللہ تمام برادری اور گاؤں والے میرے ساتھ ہیں اور خدا نے بچا لیا تھا اگر کوئی مصنف مجھ سے رابطہ کرے تو میں یہ سارا قصہ ان کو دینا چاہتا ہوں۔''

⌘ **اسعد عباس، سرگودھا** سے تبصرہ کر رہے ہیں ''مئی کا سسپنس 18 تاریخ کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ شربت فولاد کے 2 پیگ لے کر خطوط کی محفل میں حاضری دی۔ بلقیس خان کرسی صدارت پر براجمان تھیں۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ خطوط کی محفل میں پرانے تبصرہ نگاروں کی بھرمار تھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کاشف زبیر کی ایفائے عہد سے انصاف کیا۔ سودائے جنوں گو کہ کہانی کا ٹیمپو کچھ سلو ہے لیکن پھر بھی ڈاکٹر صاحب کے انداز بیان کی وجہ سے قارئین کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے ہے۔ امداد اپنا مرزا صاحب کی نئی دوسری کہانی ہے جس میں انہوں نے ایک گناہ گار کو باعزت بری کروا دیا ہے۔ جتھم مزاج میں مارکس آخرکار اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ جینا لوئیس نے کیا خوب انتقام لیا۔ مارکس کو کنگال کرنے کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی پہنچا دیا۔ ماروی کو حسب سابق درگزر کیا۔ انگریزی تراجم میں اس ماہ کی بہترین کہانی شہادت تھی۔ فریڈرک نے بہت خوب صورتی سے ڈھٹن کو بے وقوف بنا کر تجوری کا کوڈ معلوم کیا اور ساتھ میں تیس ہزار ڈالرز بونس کے طور پر مل گئے۔ ڈھٹن منرو کی ساری چالاکیاں خاک

شیطان پورے کا مرتد

الیاس سیتاپوری

تاریخ گواہ ہے کہ انسان جب بھی گھمنڈ میں مبتلا ہوا، اپنی طاقت کو منوانے کے زعم میں ہمیشہ تنزل کی جانب گامزن ہوا... اکبر بادشاہ نے بھی ایک ایسا ہی الگ دین بنا کر رعایا کو جس طرح شرک کے دائرے میں قید کرنے کی کوشش کی اور بھول گیا کہ اس سے بھی بڑی طاقت اوپر بیٹھی کٹھ پتلی کے سے تماشے دیکھ رہی ہے... انسان بھی بہت عجیب مخلوق ہے، کہیں انکساری وعاجزی کا پیکر تو کہیں متکبرانہ مزاج کی عظیم مثال مگر... مٹی کا یہ پتلا بالآخر جب اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچتا ہے تو حاصل وہی دو گز زمین کا ٹکڑا اور خاک کا بستر... حسن وعشق کی داستان، لعل وگوہر کے زیور... اونچے اونچے محلوں کی شان وشوکت اور کسی ماہ جبین کی پل بھر کی رفاقت یہ سب جیتے جی کے قصے ہیں۔ اگرچہ اس کا حسن بھی اپنی مثال آپ تھا لیکن اس کی بنیاد کیچڑ اور گندگی سے رکھی گئی تھی لہٰذا مہنگی سے مہنگی مہک بھی اس کے خمیر کی ناگوار بو کو ختم نہ کر سکی مگر اس کے باوجود پورا شاہی دربار اس کا دیوانہ تھا اور اسی دیوانگی سے لطف اندوز ہونا ایک طوائف کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے ان مشاغل سے بھرپور انداز میں لطف لے رہی تھی کیونکہ اسے ٹھکرانے کی عادت نہیں تھی۔ محبتوں کی قدر کرنا ویسے بھی اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات
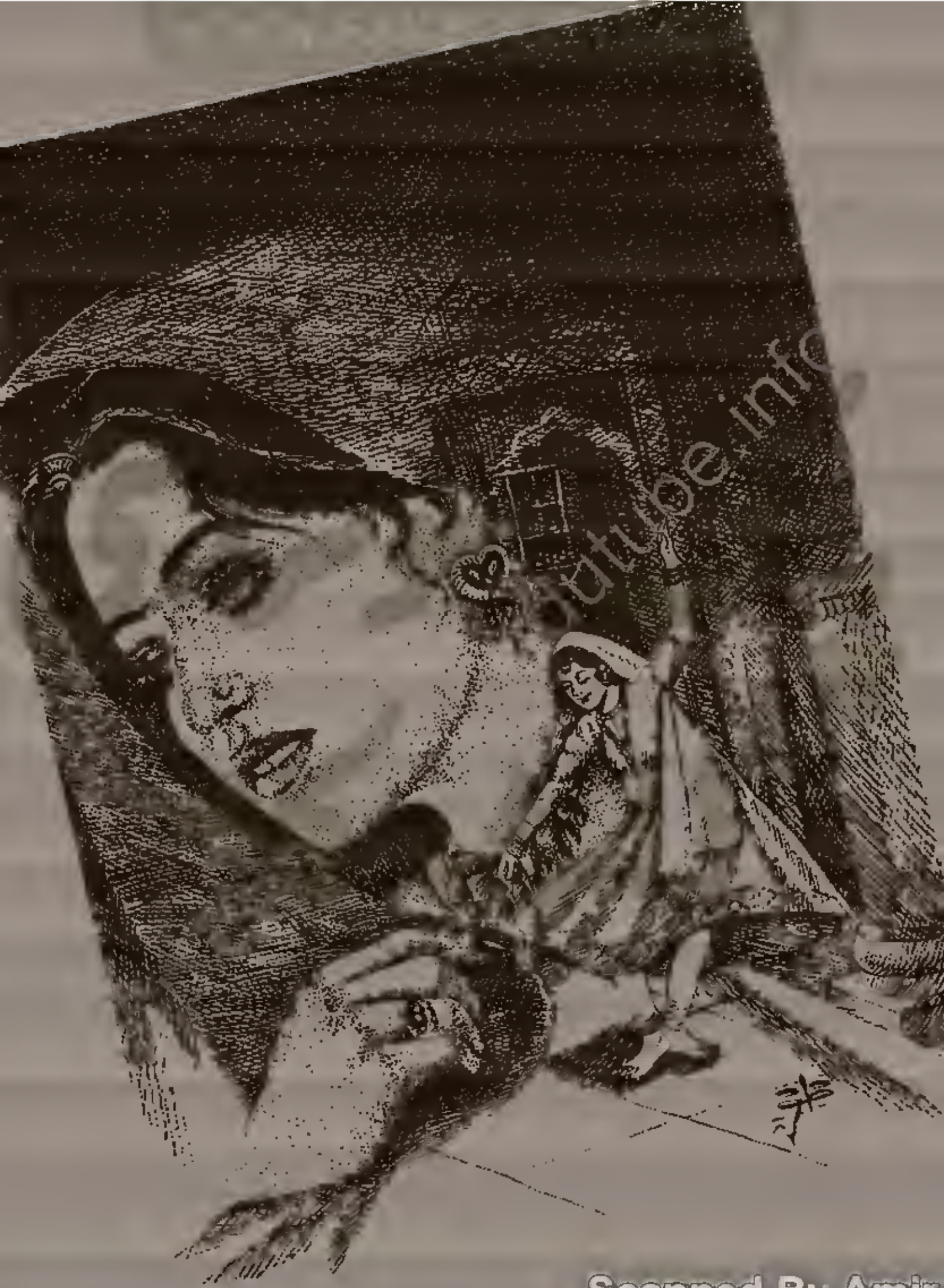
اٹھائیسواں سال جوں نوروز کے ساتھ ہی آیا۔ یہ صفر کی 15 تاریخ تھی۔ اکبراعظم کو تخت حکومت سنبھالے اٹھائیس سال پورے ہو چکے تھے۔ دیوانِ خاص و عام سجا دیے گئے۔ آگرہ اور فتح پور کے کوچہ و بازار جگمگا اٹھے۔ مکانوں اور دکانوں کے سجانے میں ہر کوئی دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دن کے انتظار میں درباری، غیر درباری، ملکی اور غیر ملکی، ملازمت پیشہ، وابستگانِ دولت اور مطربانِ خوش ادا و خوش شکل بڑی اذیتیں جھیل چکے تھے۔ انہیں شاید پہلی بار انتظار میں نزع کا کرب محسوس ہوا ہوگا۔ دیوان خاص و عام کے آس پاس ایک سو بیس عالی شان ایوان، ان امراء کے لیے تعمیر کرائے گئے تھے جنہیں اکبر کے مزاج اور حکومت میں اہمیت اور خصوصیت حاصل تھی۔ ان محلات کے رنگ برنگے پتھر کسی سجاوٹ کے بغیر ہی وہ رنگ پیدا کر رہے تھے جس سے بہت سی سجاوٹوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

بادشاہ کی جلوہ گاہ خاص کو سبھا منڈل کہا جاتا تھا۔ سبھا منڈل کی سجاوٹ اور آرائش دوسرے ایوانوں کی آرائش اور سجاوٹ پر فوقیت رکھتی تھی۔ اس کے در و دیوار پرتگالی بانات، رومی و کاشانی مخمل، بنارسی زربفت و کمخواب اور کشمیری شالیں ڈال کر خوبصورت سماں پیدا کر دیا گیا۔ فرش پر ایران اور ترکستان کی مشجر و مصور قالینیں بچھا دی گئیں۔ چھتوں میں جھاڑ، فانوسیں، قندیلیں اور رنگ برنگے قمقمے لٹک رہے تھے۔ ان تکلفات نے مجموعی شکل میں حاضرین سبھا منڈل کو مرعوب اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہ جشن اٹھارہ دن تک منایا جاتا رہا۔ ان اٹھارہ دنوں میں وہ دن بھی شامل تھا جب بادشاہ کی خدمت میں ملکی اور غیر ملکی موسیقار اور بے مثال ناچنے گانے والیاں پیش کی گئیں۔ انہوں نے بادشاہ اور امراء کے دلوں کو اپنے ہنر اور ناز و ادا سے لوٹ لیا۔ امراء اور دوسرے حاضرین سبھا منڈل ان خوش اداؤں اور پری پیکروں کو جس شوق اور والہانہ پن سے گردنیں اٹھا اٹھا کر اور شانے اچکا اچکا کر دیکھ رہے تھے بادشاہ کو ہنسی آ رہی تھی۔ انہوں نے وفور شوق میں شاہی دبدبے اور درباری آداب تک کو بھلا دیا تھا۔

رنگ برنگے فانوسوں سے منعکس ہونے والی روشنی نے ماحول کو طلسماتی اور ساحرانہ بنا دیا تھا۔ ایسے میں ایک پچیس تیس سالہ رقاصہ، رقص کے لیے کھڑی ہوئی۔ بوٹا سا قد، اعضا میں تناسب اس غضب کا کہ منکر بھی صانع کا قائل ہو جائے۔ بڑی بڑی بادام جیسی آنکھوں میں خمار ایسا، گویا ابھی ابھی سو کر اٹھی ہو۔ آنکھیں مدبھرے پیالے تھے۔ جن سے خمار غیر مرئی انداز میں چھلک رہا تھا اور اس سے جس کی نظریں بھی چار ہوتیں، اس کا پورا وجود نشے میں ڈوب جاتا۔ وہ اٹھی تو سبھا منڈل میں ایک خاموش ہلچل مچ گئی۔ خود بادشاہ بھی متاثر ہوا اور یہ تاثر اس وقت اور شدید ہو گیا، جب اس نے رقص شروع کیا۔ اس رقص میں اس نے اس فراق زدہ اور برہا کی ماری عورت کی کیفیات پیش کی تھیں جو آہٹ پر محبوب کی آمد کا گمان کر رہی تھی۔ ہواؤں کی سرسر میں اسے محبوب کے دامن کی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ پھر جب اسے ناکامی اور مایوسی سے دوچار ہونا پڑے تو وہ خیالوں ہی خیالوں میں محبوب سے باتیں اور شکوہ و شکایت کرنے لگے۔ وہ ہواؤں کے ذریعے اپنے محبوب کو پیغام بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی اور اجرام فلکی کو اپنا ہم راز بنا کر دل کا بوجھ اتارنے کی سعی ناکام میں مشغول تھی۔ وہ اپنی جن کیفیات کا اظہار کر رہی تھی، ناظرین کے دل انہی کیفیات کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے دلوں میں سوز و ساز اور درد و گداز پیدا ہو چکا تھا۔ بعضوں کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں اور وہ ٹھنڈی آہیں بھرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حاضرین اور ناظرین کے برعکس رقاصہ کی ہم پیشہ عورتیں رشک و حسد میں جل رہی تھیں لیکن ان میں بعض خوش بھی تھیں کہ ان کی ایک ہم پیشہ نے اپنے بے مثال فن سے ان سب کا سر اونچا کر دیا تھا۔

اس کے بعد بھی کئی رقاصاؤں نے اپنے فن کی ماہرانہ نمائش کی اور انہوں نے بھی دیکھنے والوں سے داد و تحسین حاصل کی لیکن اس کا تاثر تازہ اور زندہ ہی رہا۔ جب ان سب کو انعام و اکرام سے نوازا جانے لگا تو بادشاہ نے اپنے قریب کھڑے ہوئے میر سامان سے کہا۔ ”اس رقاصہ کو بطور خاص ہمارے قریب لایا جائے جس نے اول شب ہمارے دل میں اپنے ہنر سے ایک آگ سی لگا دی تھی۔“

میر سامان نے بہ آواز بلند کہا۔ ”گوہری! مہابلی کے روبرو حاضری دے کر سجدے کی سعادت حاصل کرے، اسے یاد فرمایا جا رہا ہے۔“

گوہری آہستہ سے اٹھی اور ناز و ادا سے چلتی ہوئی بادشاہ سے دس بارہ قدم دور رک گئی۔

بادشاہ نے کہا۔ ”آگے آؤ، ذرا اور۔“

وہ چند قدم اور بڑھی اور بے اختیار اپنا ماتھا زمین سے لگا دیا۔

بادشاہ نے کہا۔ ''میر سامان! تم اس سے پوچھو، یہ کہاں سے آئی ہے اور سبھا منڈل کے جشن نوروز میں کس کی وساطت سے باریابی کی سعادت حاصل کی ہے؟''

میر سامان نے بادشاہ کا سوال دہرا دیا۔ گوہری پر کچھ ایسی کیفیت طاری تھی گویا وہ ہیبت اکبری سے لرزہ براندام ہے اور اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

بادشاہ کچھ دیر تو اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن جب گوہری کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو نہایت باوقار انداز میں کہا۔ ''میر سامان! اس سے کہو، ہم اس بے جا نازو انداز کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس سے پوچھو یہ جواب کیوں نہیں دیتی؟''

میر سامان نے بادشاہ کا سوال دہرا دیا۔

گوہری نے اٹک اٹک کر لکنت زدہ آواز میں جواب دیا۔ ''یہ ناچیز دراصل مہابلی کے رعب و جلال کا شکار ہو گئی تھی۔ میری زبان اور آواز نے مہابلی کے دبدبے کی وجہ سے میرا ساتھ ہی چھوڑ دیا۔''

اکبر نے میر سامان سے کہا۔ ''لیکن تم اس سے کہو، مجھے اپنے سوال کا جواب پھر بھی درکار ہے۔''

میر سامان نے کہا۔ ''گوہری! تو فضول تکلفات میں مہابلی کا وقت نہ ضائع کر۔ تجھ سے جو کچھ پوچھا گیا ہے اس کا جواب دے دے۔''

گوہری نے جواب دیا۔ ''مہابلی! یہ ناچیز کوچۂ آوارگاں سے آئی ہے اور میرا ناچیز ہنر مہابلی کی بارگاہ تک لانے کا ذریعہ بنا ہے۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''میں اسے نوازنا چاہتا ہوں لیکن یہ اپنی پیشہ ورانہ گفتگو سے میری طبیعت میں تکدر پیدا کر رہی ہے۔''

گوہری نے عاجزی سے عرض کیا۔ ''مہابلی کا اس ناچیز کے ہنر سے لطف اندوز ہونا اور پھر اپنے قریب بلا کر شرفِ ہم کلامی بخشنا اس گناہ گار کے لیے اتنی بڑی سعادت اور شرف و عزت ہے کہ میں زندگی بھر اس کا خیال تک اپنے دل میں نہ لا سکتی تھی۔ مجھے اس بارگاہ سے کچھ بھی نہ ملے تب بھی حضورِ والا کی یہ نوازشیں ہمیشہ میرے لیے سرمایۂ کیف و انبساط ثابت ہوں گی۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''میر سامان! تم اس سے دریافت کرو کہ یہ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟''

میر سامان نے سوال دہرا دیا۔ گوہری نے کہا۔ ''میں اپنے لیے مہابلی سے کچھ بھی نہیں چاہتی لیکن اپنی ہم پیشگان کے لیے ضرور کچھ طلب کروں گی۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کیا؟ میر سامان! یہ اپنی ہم پیشگان کے لیے کیا چاہتی ہے؟ پوچھو۔''

گوہری نے عرض کیا۔ ''مہابلی! آگرہ اور فتح پور کے بازاروں میں میری ہم پیشہ آوارہ و سرگرداں پھر رہی ہیں۔ دکانوں کے دالانوں میں راتیں گزارتی ہیں۔ شہر کوتوال اور اس کے عملے کی جھڑکیاں اور تادیبی کارروائیاں ہمارا مقدر بنی ہوئی ہیں۔ میں حضورِ والا سے صرف یہ چاہتی ہوں کہ ہمیں آگرہ یا فتح پور میں رہنے کے لیے زمین عطا فرما دی جائے۔ ہم بھی مہابلی کی رعایا اور نمک خوار ہیں، ہمیں بھی سر چھپانے کی جگہ مرحمت فرمائی جائے۔''

بادشاہ نے کچھ سکوت اختیار کیا پھر کہا۔ ''میر سامان! تم اس سے ہماری طرف سے وعدہ کرلو، اسے اور اس کی ہم پیشگان کو زمین کا وسیع و عریض قطعہ دے دیا جائے گا لیکن اس کے لیے کچھ قوانین بھی وضع کرنا پڑیں گے کیونکہ ہم اپنے امراء اور امراء زادوں کو اس گندگی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔''

گوہری نے کہا۔ ''مہابلی! اگر ہمیں زمین کا کوئی قطعہ نہ بھی ملے تب بھی ہم سب مہابلی کے قوانین اور مرضی کے پابند ہیں۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اختتامِ روزِ جشنِ نوروز کے بعد اس کی خواہش پوری کر دی جائے گی۔''

اس کے بعد بادشاہ نے گوہری کو انعام و اکرام سے بھی نوازا اور اتنا کچھ دیا کہ دیکھنے والے بادشاہ کی دریا دلی، سخاوت اور تحمل اور عفو و درگزری کے قائل ہو گئے۔

گوہری کی ہم پیشہ عورتیں بے حد خوش تھیں اور امراء اور دوسرے معزز حاضرین سبھا منڈل بھی بہت خوش تھے کیونکہ ان سب کی یہ دلی خواہش تھی کہ آگرہ اور فتح پور کے بازاروں اور دالانوں میں شب بسری کرنے والے مہ پارے کسی طرح ہمیشہ کے ہو رہیں۔

☆☆☆

گوہری نے ایک رات میں وہ شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ اسے مختلف امراء کی طرف سے پیشکشیں ملنے لگیں۔ اسے رہنے کے لیے سجے سجائے مکانوں کی پیشکش ملی لیکن گوہری نے بڑی بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ وہ جس دکان کے دالان میں سر چھپائے بیٹھی تھی، اس میں ایک شمشیر ساز کی شاندار دکان تھی۔ صبح دکان کھولنے کے بعد اس نے اپنی دکان کے سامنے امراء کا ہجوم دیکھا۔ گوہری صبح

سویرے سے ہی سے ان امراء سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ وہ ان سے بات تک نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن یہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس سے بات کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ دکان کے مالک لالہ کبیر چند نے جیسے ہی دکان کھولی، گوہری ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ لالہ جی بھی ڈگمگا گئے، ہری رام کا جاپ بھول گئے۔ پوری جیسی نظر آنے لگی، سراپا نیاز بن کے دریافت کیا۔ "لکشمی جی! مجھ سے کوئی کام؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "رہنے کے لیے میرے پاس ٹھکانوں کی کوئی کمی نہیں لیکن میں آپ کی دکان کے دالان میں ایک خاص مقصد سے ٹھہری ہوئی تھی، وہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ میں یہاں سے بہت جلد چلی جاؤں گی۔ آپ مجھے ایک دن اور رہنے دیں۔"

لالہ جی نے فراخ دلی سے کہا۔ "تم شوق سے رہو، جب تک چاہو رہو۔ میں نے کب منع کیا ہے، رہنے سے۔"

گوہری نے دکان کے اندر دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب میں اس دالان میں نہیں رہوں گی۔"

لالہ جی نے گھبرا کر سوال کیا۔ "پھر کہاں رہو گی دیوی؟"

گوہری نے ہنس کر جواب دیا۔ "آپ کے دل میں لالہ جی، بشرطیکہ اسے آپ بھی پسند کریں تو۔"

لالہ جی سراپا نیاز مندی سے بولے۔ "اہا! ایسے بھاگ کہاں دیوی، جانتا ہوں رات تم نے اکبر بادشاہ کو خوب خوب لطف اندوز کیا اور رات کی محفل تمہارے ہاتھ رہی۔"

گوہری نے جواب دیا۔ "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں اس کی تردید نہیں کروں گی لیکن اس وقت ان باتوں کا موقع نہیں ہے، آپ مجھے اپنی دکان کے پچھلے حصے میں رہنے کی جگہ دے دیجیے پھر دیکھیے مزہ ... ایسی زبردست دکانداری ہوگی کہ زندگی میں کبھی ایسی نہ ہوئی ہوں۔"

لالہ جی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، بولے۔ "دیوی! میری دکان کے پچھلے حصے میں کون سی جگہ ہے جہاں تم رہنا چاہتی ہو؟"

گوہری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دکان میں گھس کر پچھلے حصے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ پیچھے پیچھے لالہ جی بھی پہنچ گئے، بولے۔ "ارے ارے یہ کہاں جا رہی ہو؟ کیا میری بات کا اعتبار نہیں ہے؟"

گوہری دکان کے آخری کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کمرے میں حساب کتاب کی پوتھیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے دائیں طرف ملحقہ غسل خانہ اور بیت الخلا تھا اور ان دونوں کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ گوہری نے اس صحن میں کھڑے ہو کر کہا۔ "لالہ جی! میں ایک دو دن اسی صحن میں گزارہ کرلوں گی، اس طرح میں ان امراء سے نجات حاصل کرلوں گی جو میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

لالہ جی نے تشویش سے پوچھا۔ "اس پر اکبر بادشاہ تو نہیں ناراض ہوں گے؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "وہ کیوں ناراض ہونے لگے، لالہ جی! میں پھر آپ کو یہ یقین دلاؤں گی کہ اگر میں دو دن یہاں رہ جاؤں تو تمہاری دکان خوب چلے گی۔ میرا پیچھا کرنے والے جب یہ سنیں گے کہ میں آپ کی دکان کے پچھلے حصے میں رہ رہی ہوں تو وہ لوگ دن بھر آپ کی دکان پر موجود رہیں گے اور انہیں شرماحضوری خریداری بھی کرنا پڑے گی۔"

لالہ جی کی سمجھ میں بات آگئی، بولے۔ "اچھا دیوی! جیسی تیری مرضی۔ رہ جاؤ ایک دن اس دکان میں۔"

گوہری کے ساتھ اس کی ماں اور چند سازندے بھی تھے۔ لالہ جی نے دکانداری کے لالچ میں ان لوگوں کو اندر پہنچا دیا۔ شہر کے امراء میں سے کئی نے گوہری کو اندر جاتے دیکھ لیا تھا۔ اب کیا تھا، دکان پر ہجوم شروع ہو گیا۔ برتنوں کی فروخت شروع ہوئی۔ امراء اپنے خدمت گاروں کے ساتھ دکان پر آتے اور برتنوں کی الٹ پلٹ شروع کر دیتے۔ اس دوران میں ان کی نظریں بار بار دکان کے اندر کا حال جاننے کی مشتاق نظر آتیں۔ گوہری نے کئی بار سامنے آکر انہیں اپنی جھلک دکھا بھی دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھنے والے امراء نے نہ صرف بہت سارے برتن خرید کر اپنے اپنے گھر بھجوا دیے بلکہ لالہ جی سے بڑی محبت سے باتیں کی تھیں۔ لالہ جی بھی دگنی قیمتیں وصول کر رہے تھے۔

قریب شام دلدار بیگ نامی ایک امیر نے لالہ جی سے سرگوشی میں پوچھا۔ "لالہ جی! آپ تو جانتے ہو کہ میں نے تمہارے برتنوں کی ڈیوڑھی دگنی قیمتیں کیوں ادا کی ہیں؟"

لالہ جی نے جواب دیا۔ "میں نے تو آپ لوگوں سے ڈیوڑھی ... دگنی قیمت وصول ہی نہیں کی۔ آپ مجھ پر یہ تہمت کیوں لگا رہے ہیں؟"

دلدار بیگ نے کہا۔ "میں تہمت نہیں لگا رہا ہوں لالہ جی، واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ میں رقم کی پروا نہیں کرتا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں کسی چیز کی خریداری کے بغیر ہی اتنا کچھ بخش سکتا ہوں کہ تم کئی پشت تک کھاؤ گے۔"

لالہ جی کے منہ میں پانی بھر آیا، پوچھا۔ "وہ کس طرح؟ میں بھی تو سنوں۔"

دلدار بیگ نے جواب دیا۔ "وہ باتیں اس وقت نہیں ہوں گی، پھر کسی وقت پر اٹھا رکھو لیکن ایک بات میں اسی وقت جاننا چاہتا ہوں۔"

لالہ جی نے دریافت کیا۔ "کون سی بات؟ پوچھیے۔"

دلدار بیگ نے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ گوہری کیا تمہاری دکان میں رہے گی؟"

لالہ نے جواب دیا۔ "ہاں کیونکہ اس کی کسی نے زبردست سفارش کی تھی مجھ سے۔"

دلدار بیگ ڈر گئے کہ معلوم نہیں کس امیر نے گوہری کی سفارش کی ہے۔ امراء اپنے ہم عصروں سے خوفزدہ تھے۔ عزت آبرو بھی کو عزیز تھی۔ کوئی کھل کر سامنے آنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ دلدار بیگ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "لالہ جی! میں تم سے اس امیر کا نام نہیں معلوم کروں گا جس نے گوہری کو تمہاری دکان میں جگہ دی ہے لیکن بات دراصل یہ ہے کہ رات گوہری کو میں اپنا دل دے بیٹھا ہوں۔ میں کس طرح صبر وضبط سے کام لے رہا ہوں، بیان نہیں کرسکتا۔ کیا تم گوہری سے چند باتیں کرا سکتے ہو؟"

لالہ جی نے جواب دیا۔ "دلدار جی! آپ دسویں امیر ہیں جس نے اس بے چینی اور بے تابی سے گوہری سے ملنے کی خواہش کی ہے لیکن میں کیا کروں، میں ایسا نہیں کرسکتا۔ گوہری کو جس امیر کی سرپرستی حاصل ہے، وہ بہت بڑا امیر ہے اور میں اس کی ناراضی نہیں مول لے سکتا۔ اس کی ناراضی مول لینے کا مقصد یہ ہوگا کہ میں آگرہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں۔"

اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ لالہ جی نے گوہری کے لیے چراغ اور کھانے پینے کا انتظام کردیا۔ جب وہ دکان بند کر کے جانے ہی والے تھے تو کسی نے پیچھے سے لالہ جی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ "لالہ جی! گوہری کہاں ہے؟"

لالہ جی نے تلخی سے جواب دیا۔ "اس سوال نے مجھے سارا دن پریشان رکھا ہے۔ تم کون ہو اور گوہری کو کیوں پوچھ رہے ہو؟"

اجنبی نے کہا۔ "میر چند! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تم مجھے پہچان لو۔ میں شاہی میر سامان ہوں اور گوہری کو میں نے ہی بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ گوہری کو مطلع کرو کہ میر سامان اس سے ملنا چاہتا ہے۔"

لالہ جی کچھ ڈر گئے کیونکہ میر سامان کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ انہوں نے ڈرے سہمے لہجے میں پوچھا۔ "اگر میں گوہری کو آپ کی آمد سے مطلع کروں تو وہ آپ سے ملنا پسند کرے گی؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "بالکل ملنا پسند کرے گی، بلکہ اسے تو میرا انتظار ہوگا۔"

لالہ جی جب اندر جانے لگے تو میر سامان نے کہا۔ "لالہ جی! میں دکان کے پچھلے دروازے پر پہنچ رہا ہوں، تم اسے اندر سے کھول دو اور میں گوہری کی اجازت کے بعد اندر آ جاؤں گا۔"

لالہ جی پس وپیش ڈر اور خوف کے ساتھ اندر چلے گئے اور میر سامان دکان کے پچھلے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا اور گوہری نے سر باہر نکال کر میر سامان کو اندر بلا لیا۔ اپنے سامنے بٹھا کر بولی۔ "میں تو صبح سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ کہاں رہ گئے تھے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "گوہری! تفصیلی باتیں تو کہیں اور چل کے ہو جائیں گی، اس وقت میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

گوہری سوچ میں پڑ گئی۔ گوہری کی ماں بھی میر سامان کے قریب ہی آ کھڑی ہوئی، پوچھا۔ "تم ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "میں نے آپ لوگوں کے لیے جمنا کے کنارے ایک حویلی کا انتظام کردیا ہے۔ آپ لوگ وہیں چل کر رہیں۔"

گوہری نے فکرمند آواز میں کہا۔ "میں اسی وقت ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن بس ایک الجھن میرے قدم پکڑ رہی ہے۔"

"کون سی الجھن؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔"

گوہری نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ جہاں پناہ اس بات کو سختی سے ناپسند کرتے ہیں کہ ان کے معزز امراء اور قرابت دار ہم لوگوں سے ربط ضبط پیدا کریں۔ اگر ہم لوگ چند دن یہیں رہ لیں تو کیا حرج ہے؟"

میر سامان نے ذرا جوش میں کہا۔ "اس کے سوا کوئی حرج نہیں کہ مرزا دلدار بیگ نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ آج رات پچھلے پہر وہ اپنے آدمیوں کی مدد سے تمہیں اغوا کرالے۔ کیا تم ایسا ہونا پسند کرو گی؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ ایسا کیونکر ہوسکتا ہے۔ دلدار بیگ میری مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

"ایسا مت سوچو گوہری! تم ان امراء کے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں ہو اور دلدار بیگ تو بدنام ترین آدمی ہے۔"

گوہری کے چہرے سے رنج و غم عیاں تھا، بولی۔ "کرامت! تم مجھے دلدار بیگ اور اس کے ساتھیوں سے ڈرا کیوں رہے ہو؟"

میر سامان کرامت علی نے جلدی جلدی کہا۔ "گوہری! میں پھر بھی کہوں گا کہ تم لوگ اسی وقت یہاں سے نکل چلو اور جمنا کے کنارے والی حویلی میں رہنے لگو۔"

گوہری نے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے کہا۔ "میں نہیں جانتی کہ ہم سب کے خلاف ایسا کون سا قدم اٹھ سکتا ہے۔"

میر سامان، کرامت علی نے گوہری سے کہا۔ "گوہری! اگر تم لوگ میرے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوئے تو میں تنہا ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

گوہری نے عاجزی سے کہا۔ "میر سامان کرامت علی صاحب! مشیا میری ماں بالکل پسند نہیں کرتیں کہ ہماری وجہ سے ہمارے محسن پر کوئی مصیبت نازل ہو۔ مہاجی بہت ہوشیار اور عقلمند انسان ہیں۔"

لالہ جی نے لقمہ دیا، پوچھا۔ "صاحبان! میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں ٹھہروں یا جاؤں؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "میر سامان کرامت! اب بھی ہم یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ آپ بھی کسی کو رام کر سکتے ہیں۔"

میر سامان نے کہا۔ "میں نے کس کو رام کر لیا؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا گوہری!"

گوہری نے جواب دیا۔ "آپ کی گاڑی کہاں ہے؟ آپ جیتے میں ہاری۔ میں آپ کے ساتھ اسی وقت جمنا کے کنارے والی خالی حویلی میں چلوں گی، آپ فکرمند نہ ہوں۔"

لالہ جی نے پریشانی سے کہا۔ "دیوی! تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے، دو ایک دن تو رہ لو اس گھر میں۔"

گوہری نے جواب دیا۔ "نہیں لالہ جی! میں تو ان کے ساتھ اسی وقت چلی جاؤں گی۔" پھر میر سامان سے کہا۔ "اور ہاں، میں کئی دن سے کچھ کہنا چاہتی تھی، اگر اجازت ہو تو عرض کر دوں؟"

میر سامان نے کہا۔ "میں یہاں کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"اچھا پھر گاڑی لے آیئے۔"

میر سامان باہر نکل گیا لالہ جی نے بڑے دکھ سے پوچھا۔ "کیا تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ گی؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "ہاں لالہ جی! اگر کوئی کام ہو تو بتایئے۔"

میر سامان گاڑی لے آیا اور کہا۔ "لالہ جی سے کہہ دو کہ میں ان کا یہ قرض بھی چکا دوں گا، بہت جلد، عنقریب ہی۔"

لالہ جی نے طنزاً کہا۔ "گیا ہوا آدمی واپس کہاں آتا ہے۔"

میر سامان نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر لالہ جی کو سمجھایا۔ "لالہ جی! اس وقت میرے پاس چند سکوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ میں انہیں آپ کی نذر کر سکتا ہوں۔"

گوہری کی ماں نے ہاتھ پھیلا دیا لیکن اس ہاتھ پر رکھا کچھ بھی نہ گیا۔ میر سامان نے اپنی جیب کی ساری کی ساری رقم لالہ جی کے ہاتھ میں دے دی۔ لالہ جی خوش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ... باہر کھڑی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھے اور گاڑی جمنا کے کنارے خالی حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

رات کو انہیں خالی حویلی میں چھوڑ کر میر سامان اپنے گھر چلا گیا تھا۔ وہ گوہری سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد وہ گوہری کے پاس پہنچ گیا۔ جلدی جلدی کہا۔ "گوہری! تم نے اور کچھ بھی سنا؟"

"کیا؟ مجھے کچھ پتا نہیں۔"

میر سامان نے کہا۔ "گوہری! اگر تم رات لالہ جی کی دکان ہی میں رہتیں تو تمہیں صبح ایک دردناک خبر ضرور سننے کو ملتی۔"

"وہ کیا؟ کون سی خبر؟ معاملہ کیا ہے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "رات دلدار بیگ نے اپنے آدمیوں کی مدد سے دکان کو تباہ و برباد کر دیا۔"

گوہری کی ماں کی زبان سے نکلا۔ "یا اللہ خیر۔"

میر سامان نے ہنس کر کہا۔ "اللہ نے خیر تو اسی وقت کر دی تھی، جب مجھے دلدار بیگ کے منصوبے کا بروقت علم ہو گیا تھا۔"

گوہری کے سازندے اپنی جگہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ "بڑی سرکار میں آنا بڑا خطرناک کام ہے۔ میں نے تو پہلے ہی یہاں آنے سے منع کیا تھا۔"

دوسرے نے رائے دی۔ ''کسی امیر کی مخالفت اچھی بات تھوڑی ہے، کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

میر سامان نے ان دونوں کو ہنس کر جواب دیا۔ ''تم دونوں مت گھبراؤ، جو ہونا تھا ہو چکا۔ جب تک میں تم لوگوں کی پشت پر موجود ہوں کسی امیر کا نقصان پہنچانا اتنا آسان نہیں ہے۔''

گوہری کی ماں گوہری کو اشارے سے بلا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہاں سرگوشی میں سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''گوہری! میں تجھے کیا سمجھاؤں گی تو خود بہت سمجھدار ہے لیکن ایک بات جو میرے دل میں آئی ہے، تجھ سے ضرور کہوں گی۔''

گوہری نے جواب دیا۔ ''کہیے۔''

ماں نے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ میر سامان نے ہمارا بڑا ساتھ دیا ہے اور اسی کے ذریعے ہماری بادشاہ کے سجامنڈل میں حاضری ممکن ہو سکی۔ اس کی مہربانیوں سے تو بادشاہ سے ہم کلام ہوئی۔ ظاہر ہے کہ میر سامان نے یہ جو کچھ کیا یوں ہی تو نہیں کیا ہوگا۔''

گوہری نے جواب دیا۔ ''اماں! ہمارے ساتھ جو بھی مہربانی اور اخلاق سے پیش آتا ہے، اس کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے، وہ یہ کہ ہمیں حاصل کر لے۔''

ماں نے خوش ہو کر کہا۔ ''ہاں تو خود بڑی سمجھدار ہے، پھر تو نے کیا فیصلہ کیا میر سامان کے بارے میں؟''

گوہری نے کہا۔ ''آپ میرا فیصلہ پوچھ رہی ہیں؟ کمال ہے۔ بات صاف ہے کہ ہم لوگ یہاں کمانے آئے ہیں۔ اگر میں یہاں کسی ایک کی ہو گئی تو یہاں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔''

ماں کے چہرے پر تروتازگی پیدا ہو گئی، بولی۔ ''شاباش، مجھے تو ان امراء سے ڈر لگنے لگا ہے۔ انہیں قریب بلالینا تو بہت آسان ہے لیکن قریب بلا کر پیچھا چھڑانا بہت دشوار ہے۔''

گوہری نے جواب دیا۔ ''اماں! یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ ان امراء کو قابو میں رکھنا میرا کام ہے۔ میں نے انہیں سمجھ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جہاں آپس میں اتنی رقابتیں اور حسد و رشک پایا جاتا ہو وہاں انہیں قابو میں رکھنا بڑا آسان کام ہے۔''

ماں گوہری پر واری جا رہی تھی بولی۔ ''میں نے بھی ایک زمانہ دیکھا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تو میر سامان سے کچھ ایسے تعلقات رکھ کہ بعد میں کوئی مصیبت نہ اٹھ کھڑی ہو۔''

گوہری نے کہا۔ ''اماں! آپ بے فکر رہیے۔ میر سامان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''میں میر سامان سے نہیں، تیری خوش اخلاقی سے ڈرتی ہوں۔''

گوہری نے بے پروائی سے کہا۔ ''آپ کو یاد ہے نا، جب میں لاہور میں تھی تو میرے پاس ایک چینی آیا کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ گوہری جب میں تجھے ہنستے مسکراتے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے ملک کی ایک کہاوت یاد آجاتی ہے۔''

ماں حیرت سے دیدے پھاڑے گوہری کی باتیں سن رہی تھی، پوچھا۔ ''کون سی کہاوت؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''وہ کہتا تھا کہ ہمارے چین میں کہتے ہیں کہ جو مسکرانا نہیں جانتا وہ دکانداری نہیں کر سکتا۔'' پھر ماں کو ایک خاص انداز میں مسکرا کر دیکھا، بولی۔ ''اس چینی کی یہ کہاوت کہیں اور صادق آتی ہو یا نہ آتی ہو لیکن ہمارے پیشے پر اس کا صد فیصد اطلاق ہوتا ہے۔''

اسی وقت میر سامان بھی ان کے کمرے میں آگیا۔ بولا۔ ''یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں تنہائی میں؟ کیا میں مخل ہو سکتا ہوں؟''

گوہری نے نہایت خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ''بصد شوق، زہے نصیب کہ آپ کو ہمارا اتنا خیال رہتا ہے۔ اس وقت بھی ہم آپ ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ آپ نے ہمارا بڑا ساتھ دیا ہے، آپ ہمارے بڑے محسن ہیں۔''

میر سامان ہنسنے لگا، بولا۔ ''تو پھر اس کا منہ مانگا صلہ بھی دے دینا۔''

گوہری نے ہنس کر جواب دیا۔ ''واہ جناب! جب میں نے یہ کہہ دیا کہ آپ ہمارے محسن ہیں تو آپ اس کا صلہ مانگ کر خود کو میری نظروں میں کیوں گرا رہے ہیں۔ خدا کی قسم جس دن میں یہ محسوس کروں گی کہ آپ کسی طرح میری نظروں سے گر رہے ہیں تو میں خودکشی کر لوں گی لیکن آپ کو نظروں سے نہیں گرنے دوں گی۔''

میر سامان کا سینہ فخر و خوشی سے پھول گیا اور ماں کا خوشی سے برا حال ہوا جا رہا تھا۔ میر سامان نے کہا۔ ''گوہری! قرآن میں خدا خود فرماتا ہے کہ احسان کی جزا احسان کے سوا نہیں ہو سکتی۔ میں بھی کبھی تم سے کوئی احسان ہی طلب کروں گا۔''

ماں نے کہا۔ ''یہاں کیا کھڑے ہو تم دونوں، صحن میں

چل کر بیٹھو۔'' گوہری اور میر سامان گنبد کے تخت پر جا بیٹھے۔

میر سامان نے کہا۔ ''کل بادشاہ نے تم لوگوں کا ذکر خود ہی چھیڑ دیا۔ انہوں نے میر تعمیرات کو حکم دے دیا ہے کہ فتح پور میں آبادی سے الگ تھلگ ایک قطعہ زمین تم لوگوں کے لیے مختص کر دیا جائے۔ اس حکم پر شاید فوراً ہی عمل درآمد ہو جائے اور تمہارے لیے مکانات کی تعمیر کا کام آج یا کل میں شروع ہو جائے۔''

گوہری نے ماں کا خیال کیے بغیر ہی میر سامان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولی۔ ''یہ سب کچھ آپ ہی کے طفیل ہو رہا ہے۔ میری ہم پیشہ عورتیں آپ کو کتنی دعائیں دیں گی۔ بڑی دعائیں ملیں گی آپ کو۔''

میر سامان نے کہا۔ ''لیکن میں دعاؤں کے ساتھ ساتھ دوا بھی چاہتا ہوں۔''

اس نے گوہری کو بھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ تڑپ کر نکل گئی اور بولی۔ ''اوں ہوں، ابھی نہیں۔ پراگندہ روزی پراگندہ دل۔ ابھی دلجمعی نہیں ہے اس لیے ابھی تو میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا بھی نہیں۔''

میر سامان نے کہا۔ ''گوہری! میں جو کچھ چاہتا ہوں اس سلسلے میں تمہیں ابھی اسی وقت سوچنا ہے کیونکہ نئی آبادی کی تعمیر کے بعد نہ تو سوچنے کا وقت ہی ہوگا اور نہ تم سوچنا پسند کرو گی۔''

گوہری نے کہا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

میر سامان نے جواب دیا۔ ''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

گوہری کی ماں نے نہایت ناگواری سے میر سامان کی طرف دیکھا۔ گوہری کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا، بالکل غیر جذباتی۔ گویا اس پر میر سامان کی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ''پہلے سے کتنی بیویاں رکھتے ہیں آپ؟''

میر سامان نے کہا۔ ''تمہارا یہ سوال فضول ہے۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔''

گوہری نے کہا۔ ''میر سامان صاحب! میں یہاں شادی کرنے نہیں آئی ہوں، میں دولت کمانے آئی ہوں۔ شادی کر کے نہ تو آپ خوش ہوں گے نہ میں۔''

میر سامان کے جسم میں آگ سی لگ گئی، تلملا کر کہا۔ ''شادی کر کے ہم دونوں خوش کیوں نہیں ہوں گے، وجہ؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''میں شادی کی عادی نہیں ہوں اور آپ شادی کر کے اس سے بددل ہو جائیں گے کہ شادی کے بعد ملکیت اور اختیار کا احساس شوق اور تڑپ کو فنا کر دیتا ہے اور آدمی حاصل سے بے نیاز ہو کر غیر حاصل کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔''

میر سامان نے ذرا بے رخی سے کہا۔ ''گوہری! تمہاری حصولیابی میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن میں دلدار بیگ کی طرح جبر و زیادتی پسند نہیں کرتا۔''

گوہری نے نرمی سے جواب دیا۔ ''کرامت صاحب! آپ مجھ سے بقول خود عشق کرنے لگے ہیں لیکن محبوب کو دھمکی دینا عاشق کا شیوہ نہیں ہے، آپ کے طرز گفتگو سے مجھے دکھ پہنچا۔''

میر سامان نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا، کہا۔ ''گوہری! تم درست کہتی ہو کہ دھمکی دینا عاشق کا شیوہ نہیں لیکن تمہارے عشق نے میرے ہوش و حواس اور صبر و تحمل کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس وقت میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اس پر تم یقین نہ کرنا۔ میں اپنی گستاخ کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔''

گوہری ہنسنے لگی، بولی۔ ''اگر اس وقت آپ واقعی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں تو پھر اس نازک مسئلے پر اس وقت بات کیجیے گا جب آپ اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔''

میر سامان گوہری کی باتوں سے عاجز آ گیا۔

حویلی کے صدر دروازے پر کوئی زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ حویلی کے اندر از قسم خدمت گار کوئی بھی نہ تھا۔ میر سامان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے سازندوں سے کہا۔ ''تم میں سے کوئی ایک صدر دروازے پر چلا جائے اور معلوم کرے کہ کون ہے اور کس سے ملنا چاہتا ہے؟''

ایک سازندہ جب جانے لگا تو میر سامان نے بھنچی بھنچی آواز میں ہدایت کی۔ ''اور دیکھو، یہاں میری موجودگی کا کسی کو علم نہ ہو۔''

تھوڑی دیر بعد سازندہ واپس آ گیا، بولا۔ ''امیر دلدار بیگ آیا ہوا ہے۔ وہ بی بی گوہری سے ملنا چاہتا ہے۔''

میر سامان کی جان نکل گئی، آہستہ سے پوچھا۔ ''اسے میری بابت تو کچھ نہیں بتایا تھا؟''

سازندے نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ میں نے آپ کی بابت کچھ بھی نہیں بتایا لیکن وہ دروازے پر کھڑے ہیں، میں انہیں کیا جواب دوں؟''

میر سامان نے کہا۔ ''تم اس سے کہہ دو، گوہری تم

سے نہیں ملنا چاہتیں اور تم آئندہ یہاں مت آنا۔"

سازندہ کچھ ہی دیر بعد پھر واپس آ گیا، بولا۔ "دلدار بیگ صاحب تو کمبل ہو گئے ہیں، ٹلتے ہی نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

میر سامان نے عاجزی سے کہا۔ "گوہری! تم اسے کسی بھی طرح رخصت کر دو، ورنہ میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ تم نہیں جانتیں کہ اگر دلدار بیگ نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بادشاہ کے کان میرے خلاف کس کس طرح بھرے گا؟"

گوہری نے تشویش سے پوچھا۔ "آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور بادشاہ سے ڈرتے ہیں، کمال ہے۔"

میر سامان نے جواب دیا۔ "ہاں، بات ہی کچھ ایسی ہے۔ بادشاہ سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔"

گوہری نے کہا۔ "میں تو ان صاحب کو کسی نہ کسی طرح ٹال ہی دوں گی لیکن آپ کیا کریں گے کیونکہ میں دلدار بیگ صاحب کو بہت ممکن ہے اندر بلوا لوں، اس حالت میں آپ کہاں چھپیں گے؟"

میر سامان بھاگنے کی تیاری کر چکا تھا، جلدی جلدی بدحواسی میں بولا۔ "میں حویلی کے پچھلے دروازے سے فرار ہو جاتا ہوں لیکن فرار ہونے سے پہلے میری ایک بات ضرور یاد رکھنا، وہ یہ کہ یہاں میری موجودگی کا دلدار بیگ ہی کو کیا، کسی کو بھی علم نہیں ہونا چاہیے۔"

گوہری نے انہیں پچھلے دروازے سے رخصت کر دیا۔ وہ دروازے کی جھری سے میر سامان کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ پھر بے تحاشا ہنستی ہوئی سازندے سے بولی۔ "جا، صدر دروازے پر اپنے ساتھی سے کہہ دے کہ وہ گیا اب واپس آ جائے۔"

کچھ دیر بعد سازندہ اپنے ساتھی کے ساتھ ہنستا ہوا گوہری کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

گوہری بھی خوب ہنستی رہی، بولی۔ "اگر میں یہ ترکیب نہ کرتی تو اس بجلی اور موذی سے چھٹکارا نہ ملتا۔" پھر ماں سے کہا۔ "کیوں اماں! میں نے ٹھیک کیا نا؟"

ماں نے جواب دیا۔ "گوہری! مجھے تیری عقل پہ بھروسا ہے، لیکن میں یہاں کے دوسرے امراء سے بہت ڈرتی ہوں۔"

گوہری نے کہا۔ "مت ڈریئے، ان امیروں کو کچھ بھی نہیں آتا، احمق بے وقوف کہیں کے۔ میں اگر انہیں نچانا چاہوں تو بندر کا ناچ نچا دوں۔"

سازندے بہت خوش تھے، بولے۔ "عجیب بے وقوف ہے یہ میر سامان بھی، بے وقوف آدمی یہ بھی نہیں سوچتا کہ ہم سب یہاں کچھ کمانے آئے ہیں، کم بخت بی بی سے کہتا ہے شادی کر لو۔ سور کھوتا دھن، گیدڑ کی اولاد کہیں کا۔"

گوہری نے ڈانٹا۔ "تم لوگ میر سامان کے بارے میں یوں اظہار خیال نہ کرو، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ ان سب نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ صدر دروازے سے میر سامان، دلدار بیگ اور مبیش داس بیربل ایک ساتھ چلے آ رہے تھے۔ گوہری اور اس کی ماں کو بڑی حیرت ہوئی۔ گوہری دوسرے کمرے میں جانے لگی لیکن دلدار بیگ نے اسے ڈانٹا۔ "گوہری! خبردار جو تو نے چھپنے کی کوشش کی۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں نے محض تیری خاطر لالہ کی دکان کو تباہ و برباد کرا دیا۔ یہ کس کی حویلی ہے اور تجھے اس حویلی میں کس نے اتارا ہے؟ میں نہیں جانتا لیکن میں ایک بات ضرور جانتا ہوں کہ میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ تجھے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں نے تجھے تلاش کر لیا، میرا نام دلدار بیگ ہے۔"

بھدے جسم اور بھونڈی شکل والا بیربل مسکرا رہا تھا۔ دلدار بیگ سے بولا۔ "مرزا! تم گوہری غریب کو دھمکی کیوں دے رہے ہو؟"

دلدار بیگ نے جواب دیا۔ "بیربل! تم خاموش رہو۔ میں جانتا ہوں، بادشاہ کے مزاج میں تم بہت زیادہ دخیل ہو لیکن یہ گوہری کوئی اور ہے۔ یہ مہابلی کا دربار نہیں ہے۔ تم دونوں خواہ مخواہ میرے ساتھ آ گئے ہو ورنہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میں سے کوئی ایک بھی میرے ساتھ آئے۔"

بیربل نے مسخرے پن سے کہا۔ "گوہری کے تم کیا لگتے ہو؟ بھائی؟ باپ یا شوہر؟ اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک رشتہ بھی نکل آیا تو میں یہاں آنے پر نادم ہو جاؤں گا ورنہ میں یہاں جس غرض سے آیا ہوں، اگر یہ بتا دوں تو تم دونوں کا ہوش و حواس کے ساتھ یہاں سے واپس جانا مشکل ہو جائے گا۔"

دلدار بیگ نے جواب دیا۔ "میں نہ تو گوہری کا بھائی ہوں، نہ باپ نہ شوہر۔ ہاں شوہر بننے کا ارادہ ضرور رکھتا ہوں۔ رہا یہ سوال کہ تم یہاں کیوں آئے ہو، میں نہیں جاننا چاہتا۔"

میر سامان کے دل پر آرے سے چل رہے تھے، جل کر بولا۔ "تم گوہری سے شادی کس طرح کر لو گے؟
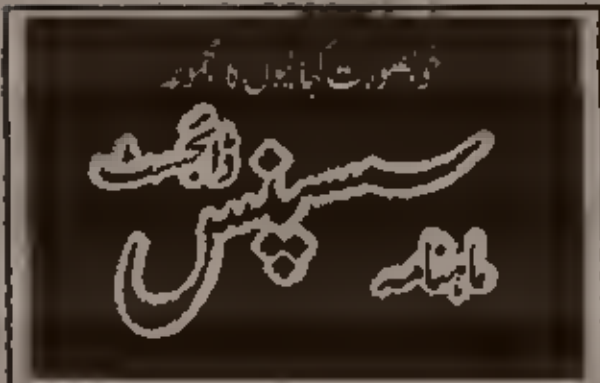
زبردستی؟ اگر وہ تمہیں پسند ہی کرتی تو نالہ کی دکان سے بھاگ کر اس حویلی میں کیوں آتی؟"

دلدار بیگ نے طیش میں کہا۔ "تو بادشاہ کا میر سامان ہے، تو بادشاہ کے توشک خانے کا انتظام سنبھال اور یہاں سے بھاگ جا۔"

بیربل نے کہا۔ "مرزا! تو اپنے سوا ہر ایک کو بھگا دینا چاہتا ہے، کیا تیری عقل تو نہیں ماری گئی۔ یہ خانۂ دلبراں ہے، جہاں کوئی بھی عاشق آسکتا ہے۔ میں تجھے مشورہ دوں گا کہ تو گوہری سے عشق نہ کر، آشنائی کر.... اس سے دونوں فائدے میں رہیں گے۔"

دلدار بیگ پر عشق کا بھوت سوار تھا، بیربل کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، گوہری سے پوچھا۔ "تجھے اس حویلی میں کون لایا؟"

میر سامان نے نظروں ہی نظروں میں منع کیا کہ اس کا نام نہ لیا جائے۔ گوہری نے جواب دیا۔ "آپ مجھ سے ذاتی نوعیت کے سوال نہیں کر سکتے، اگر کریں گے تو میں ان کے جواب دینا غیر ضروری سمجھوں گی۔"

بیربل نے ذرا درشت لہجے میں کہا۔ "مرزا! مجھے جہاں پناہ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں امراء کی نگرانی کروں کیونکہ جہاں پناہ یہ نہیں پسند کرتے کہ ان کے امراء زنانِ بازاری میں دلچسپی لیں۔ میں اب مزید باتیں نہیں سن سکتا۔ ہم تینوں کو اسی وقت یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

میر سامان نے کہا۔ "میں واپس چلنے کو تیار ہوں۔"

دلدار بیگ بھی گھبرایا۔ پوچھا۔ "جہاں پناہ نے تمہیں یہ حکم کب دیا؟"

بیربل نے جواب دیا۔ "کل شب کو.... اور مجھے ہی نہیں، کئی دوسرے امراء کو بھی۔" پھر میر سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہوسکتا ہے ان میں یہ بھی شامل ہوں۔ جہاں پناہ زنانِ بازاری سے بہت فکر مند ہیں۔"

میر سامان نے کہا۔ "بیربل! اگر جہاں پناہ نے تمہارے ذمے کوئی خدمت کی ہے تو تمہیں اس کا چرچا نہیں کرنا چاہیے۔"

دلدار بیگ اور زیادہ سہم گیا۔ وہ نرم پڑ گیا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں اب یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ جہاں پناہ سے میری شکایت نہ کرنا۔ اگر شکایت کرنا تو یہ بھی بتا دینا کہ میں گوہری کے پاس تماشائی بن کے نہیں پہنچا تھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور شادی کرنا گناہ نہیں ہے۔"

گوہری، اس کی ماں اور سازندے بیربل کو شکر گزار

نظروں سے دیکھنے لگے کیونکہ دلدار بیگ جیسے خونخوار سے پیچھا چھڑانا بیربل ہی کا کام تھا۔ بیربل نے جاتے جاتے گوہری سے کہا۔ "بی بی! میں وقتاً فوقتاً اس حویلی کے چکر لگاتا رہوں گا۔ اس دوران اگر کسی پریشانی سے دوچار ہونا پڑے تو مجھے مطلع کر دینا۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ مہابلی تمہارا مسئلہ بہت جلد حل کرنے والے ہیں۔"

گوہری نے سرتاپا نیازمندی سے کہا۔ "میں آپ سب کی شکر گزار ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ مہابلی کا میری ہم پیشگان پر التفات آپ ہی لوگوں کا مرہون منت ہوگا، ورنہ بڑے دربار میں چھوٹوں کی باتوں پر دھیان ہی کون دیتا ہے۔"

بیربل نے دلدار بیگ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، کہا۔ "آؤ مرزا دلدار بیگ صاحب، اس وقت سے پہلے ہی نکل چلیں جب یہاں کوئی میرے ہی جیسا مخبر اور آدھمکے۔"

میر سامان بھی بہت پریشان تھا۔ بیربل ان دونوں کو ساتھ لے کر اس حویلی سے چلا گیا۔

اس دوران میں بادشاہ نے ایک عجیب و غریب اعلان کرا دیا۔ بادشاہ نے ایک نئے مذہب کا اعلان کر دیا تھا۔ دین الٰہی۔ یہ بادشاہ کا دین تھا۔ دین بادشاہی۔ بادشاہ کا وزیر اور معتمد خاص ابوالفضل بادشاہ کی پشت پر تھا۔ آگرہ، فتح پور اور ملک کے دوسرے حصوں میں انتشار کے آثار نظر آنے لگے۔ بادشاہ کے دین کو جن لوگوں نے فوراً ہی اختیار کر لیا، ان میں بیربل کا نام سرفہرست تھا۔ بادشاہ بیربل سے یوں ہی بہت خوش رہتا تھا، اب اور زیادہ خوش ہو گیا۔

بادشاہ کے سامنے امراء اور معززین شہر کے علاوہ مختلف مذاہب کے دینی پیشوا اور عالم بھی موجود تھے۔ بادشاہ مختلف مذاہب کے عالموں سے بحث و مباحثہ کرا رہا تھا۔ وہ آپس میں بری طرح الجھ رہے تھے۔ بادشاہ ان سب سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس بحث و مباحثے کے دوران ایک ہندو عالم کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو خاموش کر دیا۔

اس نے کھڑے ہو کر حاضرین دربار پر ایک اچٹتی نظر ڈالی، پھر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "مہابلی اور حاضرین دربار! لوگوں کی بحث و مباحثے کی لن ترانیاں ہرگز ایسی نہیں ہیں جن پر سمجھدار اور حق شعار اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔ میں اپنے دھرم کا مہا گیانی ہوں نہ مورکھ! تمہاری عقلوں اور آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے عہد کے رام اور کرشن کو نہیں پہچان رہے ہو۔" پھر اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مہابلی اس دور کے اوتار ہیں اور پرمیشور نے مہابلی میں حلول کیا ہے۔" پھر حاضرین سے پوچھا۔ "کیا تم لوگوں نے اس بادشاہ کو ابھی تک نہیں پہچانا۔ یہ بادشاہ مہابلی ہیں۔ اپنے اپنے جھگڑے ختم کرو اور مہابلی کی اوتاریت پر ایمان لے آؤ۔"

درباریوں میں سے اکثر نے بادشاہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کیا لیکن ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے بادشاہ کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ ان میں مشہور راجپوت سردار راجہ مان سنگھ، میر سامان کرامت علی اور مرزا دلدار بیگ بھی شامل تھے۔ بیربل نے راجہ مان سنگھ سے طنزاً دریافت کیا۔ "کیا بات ہے؟ کیا تم مہابلی کو پرمیشور کا اوتار نہیں سمجھتے؟"

مان سنگھ نے جواب دیا۔ "بیشک جی! اس جلسے میں، میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ ہاں اگر خود مہابلی مجھ سے یہ سوال کریں گے تو میں انہیں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔"

بادشاہ نے نہایت پیچیدہ لفظوں میں اپنا مفہوم ادا کیا۔ "مان سنگھ ایک بات ہے، اس سے تم جیسا سمجھدار ضرور واقف ہوگا۔"

مان سنگھ نے پوچھا۔ "مہابلی! وہ کیا؟"

بادشاہ نے کہا۔ "اخلاص کامل کے لیے کچھ گواہیاں دینا پڑتی ہیں۔ تمہاری جاں نثاری اور وفاداری اپنی جگہ لیکن اگر ان کا کسی اور طرح بھی اقرار ہو جائے تو کیا کہنے۔"

مان سنگھ نے جواب دیا۔ "مہابلی! اگر میری جاں نثاری اور وفاداری کے لیے کسی اور طرح کے اقرار سے یہ مراد ہے کہ میں مہابلی کا مرید ہو جاؤں تو میں اس وقت بھی مہابلی کا مرید ہی ہوں کیونکہ مہابلی دیکھتے ہیں کہ میں جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں، مزید کسی امتحان کی ضرورت نہیں، لیکن اگر اس مریدی کا مطلب کچھ اور ہے یعنی حضور کی مراد یہ ہے کہ میں دین الٰہی اختیار کر لوں تو میں اپنا دھرم چھوڑ کے اگر کوئی دوسرا دھرم اختیار کر سکتا ہوں تو وہ اسلام ہے۔ حکم دیجیے، میں ابھی مسلمان ہوا جاتا ہوں۔ ان دو مذہبوں کے علاوہ میں کسی تیسرے مذہب کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں۔"

بادشاہ نے خاموشی اختیار کی۔

اسی دن ہندو اور مسلمانوں کے ایک ہجوم نے اپنے اپنے ہاتھوں سے اقرار نامے لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے۔

بادشاہ نے اپنے عام اور وفادار معتقدین کو "احدی"

کالقب دیا۔

جن امراء نے بادشاہ کو اوتار یا صاحب زماں نہیں مانا تھا، انہیں بادشاہ نے وقت اور حالات کے تقاضوں کے پیش نظر کوئی اہمیت نہیں دی لیکن انہیں باری باری خلوتوں میں طلب کرنیا گیا۔ اس نے مرزا دلدار بیگ کو بلا کر خوب خوب ڈانٹا۔ برا بھلا کہتے ہوئے چند طمانچے بھی رسید کر دیے، کہا۔ "دلدار بیگ! تم میرے نمک خوار ہو اور میری ہی بزرگی اور فضیلت کا انکار کرتے ہو۔"

دلدار بیگ نے جواب دیا۔ "میں بہت بڑا گناہ گار سہی لیکن میں اپنی زندگی کا بدترین گناہ نہیں کر سکتا۔ میں مسلمان ہوں، مسلمان تھا اور مسلمان ہی مروں گا۔"

بادشاہ نے اس کے منہ پر ایک زوردار مکا رسید کر دیا۔ دلدار بیگ چکرا کے گر گیا۔ بادشاہ نے کہا۔ "خبردار! جو تجھے گوہری یا کسی اور طوائف کے پاس دیکھا گیا۔ تیری امارت بحال رہے گی لیکن تیرے لہو ولعب پر پابندی لگادی گئی ہے۔"

دلدار بیگ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت بادشاہ نے بیربل کو طلب کیا۔ جب وہ آگیا تو اس سے دریافت کیا۔ "وہ ضمیرا کہاں ہے جس کی دکان اس دلدار بیگ مردود نے گوہری کی خاطر تباہ و برباد کر دی تھی؟"

بیربل نے جواب دیا۔ "مہابلی! میں اسے یہاں بھی لاسکتا تھا لیکن اس خیال سے نہیں لایا کہ اصل واقعے کا مہابلی کے علم میں آجانا ہی کافی ہے۔ مظلوم کو انصاف اور ظالم کو سزا مل جائے گی، بس یہی کافی ہے۔"

اکبر نے کہا۔ "وہ بدمعاش میر سامان کہاں ہے، اسے حاضر کیا جائے۔"

کچھ دیر بعد میر سامان بھی حاضر کر دیا گیا۔ بادشاہ نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "کیا تو نے گوہری کی اسی لیے سفارش کی تھی کہ اسے زیر بار احسان کر کے اس سے شادی کرلے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "حضور والا! شادی کرنا گناہ تو نہیں ہے؟"

اکبر نے ایک بھرپور مکا میر سامان کے منہ پر بھی رسید کر دیا۔ غصے میں کہا۔ "میں اس قسم کے جوابات نہیں سن سکتا۔ تجھے جواب دینے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ تو کس سے مخاطب ہے۔"

میر سامان کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "حضور اس ملک کی سب سے زیادہ بااختیار شخصیت ہیں۔ اس اختیار کو اگر یوں استعمال کیا گیا تو پھر مہابلی اور کسی ادنیٰ آدمی میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔ ایک معمولی آدمی بھی اپنے گھر، محلے میں بلا کر اسی طرح مار سکتا ہے۔"

بیربل نے سختی سے کہا۔ "تو اپنی زبان بند کر، کہیں تیری گستاخ کلامی تجھے ہلاک نہ کرادے۔"

میر سامان نے جواب دیا۔ "تم چپ رہو، بات میں مہابلی سے کر رہا ہوں اور مہابلی کو اس کا پورا حق پہنچتا ہے کہ چاہیں تو مجھے ہلاک کردیں اور چاہیں تو بخش دیں۔"

بادشاہ میر سامان کی خوشامدانہ باتوں سے کسی قدر متاثر ہوا، بولا۔ "تو کہنا کیا چاہتا ہے میر سامان؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "مہابلی! میں ایک کم نام اور ادنیٰ خاندان کا ایک فرد تھا۔ حضور والا کی کرم فرمائی اور بندہ پروری نے مجھے فرش سے عرش پر پہنچادیا۔ اب اگر مہابلی خود ہی مجھے دوبارہ خاک میں ملا دینا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی انکار نہیں۔ میں راضی بہ رضائے بادشاہ ہوں۔ میں سر تسلیم خم کرتا ہوں، بادشاہ اسے قلم کرا سکتا ہے۔"

اکبر نے پوچھا۔ "پھر تو نے دین الٰہی کیوں نہیں قبول کیا؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "مہابلی! مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیا جائے۔ اگر میں سوچے سمجھے بغیر دین الٰہی اختیار کرلوں گا تو زندگی بھر ضمیر کے کچوکوں سے پریشان رہوں گا اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دین الٰہی بڑے غور و خوض کے بعد اختیار کروں گا۔"

بادشاہ نے بیربل سے پوچھا۔ "مہیش داس! تیرا کیا خیال ہے؟ کیا میر سامان سچ کہہ رہا ہے یا یہ مجھے دھوکا دے رہا ہے؟"

بیربل نے جواب دیا۔ "مہابلی! یہ دھوکا دے کر جائے گا کہاں؟ میرا خیال ہے یہ سچ بول رہا ہے۔"

بادشاہ نے میر سامان سے کہا۔ "فی الحال تو اپنے آبائی دین پر قائم رہ، پھر دیکھا جائے گا۔"

میر سامان نے عرض کیا۔ "حضور والا! میں روشن ضمیر بادشاہ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں گوہری سے محبت کرنے لگا ہوں اور اسے حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس میں حضور کوئی دخل نہ دیں۔"

بیربل نے مخالفت کی۔ "مہابلی! میرے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بازاری عورتوں کو گھروں میں نہیں داخل ہونا چاہیے۔"

اکبر نے تائید کی اور اعلان کیا۔ "بیربل! میں نے میر تعمیرات کو حکم دے دیا ہے۔ وہ فتح پور کے خالی میدان میں زنانِ بازاری کی آبادی قائم کر دے گا۔ میں نے اس بستی کا نام بھی سوچ لیا ہے۔"

بیربل اور میر سامان نے تقریباً ایک ساتھ اور ایک ہی سوال کیا۔ "مہابلی نے کیا نام سوچا ہے؟"

اکبر نے جواب دیا۔ "چونکہ اس نئی آبادی میں زنانِ بازاری اور ان کے پیشے چاہنے والوں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوگا اس لیے میں نے ان کے پیشے کی نسبت سے اس نئی آبادی کا نام شیطان پورہ رکھ دیا ہے۔"

میر سامان اور بیربل نے ایک ساتھ عرض کیا۔ "کیا خوبصورت نام تجویز فرمایا ہے حضور والا نے۔ یہ نام بھی ایک طرح سے الہامی اشارے پر رکھا ہوگا۔"

بادشاہ نے مزید کہا۔ "اس شیطان پورہ کے لیے میں نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ وہاں ایک عملہ رکھا جائے گا۔ نگراں، داروغہ اور منشی ان سب کا یہ کام ہوگا کہ وہاں جو بھی جائے اس کا نام پتا اور پیشہ وغیرہ لکھ لیا جائے۔ امراء کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اگر وہ وہاں رات بسر کرنا چاہیں تو مجھ سے پہلے ان کی منظوری حاصل کر لیں۔ اس کے ساتھ یہ کہ اگر وہ شیطان پورہ کی کسی عورت یا لڑکی کو کہیں اور لے جانا چاہیں تو انہیں اس کی بھی اجازت اس وقت ملے گی جب وہ باضابطہ اجازت طلب کریں گے۔"

دونوں کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ بادشاہ ان دونوں کی دلی کیفیات کا خوب اندازہ کیے ہوئے تھا۔ آخر میں بادشاہ نے بیربل سے کہا۔ "مہیش داس! تم اس دلدار بیگ سے وہ ساری دولت نکلوا لو جو خطیر ہے کو نقصان پہنچانے میں ضائع ہو چکی ہے۔"

بیربل نے دریافت کیا۔ "اور اس کے بعد؟"

بادشاہ نے کہا۔ "اس کے بعد اسے بھیک مانگنے کے لیے آگرے کے گلی کوچوں میں چھوڑ دیا جائے۔"

دلدار بیگ کا چہرہ فق ہو چکا تھا لیکن جب کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا تو آواز نہیں نکلی۔

دلدار بیگ کو قید خانے میں ڈلوا دیا گیا۔ بیربل اور میر سامان ہنستے ہوئے باہر نکلے۔ بیربل نے شرارتاً کہا۔ "میر سامان صاحب! مجھ سے ذرا بچ کر رہیے گا کیونکہ میں بادشاہ کو خبریں اور کارگزاریاں پہنچایا کرتا ہوں۔"

میر سامان نے جواب دیا۔ "مہیش داس! آخر اس دربار میں میری اپنی بھی تو کوئی حیثیت ہے اور وہ حیثیت بہت اہم ہے ورنہ یہاں کوئی بھی کچھ نہیں۔"

بیربل زور زور سے ہنسنے لگا۔

☆☆☆

دلدار بیگ کی بڑی درگت بنی۔ بیربل اور میر سامان گوہری کے پاس برائے نام آئے گئے۔ ہاں چوری چھپے خرچ دونوں ہی دے رہے تھے۔ گوہری کی ماں بہت خوش تھی کہ اب کوئی بھی گوہری سے شادی کی بات نہیں کر رہا تھا۔ شیطان پورہ تعمیر ہوتا رہا اور پھر جب تعمیر کا کام ختم ہو گیا تو ساری طوائفوں کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔ شیطان پورہ کو چاروں طرف سے فصیلوں کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔ اس میں داخلے کا ایک ہی راستہ تھا اور اس راستے میں سب سے پہلے نگراں، داروغہ اور منشی کے دفاتر تھے جہاں باقاعدہ لکھت پڑھت ہوتی تھی۔ گوہری کی شیطان پورے میں شاندار زندگی گزر رہی تھی لیکن یہاں میر سامان کی یاد بھی کبھی آ جاتی تھی۔ میر سامان اور بیربل کا شیطان پورے میں داخل ہونا یوں دشوار گزار ہو گیا تھا کہ ان کے ناموں کا اندراج ہو جاتا اور پھر یہ خبر بادشاہ تک پہنچ جاتی۔

ان دنوں میر سامان بہت پریشان اور اداس تھا۔ اس کا رقیب اور حریف بیربل اپنی جاگیر کو روانہ کیا ہوا تھا۔ میر سامان شیطان پورہ میں داخلے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ وہ چاہتا تو رشوت دے کر اندر داخل ہو جاتا لیکن شیطان پورے کے دفتری عملے کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ وہ رشوت لینے کے بعد بھی بادشاہ کو مطلع کر سکتے تھے۔ سوچتے سوچتے اس کے سر میں درد ہو گیا اور آہستہ آہستہ اتنا بڑھا کہ اسے طبیب کے پاس جانا پڑ گیا۔ طبیب نے اسے نہایت توجہ سے دیکھا اور نسخہ لکھ کر دوا تیار کرا دی۔ مطب کے باہر اس کی پالکی رکھی تھی اور وہ کہار زمین پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ دوا لے کر باہر نکلے تو مطب کے دوسرے دروازے سے ایک لڑکا نکلا اور بھاگتا ہوا میر سامان کے پاس آن کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تذبذب کی حالت میں میر سامان کو دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میر سامان کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ میر سامان پالکی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا، پوچھا۔ "میاں صاحبزادے! تم میری شکل میں کسے تلاش کر رہے ہو؟"

لڑکے نے پھر سوال کیا۔ "کیا آپ ہی میر سامان ہیں؟"

اس نے حیرت زدہ آواز میں کہا۔ "لڑکے میں پوچھتا ہوں کہ تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟"

لڑکے نے کہا۔ ''اک ذرا میرے ساتھ آجائیے، آپ سے ایک کام ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کہاں؟ تم کہاں سے آئے ہو اور تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔''

میر سامان چونک پڑا۔ ڈرتے ڈرتے لڑکے کے ساتھ ہولیا۔ لڑکا اسے مطب کے اس حصے میں لے گیا جہاں مریض عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لڑکا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد مطب کے دروازے پر ایک عورت آن کھڑی ہوئی۔ تب نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ''گوہری! یہ تم ہو کیا واقعی تم ہو؟ گوہری! کیا تم سچ مچ اس وقت میرے سامنے کھڑی ہو؟''

گوہری نے کہا۔ ''ہاں میں گوہری ہوں! آپ کو پہچاننے میں زحمت کیوں پیش آ رہی ہے؟''

میر سامان نے جواب دیا۔ ''میں نے تمہیں ایک عرصے بعد دیکھا ہے۔ اس لیے یقین نہیں آ رہا کہ میں نے تمہیں اچانک پا لیا ہے۔''

گوہری نے کہا۔ ''میں یہاں بات نہیں کر سکتی، مجھے کہیں اور لے چلیے۔''

میر سامان بھی یہی چاہتا تھا، پوچھا۔ ''تمہارے ساتھ اور کون ہے؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''کوئی بھی نہیں، بس یہ لڑکا ہے میرے ساتھ جو ابھی آپ کو بلانے گیا تھا۔''

میر سامان کچھ سوچنے لگا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا تم میرے گھر چلنا پسند کرو گی؟''

گوہری نے کہا۔ ''میں کہیں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں بشرطیکہ اس میں آپ کی بدنامی نہ ہو۔''

میر سامان نے کہا۔ ''میں اپنی پالکی میں گھر جاتا ہوں۔ تم طبیب کی طرف سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میری حویلی میں آجاؤ۔ میں تمہارے کہار کو اپنا پتا سمجھائے دیتا ہوں۔ وہ تمہیں لے کر آجائے گا میرے پاس۔''

گوہری نے جلدی جلدی مسکرا کر کہا۔ ''میر سامان کرامت علی صاحب! عجلت اور بدحواسی میں کوئی ایسا قدم مت اٹھائیے جس سے بعد میں پریشانی یا ندامت کا سامنا کرنا پڑ جائے۔''

میر سامان نے پریشانی سے پوچھا۔ ''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی حویلی میں آتو جاؤں لیکن آپ کی بیویاں کیا کہیں گی؟ انہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

میر سامان ہنس دیا، بولا۔ ''ارے گوہری! تم ان بے کار فکروں میں کیوں پڑتی ہو؟''

گوہری نے بھی ہنس کر جواب دیا۔ ''اچھا، اگر یہ بات ہے تو آپ چلیے میں آتی ہوں۔''

میر سامان پالکی میں آبیٹھا اور کہاروں کو حکم دیا۔

''اٹھاؤ پالکی۔ لے چلو۔''

کہاروں نے پالکی اپنے کاندھوں پر رکھ لی۔ میر سامان پالکی سے جھانکتا رہا۔ وہ بدستور گوہری کو دیکھے جا رہا تھا جو خود بھی مطب کے اوپر سے دیکھ رہی تھی۔

میر سامان حویلی کے باہر ٹہلنے لگا، وہ بار بار اس رہگزر کو دیکھ رہا تھا جدھر سے گوہری کی پالکی نمودار ہونے والی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ایسی پالکی آتی دکھائی دی جس پر سرخ بانات پڑی ہوئی تھی۔ وہ حویلی سے بیس پچیس قدم آگے چلا گیا اور پالکی کو وہیں رکوا لیا۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنی حویلی کی طرف دیکھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ جب اسے نہ دیکھنے کا یقین ہو گیا تو اس نے کہاروں سے کہا۔ ''اودھر دیکھو، میری حویلی کی طرف، تم اس کی پشت پر پہنچو۔ اودھر پیچھے ایک دروازہ ہے۔ دروازے کے پیچھے زینہ ہے، یہ زینہ اوپر جاتا ہے۔'' پھر گوہری سے کہا۔ ''تم پالکی سے اتر کر اس زینے سے اوپر چلی جاؤ۔ میں وہیں ملوں گا تمہیں۔ وہاں تنہائی ہے۔''

کہاروں نے پالکی اٹھائی اور دکان کے پیچھے پہنچا دی۔ گوہری پھرتی سے باہر نکلی اور دروازے میں گھس کر زینے پر چڑھنے لگی۔

اس کے پیچھے ہی میر سامان بھی وہیں پہنچ گیا اور تیزی سے زینے سے چھت پر پہنچ گیا۔

حویلی کی چھت پر ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں کوئی رہتا تو نہیں تھا لیکن کبوتر ضرور پال رکھے تھے۔ کبوتروں کے کابک کمرے کے باہر چھت پر رکھے ہوئے تھے اور کمرے کے اندر ایک تخت اور ایک چوکی بھی۔ ان دونوں پر سفید چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے سامنے رکھے ہوئے کابکوں میں کبوتر بند تھے اور ان کی غٹرغوں غٹرغوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میر سامان اور گوہری اس کمرے میں بیٹھ گئے۔

گوہری نے کہا۔ ''میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں

تھی کیونکہ پالکی نیچے رکھی ہے اور بادشاہ کے آدمی ہم پر نظریں رکھے ہوئے ہیں۔"

میر سامان نے جواب دیا۔ "گوہری! اب تو میں تم سے مل بھی نہیں سکتا، بادشاہ کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ اس نے شیطان پورے کے دروازے پر نگراں بٹھا دیے ہیں حالانکہ خود بادشاہ عورتوں کے معاملے میں کبھی بھی کسی تعداد کا پابند نہیں رہا ہے۔"

گوہری نے کہا۔ "ایک بات تو بتائیے۔ یہ مرزا ولدار بیگ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "میں اس وقت بادشاہ کے سامنے تو نہیں تھا لیکن سنتا ہوں، بادشاہ نے اس کی مرمت کروی۔ بادشاہ نے اپنے خوشامدیوں کے مشورے پر ایک نیا دین نکالا ہے۔ دین الٰہی اکبر شاہی جب بھرے دربار میں درباری بادشاہ کو سجدہ کر رہے تھے تو ان میں سے چند ایسے بھی تھے جنہوں نے سجدہ نہیں کیا۔ مان سنگھ میں اور مرزا ولدار بیگ۔ کچھ اور لوگ بھی تھے جن کے اس وقت نام نہیں یاد آ رہے۔ مان سنگھ نے تو بھرے دربار میں یہ کہہ دیا کہ وہ مسلمان تو ہو سکتا ہے لیکن دین الٰہی نہیں اختیار کرے گا۔"

گوہری نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "راجا مان سنگھ بہادر آدمی ہے۔ شاباش و آفرین ہے اس کے حوصلے پر۔"

میر سامان کہتا رہا۔ "پھر جب دربار برخاست ہوا تو بادشاہ نے ان سب کو باری باری خلوت میں طلب فرمایا جنہوں نے اسے سجدہ نہیں کیا تھا۔ ان میں میں بھی شامل تھا اور ولدار بیگ بھی۔"

گوہری نے پوچھا۔ "اور بیربل کہاں تھا؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "اس نے تو بادشاہ کو سجدہ کر لیا تھا لیکن اس وقت وہ بادشاہ کے خلوت میں بھی موجود تھا۔"

گوہری نے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟ تفصیل تو بتاؤ۔"

میر سامان نے کہا۔ "بادشاہ نے چڑ کر ولدار بیگ سے معلوم نہیں کیا کچھ پوچھا اور پتا نہیں اس نے ان کے کیا جواب دیے کہ بادشاہ نے طمانچوں اور مکوں سے اس کی مرمت کر دی۔ بیربل سے تو یہی معلوم ہوا کہ اگر ولدار بیگ دین الٰہی اختیار کر لیتا اور بادشاہ کو سجدہ کر لیتا تو یہ ناخوشگوار واقعہ ہرگز پیش نہ آتا۔"

گوہری نے دریافت کیا۔ "اس واقعے کے بارے میں آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "میں خود بھی بیربل کی رائے سے یوں متفق ہوں کہ جب بادشاہ نے مجھ پر بھی وہی دباؤ ڈالا اور میں نے بادشاہ سے سوچنے سمجھنے کا وقت مانگا تو بادشاہ نرم پڑ گیا اور مجھ سے سختی نہیں کی گئی۔"

"ہوں۔" گوہری کسی سوچ میں پڑ گئی۔ "تو ولدار بیگ کو اس لیے ذلیل کیا گیا کہ اس نے بادشاہ کے دین الٰہی کو اختیار نہیں کیا۔ بادشاہ کو سجدہ نہیں کیا اور اپنے دین اور مسلک پر جواں مردی اور استقلال سے قائم رہا؟"

"ہاں، بیربل اور میں بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔"

گوہری نے میر سامان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا بولی۔ "میر سامان کرامت علی صاحب! آپ میرے محسن ہیں آپ نے میرا ساتھ دیا تھا، اگر مجھ میں شرافت کے چند قطرے بھی موجود ہیں تو میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی لیکن اس وقت میری نظر میں ولدار بیگ آپ سے بڑا انسان نکلا۔ وہ ظالم جابر یا جو کچھ بھی ہے، ان برائیوں میں ایک شاندار خوبی بھی موجود ہے اور وہ خوبی ہے اس کا صاحب کردار ہونا۔ میں اپنے دل میں اس کے لیے شاندار جذبات محسوس کر رہی ہوں۔"

میر سامان نے پریشان ہو کر اسے پکڑ کر بٹھانا چاہا۔ بولا۔ "گوہری! تم کھڑی کیوں ہو گئیں؟ ابھی کام کی تو ایک بات بھی نہیں ہوئی اور تم جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔"

گوہری نے افسوس کے ساتھ جواب دیا۔ "میر سامان صاحب! میں آپ کو ایک عظیم انسان سمجھتی تھی اور ولدار بیگ کو کمتر درجے کا لیکن اس وقت اچانک یہ انکشاف ہوا کہ میں غلطی پر تھی اور معاملہ اس کے برعکس ہے۔"

میر سامان نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ "میں تمہارے خیال میں.... کمتر انسان ہوں؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "آپ کیا ہیں، یہ بات آپ کو مجھ سے زیادہ معلوم ہو گی لیکن آپ وہ ہرگز نہیں ہیں جو میں تھوڑی دیر پہلے تک سمجھے ہوئے تھی۔"

میر سامان نے عاجزی سے کہا۔ "لیکن گوہری! تم یقین کرو، میں نے مصالحانہ یا مفاہمانہ روش محض تمہاری خاطر اختیار کی تھی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت ولدار بیگ کی طرح میں بھی قید خانے کی صعوبتیں جھیل رہا ہوتا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس وقت تو بادشاہ کے عتاب سے بچ نکلوں، اگر باہر رہوں گا تو کبھی نہ کبھی تم سے مل تو سکوں گا۔ چنانچہ تم خود ہی دیکھ لو کہ اگر میں قید خانے میں ہوتا تو اس

وقت تم سے ملاقات کیسے ہوتی؟"

گوہری نے کہا۔ "اگر آپ قید خانے میں ہوتے تو میں آپ سے وہیں ملنے پہنچ جاتی۔"

میر سامان نے حیرت سے کہا۔ "یعنی تم قید خانے میں مجھ سے ملنے پہنچ جاتیں؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "ہاں بالکل پہنچ جاتی۔"

"لیکن تمہیں قید خانے میں کون جانے دیتا؟"

"میں بہرحال پہنچنے کی کوشش کرتی۔ خواہ اس کے لیے مجھے بادشاہ کے پاس ہی کیوں نہ جانا پڑتا۔"

میر سامان کے دل میں رقابت کی آگ جل اٹھی۔ تیوریوں پر بل پڑ گئے، کہا۔ "تو میں ابھی تک اس غلط فہمی میں تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اس لیے تم بھی میرا خیال کرو گی۔ دلدار بیگ میرا دوست تھا لیکن ہم دونوں میں رنجش اور ناچاقی تمہاری وجہ سے پیدا ہوئی۔ آج یہ انکشاف ہوا کہ تم دلدار بیگ کو پسند کرتی رہی ہو اور تمہاری نظر میں میری حیثیت ثانوی ہے۔"

گوہری نے گویا میر سامان کی باتیں سنی ہی نہیں، بولی۔ "اب میں جانا چاہتی ہوں، مزید باتیں کی اور دن ہو جائیں گی۔"

میر سامان نے کہا۔ "گوہری! اگر تم جانا ہی چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ اب مجھے مزید باتیں بھی نہیں کرنا ہیں لیکن میں ایک بات بطور خاص تمہارے علم میں لانا چاہتا ہوں۔"

گوہری نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں حاصل ضرور کر لوں گا۔ تم یہ بات کبھی نہ بھلانا کہ جو شخص بادشاہ کو شیطان پورہ کے قیام پر آمادہ کر سکتا ہے وہ اور بہت کچھ بھی کر سکتا ہے؟"

گوہری نے تیکھی مگر خشمگیں نظروں سے دیکھا، بولی۔ "اس طرح آپ مجھے باور کیا کرانا چاہتے ہیں؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "یہ کہ میں ہر اس طریقے اور تدبیر پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا جس سے تم میری بن سکو۔"

"ناممکن!" گوہری نے بے مروتی سے کہا۔ "میر سامان کرامت علی صاحب! ایک بات میں خود بھی آپ کے ذہن نشین کرا دینا چاہتی ہوں، جب بھی کوئی قدم اٹھائیے گا اسے ذہن میں ضرور رکھیے گا۔"

"وہ کیا؟"

"یہ کہ میں آگرہ یا فتح پور کے کسی امیر سے شادی

کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں یہاں مال و زر کمانے آئی ہوں اور یہ طرزِ زندگی گھریلو زندگی سے قطعاً مختلف اور متضاد ہے۔ اس لیے میں کسی کی بیوی تو بن کر رہ نہیں سکتی۔"

زینے پر کسی کے چڑھنے کی آوازیں آنے لگیں۔

دونوں چپ ہو گئے۔ میر سامان زینے کی طرف بڑھا اور جھانک کر دیکھا۔ ایک کہار اوپر سے چار زینے نیچے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "حضور گلی میں مجمع لگ گیا ہے، لوگوں نے بی بی کو پہچان لیا ہے۔ وہ انہیں دیکھنے کی خاطر میری پالکی کے آس پاس اکٹھا ہو رہے ہیں۔"

گوہری پریشان ہو گئی، بولی۔ "اب کیا ہوگا؟"

میر سامان بھی بہت پریشان تھا۔ فکرمند لہجے میں بولا۔ "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اب کیا ہوگا۔ بادشاہ کو بھی یہ خبر پہنچ جائے گی۔"

گوہری نے کہا۔ "میں پالکی میں بیٹھوں گی کس طرح؟ مجھے تو یہ دیوانے پالکی میں بیٹھنے بھی نہ دیں گے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "تمہاری واپسی کا تو میں انتظام کر دوں گا۔ وہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" پھر وہ بارہ چھت کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "تم کمرے میں بیٹھو، میں تمہارے جانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

گوہری تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ واقعی بہت پریشان تھی۔

میر سامان نے جاتے ہوئے کہا۔ "میں نیچے جاتا ہوں اور تمہاری واپسی کا بندوبست کرتا ہوں، تم زیادہ فکر نہ کرو۔"

میر سامان نیچے چلا گیا۔ گلی میں زبردست مجمع لگ گیا تھا۔ میر سامان نے ہجوم سے پوچھا۔ "تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ "ہم اس بے مثال رقاصہ کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے ہیں جسے مہابلی نے بطورِ خاص پسند فرمایا تھا۔"

میر سامان نے کہاروں سے کہا۔ "تم لوگ خالی پالکی یہاں لیے کیا کھڑے ہو۔ تمہاری بی بی حویلی کے صدر دروازے پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں، ادھر پالکی لے کر پہنچ جاؤ۔"

کہار پالکی لے کر صدر دروازے پر پہنچے میر سامان پھر اوپر واپس پہنچا۔ گوہری سے بولا۔ "گوہری! تم تیار رہو، میری گھوڑا گاڑی آتی ہے۔ میرا کوچوان تمہیں گھوڑا گاڑی میں شیطان پورے تک پہنچا دے گا۔"

کہار پالکی لے کر صدر دروازے پر گوہری کا انتظار کرنے لگے میر سامان حویلی میں داخل ہوا اور کوچوان کو حکم دیا کہ وہ گھوڑا گاڑی لے کر پچھلے دروازے پر پہنچ جائے اور خود گوہری کے پاس چلا گیا۔ "گوہری! اب ہرچند کہ میرا شیطان پورے تم سے ملنے کے لیے پہنچنا اچھی بات نہیں ہے لیکن میں وہاں تم سے ملنے آؤں گا ضرور اور ہم دونوں کی بقیہ باتیں وہیں ہوں گی۔"

گوہری جواب دینے کے بجائے میر سامان کی شکل دیکھتی رہی۔

میر سامان نے کہا۔ "میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟ میں نے جو کچھ کہا، کیا تم نے سن لیا؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آخر آپ ہیں کیا؟"

میر سامان نے کہا۔ "میں کیا ہوں، یہ عجیب سا سوال ہے۔ میں کرامت علی ہوں، اکبرِاعظم کا میر سامان۔"

گوہری نے کہا۔ "نہیں، یہ تو آپ کا نام ہے یا آپ کا منصب۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ نام اور اپنے منصب کے علاوہ اور کیا ہیں؟"

میر سامان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ جواب دیا۔ "میں اور کیا ہوں؟ میں ایک عاشق ہوں، میں حسن پرست ہوں، میں اچھا دوست ہوں۔ میں ایک انسان ہوں اور ایک اچھا منتظم بھی۔"

گوہری نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کچھ بھی نہیں، ہاں ایک اچھے عاشق، حسن پرست اور ہمدرد انسان ضرور ہیں۔"

میر سامان نے شرمندگی سے کہا۔ "شکریہ تم نے مجھے کچھ تو سمجھا۔"

گوہری نے کہا۔ "ابھی ذرا دیر پہلے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ سے کبھی نہ ملوں گی لیکن پھر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آپ سے شادی تو نہیں کروں گی لیکن آپ سے تعلق ضرور قائم رکھوں گی۔"

میر سامان نے طنزاً پوچھا۔ "اور دلدار بیگ سے؟"

گوہری نے شوخی سے کہا۔ "بس جل گئے۔ میں دلدار بیگ سے کس طرح تعلق قائم رکھ سکتی ہوں۔ وہ قید خانے میں ہے اور آپ کے بقول شاہی معتوب ہے۔ قید خانے میں ملنا کوئی آسان کام نہیں۔"

میر سامان نے کہا۔ "لیکن اگر تم کہو تو میں ملاقات کا انتظام کر دوں۔"

گوہری نے غیر متوقع جواب دیا۔ "اگر آپ دلدار بیگ سے میری ایک ملاقات کرا دیں تو بہت شکرگزار ہوں گی۔"

میر سامان پس و پیش میں پڑ گیا، پوچھا۔ ’’کیا یہ تمہاری سنجیدہ خواہش ہے؟‘‘

گوہری نے جواب دیا۔ ’’ہاں، یہ میری سنجیدہ خواہش ہے اور اگر میری یہ خواہش پوری ہو بھی جائے تو آپ کو اس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

میر سامان نے ہنس کر جواب دیا۔ ’’کتنی عجیب بات ہے کہ تم مجھ سے میرے رقیب سے ملنے کی خواہش کرو اور اس خوش فہمی میں بھی رکھو کہ مجھے اس سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

گوہری نے کہا۔ ’’یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ شاہی معتوب کا قید خانے سے نکلنا آسان بات تو نہیں۔ ہاں اگر وہ باہر آ جائے تو آپ کو ضرور فکر مند ہو جانا چاہیے۔ اس وقت تو ولدار بیگ ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے۔‘‘

میر سامان نے جواب دیا۔ ’’یہ درست ہے کہ ولدار بیگ ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے لیکن موجودہ حالات میں ولدار بیگ سے ہمدردی کرنا بہت مشکل بھی ہے اور خطرناک بھی..... لیکن میں تمہاری خاطر کوشش کروں گا کہ ولدار بیگ سے ہمدردی کی جائے۔‘‘

گوہری نے ابھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ معلوم ہوا کوچوان گاڑی لے کر آ گیا ہے۔ میر سامان نے کہا۔ ’’اچھا گوہری اب تم جاؤ۔ میں تم سے ملنے شیطان پورہ ضرور آؤں گا اور وہاں کچھ اہم باتیں کروں گا۔‘‘

گوہری نے کہا۔ ’’وہ باتیں شادی کے علاوہ ہونا چاہئیں۔‘‘

’’دیکھا جائے گا۔‘‘ میر سامان نے جواب دیا اور گوہری کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ گاڑی شیطان پورہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

میر سامان بڑی الجھنوں کا شکار تھا۔ شیطان پورہ جانے کو دل تو بہت چاہتا تھا لیکن بادشاہ سے ڈر بھی لگتا تھا کیونکہ بادشاہ کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ اس کے دربار کے معزز امراء شیطان پورے میں آمد و رفت رکھیں۔ اس کی سمجھ میں اور کوئی ترکیب تو نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ایک تاجر کا بھیس بدلا اور شیطان پورہ روانہ ہو گیا۔ شیطان پورہ کے دفتری حکام نے اس سے طرح طرح کے سوالات کیے لیکن اس کے پاس ان کے سارے سوالات کا بنیادی جواب یہ تھا کہ وہ ایک سفری تاجر ہے، جنوبی ہند سے آیا ہے اور اپنے دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے اپنی وضع قطع میں حیرت انگیز تبدیلی کر لی تھی اور حکام کو تھوڑی سی رشوت دینے سے شیطان پورہ میں داخلہ بہت آسان ہو گیا تھا۔

وہ شیطان پورہ میں داخل تو ہو گیا لیکن یہاں گوہری کو تلاش کرنا قدرے مشکل تھا لیکن یہ مشکل بھی آسان ہو گئی اور شیطان پورے کے ایک راہنما نے اسے گوہری کے گھر تک پہنچا دیا۔ گوہری اسے پہلی نظر میں پہچان نہیں سکی تھی وہ اسے دیکھتی رہ گئی، پوچھا۔ ’’آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟‘‘

میر سامان نے جواب دیا۔ ’’میں جنوبی ہند کا تاجر ہوں اور آپ کی شہرت سن کر حاضر ہوا ہوں۔‘‘

گوہری نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ’’کس کی شہرت سن کر؟‘‘

میر سامان نے جواب دیا۔ ’’گوہری کی، آپ کی..... آپ کا نام گوہری ہے نا؟‘‘

گوہری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں جناب میر سامان کرامت علی صاحب! یہ آپ جنوبی ہند کے تاجر کب سے ہو گئے؟‘‘

میر سامان نے کھسیانے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ’’تم نے مجھے پہچان لیا؟ خوب...... لیکن گوہری تمہارے پاس آنے کے لیے مجھے کیسا بھیس بدلنا پڑا اور اس میں کیسی مشکل پیش آئی۔ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔‘‘

گوہری اسے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں تماش بین نہیں بٹھائے جاتے تھے۔ گوہری کی ماں میر سامان کو بالکل نہ پہچان سکی۔ اسے اس خاص کمرے میں لے جاتے دیکھ کر دریافت کیا۔ ’’گوہری! یہ کون ہے جسے تو اس کمرے میں لے جا رہی ہے؟‘‘

گوہری نے جواب دیا۔ ’’آپ کے خاص مہمان ہیں۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گی۔ میں ان کے ساتھ اس خاص کمرے میں ضروری باتیں کر رہی ہوں۔ ادھر کسی کو نہ آنے دیجیے گا۔‘‘

ماں اس خاص مہمان کو دیکھنے پہنچ گئی لیکن پہچان نہ سکی۔ گوہری نے ماں کے تجسس کو دور کرنے کے لیے کان میں اصل حقیقت بیان کر دی۔ وہ خوش نہیں ہوئی، پوچھا۔ ’’یہ شخص یہاں کیوں آیا ہے؟‘‘

میر سامان کو اس انداز گفتگو سے اذیت پہنچی۔ گوہری نے بھی اس کی اذیت کو محسوس کر لیا بولی۔ ’’اماں! یہ ہمارے مہمان ہیں اور یہ ہم پر کچھ عرصہ پہلے احسان کر چکے ہیں۔ ہمیں ان کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے۔‘‘

ماں نے اسی ترشی اور تندی سے کہا۔ ''یہ شخص کہیں تم سے شادی کرنے تو نہیں آیا؟ بہ خدا جب میں ان دنوں کو یاد کرتی ہوں تو میرا دل ہول جاتا ہے۔ پردیس، در در کی ٹھوکریں، ان پریشانیوں میں اس شخص نے ہمیں سہارا دیا بھی تو فوراً ہی شادی کی درخواست بھی کر دی۔ ان دنوں مجبوری کی وجہ سے میں کچھ بول بھی نہ سکی تھی لیکن اس خاموشی میں جو اذیت تھی اسے میرے سوا کوئی اور برداشت نہ کر سکتا تھا۔''

گوہری نے عاجزی سے کہا۔ ''اماں! اب ان باتوں کا ذکر ہی کیا۔ ختم کیجیے ان باتوں کو۔ اب تو یہ شادی کی درخواست نہیں کر رہے ہیں۔''

ماں نے بے تکی سے کہا۔ ''پتا نہیں، درخواست کر رہے ہیں یا نہیں کر رہے۔ اس شخص نے تو میرے دل سے اپنا اعتبار ہی اٹھا دیا۔''

میر سامان نے نہایت شاکی لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ماں کے مزاج سے میں واقف نہیں تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ان کے دل میں میرے خلاف اتنی کدورت ہے تو میں یہاں کبھی نہیں آتا۔''

ماں نے تلملا کر جواب دیا۔ ''تو نے ہمارے دل میں کدورت کے سوا بویا ہی کیا ہے۔ جو بویا تھا وہی آج کاٹے گا۔''

میر سامان نہایت بددل ہو رہا تھا، بولا۔ ''گوہری! میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں اب مزید باتیں برداشت نہیں کر سکتا۔''

گوہری نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اماں! اگر آپ نے خاموشی اختیار نہیں کی تو میں اس معقول شخص کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ میں یہاں سے اس کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔''

ماں کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ چند لمحوں تک گوہری کی شکل دیکھتی رہی پھر پوچھا۔ ''کیا تم دونوں نے واقعی کوئی منصوبہ تیار کر رکھا ہے؟''

میر سامان، گوہری کے جواب سے بہت خوش ہوا تھا، بولا۔ ''ہم دونوں نے کوئی خفیہ منصوبہ تو نہیں بنایا لیکن اگر گوہری چاہے گی تو کوئی منصوبہ بن جائے گا۔''

ماں نے گوہری کو جھنجوڑ ڈالا، پوچھا۔ ''سچ بتا تو نے ایسی بات آخر کہی کیوں؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''محض اس لیے کہ آپ مسلسل زیادتی کیے جا رہی ہیں۔ میں اس شخص کے سامنے شرمندہ ہوئی جا رہی ہوں جس نے ہم پر کئی احسان کیے ہیں۔''

ماں نے طیش میں کہا۔ ''اس شخص نے ہم پر احسان کیے ہیں اس بات کو تو کتنی بار دہرائے گی۔ اب میں مزید اس قسم کا مکالمہ ہرگز نہ سنوں گی۔ تم دونوں میرا انتظار کرو اور میر سامان صاحب! آپ بطور خاص میرا انتظار کریں۔ میں ابھی آتی ہوں اور خدا نے چاہا تو تمہارا حساب کتاب اسی وقت چکتا ہو جائے گا۔''

گوہری کی ماں چلی گئی اور دونوں کو تجسس میں ڈال گئی۔ دونوں معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ گوہری نے کہا۔ ''اب تو میں ان سے عاجز آ گئی ہوں۔ یہ ہر جگہ اسی طرح لڑنے جھگڑنے لگتی ہیں۔ مال و زر کی ہوس نے ان میں ایک مرض کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مجھ میں نہیں آتا کہ کروں کیا؟''

میر سامان نے جواب دیا۔ ''گوہری! اس دنیا میں مال و زر سب کچھ نہیں ہے۔ ان مال و زر سے تم سکون قلب نہیں حاصل کر سکتیں۔ ایک نہ ایک دن تم اس اعتراف پر مجبور ہو جاؤ گی کہ میں نے جو تجویز پیش کی تھی وہ بہت معقول اور صائب تھی۔''

گوہری نے کہا۔ ''آپ کی تجویز کی معقولیت سے کس کافر کو انکار ہے لیکن اس نامعقول ماحول میں دلہن بن کر جاؤ جہاں پہلے ہی سے کئی دلہنیں موجود ہوں، کہاں کی معقول بات ہوئی۔''

میر سامان نے کہا۔ ''اگر تم شادی پر آمادہ ہو جاؤ تو میں ان سب کو طلاقیں دے سکتا ہوں۔''

گوہری نے چونک کر میر سامان کی شکل دیکھی، بولی۔ ''یہ تو بڑی نامعقول بات کہی آپ نے۔''

میر سامان نے جواب دیا۔ ''میں وہ ہر طریقہ اختیار کرنے کو آمادہ ہوں جو تمہیں پسند ہو۔''

گوہری نے میر سامان کے چہرے پر معلوم نہیں کیا دیکھا کہ جذبات سے مغلوب ہو گئی، بولی۔ ''میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کبھی شادی کا خیال دل میں آیا تو آپ ہی سے کروں گی۔''

میر سامان کا مارے خوشی کے برا حال ہو گیا۔ گوہری کی ماں بڑبڑاتی ہوئی پھر واپس آ گئی لیکن اس وقت وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ تین نوخیز اور فتنہ قیامت لڑکیاں بھی تھیں۔ ان تینوں کو باری باری میر سامان پر دھکیل دیا۔ چیختی ہوئی بولی۔ ''ان تینوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لے لیکن

شرط یہ ہے کہ پھر آئندہ کبھی اپنے احسان وحسان کا ذکر نہ کرنا۔"

میر سامان نے کھڑے ہو کر جوش سے کہا۔ "گوہری! اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہ رکوں گا۔ میں جا رہا ہوں اور ہاں.....

گوہری کی ماں نے بات کاٹ دی، کہنے لگی۔ "جاؤ گے کدھر سے..... تمہارا ایک یار بیربل بھی یہاں آیا ہوا ہے، فی الحال تم یہیں رہو۔ جب وہ چلا جائے تو تم بھی چلے جانا۔"

میر سامان نے کہا۔ "تو بیربل گویا یہاں آتے رہتے ہیں؟"

"ہاں بڑے احترام اور اہتمام سے۔"

میر سامان نے پوچھا۔ "اور کوئی بادشاہ سے شکایت بھی نہیں کرتا؟"

"اس کی شکایت کون کرے گا؟ وہ بادشاہ کے دین الٰہی کا اہم ترین شخص ہے۔ اگر بادشاہ کو اس کا علم بھی ہو جائے تو وہ کچھ بھی نہ کہے گا۔ بادشاہ اپنے مریدوں کا خیال رکھتا ہے۔"

میر سامان نے کہا۔ "یہاں آنے میں واقعی بڑی مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

تینوں لڑکیاں سامنے کھڑی تھیں۔ ماں نے پھر کہا۔ "میر سامان! میں تجھ سے کہتی ہوں کہ تو ان میں سے کسی ایک کو لے لے اور اس کے ساتھ پوری رات گزار دے۔ آج میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تیرا احسان اتار ہی کے دم لوں گی۔"

گوہری نے کہا۔ "اماں! ان پر مزید زیادتی نہ کیجیے۔ بیربل کے پاس چلی جائیے ورنہ وہ ادھر بھی آ سکتا ہے۔"

گوہری کی ماں معلوم نہیں کیا سوچ کر وہاں سے چلی گئی۔ لڑکیاں اب بھی کھڑی تھیں۔ گوہری نے ان سے کہا۔ "تم تینوں بھی واپس جاؤ اور اب ادھر مت آنا۔"

وہ تینوں چلی گئیں۔ گوہری نے ایک ادائے خاص سے کہا۔ "میں دیکھ رہی ہوں آپ پر بڑے ظلم ہو رہے ہیں۔"

میر سامان نے جواب دیا۔ "محض اس لیے کہ میں شریف انسان ہوں۔ اگر میں بیربل ہوتا تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ مجھ پر ظلم کر سکتا۔"

گوہری اسے دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی، بولی۔ "میں چاہتی ہوں اس کی کسی حد تک تلافی ہو جائے۔"

میر سامان نے تذبذب کے لہجے میں دریافت کیا۔ "وہ کس طرح؟"

گوہری نے نظریں جھکا لیں اور جواب دیا۔ "میں آج کی رات آپ کے حوالے کر دوں گی۔ شادی کا خیال دل سے نکال دیجیے اور شادی کے سوا جو کچھ بھی مل رہا ہے، اسے غنیمت جان کر وصول کر لیجیے گا۔"

میر سامان دنگ رہ گیا۔ حیرت اور خوشی سے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی، بولا۔ "یہ تم کیا بول رہی ہو؟"

گوہری نے شوخی سے جواب دیا۔ "میں وہی کہہ رہی ہوں جو آپ سن رہے ہیں۔"

"کیا تمہاری ماں بھی اس سے اتفاق کریں گی؟"

"وہ میرے خلاف نہیں جا سکتیں۔"

اس نے پوچھا۔ "یہ تینوں لڑکیاں کون تھیں؟"

گوہری نے دریافت کیا۔ "کیا ان میں سے کوئی پسند آ گئی؟"

"لاحول ولا قوۃ..... کیسی بات کر رہی ہو۔"

"نہیں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک پسند آ گئی ہے تو بتا دیجیے میں اسی وقت اسے حاضر کر دوں گی۔"

میر سامان نے شرارت سے کہا۔ "مجھے تو بس تم ہی پسند آئی ہو اور کوئی نہیں۔"

گوہری نے کہا۔ "یہ تینوں لڑکیاں میں نے بردہ فروشوں سے خریدی ہیں اور ان پر محنت بھی ہو رہی ہے۔ انہیں میں نے اس لیے خریدا ہے کہ یہ تینوں اماں کی ہوس مال و زر کو تسکین پہنچاتی رہیں گی اور میں کسی حد تک ان کے دباؤ سے نکل جاؤں گی۔"

میر سامان کو یہی محسوس ہوا کہ گوہری یہ سب کچھ اس کی خاطر کر رہی ہے، پوچھا۔ "تو آج کی رات میری ہے؟"

"بالکل..... میں نے جو کچھ کہا ہے، اس سے بھی نہیں مکروں گی۔"

"زہے نصیب بہت خوب شکریہ..... پیشگی شکریہ۔"

"شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں بس ایک بات پھر یاد دلاؤں گی، مجھ سے آپ شادی کی بات بھی نہ کیجیے گا۔"

دونوں میں ایک مشترکہ رات گزارنے کا معاہدہ ہو گیا اور گوہری کی ماں بیربل کی طرف رجوع رہی۔

☆☆☆

میر سامان کا شیطان پورے میں رات گزارنا اور

اپنی حویلی سے غائب رہنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ حویلی والوں کو کچھ بتا کر بھی نہیں آیا تھا۔ گوہری کی پُرخلوص، حسین اور رنگین پیشکش ٹھکرا بھی نہیں سکتا تھا۔ شیطان پورے میں رات گزارنے کا مطلب تھا تختۂ دار پر آرام کرنا لیکن میر سامان نے اپنی زندگی، عزت ہر چیز کو گوہری کے مقابلے میں ہیچ جانا اور وہیں رہ گیا۔

رات بھر عیش و عشرت کا دور دورہ رہا۔ میر سامان نہ خود سویا اور نہ گوہری کو سونے دیا۔ وہ اس نشے میں سرشار رہا گویا اس نے گوہری کو مستقلاً حاصل کر لیا ہے۔ میر سامان کے جوش اور سرگرمی سے گوہری نے یہی تاثر لیا کہ وہ اسے واقعی چاہتا ہے اور وہ قسمیہ یہ کہہ سکتی تھی کہ میر سامان جیسا والہانہ اور جنون آمیز برتاؤ آج تک کسی اور نے نہیں کیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر گوہری کو نیند آنے لگی میر سامان نے نہیں سونے دیا۔ گوہری کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں اور پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ جمائیوں پر جمائیاں آرہی تھیں۔ میر سامان اسے اس عالم میں دیکھ کر بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گوہری نے دوسری طرف کروٹ لے لی، بولی۔

"اب مجھے نیند آرہی ہے، ذرا دیر سو جانے دو۔"

میر سامان نے جواب دیا۔ "مجھے تمہاری یہ کیفیت بڑی اچھی لگ رہی ہے۔ تم غنودگی میں مجھے دیکھتی مسکراتی اور بات کرتی رہو اور میں ان سے لطف اندوز ہوتا رہوں۔"

گوہری نے کہا۔ "تم ہو بڑے ظالم..... ذرا سی رات تو باقی ہے کچھ سولوں گی تو تکان جاتی رہے گی۔"

میر سامان نے کہا۔ "میں چلا جاؤں تو خوب سو لینا۔ میرے پاس نیند اڑانے کا ایک نسخہ بھی موجود ہے۔"

گوہری نے پوچھا۔ "کہاں سے ہاتھ آ گیا تمہارے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "نسخہ کہیں اور سے ہاتھ نہیں آیا، میرا اپنا نسخہ ہے اور بڑا مجرب ہے۔"

گوہری نے پوچھا۔ "کہاں ہے وہ نسخہ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔"

میر سامان نے کہا۔ "گوہری! مجھ سے شادی کر لو۔ یہ شادی کا ذکر ہی وہ نسخہ ہے جو تمہیں ناراض کر سکتا ہے۔"

گوہری زور زور سے ہنسنے لگی، بولی۔ "بڑا اچھا نسخہ ہے۔ خوب خوب۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

"میں اپنا خیال بار بار نہیں بدلتی۔ رات ہی میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر شادی کا میرے دل میں کبھی خیال آیا تو آپ ہی سے کروں گی۔"

میر سامان نے بڑی حسرت سے کہا۔ "گوہری! اب کے بچھڑے خدا جانے پھر کب ملیں۔ میں تمہیں اپنے پاس بلا نہیں سکتا اور یہاں آ نہیں سکتا۔"

گوہری نے جواب دیا۔ "انتظار کرو ہو سکتا ہے وہ لمحہ بھی آجائے جب میں شادی کے لیے تیار ہو جاؤں۔"

میر سامان نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "بہر حال میں نمازیں پڑھ کر دعا مانگوں گا کہ خدا تمہارے دل میں شادی کا خیال ڈال دے۔"

میر سامان نے اسے صبح تک نہیں سونے دیا۔

شیطان پورے میں رات جیسا سناٹا طاری تھا۔ آفتاب مشرق سے اس طرح طلوع ہوا گویا شیطان پورے کی ویران اور سنسان صبح کا نظارہ کر رہا ہو۔ گوہری میر سامان کو رخصت کر رہی تھی۔ اس کی ماں میر سامان کو شک و شبہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گوہری کے انداز و حرکات سے یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ کہیں اس نے اس امیر سے شادی کا وعدہ تو نہیں کر لیا۔

گوہری پوچھ رہی تھی۔ "اب کب آؤ گے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "اب تو میں تم کو بلاؤں گا۔"

گوہری کی ماں نے کہا۔ "گوہری کہیں اور نہیں جائے گی۔ جسے آنا ہے یہاں خود آئے گا۔"

اسی وقت کسی نے زور زور سے دستک دی۔ دستک دینے کا انداز تشویش ناک تھا۔ گوہری نے کہا۔ "تم کچھ دیر کے لیے اندر چلے جاؤ۔ آثار اچھے نہیں نظر آرہے۔"

میر سامان جس کمرے میں سویا تھا، اسی میں جا چھپا۔ گوہری نے ماں کو روک دیا اور خود دروازے پر پہنچ گئی۔ پوچھا۔ "کون ہے کیا بات ہے؟ صبح صبح آنے کا مطلب؟"

کسی کرخت دار آواز نے حکم دیا۔ "دروازہ کھولو۔ شیطان پورے کا سرکاری نگران بول رہا ہوں۔"

گوہری ڈر گئی۔ فوراً دروازہ کھول دیا۔ شیطان پورے کا بڑی بڑی مونچھوں والا نگران گوہری کو گھورتے ہوئے بولا۔ "رات یہاں کون کون آیا تھا؟"

گوہری سٹپٹا گئی۔ نگران کی آواز میر سامان بھی سن رہا تھا۔ اس کی جان نکل گئی کہ گوہری معلوم نہیں کیا جواب دے۔ گوہری نے جواب دیا۔ "ایک ہندو امیر آیا تھا...... غالباً مہیش داس یعنی بیربل۔"

نگران نے پوچھا۔ "اور کون؟"

گوہری نے ہمت سے جواب دیا۔ ''اور ایک تاجر بھی جس کا تعلق جنوبی ہند سے تھا۔''

نگران نے پوچھا۔ ''وہ تاجر کہاں ہے؟''

گوہری نے بڑی ہمت کی، بولی۔ ''وہ تو رات ہی چلا گیا تھا۔''

''اور بیربل؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''بیربل بھی کبھی یہاں رات بھر کے لیے نہیں آتا۔ وہ اپنی پسند کی لڑکی کو لے کر چلا جاتا ہے اور دوسرے دن کسی وقت واپس بھیج دیتا ہے۔''

نگران نے کہا۔ ''کیا بیربل پہلے بھی آچکا ہے؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''ہمارے یہاں وہ چار بار آچکا ہے اور رہا یہ سوال کہ شیطان پورہ میں کتنی بار آچکا ہے، اس کا علم مجھ سے زیادہ آپ لوگوں کو ہونا چاہیے۔''

نگران نے پوچھا۔ ''تو وہ جنوبی ہند کا تاجر بھی رات ہی کو چلا گیا تھا؟''

''ہاں۔'' گوہری نے جواب دیا۔

نگران نے حیرت سے کہا۔ ''مگر تعجب ہے کہ اس نے واپسی میں دفتر والوں سے ملاقات نہیں کی اور چوری سے نکل گیا۔''

گوہری نے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے، وہ میرے پاس سے کسی اور کے پاس چلا گیا ہو۔''

''ہوسکتا ہے۔'' نگران نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لوگ بڑی بے ضابطگی کرنے لگے ہیں، مجھے کچھ زیادہ ہی سختی اختیار کرنی پڑے گی۔ اگر لوگ یوں ہی آتے جاتے رہیں اور میں ان کی حرکات وسکنات سے لاعلم رہوں تو میری شیطان پورے میں موجودگی فضول ہے۔ یہ خبریں ظل الٰہی کو پہنچ گئیں تو میری تو شامت ہی آجائے گی۔''

نگران بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ گوہری نے دروازہ بند کیا تو ماں جیسے اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ ''گوہری! تو دیکھ رہی ہے کہ میں تیرے معاملوں میں ذرا بھی دخل نہیں دیتی لیکن آج میں خاموش نہیں رہوں گی۔''

گوہری نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے اماں...... آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

اماں نے جواب دیا۔ ''شیطان پورے کا نگران اگر مجھ سے پوچھو تو تیرے میر سامان کرامت علی کی تلاش میں آیا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کی اصل حیثیت کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ میں اسی وقت نگران کو مطلع کیے دیتی ہوں کہ میر سامان میرے گھر میں موجود ہے۔ اس سے یہ پکڑا جائے گا اور میں انعام واکرام حاصل کرلوں گی۔''

گوہری نے بڑی نفرت سے ماں کو جھڑک دیا۔ ''اماں! اگر آپ نے ایسا کیا تو میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔ آخر مال وزر کی اتنی ہوس کیوں ہے آپ کو؟''

ماں نے کہا۔ ''یہ مال وزر کی ہوس میں تھوڑی کروں گی، بادشاہ کی وفاداری میں کروں گی۔''

''لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کرامت علی نے ہم پر احسان کیا ہے۔''

ماں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''لڑکی! کہاں کا احسان، کیسا محسن۔ اس نے تیرے ساتھ پوری رات گزار کر اپنے احسان کی قیمت تو وصول کرلی۔ اب وہ ہمارا محسن کہاں رہا؟''

گوہری تلملا گئی، پھر کر شیرنی کی طرح ماں کے سامنے کھڑی ہوگئی، بولی۔ ''اماں! آپ مجھے مجبور نہ کیجیے۔ میں آپ کی ان باتوں سے عاجز آگئی ہوں۔ اگر آپ نے یہ حرکت کی تو میں بھی وہ کر گزروں گی جس کی آپ مجھ سے امید تک نہ کرتی ہوں گی۔''

ماں بڑبڑاتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ گوہری میر سامان کرامت علی کے پاس چلی گئی۔ کرامت علی نے نہایت افسوس سے کہا۔ ''گوہری! میں نے تمہاری ماں کی باتیں سن لی ہیں۔ اگر تمہیں واقعی میری گرفتاری یا رسوائی سے انعام واکرام مل سکتا ہے تو میری طرف سے اس کی اجازت ہے۔''

گوہری نے بڑے دل جلے لہجے میں کہا۔ ''زخموں پر نمک نہ چھڑکیے۔'' اس کے بعد ایک طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''اگر اپنی گرفتاری یا رسوائی کا اتنا ہی شوق ہے تو خود ہی نگران کے پاس پہنچ جائیے اور خود کو اس کے حوالے کردیجیے۔''

میر سامان کرامت علی چپ ہورہا۔ کچھ دیر بعد گوہری واپس آگئی۔ چھوٹی سی تھیلی کرامت علی کو دیتے ہوئے بولی۔ ''انہیں ساتھ لے جائیے کیونکہ میں نہیں جانتی کہ آپ کے پاس کتنی نقدی ہے۔ تھیلی میں اشرفیاں ہیں۔ نگران کو رشوت دے کر رسوائی سے بچنے کی کوشش کیجیے گا۔''

میر سامان، گوہری کے اس رویے سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ''اس کی کیا ضرورت تھی، میرے پاس بھی اشرفیاں موجود ہیں۔''

گوہری نے جواب دیا۔ ''میں یہ اشرفیاں آپ کو

بطور قرض دے رہی ہوں، قرض حسنہ..... بعد میں واپس کر دیجیے گا۔"

دونوں کی جدائی بڑی بدمزگی سے ہوئی۔ گوہری اسے دروازے سے نکال کر فوراً واپس چلی گئی اور میر سامان کرامت علی باہر نکل کر ایک ایسی فضا محسوس کرنے لگا جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا اور جس کی فضاؤں میں ذلت ورسوائی کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

میر سامان حویلی واپس پہنچا تو پتا چلا کہ اسے اسی دن سہ پہر کو بادشاہ کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔ وہ گھبرا گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے اور بادشاہ کو اس کی ساری حرکات وسکنات کا علم ہو گیا ہے گو کہ وہ نگران کو رشوت دے کر نکل آیا تھا۔

سہ پہر تک اس کی بڑی بری حالت رہی۔ جب وہ بادشاہ کی بارگاہ میں جا رہا تھا تو اس نے سامنے سے گوہری اور اس کی ماں کو آتے دیکھا۔ ان دونوں کے ساتھ ان تین لڑکیوں میں سے ایک لڑکی بھی تھی جسے ایک دن پہلے رات کو گوہری کی ماں نے اس کے سامنے پیش کیا تھا۔ میر سامان کا ماتھا ٹھنکا اور وحشتوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ گوہری سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن شاہی ہرکارے ان کے آس پاس لگے تھے۔ ان کی موجودگی میں بات کرنا بہت مشکل تھا۔ گوہری نے بھی اسے دیکھ لیا تھا لیکن نظریں چرا گئی تھی۔

میر سامان کو جب مہابلی کی خدمت میں پہنچایا گیا تو بادشاہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے پاس ہی مفتی ممالک محروسہ صدر جہاں بھی موجود تھا۔ بادشاہ کی طبیعت میں قدرے انقباض پایا جاتا تھا۔ ماتھے پر قشقہ کھنچا ہوا تھا۔ میر سامان ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔

اکبر نے اس کی آمد کا کوئی خیال ہی نہ کیا۔ آخر مفتی صدر جہاں نے دریافت کیا۔ "کرامت علی! کیا تو بھی کبھی شیطان پورہ گیا ہے؟"

اکبر نے نرمی سے کہا۔ "جانا کیسا..... اسی نے تو گوہری کے چکر میں آ کر شیطان پورے کے قیام اور آبادی کی تجویز پیش کی تھی۔"

میر سامان نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مہابلی! اس گناہ گار نے اس خیال سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان دنوں آگرے اور فتح پور کی سڑکوں، بازاروں، دکانوں اور ان کے دالانوں میں زنانِ بازاری کی افراط تھی۔ معلوم نہیں یہ کہاں کہاں سے آ گئی تھیں۔ اگر ان کے لیے شیطان پورہ نہ آباد کیا جاتا تو آج یہ گندگی ہمارے محلوں اور پھر گھروں میں داخل ہو جاتی۔"

بادشاہ نے کہا۔ "میں تیری تجویز کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں۔ اچھا اب یہ بتا کہ بیربل کہاں ہے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "اس ناچیز کو کچھ پتا نہیں۔ ممکن ہے اپنی جاگیر پر چلا گیا ہو۔"

مفتی صدر جہاں نے عرض کیا۔ "مہابلی! کیا میر سامان کرامت علی مریدانِ خاص میں داخل ہو گیا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "ابھی نہیں لیکن اس نے غور وفکر کی مہلت ضرور مانگی تھی۔"

مفتی صدر جہاں نے میر سامان سے دریافت کیا۔ "کیا تو نے غور وفکر کر لیا؟"

بادشاہ نے میر سامان سے پہلے جواب دیا۔ "مفتی صدر جہاں! اکثر امراء نے اشارۃً عذر پیش کیا کہ مفتی صدر جہاں اب تک مریدانِ خاص میں کیوں داخل نہیں ہوئے؟"

مفتی صدر جہاں نے جواب دیا۔ "آپ کے غلام، میرے دونوں بیٹے باہر موجود ہیں اور اس وقت میرے ساتھ اس لیے آئے تھے کہ میرے ساتھ وہ دونوں بھی مریدانِ خاص میں داخل ہو جائیں۔"

بادشاہ نے کہا۔ "پھر انہیں بلاتے کیوں نہیں؟"

مفتی صدر جہاں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اسی وقت اندر بلا لیا۔ دونوں نے داخل ہوتے ہی بادشاہ کو سجدہ کیا۔ مفتی صدر جہاں نے اسی وقت اپنے ساتھ دونوں بیٹوں کا اقرار نامہ تیار کیا اور یہ تینوں بادشاہ کے مریدانِ خاص میں داخل ہو گئے۔

بادشاہ کے مسلک، دینِ الٰہی میں شراب جائز تھی اور داڑھی غیر ضروری۔ باپ بیٹوں نے بادشاہ کے سامنے شراب پی اور... مفتی صدر جہاں نے بادشاہ کی مزید خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ "مہابلی! اس داڑھی کے لیے حضورِ والا کا کیا ارشاد ہے؟"

بادشاہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "رہنے دو۔"

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد مفتی صدر جہاں نے میر سامان سے سوال کیا۔ "کیا تجھے بھی یہی عذر تھا؟ اب کیا کہتا ہے؟"

بادشاہ کو جیسے میر سامان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ کہا۔ "مفتی صدر جہاں! بیربل بھاگ نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرا مرید خاص اور اخلاص چہارگانہ کا حامل ہے۔ اس کی

حیثیت دوسرے امراء سے مختلف ہے، میں اس سے باز پرس نہیں کرتا۔"

مفتی صدر جہاں نے عرض کیا۔"حضور بیربل کے لیے اتنے ہی بے چین ہیں تو ان کو بلوانے کے لیے کسی کو روانہ کردیا جائے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔"ہاں، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ بیربل کو بلوالیا جائے اور جو شخص بھی اسے بلانے جائے یہ یقین دلا دے کہ بادشاہ نے اس کے شیطان پورے والے جرم کو معاف کردیا ہے۔ وہ واپس آجائے گا۔"

مفتی صدر جہاں نے میر سامان کو پھر مخاطب کیا۔

"کرامت علی! میں مفتی ممالک محروسہ اپنے بیٹوں سمیت دین الٰہی اکبرشاہی میں داخل ہو چکا ہوں۔ اب مجھے پس وپیش سے کام نہیں لینا چاہیے۔"

بادشاہ نے مفتی صدر جہاں سے کہا۔"مفتی صدر جہاں! آج سے آپ کو ہزاری منصب بھی حاصل رہے گا۔"

میر سامان کے دل و دماغ آپس میں برسرپیکار تھے۔ دل ترک اسلام پر آمادہ نہیں تھا۔ دماغ مشورہ دے رہا تھا کہ جب ابوالفضل فیضی ان دونوں کا باپ شیخ مبارک ناگوری، بیربل، مرزا جانی، حاکم ٹھٹھہ جعفر بیگ، آصف خان مورخ، عبدالصمد اور مفتی صدر جہاں جیسے لائق فائق آدمیوں نے دین الٰہی اختیار کرلیا ہے تو وہ خود کس شمار قطار میں ہے۔ اس نے ان فائدوں پر غور کیا جو ان امراء کو دین الٰہی میں داخل ہونے سے حاصل ہوئے تھے اور پھر یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ بیربل کا شیطان پورے سے تعلق رکھنے کا جرم اس لیے معاف کیا جارہا تھا کہ وہ بادشاہ کے مریدانِ خاص میں داخل تھا۔ یہ تمام ترغیبیں اور تحریصیں تھیں جو اس کو بے بس کیے دے رہی تھیں اور سب سے بڑا یہ لالچ کہ اس کے شیطان پورے کے تعلق کو نظرانداز کردیا جائے گا، اپنا کام کر گیا لیکن اسی لمحے یہ خیال آیا کہ گوہری بادشاہ کے مذہب کو پسند نہیں کرتی۔ جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ کرامت علی بھی دین الٰہی اکبرشاہی میں داخل ہوگیا ہے تو اس کا اس پر کیا اثر ہوگا۔

مفتی صدر جہاں نے پوچھا۔"میر سامان کرامت علی کیا سوچ رہے ہو؟"

کرامت علی نے جواب دیا۔"میں بادشاہ کے مریدانِ خاص میں شامل ہونے کو تیار ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اس عاجز کی ایک درخواست بھی ہے۔ اگر اسے منظور کرلیا جائے تو بادشاہ کی عین مرید پروری ہوگی۔"

بادشاہ نے دریافت کیا۔"وہ کیا...... بیان کر؟"

میر سامان نے جواب دیا۔"میرے مریدانِ خاص میں داخلے کو کچھ عرصے کے لیے راز میں رہنے دیا جائے۔"

بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔"مفتی صدر جہاں! آپ دیکھ رہے ہیں اس کا کوئی کام بھی مصلحت سے خالی نہیں۔"

مفتی صدر جہاں نے سفارش کی۔"مہابلی! میری رائے اس کی تائید کرتی ہے۔ شروع شروع میں مسلمانوں نے بھی اپنا مسلمان ہونا چھپائے رکھا تھا، اگر یہ اپنے نئے دین کو لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہے تو کوئی حرج یا اعتراض کی بات نہیں ہے۔"

بادشاہ نے میر سامان کو اسی وقت مریدانِ خاص میں داخل کرلیا۔ اسے اس موقع پر جو خاص خاص عقائد اور باتیں بتائی گئیں ان کی ایک تحریری نقل بھی اس کے حوالے کردی گئی۔

بادشاہ نے کہا۔"اب تو میرے مریدانِ خاص میں داخل ہو چکا ہے اس لیے تو دین الٰہی کے عقائد ذہن نشین کرلے۔"

میر سامان کو یاد آیا کہ گوہری نے دلدار بیگ سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ اس نے کہا۔"مہابلی! معتوب دلدار بیگ اس ناچیز کا دوست رہ چکا ہے۔ وہ ذرا جوشیلا اور مستقل مزاج انسان ہے لیکن اس عاجز کی رائے میں اگر اسے سمجھایا جائے اور ہمدردی کی جائے تو وہ بھی حضور کے مریدانِ خاص میں داخل ہوسکتا ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔"اس نے میری جناب میں گستاخیاں کی تھیں۔ اسے کس طرح معاف کیا جاسکتا ہے۔"

میر سامان نے عرض کیا۔"اگر میں اسے راہِ راست پر لے آؤں تو حضور اسے معاف فرمادیں گے؟"

بادشاہ نے کہا۔"میں تیرا مطلب سمجھ چکا ہوں۔ تو اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ جا میری طرف سے ملاقات کی اجازت ہے۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ تیرے سمجھانے سے راہِ راست پر آجائے گا تو میری طرف سے ملاقاتیں کرنے اور راہِ راست پر لانے کی اجازت ہے۔"

بادشاہ نے میر سامان کو دلدار بیگ سے ملاقات کا ایک پروانۂ خاص مرحمت کردیا۔

میر سامان اب ذرا دلیر ہوگیا تھا۔ اس نے رات کو تخلیے اور شمع کی روشنی میں دین الٰہی کا عقائد نامہ پڑھا اور

اسے فوراً ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اس عقائد نامے کو دوسروں سے چھپائے رکھنا ہے۔ اس نے اٹھ کر فوراً ہی کمرے کے دروازے بند کر لیے اور ڈرے سہمے انداز میں عقائد نامہ دوسری بار پڑھنے لگا۔

گائے کا گوشت، لہسن اور پیاز سے پرہیز کیا جائے۔ ڈاڑھی منڈوا دی جائے تو فعل احسن ہوگا۔ خنزیر اور کتے کی ناپاکی کا تصور ذہن سے نکال کر انہیں پاک سمجھا جائے کیونکہ خنزیر (ہندو عقائد کے مطابق) ان دس مظاہر میں سے ایک ہے جن میں پرمیشور نے حلول کیا ہے اور کتے میں بعض عارفوں کے قول کے مطابق ایسی دس صفات موجود ہیں کہ اگر ان میں سے ایک صفت بھی کسی انسان کو مل جائے تو وہ ولی بن جائے۔

شب و روز میں چار مرتبہ سورج کی پرستش کی جائے۔

عقائد نامے نے میر سامان کو لرزا کے رکھ دیا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور مریدانِ خاص سے خود کو نکال لینا اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

وہ اپنی اولین فرصت میں ولدار بیگ سے ملنے چلا گیا۔ اسے قلعے کے آخری حصے کے زمین دوز قید خانے میں بند کیا گیا تھا۔ قلعے کا یہ حصہ مرکزی پھاٹک سے ملحق تھا اور اس کے برابر ہی سے ایک تنگ سڑک بتدریج نشیب میں اترتی چلی گئی تھی۔ آگے جا کر وہ ایک چھوٹے سے دروازے پر ختم ہو گئی تھی۔ اس دروازے پر ایک پہرے دار ہر وقت موجود رہتا تھا۔ قلعہ دار میر سامان کے ساتھ اس دروازے تک گیا اور پہرے دار کو حکم دیا کہ میر سامان کو ولدار بیگ سے ملوا دیا جائے۔

دروازہ کھل گیا اور شمع کی روشنی میں پہریدار آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں شمع جھلملا رہی تھی۔ اندر بڑا اندھیرا تھا اور میر سامان پہرے دار کی راہنمائی میں سیڑھیوں سے نیچے اترتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا دل ہول رہا تھا کہ یہ قید خانہ ہے یا تاریک جہنم۔ پہرے دار ایک دوسرے دروازے پر جا کر رک گیا اور بلند آواز میں کہا۔ ”ولدار بیگ! تیرا دوست کرامت علی میر سامان بادشاہ کی اجازت سے تجھ سے ملنے آیا ہے۔“ اس کے بعد میر سامان سے کہا۔ ”تم اندر جا سکتے ہو، میں باہر ہی موجود رہوں گا۔ جب تم اندر سے دستک دو گے، میں دروازہ کھول کر تمہیں باہر بلا لوں گا۔“

میر سامان اندر جانے لگا تو پہریدار نے ہدایت کی۔ ”وہاں زیادہ دیر مت رکنا کیونکہ بادشاہ کے معتوب سے زیادہ گھل مل جانا شک و شبے کا باعث بن جاتا ہے۔“

میر سامان اندر چلا گیا۔ وہاں گھٹن تو زیادہ نہیں تھی کیونکہ معلوم نہیں کس طرف سے ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ ہاں تاریکی بہت زیادہ تھی۔ اندر ولدار بیگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میر سامان نے آواز دی۔ ”ولدار بیگ! تم کدھر ہو؟“

پاس ہی سے جواب ملا۔ ”میں تمہارے پاس ہی تو کھڑا ہوں۔“

میر سامان نے اپنے پیچھے داہنی طرف ایک سایہ سا دیکھا اور پھر دونوں دوست ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ ولدار بیگ نے پوچھا۔ ”کیا اکبر ابھی تک حکمرانی کر رہا ہے یا کسی اور کا دور شروع ہو چکا ہے؟“

میر سامان نے ولدار بیگ کی آواز میں نقاہت سی محسوس کی، جواب دیا۔ ”اکبر زندہ ہے اور میں تمہارے پاس ایک خاص مقصد سے حاضر ہوا ہوں۔“

اس کے بعد اس نے بادشاہ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور کہا۔ ”مفتی ممالک محروسہ صدر جہاں اور اس کے دونوں بیٹے بھی دینِ الٰہی میں داخل ہو چکے ہیں۔ مفتی کی گفتگو سے میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ اگر ہم دونوں بھی دینِ الٰہی میں داخل ہو جائیں تو بادشاہ تمہیں معاف کر دے گا۔“

ولدار بیگ نے جواب دیا۔ ”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“

میر سامان نے کہا۔ ”میں کیا جواب دیتا، میں نے کہہ دیا کہ اگر ولدار بیگ اس پر آمادہ ہو گیا تو اپنے دوست کی خاطر میں بھی دینِ الٰہی میں داخل ہو سکتا ہوں۔“

ولدار بیگ نے کہا۔ ”کرامت علی! تم نے غلط فیصلہ کر لیا۔ میں چند روزہ زندگی کے عیش و آرام کی خاطر اپنی عاقبت کا سودا نہیں کر سکتا۔ اب میں اس تاریک ماحول کا عادی ہو چکا ہوں۔ مفتی سے جا کر کہہ دے کہ میں اس جیسا احمق نہیں ہوں۔“

میر سامان کھسیا گیا، بولا۔ ”تمہاری قید کا گوہری کے دل پر برا اثر پڑا۔ وہ بہت افسوس کر رہی تھی۔“

ولدار بیگ کی بے زاری جیسے ایک دم ختم ہو گئی۔ نہایت اشتیاق سے بولا۔ ”کیا گوہری تم سے ملی تھی؟ کیا کہہ رہی تھی؟“

میر سامان نے جواب دیا۔ ”کہہ رہی تھی، ولدار بیگ پر زیادتی ہوئی، بہت ظلم ہوا۔“

ولدار بیگ نے ایک سرد آہ بھری، کہا۔ "حالانکہ میں نے... گوہری کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اب اگر گوہری سے ملاقات ہو تو میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا۔"

دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے، میر سامان نے کئی بار کوشش کی ولدار بیگ کو دین الٰہی اختیار کرنے پر آمادہ کر لے لیکن اس نے ہر بار انکار کیا۔ آخر کار وہ چلا آیا۔ اب میر سامان کسی اور ہی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ احمق ترین انسان ہے جس نے مفتی صدر جہاں اور دوسرے امراء کی دیکھا دیکھی دین الٰہی اختیار کر لیا تھا۔ ولدار بیگ کے انکار نے تو اسے بہت زیادہ نادم کر دیا تھا۔

ایک دن اس نے گوہری کو ایک خط لکھا۔ "گوہری! تم خریداری یا بیماری کے بہانے ایک دن کے لیے میرے پاس آ جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میں تمہیں ایک نامہ شوق لکھنا چاہتا تھا لیکن ابھی نہیں لکھ سکتا۔"

دوسرے دن اول ساعت ہی گوہری اس کی حویلی میں آ گئی۔ اس بار میر سامان نے اس کے لیے حویلی کے ایک دوسرے حصے میں انتظام کر رکھا تھا۔ میر سامان اسے اس خاص کمرے میں لے گیا۔ گوہری اسے دیکھتے ہی بے ساختہ مسکرا دی۔

میر سامان نے ہنس کر پوچھا۔ "گوہری! خیریت تو ہے، یہ ہنسی کیوں؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "ہنسی پر کوئی پابندی تھوڑی ہے، بس آ گئی ہنسی، وجہ کیا بتاؤں۔"

میر سامان نے پوچھا۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس وقت میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"ہاں بتا سکتی ہوں بالکل بتا سکتی ہوں، شرط لگا لو۔"

"اچھا بتاؤ تو کیوں بلایا ہے؟ اگر بتا دو گی تو اپنی ہار کی صورت میں تمہیں تمہارا منہ مانگا انعام دوں گا۔"

گوہری نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "تم نے شادی کے لیے بلایا ہو گا مجھے۔"

میر سامان بھی ہنسنے لگا، بولا۔ "تم نے شادی کو میری چڑ بنا لیا ہے۔"

گوہری نے جواب دیا۔ "تم نے شادی کا اتنی بار ذکر کیا ہے اور اس پر اتنا اصرار کیا ہے کہ اماں کو تمہاری شکل دیکھ کر یا نام سن کر بس شادی ہی کا خیال آ جاتا ہے اور وہ بڑبڑانا شروع کر دیتی ہیں۔"

میر سامان نے کہا۔ "خیر فی الحال تو شادی کا ذکر مت کرو۔ اگر میری طلب صادق ہے تو میں تم سے شادی کر کے رہوں گا۔ اس وقت میں تم سے کچھ اور ہی باتیں کروں گا۔"

گوہری نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ "کیسی باتیں؟ کس کی اور کون سی باتیں؟"

میر سامان نے کہا۔ "گوہری! پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم لوگ اس دن بادشاہ کے پاس کیوں گئی تھیں؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "اس دن وہ جو لڑکی ہمارے ساتھ تھی اسے بیربل ایک رات کے لیے گھر لے گیا تھا، بادشاہ کو اس کی خبر مل چکی تھی۔ انہوں نے ہمیں بلا کر اس کی تصدیق چاہی تھی۔"

میر سامان سناٹے میں آ گیا، پوچھا۔ "پھر تم لوگوں نے کیا کچھ کہا سنا؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "ہم وہاں جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، دوسرے بیربل سے میں یوں ہی چڑی ہوئی ہوں۔"

میر سامان نے پوچھا۔ "بیربل نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

گوہری نے طنزیہ ہنسی ہنس کر کہا۔ "وہ میرا کیا بگاڑے گا لیکن میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ جن امراء نے بادشاہ کو بگاڑا ہے، ان میں یہ بیربل بھی شامل ہے۔ بادشاہ کے مریدان خاص میں داخل ہے اور مراتب چہار گانہ بھی رکھتا ہے، مجھے اس کی یہی باتیں بری لگتی ہیں۔"

میر سامان نے کہا۔ "لیکن میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر بیربل یا کوئی اور بادشاہ کے مریدان خاص میں داخل ہو جاتا ہے تو اس سے تمہیں کیا نقصان پہنچتا ہے؟"

گوہری نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ، یہ مراتب چہار گانہ... کا کیا مطلب ہے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "چہار گانہ کا مطلب ہے ترک مال، ترک جان، ترک دین اور ترک ناموس۔"

گوہری نے کہا۔ "بیربل نے ان چہار گانہ میں سے صرف دو پر عمل کیا ہے، ترک دین اور ترک ناموس پر۔"

میر سامان نے کہا۔ "گوہری! میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "میرا مطلب بالکل واضح اور صاف ہے۔ بیربل نے ترک دین کر کے دین الٰہی اختیار کیا اور ترک ناموس کر کے اپنی بیٹیوں تک کو نہیں

چھوڑا۔"

میر سامان پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔ گھبرا کے بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو گوہری؟ تمہیں کسی نے غلط خبر دی ہے۔"

گوہری نے جواب دیا۔ "مجھے بالکل صحیح خبر ملی ہے اس لیے میں بادشاہ کے دینِ الٰہی سے نفرت کرتی ہوں۔ کرامت علی! تم یقین کرو میں دنیا کے ہر آدمی کا یقین کر سکتی ہوں، ہر فرقے اور ہر مذہب کے پیرو پر اعتماد کر سکتی ہوں لیکن بادشاہ کے مریدانِ خاص پر بھروسا نہیں کر سکتی۔ مجھے اس دین سے اور اس کے پیروؤں سے نفرت ہے۔"

میر سامان نے کہا۔ "انہیں ایسا تو نہ کہو گوہری! بادشاہ کے مریدانِ خاص میں اپنے عہد کے بڑے بڑے لوگ داخل ہو چکے ہیں۔"

گوہری ایک لمحہ میر سامان کو دیکھتی رہی، پوچھا۔ "تب پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟ تم بھی دینِ الٰہی اختیار کر لو یا پھر یہ کہ کہیں تم نے بھی بادشاہ کا دین تو اختیار نہیں کر لیا؟"

میر سامان نے گھبرا کر جواب دیا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں گوہری؟"

گوہری نے کہا۔ "مگر ایک بات میری بھی یاد رکھنا۔ اگر تم نے یہ گناہ کیا تو یہ سمجھ لینا کہ میں تم سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو جاؤں گی۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن یہ نہیں کر سکتی کہ تم یا میں، دونوں میں سے کوئی ایک دینِ الٰہی میں داخل ہو جائے۔"

میر سامان کا خوف سے برا حال تھا، اس نے موضوع ہی بدل دیا۔ "گوہری! میں دلدار بیگ سے مل آیا۔ وہ تمہارا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں نے گوہری کے ساتھ بڑی زیادتیاں کیں۔ اب میں ان پر شرمندہ ہوں، وہ تم سے بہت نادم تھا۔"

گوہری نے کہا۔ "دلدار بیگ نے میرے ساتھ بچ بچ زیادتیاں کیں لیکن وہ اگر مجھے پسند آیا ہے تو اپنے کردار کی وجہ سے۔"

میر سامان حسد سے جل بھن گیا، پوچھا۔ "تو تم اسے پسند کرنے لگی ہو؟"

"بس جل گئے؟ کیا کسی کو پسند کرنا بری بات ہے؟ تم، مفتی صدر جہان، ابوالفضل، فیضی اور بیربل وغیرہ کو ان کی دانش مندی اور زمانہ سازی کی وجہ سے پسند کرنے لگے ہو۔ محبت کرنا اور چیز ہے اور پسند کرنا کچھ اور۔"

میر سامان کی جان میں جان آئی، بولا۔ "دلدار بیگ کہہ رہا تھا کہ میں تمہیں ایک بار اس سے ملا دوں۔"

گوہری نے کہا۔ "پھر ملا دو کسی دن، اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "بس جلد ہی ملا دوں گا۔" پھر مستی خیز انداز میں پوچھا۔ "اس دن تو تم نے مجھے ایک رات بخش دی تھی، کیا آج کا دن مجھے مل سکتا ہے؟"

گوہری نے دو ٹوک جواب دیا۔ "نہیں، یہاں میں اس لیے نہیں آئی ہوں، تم وہاں آؤ گے تو تمہارے لیے ہر چیز حاضر ہوگی۔"

میر سامان نے کہا۔ "گوہری! کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جاؤں کیونکہ بادشاہ کو جس دن ان باتوں کا علم ہو گیا، وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

گوہری نے بے بسی سے کہا۔ "پھر تو مجبوری ہے۔"

اس نے گوہری سے ہم آغوش ہونے کی کوشش کی لیکن گوہری گویا ٹھنڈی برف ہو رہی تھی، بدک کر دور جا کھڑی ہوئی، بولی۔ "اونہوں، صبر۔"

میر سامان نے عاجزی سے کہا۔ "لیکن گوہری! میرا شیطان پورے آنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔"

گوہری نے جواب دیا۔ "کرامت علی! تم سمجھتے کیوں نہیں... بادشاہ کے مخبر ہمارے پیچھے لگے ہیں، بادشاہ ہمیں تخلیے میں بلا بلا کر یہ پوچھتا رہتا ہے کہ کس کے پاس کون امیر آیا تھا اور کس امیر نے کس کو اپنے گھر بلایا تھا۔ بادشاہ کو اس معاملے میں یہاں تک خبط ہے کہ وہ شیطان پورے کی نائکہ گرامی عورتوں کو بلا کر یہ معلوم کرتا رہتا ہے کہ ان کے گھروں میں جو کنواری لڑکیاں رہتی ہیں، انہوں نے اپنی پہلی رات کن امراء کے ہاتھ ہبہ کر دی تھی۔"

میر سامان نے دہشت سے پوچھا۔ "پھر، پھر بادشاہ کو کیا جواب دیا جاتا ہے؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "بادشاہ کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا جاتا ہے اور بادشاہ ان امراء کو سزائیں دیتا ہے جو شیطان پورے کی کنواری لڑکیوں کی آبرو باختگی کے پہلے شکاری قرار پاتے ہیں۔"

"ہونہہ، تو یہ بات ہے۔" میر سامان بہت پریشان تھا۔

گوہری نے کہا۔ "اس لیے میں یہاں محفوظ رہنا چاہتی ہوں کیونکہ میں بادشاہ کے روبرو جھوٹی قسم نہیں کھانا چاہتی۔"

میر سامان ہنسنے لگا۔

گوہری نے کہا۔ "آج تو میں چلی جاؤں گی لیکن کل تم آجاؤ۔ شاندار ضیافت دوں گی، اتنی شاندار کہ تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی اور تم شادی جیسی بے مزہ خواہش کا پھر کبھی اظہار نہ کرو گے۔"

میر سامان نے پوچھا۔ "تب پھر کل، میری دعوت ہے؟"

گوہری نے جواب دیا۔ "بالکل ہے، تم آجانا۔ خوش کر دوں گی۔"

میر سامان نے کہا۔ "اچھا میں ابھی آیا۔"

وہ اندر جا کر کچھ دیر بعد واپس آگیا، اشرفیوں کی تھیلی گوہری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری امانت تھی، جو تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ اب اسے لیتی جاؤ۔"

گوہری نے کہا۔ "اگر تم اسے میری امانت سمجھتے ہو تو اسے وہیں واپس کرنا، جہاں سے اسے حاصل کیا تھا۔"

میر سامان نے بڑی کوشش کی لیکن گوہری نے تھیلی نہیں لی۔

☆☆☆

شام کی شفق پھوٹ رہی تھی اور مغربی افق پر منتشر بادلوں میں ڈوبتے سورج کی شعاعوں نے طرح طرح کے رنگ بھر دیے تھے۔ اس شام پھر جنوبی ہند کا تاجر رشوت دے کر شیطان پورے میں داخل ہو گیا۔ گوہری نے خوش آمدید کہا، گوہری کی ماں آزردہ و افسردہ ہو گئی۔ اسے میر سامان کی شکل تک سے چڑ تھی۔

وہ رات پھر میر سامان کو دے دی گئی۔ اس وقت وہ اپنی قسمت پر بڑا ناز کر رہا تھا۔ اس رات عیش و کیف کے دوران میر سامان نے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دلدار بیگ سے ملوا ضرور دے گا۔

گوہری نے کہا۔ "تم کسی نہ کسی طرح دلدار بیگ کو رہا کرالو کیونکہ کسی نہ کسی امیر کو تمہاری پشت پر ہاتھ ضرور رکھنا چاہیے۔"

میر سامان نے جواب دیا۔ "گوہری! تم فکر مت کرو، میں اپنی پشت پر عنقریب ایسے امراء کو کھڑا کرنے والا ہوں کہ ان سے بڑے امراء کا خیال تک نہیں لایا جا سکتا۔"

میر سامان، شیطان پورے سے واپس آکر بادشاہ سے ملا تو اسے اپنے آپ پر بہت مہربان پایا، کہا۔ "کرامت علی! کیا تو دلدار بیگ سے ملا تھا؟"

میر سامان نے جواب دیا۔ "ظل الٰہی! یہ ناچیز اس سے ملا تو ضرور تھا لیکن ایسا لگتا ہے گویا اسے راہ راست پر لانے کے لیے مجھے چند ملاقاتیں اور کرنا پڑیں گی۔"

بادشاہ نے غیر متوقع کہا۔ "لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تیرے دین الٰہی اختیار کرنے کی خوشی میں اس احمق امیر کو رہا کر دیا جائے جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے خاندان مغلیہ ہی کا ایک فرد ہے۔" پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ "جب تم واپس جانا تو اپنے ساتھ دلدار بیگ کو بھی لیتے جانا۔"

چنانچہ جب وہ بادشاہ کے پاس سے واپس آیا تو باہر دلدار بیگ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں دوست خوشی سے بغلگیر ہوئے، دلدار بیگ نے کہا۔ "مجھے وثوق سے معلوم ہوا ہے کہ میری رہائی میں تمہارا ہاتھ ہے، میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"یہ میں بعد میں وصول کرلوں گا، ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"

اس کے بعد وہ دلدار بیگ کو اپنی حویلی میں لے گیا جہاں وہ ان دنوں بھی نہیں گیا تھا جب وہ بالکل آزاد تھا اور میر سامان کو ہمیشہ اپنا رقیب سمجھا کرتا تھا۔

دونوں دوست بڑی دیر تک گپ شپ کرتے رہے، دلدار بیگ نے کہا۔ "اب تم مجھے گوہری سے ملادو، میں اس شریف عورت سے ملاقات کرنے کے لیے بے چین ہوں۔"

میر سامان کو اس خواہش سے دلی اذیت ہوئی لیکن جھیل گیا۔

وہ اسے کئی دن تک ٹالتا رہا۔ وہ گوہری سے دلدار بیگ کو نہیں ملانا چاہتا تھا۔ اب وہ پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے بلاوجہ اسے آزاد کرا کے خطرہ مول لیا پھر یکایک دلدار بیگ نے آنا ہی بند کر دیا۔

ایک دن شام سے ذرا پہلے گوہری میر سامان سے ملنے آگئی، پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ دلدار بیگ رہا کر دیا گیا ہے؟"

میر سامان نے بے پروائی سے کہا۔ "ہاں یہ درست ہے۔"

"اور کیا یہ بھی درست ہے کہ اسے تم نے رہائی دلوائی ہے؟"

"یہ بھی درست ہے...... اور کچھ؟"

گوہری نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آج کل بادشاہ تمہاری باتیں بہت ماننے لگا ہے۔"

میر سامان سہم گیا کہ کہیں گوہری کو یہ نہ معلوم ہو چکا ہو

میر سامان ہنسنے لگا۔

گوہری نے کہا۔ ''آج تو میں چلی جاؤں گی لیکن کل تم آجاؤ۔ شاندار ضیافت دوں گی، اتنی شاندار کہ تمہاری طبیعت خوش ہو جائے گی اور تم شادی جیسی بے مزہ خواہش کا پھر بھی اظہار نہ کرو گے۔''

میر سامان نے پوچھا۔ ''تب پھر کل، میری دعوت ہے؟''

گوہری نے جواب دیا۔ ''بالکل ہے، تم آجانا۔ خوش کردوں گی۔''

میر سامان نے کہا۔ ''اچھا میں ابھی آیا۔''

وہ اندر جاکر کچھ دیر بعد واپس آگیا، اشرفیوں کی تھیلی گوہری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری امانت تھی، جو تمہارا انتظار کررہی تھی۔ اب اسے لیتی جاؤ۔''

گوہری نے کہا۔ ''اگر تم اسے میری امانت سمجھتے ہو تو اسے وہیں واپس کرنا، جہاں سے اسے حاصل کیا تھا۔''

میر سامان نے بڑی کوشش کی لیکن گوہری نے تھیلی نہیں لی۔

☆☆☆

شام کی شفق پھوٹ رہی تھی اور مغربی افق پر منتشر بادلوں میں ڈوبتے سورج کی شعاعوں نے طرح طرح کے رنگ بھر دیے تھے۔ اس شام پھر جنوبی ہند کا تاجر رشوت دے کر شیطان پورے میں داخل ہو گیا۔ گوہری نے خوش آمدید کہا، گوہری کی ماں آزردہ و افسردہ ہو گئی۔ اسے میر سامان کی شکل تک سے چڑ تھی۔

وہ رات پھر میر سامان کو دے دی گئی۔ اس وقت وہ اپنی قسمت پر بڑا ناز کررہا تھا۔ اس رات عیش و کیف کے دوران میر سامان نے یہ وعدہ بھی کرلیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دلدار بیگ سے ملوا ضرور دے گا۔

گوہری نے کہا۔ ''تم کسی نہ کسی طرح دلدار بیگ کو رہا کرالو کیونکہ کسی نہ کسی امیر کو تمہاری پشت پر ہاتھ ضرور رکھنا چاہیے۔''

میر سامان نے جواب دیا۔ ''گوہری! تم فکر مت کرو، میں اپنی پشت پر عنقریب ایسے امراء کو کھڑا کرنے والا ہوں کہ ان سے بڑے امراء کا خیال تک نہیں لایا جاسکتا۔''

میر سامان، شیطان پورے سے واپس آکر بادشاہ سے ملا تو اسے اپنے آپ پر بہت مہربان پایا، کہا۔ ''کرامت علی! کیا تو دلدار بیگ سے ملا تھا؟''

میر سامان نے جواب دیا۔ ''ظلِ الٰہی! یہ ناچیز اس سے ملا تو ضرور تھا لیکن ایسا لگتا ہے گویا اسے راہِ راست پر لانے کے لیے مجھے چند ملاقاتیں اور کرنا پڑیں گی۔''

بادشاہ نے غیر متوقع کہا۔ ''لیکن میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ تیرے دینِ الٰہی اختیار کرنے کی خوشی میں اس احمق امیر کو رہا کردیا جائے جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے خاندان مغلیہ ہی کا ایک فرد ہے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''جب تم واپس جانا تو اپنے ساتھ دلدار بیگ کو بھی لیتے جانا۔''

چنانچہ جب وہ بادشاہ کے پاس سے واپس آیا تو باہر دلدار بیگ اس کا انتظار کررہا تھا۔ دونوں دوست خوشی سے بغلگیر ہوئے، دلدار بیگ نے کہا۔ ''مجھے وثوق سے معلوم ہوا ہے کہ میری رہائی میں تمہارا ہاتھ ہے، میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

''یہ میں بعد میں وصول کرلوں گا، ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔''

اس کے بعد وہ دلدار بیگ کو اپنی حویلی میں لے گیا جہاں وہ ان دنوں بھی نہیں گیا تھا جب وہ بالکل آزاد تھا اور میر سامان کو ہمیشہ اپنا رقیب سمجھا کرتا تھا۔

دونوں دوست بڑی دیر تک گپ شپ کرتے رہے، دلدار بیگ نے کہا۔ ''اب تم مجھے گوہری سے ملادو، میں اس شریف عورت سے ملاقات کرنے کے لیے بے چین ہوں۔''

میر سامان کو اس خواہش سے دلی اذیت ہوئی لیکن جھیل گیا۔

وہ اسے کئی دن تک ٹالتا رہا۔ وہ گوہری سے دلدار بیگ کو نہیں ملانا چاہتا تھا۔ اب وہ پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے بلاوجہ اسے آزاد کرا کے خطرہ مول لے لیا پھر ایک دلدار بیگ نے آنا ہی بند کردیا۔

ایک دن شام سے ذرا پہلے گوہری میر سامان سے ملنے آگئی، پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ دلدار بیگ رہا کردیا گیا ہے؟''

میر سامان نے بے پروائی سے کہا۔ ''ہاں یہ درست ہے۔''

''اور کیا یہ بھی درست ہے کہ اسے تم نے رہائی دلوائی ہے؟''

''یہ بھی درست ہے ..... اور کچھ؟''

گوہری نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آج کل بادشاہ تمہاری باتیں بہت ماننے لگا ہے۔''

میر سامان سہم گیا کہ کہیں گوہری کو یہ نہ معلوم ہو چکا ہو

بات بیربل نے بتائی ہے۔"

میر سامان کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی تھی اور پورے جسم میں ایک عجیب قسم کی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔" گوہری مجھے خود پتا نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن میں نے ایسا کیا ضرور ہے اور اب مشکل یہ پیش آگئی ہے کہ اگر میں دین الٰہی اکبر شاہی سے نکلنا بھی چاہوں تو ناممکن ہے۔"

گوہری نے کہا۔" اس وقت میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ اب میں تم سے نہیں ملوں گی، ہم دونوں کی یہ آخری ملاقات ہے۔"

" آخر کیوں؟ آخری ملاقات کیوں؟"

" اس لیے کہ تم نے دین الٰہی اختیار کر کے کفر کی راہ اختیار کرلی ہے۔"

" اور بیربل...... وہ بھی تو بادشاہ کے مریدان خاص میں سے ہے، وہ تمہارے پاس کیوں آتا جاتا ہے؟"

گوہری نے تملا کر میر سامان کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ " تو تم خود کو ان تماش بینوں میں کا ایک فرد سمجھتے رہے ہو۔ بیربل اور تم میں کوئی فرق ہی نہیں گویا شاید یہ میری غلطی تھی کہ میں تمہیں بیربل سے الگ ایک خاص ہستی سمجھتی رہی ہوں۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو تم بدستور شیطان پورہ آتے رہو۔ میری ماں اور گھر کے دوسرے لوگ تمہارا اسی طرح استقبال کریں گے جس طرح بیربل یا دوسرے تماشائیوں کا کرتے رہے ہیں۔"

اس کے بعد گوہری ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہری، میر سامان میں اس بپھری شیرنی کو روکنے کی ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ گوہری چلی گئی اور میر سامان اسے حسرت ناک نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

گوہری نے جو کہا تھا، وہ کر دکھایا۔ وہ میر سامان سے ملنے پھر نہیں آئی۔

میر سامان نے کچھ دن تو اس کا انتظار کیا کہ ممکن ہے جذباتی ندی کے بہاؤ کا زور ٹوٹ جائے اور گوہری اس کے پاس نادم ہو کر آجائے لیکن دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی جب وہ نہ آئی تو میر سامان کو دنیا اندھیر نظر آنے لگی۔ اسے دو ماہ کا زمانہ جدائی برسوں بلکہ صدیوں کا محسوس ہونے لگا۔ اسے اپنے آس پاس کی ہر چیز فضول اور ہیچ سی نظر آنے لگی۔ کئی بار جی میں آئی کہ وہ شیطان پورہ چلا جائے اور گوہری کو منانے کی کوشش کرے مگر ہر بار انا نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ اس نے یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لی کہ گوہری کے بجائے کسی اور سے دل لگا لے لیکن کہیں اور دل ہی نہ لگتا تھا۔ آخر جب جنون نے زور کیا اور صبر نے جواب دے دیا تو وہ کسی احتیاط کے بغیر ہی شیطان پورہ روانہ ہو گیا۔ نگران، داروغہ اور منشی بھی میر سامان کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ میر سامان نے داروغہ سے کہا۔" میں ایک رات یہیں شیطان پورہ میں گزاروں گا، میرا نام اور پتا لکھ لیا جائے۔"

نگران اس کے قریب آگیا، بولا۔" جناب! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ بادشاہ کو آپ کی شیطان پورہ کی آمد اور شب باشی سے مطلع کر دیا جائے گا۔ اس لیے اگر آپ پسند کریں تو اپنی مطلوبہ محبوبہ کو یہاں سے لے کر کہیں اور چلے جائیں۔ میں اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ بادشاہ کو اس کی خبر نہیں ہونے دی جائے گی۔"

میر سامان نے جواب دیا۔" نہیں، میں یہیں شیطان پورہ میں آج کی رات گزاروں گا کیونکہ میں تمہارے بادشاہ سے نہیں ڈرتا۔ اگر تم چاہو تو بادشاہ کو اسی وقت مطلع کر دو کہ میر سامان کرامت علی شیطان پورے میں رات بسر کر رہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دو کہ وہ گوہری کے پاس ملے گا۔"

نگران، داروغہ اور منشی نے ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ منشی نے داروغہ سے پوچھا۔" کیا اندراجات کر لیے جائیں؟"

داروغہ نے نگران کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں دریافت کیا۔" آپ کیا کہتے ہیں؟"

نگران نے میر سامان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ " میر سامان صاحب! آپ ایک بار پھر غور فرمالیں، ابھی قلم ہمارے ہاتھ میں ہے اگر کاغذ پر چل گیا تو اس کی مثال اس تیر جیسی ہوگی جو کمان سے نکل چکا ہو۔"

میر سامان نے منشی سے قلم چھین لیا اور دفتری اندراجات اپنے ہاتھ سے کر دیے، بولا۔" میں خود ہی سب کچھ لکھے دیتا ہوں۔ میں نے کہہ جو دیا کہ میں بادشاہ سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔"

نگران، داروغہ اور منشی ہکا بکا ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ میر سامان اپنا کام کر کے گوہری کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نے جیسے ہی دروازے پر دستک دی، گوہری کی ماں نے دروازہ کھول دیا اور خلاف معمول اس نے میر سامان کو نہایت خوش اخلاقی سے خوش آمدید کہا، بولی۔

"آؤ آؤ کرامت علی، بہت دن بعد آئے..... کہاں تھے؟"

میر سامان کا دل ڈوبنے لگا۔ گوہری کی ماں کی خوش اخلاقی بڑی پراسرار اور معنی خیز تھی۔ اس خوش اخلاقی نے اسے خوفزدہ کردیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا گوہری گھر میں موجود ہے؟"

"ہاں موجود ہے لیکن کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا، میں اس سے معلوم کرلوں پہلے۔"

اس کے بعد ماں نے اسے ایک ایسے کمرے میں بٹھا دیا جس کے برابر والے کمرے سے کسی کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ماں اس کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد واپس آکر بولی۔ "اس وقت گوہری مرزا دلدار بیگ سے باتیں کررہی ہے، کہہ رہی ہے کرامت علی سے کہہ دو، پھر کسی وقت آجائیں۔"

میر سامان کو ایسا محسوس ہوا گویا جوتیوں سے اس کا منہ کچل دیا گیا ہو، بولا۔ "گوہری سے کہہ دو میر سامان کرامت علی آیا ہوں اور میں اس طرح گفتگو کا ذرا بھی عادی نہیں۔"

ماں نے اسی خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "میں مجبور ہوں، بار بار اندر نہیں جاسکتی۔"

میر سامان نے طیش میں گوہری کی ماں کو دھکا دے کر ایک طرف گرادیا اور خود اندر چلا گیا۔ وہاں دلدار بیگ اور گوہری پاس پاس بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ کرامت علی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گوہری گھبرا گئی، کھڑی ہوگئی، بولی۔ "تم کب آئے؟ مجھے خبر بھی نہ کی۔"

میر سامان نے نفرت سے جواب دیا۔ "میں نے خبر کرادی تھی، تیری ماں نے کہا تو دلدار بیگ سے باتیں کر رہی ہے، میں کسی اور وقت آجاؤں۔"

گوہری نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم آئے ہو۔"

دلدار بیگ مسکرا رہا تھا، بولا۔ "ہاں تو فرمایئے کرامت علی صاحب! کیسے آنا ہوگیا اس وقت؟"

کرامت علی نے جواب دیا۔ "دلدار بیگ! تم میری راہ سے ہٹ جاؤ۔ تم میرے دوست ہو اس لیے میں تم سے نہیں الجھنا چاہتا۔"

دلدار بیگ مسکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ "کرامت علی!" اس نے میر سامان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا لیکن کرامت علی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور درشت لہجے میں بولا۔ "تم دور رہو مجھ سے۔"

گوہری کی ماں بھی وہیں پہنچ گئی، بولی۔ "اب کیا میرا گھر میدان جنگ بنے گا؟ کرامت میاں! آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

دلدار بیگ نے کہا۔ "تم مت پریشان ہو، کرامت علی میرا دوست ہے اور اس نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ یہ اگر میرا سر بھی اتار لے گا تب بھی میں خاموش رہوں گا۔"

گوہری سامنے سے ہٹ گئی۔ کرامت علی نے ادھر ادھر اسے تلاش کیا، پوچھا۔ "یہ گوہری کہاں چلی گئی؟ اسے بلاؤ، میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

گوہری کی ماں نے جواب دیا۔ "وہ تم سے نہیں مل سکتی۔"

دلدار بیگ نے گوہری کی ماں سے کہا۔ "تم چلی جاؤ، میں کرامت علی سے خود باتیں کرلوں گا۔"

وہ چلی گئی۔ دلدار بیگ نے کہا۔ "کرامت علی اچھا بتاؤ اس وقت تم کس ارادے سے یہاں آئے ہو؟"

کرامت علی نے جواب دیا۔ "میں یہاں کسی بری نیت سے نہیں آیا تھا لیکن گوہری کی ماں نے میری ذہنی کیفیت بگاڑ دی۔"

دلدار بیگ نے کہا۔ "کرامت علی! یہ گوہری کا گھر ہے، ایک پیشہ ور عورت کا گھر۔ یہاں جس طرح تم آسکتے ہو اسی طرح میں بھی آسکتا ہوں۔ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے، اسی احسان نے اس وقت مجھے سنبھال لیا ورنہ تم خوب جانتے ہو میں کتنا گرم مزاج انسان ہوں۔"

کرامت علی نے جواب دیا۔ "ہاں، مجھے اس کا اچھی طرح احساس ہوگیا کہ یہ ایک پیشہ ور عورت کا گھر ہے۔ یہاں ہر کوئی آسکتا ہے، کوئی بھی آسکتا ہے۔"

"تب پھر تم گوہری سے کیا باتیں کروگے اب؟"

کرامت علی نے کہا۔ "یہ تم مجھ سے نہیں پوچھ سکتے۔"

اسی وقت گوہری بھی آگئی، دلدار بیگ سے بولی۔ "مرزا دلدار بیگ! تم آج چلے جاؤ۔ آج کی رات میں کرامت علی میر سامان کے ساتھ گزاروں گی۔"

دلدار بیگ نے غصے میں کہا۔ "تم میری بے عزتی کر رہی ہو گوہری!"

"نہیں۔ میں تمہاری بے عزتی نہیں کررہی ہوں۔" گوہری نے جواب دیا۔ "میر سامان کرامت علی ہم دونوں کے محسن ہیں، تمہیں ان کی خاطر صبر و تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے۔"

دلدار بیگ نے ہونٹ بھینچ لیے، بولا۔ "بہتر ہے، میں آج کی شب کرامت علی کے حق میں دستبردار ہوتا

ہوں۔"

وہ چلا گیا تو گوہری نے ایک ادائے خاص سے مسکراتے ہوئے کرامت علی کی گردن میں دونوں ہاتھ ڈال دیے، بولی۔ ''کرامت علی! بہ خدا اگر تم نہ آتے تو میں خود حاضر ہوتی۔ اس دو ماہ میں، میں نے خوب اندازہ لگا لیا کہ میں تمہیں نہیں بھلا سکتی۔"

کرامت علی نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ ساری دکھاوے کی باتیں ہیں۔"

گوہری نے کہا۔ ''میں نے تو یہاں تک فیصلہ کر لیا تھا کہ تم سے شادی کرلوں گی لیکن اب میں اس لیے ہچکچا رہی ہوں کہ تم مسلمان نہیں رہے، تم نے کفر کی راہ اختیار کرلی ہے۔"

کرامت علی نے چڑ کر کہا۔ ''یہ تم کفر اور اسلام کی بات کیوں کرتی رہتی ہو؟ جس گندے پیشے کو تم نے اپنا رکھا ہے، یہ کون سا اسلامی ہے؟"

گوہری نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔ ''بیشک میں نے ذلیل پیشہ اختیار کر رکھا ہے لیکن میں نماز سے بھی غافل نہیں رہتی۔ میں نے وہی کچھ کیا جو میرے مقدر میں تھا لیکن میری سب سے بڑی کوشش یہی ہے کہ میرا خاتمہ اسلام ہی پر ہو۔"

''کمال ہے۔'' میر سامان نے منہ بنا کر کہا۔ ''پھر تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ دین الٰہی اختیار کرنا میری قسمت میں لکھا تھا اس لیے میں اپنی قسمت کا لکھا پورا کرنے پر مجبور تھا۔"

گوہری نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اس تقدیر کو نہیں مان سکتی۔ اگر تم دین الٰہی نہ بھی اختیار کرتے تب بھی میر سامان ہی رہتے، کیونکہ دربار کے بیشتر امراء اور منصب دار اب بھی اپنے آبائی دین پر قائم ہیں۔"

کرامت علی نے دل برداشتہ انداز میں پوچھا۔ ''پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

گوہری نے جواب دیا۔ ''میں رقاصہ اور طوائف ہونے کے باوجود دین الٰہی کی بے دینی نہیں برداشت کر سکتی۔ میں تم سے واسطہ اب بھی رکھ سکتی ہوں لیکن وابستگی نہیں پسند کروں گی کیونکہ اب تم وہ کرامت علی نہیں ہو جس سے میں متاثر ہوئی تھی اور جو میرا تصوراتی معیار تھا۔"

کرامت علی کو خود پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ دین الٰہی اختیار کر کے اس نے کیا حماقت کی ہے، پوچھا۔ ''اگر میں دین الٰہی سے نکل آؤں تو؟ پھر تم کیا کرو گی؟"

گوہری نے جواب دیا۔ ''اب یہ ناممکن ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی شخص ایک بار دین الٰہی میں داخل ہو کر دوبارہ اس سے نکل بھی سکتا ہے۔"

کرامت علی نے بے بسی سے کہا۔ ''گوہری! یہ میری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ میں نے جس کی خاطر دین الٰہی اختیار کیا تھا آج وہی اس کا سب سے بڑا مخالف ہے۔"

گوہری نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم نے میری خاطر دین الٰہی کیوں اختیار کیا تھا؟ یہ مجھ پر اتہام ہے، تہمت ہے۔ میں نے تو تم سے یہ بھی نہیں کہا کہ تم اسلام ترک کر کے دین الٰہی اختیار کرلو۔"

کرامت علی نے جواب دیا۔ ''گوہری! یہ میں کب کہتا ہوں کہ تم نے مجھے دین الٰہی اختیار کرنے پر مجبور کیا، بلکہ ہوا یوں کہ جب میں نے بادشاہ کے دربار اور مزاج کا یہ حال دیکھا کہ بیربل جیسے مریدانِ خاص اپنے بدترین جرائم کے ساتھ اس لیے معاف کر دیے جاتے ہیں کہ وہ دین الٰہی اختیار کر چکے ہیں، میں نے یہ رعایت حاصل کرنے کی خاطر دین الٰہی اختیار کرلیا۔ میں شیطان بننے سے ڈرتا تھا لیکن بادشاہ کے مریدانِ خاص میں داخل ہو جانے کے بعد میں بہت دلیر ہو گیا تھا لیکن پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم دین الٰہی کی بدترین مخالف ہو تو میں نے اسے راز میں رکھنے کی کوشش کی لیکن یہ راز راز نہیں رہا۔ ذلیل بیربل نے بھانڈا پھوڑ دیا۔"

کرامت علی سر جھکا کر رونے لگا۔

گوہری نے تسلی دی۔ ''اب رونے سے کیا حاصل؟ بادشاہ کی موت کی دعا مانگو، وہ جیسے ہی مر جائے تم دین الٰہی سے نکل آنا۔"

''نہیں!'' کرامت علی نے کہا۔ ''میں بادشاہ کے مرنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں غیر معمولی جرأت و ہمت کا اظہار کروں۔ اب میں دین الٰہی میں نہیں رہ سکتا۔ میں نے تیری ہی خاطر دین الٰہی اختیار کیا تھا اور اب تیری ہی خاطر پھر اسلام اختیار کرلوں گا۔"

گوہری نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ میرے لیے ایک اعزاز ہو سکتا ہے کہ تم میری خاطر دوبارہ دینِ برحق اختیار کرلو، لیکن اگر تم یہ کام اپنی عاقبت کی خاطر کرتے تو زیادہ اچھا تھا۔ اپنے لیے، اپنی عاقبت کی خاطر، اپنے خدا کے لیے۔"

کرامت علی اسی وقت واپس چلا گیا۔

اس نے وہ رات بڑی بے چینی میں گزاری۔ صبح دم وہ حجرے کے سامنے پہنچ گیا۔ جہاں سے بادشاہ اپنے

مریدوں کو روشنی دیا کرتا تھا۔ دیدار اندوزی کے لیے مریدانِ خاص امراء اور دوسرے عالی نسب افراد حاضر تھے۔ بادشاہ کے مریدانِ خاص تین گز سے پندرہ گز کی دوری تک کھڑے تھے۔ بادشاہ کی آمد کے انتظار میں ہر شخص مستعد اور چوکنا کھڑا تھا۔ ان میں ابوالفضل، فیضی، شیخ مبارک، بیربل اور مفتی صدر جہاں بھی موجود تھے۔ ان سب کے پیچھے شمشیر زن اور تلوار باز کھڑے تھے۔ میر سامان کرامت علی شمشیر زنوں کے آگے والی صف میں کھڑا تھا۔

اچانک نقارے پر چوٹ پڑی جو اس کا اعلان تھا کہ بادشاہ نمودار ہونے والا ہے۔ لوگوں کی نگاہیں مقامِ درشن پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد بادشاہ نمودار ہوا۔ مریدانِ خاص سجدے میں گر گئے لیکن میر سامان بدستور کھڑا رہا۔ صدر جہاں نے کہنی ماری کہ سجدہ کیوں نہیں کرتا لیکن کرامت علی بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

جب مریدانِ خاص سجدے سے اٹھے تو میر سامان نے بہ آوازِ بلند بادشاہ کو مخاطب کیا۔ ''جہاں پناہ! میں دینِ الٰہی اختیار کرنے پر شرمندہ ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اس سے خارج کر دیا جائے۔''

مفتی صدر جہاں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دبی آواز میں بولا۔ ''بے وقوف! یہ کیسی بات کر رہا ہے۔ تیرے اس انداز کا دوسروں پر بہت برا اثر پڑے گا لہٰذا اپنی زبان بند رکھ۔''

میر سامان نے مفتی صدر جہاں کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا، اپنی کہتا رہا۔ ''میں اپنی عاقبت نہیں خراب کروں گا۔ میں بادشاہ کے چیلوں میں نہیں رہنا چاہتا۔''

بیربل نے پریشانی میں کہا۔ ''کرامت علی! تو آگ سے کھیل رہا ہے۔ جل کر بھسم ہو جائے گا۔''

کرامت علی نے پھر آواز بلند کی۔ ''میں مسلمان تھا، مسلمان ہوں اور مسلمان ہی مروں گا۔''

مفتی صدر جہاں اور بیربل نے اس کی آواز کو دبانے کے لیے زور زور سے بات چیت شروع کر دی۔ اس دوران مفتی صدر جہاں نے کسی خاص مرید میر کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ پھر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور شمشیر بازوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کسی شمشیر باز کو حکم دیا۔ ''مفتی صدر جہاں نے میر سامان کرامت علی کو دینِ الٰہی کا مرتد قرار دے دیا ہے اور مرتد کی سزا موت ہے۔ اس کی تعمیل کی جائے۔''

ایک شمشیر باز تلوار تولتا ہوا مفتی صدر جہاں کے قریب پہنچا اور آہستہ سے دریافت کیا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ یہ امیر دینِ الٰہی کا مرتد ہے اور مرتد کی سزا موت ہے؟''

مفتی صدر جہاں نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ مرتد ہے اور ہمارے یہاں ارتداد کی سزا موت ہے۔''

شمشیر زن نے دریافت کیا۔ ''پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟''

مفتی صدر جہاں نے کہا۔ ''بزن.... بہ کن.... اڑا دو گردن۔''

میر سامان کرامت علی چیخ رہا تھا۔ ''میں اسلام کا مرتد تھا میں نے ارتداد کا جرم کیا تھا لیکن اب میں دوبارہ مسلمان ہو گیا ہوں۔'' اسی وقت شمشیر زن کی تلوار فضا میں لہرائی اور میر سامان کے داہنی شانے کے پاس گردن سے گزرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ میر سامان کا سر مفتی صدر جہاں کے قدموں میں گر گیا۔ دربار میں کھلبلی سی مچ گئی۔ بہت سوں کی سمجھ میں یہ معاملہ ہی نہ آیا۔ بادشاہ نے مفتی صدر جہاں کو اپنے قریب بلا کر دریافت کیا۔ ''مفتی صدر جہاں! یہ معاملہ کیا تھا؟ میر سامان کیا کہتا تھا اور کیوں مارا گیا؟''

مفتی صدر جہاں نے جواب دیا۔ ''حضور والا! یہ راز کی بات ہے، جسے میں اتنے بہت سارے حاضرین کے سامنے نہیں بیان کر سکتا۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''کرامت علی ناحق مارا گیا۔ اسے کس نے اور کیوں قتل کر دیا؟''

مفتی نے جواب دیا۔ ''حضور کی ساری باتوں کا یہ عاجز فوراً کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ ہاں کچھ وقت دیا جائے تو جواب دیا جا سکتا ہے۔''

جب بادشاہ نے مفتی صدر جہاں سے تخلیے میں دریافت کیا کہ میر سامان کیا کہتا تھا اور اسے قتل کیوں کر دیا گیا؟ تو مفتی نے جواب دیا۔ ''جہاں پناہ! میر سامان دینِ الٰہی سے پھرا جا رہا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر جتنے ارتدادی جملے ادا کر رہا تھا ان سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ بادشاہ کے دوسرے چیلے بھی کرامت علی کی دیکھا دیکھی ارتداد کی راہ اختیار کر لیں۔ بس میں نے اس خیال سے اسے فوراً ہی قتل کرا دیا۔''

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ''اس کی لاش کسی بلند ترین جگہ سے نیچے پھینک دی جائے اور عام اعلان کر دیا جائے کہ اس ناہنجار کی لاش کو جو بھی دفن کرے گا، بادشاہ کا

معتوب قرار پائے گا۔"

مفتی صدر جہاں نے عرض کیا۔ "ظل اللہ! یہ فیصلہ مصلحت وقت کے خلاف ہے۔ اگر یہ بات عام ہو گئی کہ میر سامان کرامت علی دین الٰہی سے منحرف ہو گیا تھا تو دوسروں کی ہمت پڑے گی اور دین الٰہی میں ارتداد عام ہو جائے گا۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "مفتی صدر جہاں! کچھ آپ ہی مشورہ دیجیے کہ کم بخت کرامت علی کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

مفتی صدر جہاں نے جواب دیا۔ "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ مشہور کر دیا جائے کہ کرامت علی میر سامان جوشِ عقیدت میں بادشاہ پر قربان ہو گیا۔ امراء میں ایک بھی ایسا نہیں جو اس اعلان کی تردید کرے۔ جب یہ خبر عوام الناس میں پہنچے گی تو ان کے دلوں پر اس کا ایک خاص اثر مرتب ہو گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تب پھر مفتی صدر جہاں! اس مردود کی تجہیز و تکفین بھی فتح پور کے اس میدان میں ہونا چاہیے جو شیطان پورے سے فقط ہمارے چیلوں کے لیے بنایا گیا ہے اور جس کا رخ مشرق میں آفتاب کی جانب رکھا گیا ہے۔"

مفتی صدر جہاں نے جواب دیا۔ "حضور نے بالکل بجا فرمایا۔ میں اسے وہیں دفن کرا دوں گا۔"

اسی دن آگرے اور فتح پور میں یہ اعلانِ عام کر دیا گیا کہ بادشاہ کے مریدِ خاص کرامت علی، میر سامان نے فرطِ جوش و عقیدت اور محبت میں خود کو بادشاہ پر قربان کر دیا۔

اس اعلان سے آگرہ اور فتح پور میں ایک ہلچل مچ گئی۔ گوہری کی تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ کرامت علی نے ایسا کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب کرامت علی کے سوا اور کون دے سکتا تھا۔

مفتی صدر جہاں کی نگرانی میں کرامت علی کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ اس موقع پر بادشاہ کے مریدانِ خاص اور عام چیلے بھی موجود تھے۔ خود بادشاہ نے بھی بہ نفسِ نفیس کرامت علی کی آخری رسوم میں شرکت کی۔ مفتی صدر جہاں نے بادشاہ کو کرامت علی کا چہرہ دکھایا۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ "مفتی صدر جہاں! آگ مقدس اور پاک ہوتی ہے اور یہ انسانی گناہوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ اس لیے کرامت علی کے گناہوں کو جلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے آگ کی برکتوں سے محروم نہ رکھا جائے۔"

مفتی صدر جہاں نے عرض کیا۔ "حضور والا جو حکم دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "اگر پورے جسم کو نہیں تو اس کے چہرے ہی سے آگ چھوا دی جائے۔"

مفتی صدر جہاں نے اس وقت آگ سے کرامت کا چہرہ جھلسا دیا۔ بادشاہ اور اس کے مریدانِ خاص اور عام چیلے اس عمل سے بہت خوش تھے کہ اس طرح کرامت علی کے گناہ جلا کر بھسم کر دیے گئے۔

شیطان پورے سے ملحقہ قبرستان میں ایک قبر اس اہتمام خاص سے تیار کرائی گئی کہ قبر میں مشرقی جانب سورج کے سامنے جالی دار ایک کھڑکی لگوا دی گئی۔ کرامت علی کو اس قبر میں اتار دیا گیا۔ اس کا منہ مشرق کی سمت اور پیر مغرب میں رکھے گئے۔ مشرقی سمت کی جالی دار کھڑکی سے سورج کی شعاعیں چھن چھن کر کرامت علی کے چہرے پر پڑنے لگیں۔

اس موقع پر مفتی صدر جہاں نے بادشاہ کی طرف سے اعلان کیا۔ "ظل اللہ! مہابلی کا ارشاد گرامی ہے کہ آگ اور سورج کی شعاعیں انسان کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہیں۔ کرامت علی خوش قسمت ہے کہ سورج کی شعاعیں اسے ہمیشہ پاک و صاف رکھیں گی۔"

ان سب کے چلے جانے کے بعد گوہری بھی کرامت علی کی قبر پر پہنچی اور رو رو کر کہنے لگی۔ "کرامت علی! یہ تم نے کیا کیا؟ تم تو کہتے تھے کہ تم نے دین الٰہی میری خاطر اختیار کیا تھا۔ لیکن اب یہ بتاؤ کہ بادشاہ پر یہ جان کس کی خاطر قربان کر دی۔" پھر اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، وہ کہنے لگی۔

"میں تیرے بائیں طرف کھڑی یہ اعلان کر رہی ہوں کہ میں پورے ان گناہوں سے بری الذمہ ہوں جنہوں نے دنیا ہی میں تیرا منہ جہنم کی آگ سے جھلسا دیا اور جن کی سزا میں قیامت تک سورج کی شعاعیں تیرے چہرے کو جھلساتی رہیں گی۔"

☆☆☆

ماخذات

آئین اکبری، ابوالفضل۔ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی۔ مآثر الامرا، صمصام الدولہ شاہنواز۔ منتخب اللباب، خافی خان۔ خلاصۃ التواریخ، سبحان رائے بٹالوی۔ حضرت مجدد الف ثانی، مولانا سید زوار حسین شاہ۔ دربار اکبری، مولانا محمد حسین آزاد۔

انسان یا تو دولت کی پیچھے بھاگتا ہے یا پھر موت سے بچنے کے لیے انتہائی رستوں پہ بھٹک جاتا ہے... دونوں صورتوں میں وہ صحیح اور غلط میں فیصلہ نہیں کرپاتا... بس قسمت یاوری سے درست سمت میں اگر قدم اٹھ جائیں تو دولتی تنہا کو قرار مل جاتا ہے ورنہ صورتِ حال اتنی ہی پیچیدہ ہو جاتی ہے جیسا کہ اس کے ساتھ ہوا... موت سے فرار کے لیے اس نے موت کی سمت ہی دوڑ لگادی تھی۔

بغیر کسی خطا کے سزا پانے والی ایک دوشیزہ کی آزمائش

کاشف زبیر

نقشِ قدم

ایشلی جانسن لر کے خوف سے وہ سارے راستے خوفزدہ رہی تھی اور جب تک بس رکتی اور اس میں کوئی نیا مسافر سوار ہوتا تو وہ اسے غور سے دیکھتی۔ اسے لگتا کہ کہیں وہ شخص اس کے پیچھے یہاں بھی نہ آجائے۔ میامی سے نیویارک تک کا سفر خاصا طویل اور تھکانے والا تھا۔ وہ گزشتہ آٹھ گھنٹے سے مسلسل سفر میں تھی اور ابھی نیویارک مزید چوبیس گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ایشلی جانسن تقریباً بائیس برس کی بہت خوب صورت اور تروتازہ نظر آنے والی لڑکی تھی۔ حسین نقوش کے ساتھ اس کا جسم بہت ہی متناسب تھا۔ جیسا کسی ماڈل یا اداکارہ کا ہوتا ہے اور وہ ماڈل یا

اداکارہ بننے کے لیے ہی ایک سال پہلے گھر سے نکلی تھی۔
اس کا تعلق جنوب مشرقی امریکا کی ریاست جارجیا کے دارالحکومت سے کوئی سو کلومیٹر مشرق میں واقع ایک چھوٹے قصبے سے تھا۔ ایشلی کے ماں باپ میں اس وقت علیحدگی ہو گئی تھی جب وہ صرف تین سال کی تھی اور پھر اس نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ روزا اپنے مکان کے نچلے حصے میں ایک اسٹور چلاتی تھی اور اس کا اچھا بزنس تھا۔ روزا چاہتی تھی کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایشلی اس کے ساتھ اسٹور میں کام کرے۔ مگر ایشلی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہائی اسکول کے بعد اس نے ماں کے زور دینے کے باوجود اسٹور میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ایشلی بچپن سے ہی اس کام سے بیزار تھی۔ اسٹور کے دروازے کے ساتھ لگی گھنٹی کی آواز اسے زہر لگتی تھی۔ اسے گاؤں کی زندگی بہت سست لگتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح اس زندگی سے چھٹکارا ملے اور وہ یہاں سے جا سکے۔ وہ ماڈل یا اداکارہ بننے کے خواب دیکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ حسین ہے اور شوبز میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ ہائی اسکول کے فوراً بعد وہ اٹھارہ سال کی ہوئی اور اسے اپنی زندگی پر خود اختیار مل گیا اور اس نے روزا کو آگاہ کیا کہ وہ اسٹور سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی اور جلد ہی وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ شوبزنس میں نام پیدا کرنا چاہتی ہے مگر وہ اپنی خواہش کے برعکس اتنی جلدی نکل بھی نہیں سکی۔

اول اس کے پاس رقم نہیں تھی اور دوسرے کوئی ہنر بھی نہیں تھا جس کی بنیاد پر وہ کسی بڑے شہر میں اپنی جگہ بنا سکے۔ اسے معلوم تھا کہ اسے جاتے ہی کام نہیں ملے گا اور اسے گزر اوقات کے لیے کوئی دوسرا کام کرنا پڑے گا۔ مجبوراً اس نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک اس نے کچھ رقم جمع نہیں کر لی۔ صرف تجربے کی خاطر اس نے اسٹور میں کام کرنا گوارا کیا اور کچھ رقم اس سے بھی کمائی۔ اسٹور میں کام کرنے سے اس کی ماں کو امید ہوئی کہ شاید اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ وہ بے خبر تھی کہ ایشلی صرف رقم کی خاطر کام کر رہی ہے پھر ایک رات اس نے چپکے سے اپنا سامان ایک بیگ میں ڈالا اور ایک رقعہ چھوڑ کر گھر سے نکل آئی۔ اس نے روزا کو مطلع کیا تھا کہ وہ واپس نہ آنے کے ارادے سے جا رہی ہے اس لیے وہ اس کا انتظار نہ کرے۔ شاید وہ اسے کال کرے مگر یہ لازمی نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں انتظار کی اذیت میں نہ رہے۔ اسے بہرحال ماں سے محبت تھی۔

ایشلی نے گھر سے نکل کر میامی کا رخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ شوبز کے لحاظ سے میامی سب سے آگے ہے مگر وہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہاں نئے لوگوں کی کوئی جگہ نہیں۔ وہاں صرف مقبول ہو جانے والی ماڈلز اور اداکارائیں کام حاصل کر رہی تھیں۔ نئے لوگوں کے لیے میدان بہت تنگ تھا۔ شروع میں وہ ساتھ لائی رقم خرچ کرتی رہی لیکن جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ رقم اس مہنگے شہر میں زیادہ دیر نہیں چلے گی۔ گزارہ کرنے کے لیے اس نے ایک بار میں ویٹریس کی جاب کر لی۔ اسے یہ کام پسند تو نہیں تھا مگر اسے امید تھی کہ اس جاب میں اسے شاید شوبزنس کی دنیا میں بڑھنے کا موقع ملے۔ نوکری بھی آسان تھی۔ شام پانچ سے رات بارہ بجے تک کام کرنا ہوتا تھا۔ صبح سے لے کر شام تک وہ کوشش کرنے کے لیے آزاد تھی۔ اس نے ایک سال میں ہر ممکن کوشش کر لی تھی کہ کسی طرح اسے ایک ہی چانس مل جائے مگر وہ ناکام رہی۔

جب وہ میامی آئی تو کچھ عرصے تو اسے ماں کی یاد آتی رہی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ واپس چلی جائے۔ روزا کا اس کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا مگر وہ اپنے خواب کے پیچھے بہت آگے نکل آئی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اب واپسی کا راستہ نہیں رہا ہے۔ میامی میں اس نے لاتعداد شوبزنس ایجنسیوں سے رابطہ کیا۔ بے شمار اسکرین شوٹ دیے اور متعدد بار کیمروں کا سامنا کیا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ کسی کو متاثر نہیں کر سکی۔ اس سے کہیں کمتر لڑکیوں کو چانس مل چکا تھا اور وہ اب تک ایک معمولی سے چانس سے بھی محروم تھی۔ پھر کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ میامی کے بجائے نیویارک میں قسمت آزمائی کرے۔ نیویارک نئے لوگوں کے لیے مہربان شہر ہے۔ شاید اس کی قسمت جاگ جائے۔ وہ مایوس تھی اور نیویارک جانے کا سوچ رہی تھی کہ گڑبڑ ہو گئی۔

گڑبڑ سوحی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ سوحی اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک یوریشین لڑکی تھی۔ اس کا تعلق ویت نام سے تھا۔ اس کی ماں ویت نامی اور باپ ایک امریکی تھا۔ اس میں دونوں نسلوں کی خصوصیات موجود تھیں اور وہ دیکھنے میں خاصی دلکش لگتی تھی مگر اس نے اپنی دلکشی کو بہت بے دردی سے اور بہت سستا استعمال کیا تھا اس لیے قبل از وقت ہی وہ مرجھا چکی تھی۔ ایشلی سمجھتی تھی کہ وہ صرف منشیات کی عادی ہے مگر جب اس نے ایک بار ڈھکے چھپے انداز میں اسے منشیات فروش بننے کی پیشکش کی تو ایشلی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس دلدل میں کس حد تک اتر چکی ہے۔

ایشی جانتی تھی کہ اس کا حسن ہی اس کا اثاثہ ہے اور وہ اسے بہت سنبھال کر رکھتی تھی۔ وہ کئی گھنٹے شراب خانے میں رہتی مگر شراب نہیں پیتی تھی۔ اپنی خوراک اور آرام کا پورا خیال رکھتی تھی۔ ایکسرسائز اور سوئمنگ کرتی تھی اور ہفتے میں دوبار تین میل کی جاگنگ کرتی تھی۔ اس لیے مکمل طور پر فٹ تھی۔

اسے معلوم تھا کہ عیاشیات کا راستہ خطرناک ہے۔ اس سے آسان دولت کے ساتھ بعض اوقات آسان موت اور آسانی سے جیل بھی مل جاتی ہے۔ اس لیے اس نے سوجی کو ٹال دیا۔ پھر ایک ہفتہ پہلے سوجی نے اچانک ملازمت چھوڑ دی۔ ایشی نے سکون کا سانس لیا کیونکہ وہ اسے ورغلانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی۔ ایشی بار جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اسے سوجی کی کال آئی۔ اس نے زکام زدہ آواز میں کہا۔ ”ایشی! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”میں کام پر جا رہی...“

”پلیز! انکار مت کرو۔“ سوجی کا لہجہ التجا آمیز ہو گیا۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ مجھے مدد کی کتنی ضرورت ہے۔“

ایشی کا دل نرم پڑ گیا۔ ”کیسی مدد کی؟“

”یہ جب تم آؤ گی تب میں بتا سکوں گی۔“

بادل ناخواستہ ایشی راضی ہوگئی۔ ”لیکن میں زیادہ دیر کے لیے نہیں آسکوں گی۔ تم جانتی ہو ہارلی کو جاب پر لیٹ آنا بالکل پسند نہیں ہے۔“

”تم لیٹ نہیں ہوگی۔ مجھے ایک چیز بطور امانت تمہارے پاس رکھوانی ہے۔“ سوجی نے کہا۔ وہ ایشی کی رہائش سے کچھ ہی دور ایک جگہ رہتی تھی۔ اتفاق سے اس کا گھر بار کے راستے میں ہی آتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ وہاں سے ہوتی ہوئی بار چلی جائے گی۔ چند منٹ لیٹ بھی ہوئی تو ہارلی سے کوئی بہانہ کر لے گی جو بار کا منیجر تھا۔ سوجی ایک چھوٹے سے لکڑی کے کیبن میں رہتی تھی۔ اس نے کال بیل دی تو سوجی نے دروازہ کھولا اور اسے جس طرح پکڑ کر اندر کھینچا، اسے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”ہاں بہت بڑا لیکن صرف میرے لیے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“

سوجی نے اسے ایک چھوٹا بریف کیس دیا۔ ”تم اسے رکھ لو یہ میری امانت ہے۔ میں کل تم سے لے لوں گی۔“

”بس یہی کام ہے؟“ ایشی نے حیرت سے کہا۔

”اور اس میں کیا ہے؟“

”میری چیزیں ہیں۔“ سوجی نے مبہم انداز میں کہا۔ پھر جیسے اسے کھینچ کر اندر لائی تھی اسی طرح اسے دھکیل کر دروازے سے باہر لے آئی۔ ”اب جاؤ میں کل تمہارے گھر آؤں گی۔“

ایشی کچھ دیر حیران پریشان کھڑی رہی پھر برآمدے سے اتر کر آگے چل پڑی۔ سامنے سے ایک سیاہ کرولا نمودار ہوئی اور ایشی نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ ایک کسی قدر طویل قامت اور چھریرے جسم کا صورت سے شریف اور نرم مزاج نظر آنے والا شخص اترا تھا۔ وہ سڑک کراس کر کے سوجی کے کیبن کی طرف بڑھا اور جب ایشی گلی کا کونہ مڑ رہی تھی تو وہ دروازے پر کھڑا کال بیل بجا رہا تھا۔ ایشی بس اتنا ہی دیکھ سکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بار میں تھی۔ اس نے بریف کیس اپنے لاکر میں رکھا اور ایپرن باندھ کر کام میں لگ گئی۔ نو بجے بار میں خاصا رش ہو گیا تھا اور وہ مسلسل مصروف تھی کہ ہارلی نے اسے پکارا۔

”ہے ایشی..... دیکھنا یہ اپنی سوجی نہیں ہے؟“

ہارلی ایک کونے میں لگے ٹی وی کی طرف اشارہ کر رہا تھا جس پر سوجی کی تصویر دکھائی جا رہی تھی۔ ایشی نے ریموٹ اٹھا کر آواز کھولی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ”سوجی براؤن، چھبیس سالہ یوریشین اپنے گھر میں مردہ پائی گئی۔ نامعلوم قاتل نے اس کے سر میں گولی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔ کسی نامعلوم فرد نے نائن ون ون کو کال کر کے اطلاع دی کہ اس نے مذکورہ کیبن سے پانچ بج کر تیس منٹ پر ایک فائر کی آواز سنی۔ پولیس کی تفتیش جاری ہے مگر ابھی تک کسی فرد کو مشکوک قرار نہیں دیا گیا ہے۔“ جب تک نیوز کاسٹر خبر سنا رہی تھی، سوجی کے کیبن کے مناظر دکھائے جا رہے تھے جسے چاروں طرف سے پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ گلی میں نصف درجن پولیس کاریں اور دو عدد ایمبولینسیں بھی تھیں۔ پھر پلاسٹک میں لپٹی سوجی کی لاش کو ایمبولینس میں لے جاتے دکھایا گیا۔ ایشی کو احساس نہیں ہوا کہ ہارلی اسے کتنی دیر سے پکار رہا تھا پھر اس نے ایشی کا بازو ہلایا تو وہ چونکی۔ ہارلی نے خفگی سے کہا۔

”یہ ایسی خبر بھی نہیں ہے کہ تم گم ہی ہو جاؤ۔ دیکھو وہ آدمی بلا رہا ہے۔“

ایشی غائب دماغی کی کیفیت میں آدمی تک آئی اور اس نے آرڈر لیا۔ اسے مطلوبہ ڈرنک دے کر وہ ہارلی کے پاس گئی۔ ”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں چھٹی

کر کے جا رہی ہوں۔"

"خدا کے لیے ..... وہ صرف ایک ڈیٹر بس تھی۔"

باربی کراہا۔

"ہاں لیکن میں نے اس کے ساتھ کام کیا ہے۔"

"تم رش دیکھ رہی ہو۔" باربی نے اسے ایپرن اتارتے دیکھ کر فریاد کی مگر وہ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اندر آئی اور ایپرن لٹکا کر اپنے لاکر سے بریف کیس نکال کر بار کے عقبی دروازے سے باہر آگئی۔ ہوش میں آتے ہی اسے احساس ہوا کہ سوجی کا قاتل کون ہو سکتا ہے اور وہ خود کو خطرے میں محسوس کر رہی تھی۔ قاتل نے اسے دیکھا تھا اور وہ مارنے سے پہلے سوجی سے اگلوا سکتا تھا۔ کروزر سے اترنے والا شخص ہی قاتل تھا کیونکہ جب ایشلی سوجی کے گھر سے روانہ ہوئی تو پانچ بج کر چند منٹ ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی اسے لگا کہ قتل کا تعلق اس بریف کیس سے بھی تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ احتیاطاً وہ عام سڑکوں کے بجائے عقبی گلیوں سے گزرتی ہوئی اپنے اپارٹمنٹ تک آئی۔ عام حالات میں وہ کبھی ان گلیوں میں قدم نہ رکھتی جہاں لفنگے منتظر رہتے تھے کہ کوئی انہیں ملے اور وہ اسے لوٹ لیں۔

مگر قاتل کے خوف سے وہ یہ راہ اپنانے پر مجبور ہوئی اور خوش قسمتی سے کسی لفنگے کا سامنا کیے بغیر گھر تک پہنچ گئی۔ اس نے عجلت میں اپنا سارا سامان جمع کیا۔ یہ بس اتنا تھا کہ ایک ہینڈ کیری میں آ گیا۔ اس نے لباس بدلا اور نکلنے لگی تھی کہ اس کی چھٹی حس نے اشارہ کیا اور اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو اسے کچھ ہی دور وہی سیاہ کروزر دکھائی دی۔ اس کا جسم سرد پڑ گیا۔ قاتل اس کے گھر کے باہر موجود تھا۔ پھر اسے ہوش آیا اور وہ جلدی سے فلیٹ سے نکل کر عمارت کے عقبی حصے میں واقع ہنگامی حالات کے لیے مخصوص سیڑھیوں تک آئی اور ان سے اتر کر عقبی گلی سے ہوتی ہوئی سڑک تک پہنچی۔ خوش قسمتی سے باہر نکلتے ہی اسے ایک ٹیکسی مل گئی اور اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو بس ٹرمنل چلنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نیویارک جانے والی بس میں بیٹھ چکی تھی۔

قاتل کی پھرتی نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ تعاقب کرتا ہوا یہاں بھی نہ آ جائے۔ بس روانہ ہوئی تو اس نے سکون کا سانس لیا مگر خوف سارے راستے وقفے وقفے سے اس پر حملہ آور رہا۔ اسے اتنا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ بریف کیس کا لاک توڑ کر دیکھ سکتی۔ اس کی چابی اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ اس کے ہینڈ کیری میں موجود تھا اور بس میں اس کی سیٹ کے اوپری خانے میں رکھا تھا۔ ایشلی سوچ رہی تھی کہ اس بریف کیس میں کیا تھا جس کی خاطر سوجی اپنی جان سے گئی اور اب قاتل اس کے پیچھے تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ اس مصیبت کو ساتھ لے آئی تھی۔ کسی ڈسٹ بن میں ڈال دیتی تو اچھا تھا مگر اب وہ لے آئی تھی اور نیویارک پہنچنے تک اس کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے دیر سے اپنے پیٹ میں دباؤ محسوس ہو رہا تھا اور وہ واش روم جانے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اسی لمحے بس نے اسٹاپ کے سامنے مڑنا شروع کیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

یہ ایک چھوٹا اسٹیشن تھا۔ اس میں گیس پمپس، ایک کیفے اور ایک اسٹور تھا۔ بس کے رکتے ہی مسافر اترنے لگے۔ ڈرائیور نے سب کو خبردار کیا کہ پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی وہ بس چھوڑ دے گا اس لیے سب اپنی ذمے داری پر واپس آئیں۔ ساتھ ہی اس نے مسافروں کو اپنے سامان کی بھی خود حفاظت کرنے کو کہا۔ تمام مسافر جن کے پاس کوئی اہم چیز تھی، وہ اپنا سامان ساتھ لے کر اترنے تھے۔ ایشلی نے بھی اپنا ہینڈ کیری اٹھا لیا اور نیچے اتر آئی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے موقع پر کیفے کے واش روم پر رش ہوگا اور باری دیر سے آنے کا امکان تھا اس لیے اس نے اسٹور کا رخ کیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو وہاں گنے چنے افراد ہی تھے۔ کاؤنٹر پر ایک خوش رو نوجوان موجود تھا۔ ایشلی ایسے ہی ایک چپس کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے کاؤنٹر پر آئی اور ادائیگی کرتے ہوئے خوش رو نوجوان سے واش روم کا پوچھا۔ وہ اسے چمکتی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور ایشلی کو اس کی نگاہوں میں موجود تحسین اچھی لگی تھی۔ نوجوان نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس طرف چلی جاؤ۔"

وہ واش روم میں آئی اور کچھ دیر بعد وہ واش بیسن سے منہ ہاتھ دھو رہی تھی کہ باہر سے شور سنائی دیا۔ جیسے کچھ لوگ چلا رہے ہوں۔ پھر ایک فائر ہوا اور ایشلی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

☆☆☆

فرینک میسر ایک پیشہ ور قاتل تھا لیکن دیکھنے میں وہ بالکل بھی پیشہ ور قاتل نہیں لگتا تھا۔ بلکہ صورت اور انداز سے وہ شریف اور رکھ رکھاؤ والا آدمی نظر آتا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ فلوریڈا کی ریاست کا مہنگا ترین قاتل تھا اور ایک قتل کا معاوضہ کم سے کم بھی دو لاکھ ڈالرز لیتا تھا۔

اسے ایک اسٹاک بروکر کو قتل کرنے کا کنٹریکٹ ملا۔ اسٹاک بروکر جیمز شور کا شمار میامی اسٹاک مارکیٹ کے چند کامیاب ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی بہت زیادہ کامیابی سے بے شمار لوگوں کی ناکامیاں تھیں۔ اس لیے جب فرینک کو اس کے قتل کا کنٹریکٹ ملا تو اسے قطعی تعجب نہیں ہوا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اپنے عالی شان ولا سے باہر وہ بہت کم نکلتا تھا اور جب نکلتا اس کے ساتھ مستعد سیکیورٹی گارڈز ہوتے تھے۔ اس کی گاڑی بلٹ پروف تھی۔

اس لیے فرینک نے بہت غور و فکر کے بعد ایک پروگرام تشکیل دیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنا حلیہ بدل کر ایک معروف ٹی وی صحافی برائن ہرسٹ جیسا کرلیا۔ یہ اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا جبکہ اس کی صورت بھی برائن سے ملتی تھی اور خاص بات یہ تھی کہ برائن زیادہ تر متنازع موضوعات پر متنازع شخصیات سے انٹرویو لیتا تھا۔ اس نے جیمز شور سے رابطہ کیا اور اس سے انٹرویو کی خواہش ظاہر کی۔ ان دنوں جیمز کے خلاف ریاستی سطح پر تحقیقات جاری تھیں۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے منی لانڈرنگ کی ہے اور وہ منشیات کی رقم اسٹاک مارکیٹ میں لگا رہا ہے۔ جیمز نے اس الزام سے انکار کیا مگر ریاستی اٹارنی کا کہنا تھا کہ الزام بالکل بے بنیاد بھی نہیں تھا اور مطمئن ہونے تک تحقیقات جاری رہیں گی۔ فرینک نے اسی حوالے سے اس سے انٹرویو... مانگا تھا۔ جیمز کسی قدر حجت کے ساتھ رضامند ہو گیا۔ شاید وہ بھی چاہتا تھا کہ میڈیا کی مدد سے اپنا کیس لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ برائن ہرسٹ کا ایک نام تھا اور اس کا ہر انٹرویو لوگ بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔

اب فرینک کو ایک مددگار کی تلاش تھی مگر وہ میڈیا والوں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا تھا ورنہ اس کا بھانڈا فوراً پھوٹ جاتا۔ اس لیے اس نے آسان حل نکالا اور ایک بار سے ایک کال گرل کو ہائر کرلیا۔ اس کے بارے میں اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کام نکلنے کے بعد وہ اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ اس نے جو کال گرل ہائر کی تھی، وہ سوجی تھی۔ وہ ایک دن فرینک کے ساتھ رہی، تب فرینک نے اسے اس کام کی پیشکش کی۔ سوجی نے اسے بتایا کہ اسے ویڈیو کیمرا چلانا نہیں آتا مگر فرینک نے اسے تسلی دی کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور وہ چند منٹ میں اسے سکھا دے گا پھر فرینک نے اسے کیمرے کا استعمال سکھایا اور ساتھ ہی اسے بتایا کہ اسے کس طرح اپنا امیج پیش کرنا ہے۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے کسی نے ذرا مختلف انداز میں استعمال کیا تھا، اس لیے سوجی کو بھی مزہ آرہا تھا اور وہ خوشی خوشی فرینک کی ہر ہدایت پر عمل کررہی تھی۔ خاص طور سے جب اسے معاوضہ بھی اچھا خاصا مل رہا تھا تو انکار یا اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

تیسرے دن فرینک اسے لے کر جیمز کی عالی شان اسٹیٹ پر پہنچا جو فلوریڈا کے ساحل کے ساتھ تھی اور شاید ایک مربع کلومیٹر کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے پاس انٹرویو سے متعلق سارا سامان تھا جس میں ویڈیو اور اسٹل کیمرے بھی شامل تھے۔ خودکار سیکیورٹی کیمرے نے انہیں دیکھا اور گاڑی کے لیے گیٹ کھل گیا۔ انٹرویو کے لیے جیمز کے پاس جانے سے پہلے اس کی سیکیورٹی نے فرینک اور سوجی کی مکمل تلاشی لی اور مطمئن ہوکر انہیں اندر جانے دیا۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ جیمز نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور سوجی کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔

''تم نے اسسٹنٹ اچھی رکھی ہے۔''

''ابھی تم اس کی کارکردگی دیکھ لوگے۔'' فرینک نے کہا۔ اس نے سوجی کا حلیہ بھی کسی قدر بدل دیا تھا۔ اس نے سوجی کو کیمرا اور دوسرا سامان نکالنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت جیمز کا ایک مستعد گرگا وہاں موجود تھا۔ فرینک نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا اس کی موجودگی ضروری ہے؟''

''ہاں، یہ میرا باڈی گارڈ ہے اور صرف خواب گاہ میں مجھے اکیلا چھوڑتا ہے۔''

سوجی نے لینس والا اسٹل کیمرا نکالا تو فرینک اس سے لے کر خود اسے ایڈجسٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا اتنی سیکیورٹی ظاہر نہیں کرتی کہ دال میں کچھ کالا ہے؟''

''نہیں، آدمی کو اپنی حفاظت بھی کرنی پڑتی ہے۔'' جیمز نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ وہ جس صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی ایک خوب صورت چرمی بریف کیس بھی رکھا تھا۔

''کیا میں تمہارے آدمی کی ایک تصویر لے سکتا ہوں۔'' فرینک نے پوچھا اور پھر اجازت کا انتظار کیے بغیر کیمرے کا رخ گارڈ کی طرف کردیا۔ اس نے مسکرا کر ٹائی درست کی اور پھر اس کی مسکراہٹ منجمد ہوگئی کیونکہ ٹھس کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ماتھے پر سوراخ نمودار ہوا تھا اور وہ پیچھے گرنے لگا۔ صورت حال بھانپ کر جیمز شور کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب کی طرف گیا تھا کہ فرینک نے کیمرے کا رخ اس کی طرف کردیا۔ پھر ویسی ہی ہلکی سی آواز آئی اور جیمز

صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ اس کے نوٹ پہ تین دن کے مقام پر سوراخ ہو گیا تھا۔ دوسری بار بھی فرینک کا نشانہ لاجواب ثابت ہوا تھا۔ سوجی خوف و دہشت کے عالم میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ فرینک نے اس کے ردعمل کی پروا کیے بغیر تمام چیزیں پھرتی سے دوبارہ بیگ میں رکھیں اور صرف سیرا جو اصل میں ایک طرح کا پستول تھا اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ پھر اس نے مردہ سیکیورٹی گارڈ کی تلاشی لے کر اس کا پستول نکالا اور جیمو کی لاش کے ساتھ رکھا بریف کیس اٹھایا پھر جیمو کی موت کا یقین کرنے کے لیے گردن پر نبض دیکھی۔ مطمئن ہو کر وہ باہر کی طرف بڑھا۔

سوجی وہیں سکتے میں کھڑی تھی۔ فرینک واپس آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لایا۔ سیرے میں لگا ہوا پستول بے آواز تھا اس لیے اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گیٹ تک آئے جو اندر موجود کنٹرول روم سے کھولا اور بند کیا جاتا تھا مگر فرینک کو اس مسئلے کا حل آتا تھا۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور پلر کے ساتھ لگے برقی باکس کا نشانہ لے کر چند فائر کیے۔ اس سے چنگاریاں نکلی تھیں اس کے ساتھ ہی گیٹ کا آٹو میٹک سسٹم ختم ہو گیا اور وہ کار کے بمپر کے ہلکے سے دھکے سے کھلتا چلا گیا۔ جب تک ولا کی سیکیورٹی والے حرکت میں آتے وہ وہاں سے دور نکل گیا تھا۔ فرینک نے سوچا تھا کہ میامی سے پہلے وہ سوجی سے بھی چھٹکارا حاصل کرے گا اور اس کی لاش غائب کر دے گا مگر اس سے پہلے ہی اس کی کار ٹریفک جام میں پھنس گئی۔ وہ برابر میں آنے والے ایک ٹرک کی طرف متوجہ ہوا تھا کہ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور جب تک وہ متوجہ ہوتا، سوجی کار سے نکل کر گاڑیوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ فرینک نے دیکھا اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

فرینک کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بظاہر شاک میں لگنے والی سوجی اتنی ہوشیار ثابت ہوگی۔ وہ نہ صرف خود نکل گئی تھی بلکہ وہ بریف کیس بھی لے گئی تھی جس میں فرینک کے دو لاکھ ڈالرز موجود تھے۔ براؤن ہرسٹ کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بیک میلر ہے۔ اس تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے فرینک نے بھی اس سے بات کی اور اس نے فرینک کو دو لاکھ ڈالرز کی پیشکش کی تھی۔ فرینک کے لیے یہ بونس تھا اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے کسی شکار نے بھی اسے دھوکا دیا تھا۔ سوجی کے پیچھے جانے کے بجائے اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر اس طرف ٹرک والا موجود تھا اور دوسری طرف سے نکلنے سے پہلے ہی ٹریفک چل پڑا تھا۔ عقب میں موجود گاڑیوں نے ہارن دینا شروع کر دیا تو مجبوراً اسے بھی گاڑی آگے بڑھانا پڑی۔ وہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سوجی کہاں ہے۔ وہ اسے ایک سرخ کار میں جاتی دکھائی دی اور سرخ کار تیز رفتار لین میں تھی۔ جب تک وہ کوشش کر کے اس لین میں آتا تب تک وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

اب فرینک پچھتا رہا تھا کہ جیمو کے ولا سے نکلتے ہی سوجی کا کام تمام کیوں نہیں کر دیا۔ اس کی لاش ڈکی میں بھی ڈالی جا سکتی تھی۔ مگر فرینک زیادہ دیر پچھتانے والوں میں سے نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سوجی پولیس کے پاس نہیں جائے گی ورنہ اسے بریف کیس کے بارے میں تو بتانا پڑے گا۔ ساتھ ہی وہ جیمو کے قتل میں بھی برابر کی شریک قرار پائے گی۔ اس لیے پولیس کے پاس جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ اسے تلاش کر سکتا تھا۔ فرینک نے سب سے پہلے اپنا حلیہ بدلا اور اسی بار میں پہنچا جہاں سے اس نے سوجی کو لیا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا اور بارٹینڈر نے صرف سو ڈالرز کے عوض اسے بتا دیا کہ سوجی کہاں رہتی ہے۔ فرینک نے جو گاڑی استعمال کی تھی وہ چوری کی تھی اور اس نے اسے ایک پارکنگ میں چھوڑ دیا۔ وہیں اس کی اپنی سیاہ کرولا کھڑی تھی۔ وہ سیدھا خود دیے پتے پر روانہ ہوا اور جب وہ سوجی کے گھر کے سامنے رکا تو اس نے ایک لڑکی کو وہاں سے گزرتے دیکھا اور اس کے ہاتھ میں ویسا ہی بریف کیس تھا جیسا سوجی لے کر بھاگی تھی مگر اس وقت اس نے دھیان نہیں دیا۔

چند منٹ بعد وہ سوجی کے سامنے تھا اور وہ مرنے کی حد تک خوفزدہ تھی۔ اس نے فرفر سب اگل دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی واقف کار ایشلی ذرا دیر قبل اس سے بریف کیس لے کر گئی تھی۔ فرینک نے سکون سے سب سنا اور آخر میں اچانک ہی سوجی کے سر میں گولی مار دی۔ اس کے تعاون کا شکریہ وہ اسی طرح ادا کر سکتا تھا کہ اسے کم سے کم تکلیف کے ساتھ موت کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے بعد وہ باہر کی طرف آیا مگر اس نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی کارروائی مشکل ہے اور اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے بہترین جگہ ایشلی کا اپارٹمنٹ ہو سکتا تھا۔ سوجی نے اس کا پتا بھی بتا دیا تھا۔ وہ وہیں آیا اور ایشلی کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ سڑک سے دوسری طرف گروزنی پارک کر کے وہ دوسری منزل پر

موجود فلیٹ کی نگرانی کرنے لگا۔ ادھر نظر آنے والی کھڑکی کی لائٹ روشن تھی۔ اس لیے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ ایشلی کب فلیٹ میں آگئی۔ اچانک پردہ ہلا تو اسے پتا چلا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کروزر سے اتر کر بلڈنگ کی عقبی گلی تک پہنچا تو ایشلی اسے دوسرے سرے پر واقع سڑک پر ایک ٹیکسی میں بیٹھتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہینڈ کیری تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی ٹیکسی روانہ ہوگئی۔ فرینک تیزی سے واپس آیا مگر جب تک وہ اپنی گاڑی لے کر دوسری سڑک پر پہنچا تو ٹیکسی غائب ہوچکی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کا رخ بس ٹرمنل کی طرف کردیا۔ لڑکی جس طرح سامان لے کر نکلی تھی، اس سے ظاہر تھا کہ وہ شہر سے باہر جارہی ہے۔ میامی سے باہر جانے کے لیے بہترین ذریعہ بس تھی۔ ٹرمنل پر بے شمار بس کمپنیوں کے دفاتر تھے اور یہ جاننا آسان نہیں تھا کہ ایشلی کس کمپنی کی بس میں نکلی ہوگی۔ فرینک نے سوچا اور ایک آفس کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹکٹ والی کھڑکی پر موجود لڑکی کو اپنی بہترین مسکراہٹ سے نوازا اور شیریں لہجے میں بولا۔ ”مس! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”یس سر۔“

”میری منگیتر مجھ سے ناراض ہوکر میامی سے چلی گئی ہے اور شاید کچھ دیر پہلے کسی بس سے نکلی ہے۔ کیا تم نے کسی ایشلی جانسن نامی لڑکی کو ٹکٹ دیا ہے؟“

لڑکی نے اپنا ریکارڈ چیک کیا اور نفی میں سر ہلایا مگر تیسرے دفتر کے ٹکٹ کاؤنٹر پر موجود معمر عورت نے اسے بتایا کہ ایشلی جانسن اسی کمپنی کی بس سے نیویارک جانے کے لیے نکلی ہے اور بس کو روانہ ہوئے تقریباً ایک گھنٹا ہوگیا تھا۔ فرینک نے اس سے روٹ کا پوچھا اور پھر روانہ ہوگیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ ایک بار پھر ٹریفک جام میں پھنس گیا۔ بس کے پیسے فری وے تھا اور وہ بہت پہلے جاچکی تھی۔ خدا خدا کرکے وہ اس ٹریفک جام سے نکلا تو بس سے تقریباً تین گھنٹے پیچھے ہوگیا تھا۔ شہر سے نکل کر ہائی وے پر آتے ہی اس نے کروزر کے طاقتور انجن کی آزمائش شروع کردی۔ معمر خاتون نے بتایا تھا کہ بس ہر دو گھنٹے بعد پندرہ منٹ کے لیے اسٹاپ کرتی تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ رفتار اور بس کے رکنے کے وقفے کو کور کرتا ہوا صبح تک اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ایک بار وہ لڑکی تک پہنچ گیا تو وہ اس سے بچ نہیں سکے گی۔ وہ لگاتار ڈرائیو کرتا رہا اور بالآخر اسے صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب مطلوبہ بس نظر آگئی۔ وہ اس وقت ایک اسٹیشن کی طرف مڑ رہی تھی۔ بس کیفے کے سامنے والے حصے میں رکی تھی لیکن فرینک نے کروزر کا رخ ایک کونے کی طرف کیا۔ جب اس نے کروزر روکی تو اس نے دیکھا کہ ایشلی اتر کر اسٹور میں جارہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اتر کر اسٹور کی طرف بڑھا۔ اسٹور خاصا دور تھا۔ ابھی اس نے نصف راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ ایک پرانے ماڈل کی اسپورٹس کار آکر اسٹور کے سامنے رکی اور اس میں سے تین افراد اتر کر تیزی سے اندر گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے۔ ان میں سے ایک زخمی تھا اور باقی دو نے ہتھیاروں کے ساتھ دو عدد بڑے پیرا شوٹ بیگ اٹھا رکھے تھے جن میں کچھ بھرا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تینوں اسٹور میں گھس گئے۔ پھر اندر سے ایک فائر کی آواز آئی۔

☆☆☆

ایشلی کانپ رہی تھی کیونکہ فائر کے بعد خاموشی ہوگئی تھی۔ اب کسی عورت کے دبی آواز میں رونے اور مختلف لوگوں کے آہستہ بات کرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ ساکت کھڑی تھی کہ دھڑام سے واش روم کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے اندر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی اور اس نے نال کے اشارے سے ایشلی کو باہر آنے کو کہا۔ وہ جیسے تنویمی عمل کے زیر اثر چلتی ہوئی باہر آگئی۔ وہاں اسٹور کے ہال میں فرش پر چھ عدد لوگ اوندھے منہ لیٹے ہوئے تھے ان میں اسٹور والا لڑکا بھی تھا۔ اس کے علاوہ دو عورتیں اور تین مرد تھے۔ مسلح افراد کی تعداد تین تھی اور ان میں سے ایک کاؤنٹر سے ٹکا مشکل سے کھڑا تھا۔ اس کا رنگ زرد اور اس کے پہلو سے بہتے خون نے اس کی سفید شرٹ کو رنگین کردیا تھا۔ وہ لیٹے ہوئے افراد کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے دو ساتھی اسٹور کے باقی حصوں کو چھان رہے تھے۔ گودام کی طرف جانے والا واپس آیا اور اس نے کہا۔ ”وہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کردیا ہے۔“

ایشلی کو لانے والے نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”واش روم میں یہی تھی۔“

تینوں افراد تیس سے پینتیس کے درمیان تھے۔ وہ اپنے تاثرات اور انداز سے ہی مجرم لگ رہے تھے۔ اسٹور کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی دو عدد بینز تھے اور ان کی

کئی جگہوں سے ساخت بتا رہی تھی کہ ان میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں۔ وہ شاید کوئی ڈاکا مار کر آرہے تھے۔ ایشلی کو بھی باقی افراد کے ساتھ فرش پر اوندھے منہ لٹا دیا گیا۔ اس کا ہینڈ کیری اس کے پاس تھا اور کسی نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ تینوں دیکھ رہے تھے کہ وہاں اور تو کوئی نہیں تھا۔ اسٹور میں آنے جانے کے صرف دو راستے تھے اور انہوں نے دونوں بند کر دیے تھے۔ اسٹور والے لڑکے نے شاید اس سے دوسری بار پوچھا تو وہ چونکی۔ لڑکا کہہ رہا تھا۔ ''تم ٹھیک ہو...... اس نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔ ''یہ کون ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ دونوں سرگوشی میں بول رہے تھے۔ ''اچانک اندر آئے اور ہم سب کو یہاں لیٹنے کا حکم دیا۔''

''فائر کس نے کیا تھا؟''

''جو تمہیں اندر سے لایا ہے لیکن اس نے ڈرانے کے لیے فائر کیا تھا۔'' لڑکے نے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے یہ کہیں سے ڈاکا مار کر آئے ہیں اور ان کا ساتھی زخمی ہے۔''

''یہ تمہارا اسٹور ہے؟''

''نہیں، میں یہاں ملازم ہوں۔ میں اکاؤنٹس پڑھ رہا ہوں اور نائٹ شفٹ میں یہاں کام کرتا ہوں۔ ابھی سات بجے میری آف تھی لیکن اس سے پہلے یہ لوگ آگئے۔''

''خاموش رہو۔'' شاٹ گن والے نے غرا کر کہا۔ دوسرے کے پاس خودکار رائفل تھی جبکہ زخمی پستول سے مسلح تھا۔ اسٹور کے دو طرف دیوار تھی اور دو طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ اشیا کے ریک تھے۔ جہاں ریک نہیں تھے وہاں پردہ پوشی کے لیے جھالریں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں گرا دیا جاتا تو باہر سے اندر کچھ نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اندر کے تمام شیشوں کے ساتھ جھالریں بھی گرا دی تھیں اور بیشتر روشنیاں تک بند کر دی تھیں۔ وہ لوگ ان سے ذرا دور ہوئے تو ایشلی نے پوچھا۔

''یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''شاید ان کے پیچھے پولیس ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے یہ زخمی کی وجہ سے یہاں آئے ہوں۔''

اسی لمحے فضا میں پولیس سائرن گونجنے لگا اور ان تینوں کے انداز میں ہیجان نظر آنے لگا۔ وہ یرغمالیوں کو دھمکیاں دے رہے تھے کہ اگر انہوں نے کوئی حرکت کی تو فوراً مارے جائیں گے۔ ایشلی جس طرح لیٹی ہوئی تھی اس نے شیشے کے نیچے سے دیکھا۔ کم سے کم تین پولیس کاریں اسٹور سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر رکی تھیں۔ شاٹ گن والا تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے شیشے کا دروازہ ذرا سا کھول کر شاٹ گن باہر نکالی اور ایک فائر کیا پھر چلا کر بولا۔ ''دور رہو۔ ہمارے پاس یرغمالی ہیں...... اگر پولیس آگے آئی تو ہم انہیں مار ڈالیں گے۔''

یہ سنتے ہی سب کی حالت خراب ہوگئی اور اسی عورت نے زور و شور سے رونا شروع کر دیا جو پہلے بھی رو رہی تھی اور اس کے ساتھ موجود مرد اسے خاموش کرا رہا تھا۔ یہ بڑے حسین نقوش اور خوش بدن عورت تھی۔ اسے ہالی وڈ میں اداکارہ یا ماڈل ہونا چاہیے تھا۔ مگر اپنے لباس سے وہ گھریلو عورت لگ رہی تھی۔ رائفل والا اس کے پاس آیا اور اس کا شانہ جوتے سے دبا کر بولا۔ ''خاموش رہو۔''

''پلیز یہ مناسب نہیں ہے۔'' اس کے ساتھ موجود مرد نے کہا تھا کہ رائفل والے نے اس کے سر پر رائفل کی نال ماری۔ اس کی کنپٹی سے کھال پھٹ گئی اور خون بہنے لگا۔ ضرب نے آدمی کو بے ہوش کر دیا تھا اور دوسرے اس کا انجام دیکھ کر دہشت زدہ تھے۔ اگر کسی کو ان لوگوں کے بارے میں کوئی خیال تھا کہ وہ ان پر رحم کریں گے تو یہ دیکھ کر وہ خیال ہوا ہو گیا۔ زخمی شخص برانڈی کی بوتل سے منہ لگا کر پی رہا تھا اور غالباً اس طرح اپنے درد سے توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایشلی کا اندازہ تھا کہ اس کا کوئی اہم عضو مجروح نہیں ہوا تھا ورنہ وہ اس طرح ہوش میں اور اپنے پیروں پر نہ ہوتا۔ البتہ اسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ فائر اور دھمکی کے بعد پولیس کاریں پیچھے ہٹ گئی تھیں لیکن مزید پولیس کاروں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ لڑکے نے آہستہ سے ایشلی سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ نہ پولیس والے انہیں جانے دیں گے اور نہ ہی یہ خود کو پولیس کے حوالے کریں گے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''مجھے جان کہتے ہیں۔'' لڑکے نے اپنا تعارف کرایا۔ ''جان مائیکل۔''

''ایشلی جانسن۔'' وہ بولی۔ ''میرا تعلق جارجیا سے ہے۔''

''میں بھی یہیں پیدا ہوا ہوں لیکن میرے ماں باپ ٹیکساس سے آئے تھے۔'' جان نے مزید بتایا۔ ''تم کہاں جا رہی ہو؟ میں نے تمہیں بس سے اترتے دیکھا تھا۔''

اب تک اسے یہ بھی بھولی ہوئی تھی کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے آٹل بھی یاد آ گیا اور یہ خیال آیا کہ وہ اس سے بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے۔

☆☆☆

فرینک رک گیا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ اندر کیا ردعمل ہوتا ہے مگر اب اندر سکوت تھا اور ظاہر ہے ایک فائر کر کے اندر موجود تمام افراد کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا جا سکتا تھا۔ فائر یقیناً ڈرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اسٹور اور کیفے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ اسٹور کی طرف جانے کے بجائے کیفے کی دائیں طرف بڑھا۔ فائر کی آواز نے کیفے کے اندر موجود لوگوں کو بھی چونکا دیا تھا اور اب کچھ حال احوال کے لیے باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے فرینک سے پوچھنا چاہا مگر وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا کیفے کی سائڈ سے ہوتا ہوا عقب میں گیا۔ یہاں ایک کھلا سا میدان تھا اور اس کے کناروں پہ پارکنگ تھی۔ کیفے کی کچھ کھڑکیاں اس طرف کھل رہی تھیں مگر یہ ڈائننگ ایریا کی کھڑکیاں تھیں جبکہ اسٹور کی دیوار میں صرف ایک دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔

پھر فرینک کی توجہ ایک روشن دان نے حاصل کر لی۔ اس پہ اندر کی طرف ایگزاسٹ فین لگا ہوا تھا۔ مگر اس وقت یہ فین بند تھا۔ فرینک نے دیوار کے ساتھ رکھا ہوا بڑا سا ڈسٹ بن کھینچ کر روشن دان کے نیچے کیا اور اس پر چڑھ کر ایگزاسٹ فین کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے یہ کلپ کی مدد سے کھلنے اور بند ہونے والا ایگزاسٹ فین تھا۔ اس نے ذرا سی کوشش سے اسے کھول لیا۔ یہ کھڑکی کے پٹ کی طرح کھل گیا۔ روشن دان ایک فٹ چوڑا اور دو فٹ لمبا تھا۔ اس نے اندر جھانکا تو اسے واش روم پایا۔ روشن دان کے عین نیچے کموڈ لگا ہوا تھا۔ فرینک نے اپنے کوٹ کے بٹن بند کیے تاکہ اندر موجود پستول اور دوسری چیزیں گرنے سے محفوظ رہیں اور پھر وہ سر کے بل اندر گیا۔ دونوں ہاتھ کموڈ پہ ٹیک کر اس نے پاؤں دیوار پہ جمائے اور پھر ماہر کرتب باز کی طرح قلابازی کھا کر سیدھا ہو گیا۔

پیروں پہ کھڑے ہو کر اس نے سب سے پہلے ایگزاسٹ فین کو اپنی جگہ لگایا تاکہ کوئی واش روم میں آئے تو اسے شک نہ ہو۔ اس نے اپنا پستول نکالا اور اسٹور کے اندر جانے والے دروازے تک آیا۔ اس نے لٹو گھما کر دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ باہر سے لاک نکلا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب اسے انتظار کرنا تھا۔ اس

نے سوچا تھا کہ وہ سوٹ کیس سے وہ ڈنڈا اٹھا کر لڑکی کو شوٹ کر دے گا اور پھر یہاں سے نکل جائے گا۔ لڑکی کا قتل بھی ان لوگوں کے سر آئے گا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے سات بجنے والے تھے۔ اس کا اندازہ تھا کہ اگر وہ آدھے گھنٹے میں یہاں سے نکل سکا تو رات سے پہلے واپس میامی پہنچ جائے گا اور وہاں اپنی کامیابی کا جشن منائے گا مگر اس سے پہلے ایشلی جانسن کو ٹھکانے لگانا لازمی تھا۔ اس کے بغیر اس کی کامیابی ادھوری تھی۔ اچانک پولیس سائرن کی آواز نے اسے چونکایا اور اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اس سارے چکر میں پولیس کی مداخلت تو بھولا ہوا تھا۔ جبکہ اسے لازمی آنا تھا۔ وہ تیزی سے ایگزاسٹ فین تک آیا اور اس نے فین ہٹایا ہی تھا کہ دو پولیس کاریں عقب میں پہنچ گئیں۔ اس نے پھرتی سے فین واپس لگا دیا۔ اب وہ نہ باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر جا سکتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے بچنے کا امکان کم تھا۔ وہ پھنس گیا تھا اور... فی الحال اس مشکل سے چھٹکارا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

ایلٹ کوسل، وین رائٹ اور ایگزینڈر رشان پیشہ ور ڈاکو تھے۔ ان کا گینگ گزشتہ کئی سال سے بینکوں اور ایسے مقامات پر ڈاکے مار رہا تھا جہاں سے انہیں ایک ہی بار میں لاکھوں ڈالرز مل جاتے تھے۔ وہ سال میں دو یا تین بار واردات کرتے تھے اور ہر واردات پوری باریک بینی اور تفصیلی پلاننگ کے ساتھ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک بار بھی پکڑے نہیں گئے تھے۔ آج بھی انہوں نے ایک بگ کلب میں ڈاکا مارا اور وہاں سے تقریباً سات لاکھ ڈالرز لوٹ لیے۔ یہاں بڑے پیمانے پر جوا ہوتا تھا اسی وجہ سے اتنی رقم موجود تھی لیکن عین اس وقت جب وہ وہاں سے نکل رہے تھے، کلب کے ایک گارڈ نے جیب سے پستول نکال کر ایگ پر فائر کیا اور اسے زخمی کر دیا۔ ایلٹ نے گارڈ کو شوٹ کر دیا تھا۔ دوسری مصیبت اس وقت نازل ہوئی جب وہ فرار ہو رہے تھے۔ ایک پولیس کار ان کے پیچھے لگ گئی۔ راستے میں گولیوں کا تبادلہ ہوا۔ پولیس کار ہائی وے سے اتر کر الٹ گئی۔

مگر اس دوران میں مختلف سمتوں سے آنے والی پولیس کاروں سے بچنے کے لیے وہ اس اسٹیشن تک چلے آئے اور ان کے پیچھے پولیس یہاں بھی چلی آئی۔ ایگ آدھی بوتل برانڈی پی چکا تھا اور ایلٹ اس کے زخم کے آپریشن کی تیاری کر رہا تھا۔ وین شاٹ گن سے فائر کر رہے تھے۔ پولیس کو دھمکی دے کر اندر آیا تو ایلٹ نے اسٹور سے ہی مرہم پٹی کا سامان جمع کر لیا۔ اس نے اوزاروں والے حصے سے مختلف اقسام کے چاقو جمع کیے اور انہیں جراثیم کش دواؤں کی مدد سے صاف کیا۔ گولی ایگ کی پسلی میں لگی تھی اور دو پسلیوں کے درمیان پھنس گئی تھی۔ وین نے ایگ کو فرش پر لٹایا مگر اسے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ اس نے یرغمالیوں کا جائزہ لیا اور ایشلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم ادھر آؤ۔“

ایشلی کانپ گئی۔ ”کیوں؟“

”سوال مت کرو۔“ وین غرایا۔ ”آ کر میری مدد کرو۔“

ایشلی لرزتے قدموں سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ وین نے اس سے پوچھا۔ ”تم فرسٹ ایڈ کے بارے میں جانتی ہو؟“

”تھوڑا سا۔“

”ٹھیک ہے جیسا میں کہوں ویسا کرتی جانا۔“ وین نے اس بار نرمی سے کہا۔ ”یہ دیکھو، یہ روئی ہے اور یہ جراثیم کش دوا ہے جب میں کہوں تو روئی پر دوا لگا کر دینا مگر ابھی اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں سے زور دو، یہ ہل نہ سکے۔“

ایشلی نے ایسا ہی کیا۔ ایگ ساکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ برانڈی نے اس کے حواس پر قبضہ کر لیا ہے مگر جب وین نے چاقو کی نوک زخم میں داخل کی تو وہ تڑپا اور اس نے چیخ ماری۔ ایشلی نے اسے پوری قوت سے دبایا ہوا تھا مگر وہ اسے ہلنے سے نہیں روک پا رہی تھی۔ پتا نہیں اس نے اس کام کے لیے کسی مرد کو کیوں نہیں بلایا تھا۔ شاید انہیں مردوں کی طرف سے خطرہ تھا۔ وین ایگ کے تڑپنے اور اس کی کراہوں کی پروا کیے بغیر اس کا زخم کریدتا رہا اور بالآخر گولی تک پہنچ گیا۔ اس نے چاقو کی نوک بے دردی سے زخم کی گہرائی میں اتاری اور گولی باہر کھینچ لی۔ ایگ نے آخری چیخ ماری اور تکلیف سے نیم بے ہوش ہو گیا۔ وین کے اشارے پر ایشلی نے تیزی سے روئی پر ڈھیر ساری جراثیم کش دوا انڈیلی اور اسے پکڑا دی۔

ایٹ نے یہ روئی ایگ کے زخم پر رکھی تو وہ نیم غشی میں بھی تڑپ گیا۔ وین نے روئی کو اتنی دیر دبا کر رکھا جب تک زخم سے خون بہنے کی رفتار سست نہیں ہو گئی۔ تین بار روئی بدلنے پر خون تقریباً رک گیا تو ایشلی نے زخم کے آس پاس کی جگہ صاف کی اور وین نے اس پر موٹی پٹی

پٹی۔ کاٹ کر اوپر سے ٹیپ کر دیا۔ ایگ اب ہوش میں تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے قمیص کے بغیر ہی اپنی ڈینم کی جیکٹ پہن لی۔ ڈین نے اس کے پاس انرجی ڈرنکس اور جوسز کا ایک ڈھیر جمع کر دیا تھا۔ وہ اس سے استفادہ کرنے لگا۔ اسٹور میں دوائیں نہیں تھیں۔ البتہ کیش کاؤنٹر میں کچھ پین کلرز موجود تھیں۔ ایگ کو فی الحال وہی دے دی گئی تھیں۔ باہر روشنی تیز ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی پولیس کی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر میگا فون پر پولیس نے ان سے کہا۔

"تم لوگ ہتھیار ڈال کر خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ دوسری صورت میں ہم ریڈ کریں گے اور تمہاری جان کی ضمانت نہیں دی جاسکے گی۔"

وہ تینوں تشویش زدہ ہو گئے۔ ایگ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا اور گولی نکلنے کے بعد اس کی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ ان تینوں کے پاس خاصا اسلحہ تھا جس میں دو عدد خودکار رائفلیں، ایک شاٹ گن اور تین پستول تھے۔ ان تمام ہتھیاروں کا اچھا خاصا ایمونیشن بھی ساتھ تھا۔ ایشلی جو واپس اپنی جگہ آکر لیٹ گئی تھی۔ اس نے جان سے کہا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے اگر پولیس نے ریڈ کیا تو یہ ہمیں مار ڈالیں گے۔"

جان نے اسے تسلی دی۔ "شاید ایسا نہ ہو۔ پولیس انہیں دھمکا رہی ہے اور یہ ہتھیار ڈال دیں گے۔"

"مجھے ایسے لوگ نہیں لگ رہے ہیں۔" ایشلی انہیں کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ عورت کی حمایت کرنے اور اس پر ضرب کھانے والا مرد ہوش میں آگیا تھا۔ اس نے رومال اپنی کنپٹی پر رکھا ہوا تھا۔ عورت اس سے معذرت کر رہی تھی اور وہ اس سے رکھائی سے کہہ رہا تھا۔

"مہربانی کر کے مجھ سے دور رہو، پہلے ہی مجھے دخل اندازی کی سزا مل چکی ہے۔"

وہ تینوں پولیس کی وارننگ سے بے نیاز کھانے پینے میں مصروف تھے۔ ایگ کو خاص طور سے توانائی کی ضرورت تھی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے انرجی ڈرنکس اور جوسز کے کئی ڈبے خالی کر دیے تھے۔ پھر ڈین دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے جھالر ہٹا کر باہر جھانکا جہاں سامنے کی طرف ایک درجن پولیس کاریں اور کم سے کم پچاس پولیس والے موجود تھے۔ اسی اثنا میں ایمرجنسی ریسپانس فورس سوات کا ٹرک بھی وہاں پہنچ گیا اور اس سے مسلح سپاہی اتر کر چاروں طرف پھیلنے لگے۔ ڈین کے چہرے پر تشویش تھی۔ اس نے واپس آکر ایگ اور ایلیٹ کو بتایا۔ ایلیٹ بھی فکر مند ہو گیا مگر ایگ نے کہا۔ "اپنے حواس قابو میں رکھو۔ اگر ہم نے اعصاب کھو دیے تو ہمیشہ کے لیے جیل جائیں گے۔ ممکن ہے ہمیں سزائے موت ملے۔"

یہ سن کر ایلیٹ اور ڈین کے چہرے سفید پڑ گئے۔ گرفتاری ان کے لیے موت سے کم نہیں تھی۔ ڈین نے کہا۔ "تب کیا کریں؟"

"ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔"

"تب تک وہ باہر گھیرا تنگ کر لیں گے۔" ایلیٹ بولا۔

"وہ گھیرا تنگ کر چکے ہیں اور ہم کسی صورت لڑ بھڑ کر یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ ہمیں عقل سے کام لینا ہوگا۔" ایگ نے کہا اور یرغمالیوں کا جائزہ لیا۔ "یہ ہمیں بچا سکیں گے۔"

"کیسے؟"

"ہم انہیں یرغمال بنا کر یہاں سے نکلیں گے اور پھر کسی محفوظ جگہ پہنچنے کی کوشش کریں گے۔" اس نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سب ان کی باتیں سن رہے تھے اور دل ہی دل میں ہراساں ہو رہے تھے۔ ایشلی اور جان برابر برابر لیٹے ہوئے تھے۔ ایشلی نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کیا خواب لے کر گھر سے ماں کو اکیلا چھوڑ کر نکلی اور اسے کیا تعبیر ملی۔ اس نے جان سے کہا کہ اگر وہ یہاں سے بچ گئی تو ماں کے پاس واپس چلی جائے گی۔ جان نے اچانک اس سے کہا۔ "سنو تم جان بچا کر یہاں سے نکل سکتی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"اگر تم واش روم میں جاؤ تو وہاں کونے والے واش روم کے اوپر اگزاسٹ فین لگا ہوا ہے اور یہ کھل جاتا ہے۔ اس کے دوسری طرف بڑا سا روشن دان ہے تم بہ آسانی اس سے نکل سکو گی۔"

"لیکن کیا یہ مجھے واش روم تک جانے دیں گے؟" ایشلی نے سوال کیا۔

"ہاں آدمی بھی بھی واش روم جا سکتا ہے۔"

"انہوں نے مجھے وہیں سے تو پکڑا ہے۔"

"تم بہانہ کر سکتی ہو کہ تمہیں گردوں کا مرض ہے اور بار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔"

وہ دونوں اتنی دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے کہ خود انہیں بہ مشکل سنائی دے رہا تھا۔ زیادہ تر وہ اندازے سے سمجھ رہے تھے کہ دوسرا کیا کہہ رہا ہے۔ ایشلی نے جان کی طرف دیکھا۔ "تم خود کیوں اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا لیتے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ تمہارے پاس ماں ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بچ کر اس کے پاس واپس چلی جاؤ۔ یہ موقع ایسا ہے کہ کوئی ایک ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔''

''میرا نہیں خیال کہ یہ مجھے یا کسی کو بھی اتنی آسانی سے نکلنے دیں گے۔''

اسی لمحے الیگ آگے آیا اور اس نے ان سے کہا۔ ''سب ایک ایک کر کے کھڑے ہو اور جو پاس ہے وہ نکال کر یہاں کاؤنٹر پر ڈالتے جاؤ۔ جلدی۔''

سب سے پہلے خوب صورت عورت کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ کاؤنٹر پر رکھا۔ الیگ اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''لباس میں کچھ ہے؟''

''نن...... نہیں۔''

''زبان سے نہیں عمل سے بتاؤ۔'' الیگ نے کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''اپنا لباس اتار کر دکھاؤ کہ اس میں کچھ چھپایا ہوا تو نہیں ہے۔'' ویَن نے وضاحت کی۔ وہ الیگ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

عورت کا رنگ سفید ہو گیا۔ ''پلیز میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''لگتا ہے یہ ایسے نہیں مانے گی۔'' الیگ نے کہا۔ ''اس کا لباس پھاڑ کر اتار دو۔ اب یہ بغیر لباس کے رہے گی۔''

''نہیں...... نہیں۔'' اس نے احتجاج کیا اور پھر ہتھیار ڈال دیے۔ ''میں اتار رہی ہوں۔''

کچھ دیر بعد وہ صرف ہاتھوں سے اپنا جسم چھپائے کھڑی رو رہی تھی۔ وہ تینوں دیر تک اسے للچائی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ممکن ہے کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کے لیے درندے بن جاتے مگر یہاں وہ مجبور تھے۔ جب عورت کو کپڑے پہننے کی اجازت ملی تو اس نے جلدی سے کپڑے پہن لیے۔ اس کے بعد ایشلی کی باری آئی مگر اسے لباس اتارنے کا حکم نہیں ملا۔ اس نے اپنا ہینڈ کیری کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ایلیٹ نے پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''میرے کپڑے اور سامان ہے۔ میں نیویارک جا رہی تھی۔''

ویَن نے اس کی تلاشی لی مگر اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی، حالانکہ وہ اس عورت سے کم حسین نہیں تھی مگر ان کی شیطانیت صرف اسی عورت کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ جب اسے لپٹنے کا حکم ملا تو اس نے جرأت کر کے کہا۔ ''میں واش روم جا سکتی ہوں۔ میرے گردے میں مسئلہ ہے۔ مجھے بار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔''

الیگ نے اسے اجازت دے دی۔ ''مگر صرف دو منٹ میں واپس آنا ہوگا۔''

جب ویَن اسے پکڑنے کے لیے واش روم تک آیا تو اس نے واش روم کا جائزہ لیا تھا کہ اس میں سے نکلنے کی کوئی جگہ تو نہیں ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ایگزاسٹ فین کے پیچھے خاصا بڑا روشن دان ہے جس سے کوئی بھی متوسط جسامت کا فرد بہ آسانی نکل سکتا ہے۔ ایشلی نے جان کی طرف دیکھا تو اس نے نظروں ہی نظروں میں اس کا حوصلہ بڑھایا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ واش روم کی طرف بڑھی۔ واش روم میں اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف بڑا سا واش بیسن اور آئینہ تھا جبکہ بائیں طرف دو واش روم ساتھ ساتھ تھے۔ ان میں سے کونے والے واش روم کے اوپر ایگزاسٹ فین لگا ہوا تھا۔ وہ اندر آئی اور دروازہ بند کر کے پھرتی سے کونے والے واش روم کی طرف بڑھی اور اس کا دروازہ کھول کر اندر آئی تھی کہ اسے باہر آہٹ سنائی دی اور اس سے پہلے کہ وہ مڑتی کسی نے عقب سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے باہر کھینچ لیا۔ ایشلی کی چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اسے پکڑنے کی گرفت بہت سخت تھی اور وہ ہل بھی نہیں پا رہی تھی۔ پھر اس نے ایشلی کے کان میں سرگوشی کی۔

''شش...... آواز نہ نکلے۔ ورنہ وہ آ جائیں گے اور تمہارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔ میں تمہارا منہ چھوڑ رہا ہوں آواز مت نکالنا۔''

ایشلی نے سر ہلا کر اقرار کیا اور اس نے ایشلی کا منہ چھوڑ دیا۔ وہ گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''کون ہو تم؟''

''دیکھ لو۔'' آدمی نے کہا اور اسے آزاد کر دیا۔ ایشلی نے مڑ کر دیکھا اور خوفزدہ ہو گئی۔ اس کے سامنے سوتی کا پستول بدست قاتل فریک کھڑا تھا۔

''تم......؟'' وہ تھوک نگل کر بولی۔

''ہاں تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔'' وہ پستول کی نال سے اپنی کنپٹی سہلاتے ہوئے بولا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں تمہیں قتل کرنے آیا تھا مگر یہاں پوزیشن ہی بدل گئی ہے۔ اب میں بھی تمہاری طرح پھنسا ہوا ہوں۔''

''مستو ہم یہاں سے باہر نکل سکتے ہیں۔'' ایشلی بولی۔ اس کا خوف کسی قدر کم ہوا تھا کہ قاتل فی الحال اسے قتل نہیں کر رہا تھا۔

فرینک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”باہر پولیس ہے اور میں پولیس کے سامنے نہیں جا سکتا۔“

”پولیس تو چاروں طرف ہے۔“

فرینک نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”میں نے تمہارے پیچھے آ کر حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ خیر اب بھی وقت ہے ہم دونوں ایک معاہدہ کرتے ہیں۔“

”کیسا معاہدہ؟“ ایشلی بولی۔ ”وقت نہیں ہے انہوں نے مجھے دو منٹ دیے ہیں اور وہ پورے ہو چکے ہیں۔“

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایشلی نے چلا کر کہا۔ ”آ رہی ہوں۔“

”تم ان تینوں سے نمٹنے میں میری مدد کرو، میں تمہیں بچاؤں گا اور تم مجھے بچاؤ گی۔ اس کے بعد یہاں سے نکل کر ہم اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“ فرینک نے عجلت میں کہا۔ ”اب جاؤ، ایسا نہ ہو وہ یہاں آ جائیں اور ہاں دروازہ باہر سے لاک مت کرنا۔“

ایشلی ہاتھ تھپکتے کرتی ہوئی باہر آئی کیونکہ دروازے پر دستک مسلسل ہو گئی تھی۔ اگر اس نے اندر سے لاک نہ کیا ہوتا تو ایلٹ اندر گھس آتا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا اور ایک بار اندر بھی جھانکا۔ پھر باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔ ایشلی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ قاتل نے دروازہ لاک نہ کرنے کو کہا تھا۔ نہ جانے وہ اس پر اسے ہی قصوروار نہ سمجھے۔ وہ دو طرف سے پھنس گئی تھی۔ جان نے اسے آتا دیکھا تو سراپا سوال بن گیا تھا کہ وہ واپس کیوں آ گئی...... یہاں سے گئی کیوں نہیں؟ تمام یرغمالی ایک طرف ریکوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایشلی جان کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا ہوا...... تم واپس کیوں آ گئیں؟“

ایشلی نے گہری سانس لی اور بولی۔ ”میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں میامی سے کیوں نیویارک جا رہی تھی۔“

”کیوں جا رہی تھیں؟“

ایشلی نے اسے بتایا کہ وہ کیوں جا رہی تھی اور یہ سن کر جان کی آنکھیں پھیل گئیں کہ اس کے پیچھے آنے والا مسلح قاتل اس وقت اسٹور کے واش روم میں موجود تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اس نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں؟“

”اگر حالات نارمل ہوتے تو وہ مجھے قتل کر دیتا لیکن اس وقت وہ خود پھنسا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کی مدد کروں اور وہ ان لوگوں سے ہمیں بچا کر یہاں سے نکل سکے۔“

”وہ ہمیں نہیں خود کو بچانے کی فکر میں ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ایشلی نے کہا۔ ”میں تو دو طرف سے پھنس گئی ہوں۔“

”ایک بار ان لوگوں سے چھٹکارا مل جائے۔“ جان نے ان تینوں کو دیکھا۔ ”اس کے بعد قاتل سے پولیس کی مدد سے نمٹا جا سکتا ہے۔“

”کیا ہم قاتل کے بارے میں ان لوگوں کو بتا سکتے ہیں؟“ ایشلی نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ اسے مار دیں گے اور ممکن ہے کہ وہ بھی ان میں سے ایک دو کو مار دے اور پولیس کو اندر آنے کا موقع مل جائے۔“

”نہیں، ایسا نہ ہو کہ یہ سمجھیں کہ وہ پولیس کا آدمی ہے اور پہلے ہمیں ماریں۔“ جان نے کہا۔ ”یہ گھبرائے ہوئے مجرم ہیں، ان سے کسی بات کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔“

ایشلی کی سمجھ میں بات آ گئی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ صورت حال کو دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا اور باہر سے پولیس کئی بار، تیس میگا فون پر کال کر چکی تھی۔ جب انہوں نے جواب نہیں دیا تو پولیس کی طرف سے اسٹور میں موجود فون پر کال کی گئی اور ایگ نے کال ریسیو کی۔ اس نے دوسری طرف کی بات سن کر کہا۔ ”ایک بات اپنی کھوپڑیوں میں بٹھا لو، اگر پولیس نے ہیرو بننے کی کوشش کی تو یہاں موجود یرغمالیوں میں سے کسی کو زندہ نہیں پا سکو گے۔“

ایگ نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ گولی نکلنے، کھانے پینے اور آرام سے اس کی حالت خاصی حد تک بہتر ہو گئی تھی۔ درحقیقت گولی اوپری تھی مگر خون زیادہ نکلنے سے ایسا تاثر مل رہا تھا جیسے زخم گہرا ہے۔ اسٹور میں ایک طرف ٹی وی لگا ہوا تھا۔ ڈین نے اسے آن کر کے ایک مقامی نیوز چینل لگایا۔ حسب توقع اس پر اس واقعے کی کوریج کی جا رہی تھی۔ دور سے کیمرا اسٹور کو دکھا رہا تھا اور ایک نیوز رپورٹر خاتون تیز ہیجانی لہجے میں بتا رہی تھی کہ مسلح افراد نے اندر تقریباً ایک درجن افراد کو یرغمال بنالیا تھا اور جب وہ اندر گھسے تو ایک فائر بھی ہوا تھا۔ شاید کوئی زخمی ہے یا ہلاک ہو گیا ہے۔ فون کی گھنٹی پھر بجی اور ایگ نے ریسیور اٹھایا۔ ”کوئی زخمی نہیں ہے...... کوئی نہیں مرا ہے...... ہاں تم لوگوں نے حماقت کی تو بہت سے لوگ مریں گے۔“

ایگ نے ریسیور پٹخ دیا۔ اس نے برانڈی کی بچی ہوئی بوتل سنبھال لی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے بوتل کاؤنٹر پر رکھ دی اور اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھا۔ ایشلی اور جان نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

پرامید ہو گئے کہ اب شاید کچھ ہوگا۔

☆☆☆

فرینک زندگی میں کبھی اتنی مشکل سے دوچار نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے ہی شکار سے مدد مانگنی پڑی ہو۔ وہ پھنس گیا تھا اور نہ یہاں سے نکل سکتا تھا اور نہ ہی ان لوگوں سے بچ سکتا تھا۔ اسٹی باہر جاتے ہوئے دروازہ لاک کر گئی تھی۔ اس وقت تو فرینک بھڑکا تھا اور وہ پستول نکال کر کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس کے خیال میں اسٹی نے اسے دھوکا دیا تھا مگر جب باہر سے کوئی ردعمل نہیں ہوا تو اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ شاید دروازہ اسے نے جانے والے نے بند کیا ہوگا۔ فرینک احتیاطاً کونے والے واش روم میں تھا تاکہ کوئی اچانک آ جائے تو اسے چھپنے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ جواب دینے کے لیے پہلے سے تیار ہو۔ اسی وجہ سے وہ آنے والے کی نظروں سے بچا تھا۔ وہ اچانک آیا تھا اور آتے ہی سیدھا باہر والے دروازے پر گیا تھا۔ فرینک نے کموڈ پر اپنے پاؤں اوپر کر لیے تاکہ اگر آنے والا نیچے سے جھانکے تب بھی وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ اس کے جوتے بتا رہے تھے کہ وہ مرد ہے اور وہ جس طرح آیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ وہ یہاں قبضہ کرنے والوں میں شامل تھا کیونکہ اس کے ساتھ کوئی نہیں آیا تھا اور وہ جس طرح سے بے تکلفی سے گھوم رہا تھا، اس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ یرغمالیوں میں شامل نہیں ہے۔ فرینک جو اتنی دیر سے قابو میں بیٹھا ہوا تھا، اس کے دوبارہ حرکت میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔

ایلیک خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا اور اس کا ذہن اس صورت حال سے نکلنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ واش بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے وہ عقب میں ٹوائلٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز نہ سن سکا اور اس وقت چونکا جب آئینے میں فرینک نظر آیا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اپنی جیکٹ کی طرف گیا مگر فرینک زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا اور اس نے پستول کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ ایلیک ساکت ہو گیا۔ فرینک نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس کا پستول نکال لیا اور پھر اس کی تلاشی لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''شاید تم میری موجودگی کی توقع نہیں کر رہے تھے۔''

''کون ہو تم؟'' ایلیک نے بوجھل آواز میں کہا۔

''آواز دھیمی رکھو۔'' فرینک نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا ورنہ ابھی یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی۔''

''کیا چاہتے ہو؟''

''میں یہاں پھنس گیا ہوں اور یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔''

''تم کس طرح پھنسے ہو؟''

''باہر پولیس موجود ہے اور میں اس کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا۔'' فرینک نے صاف گوئی سے کہا۔

''تم یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''میری یہاں موجودگی اتفاقی ہے۔'' فرینک نے کہا۔ اس کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔ ''اگر تم میرا ایک کام کر دو تو زندہ رہ سکتے ہو۔''

''کیسا کام؟''

''یہاں ایک لڑکی ہے اس کا نام جیسکا جانسن ہے۔''

''ہم ناموں سے واقف نہیں تھے۔''

''وہ لڑکی جس نے جینز کے ساتھ سفید اور گلابی ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ سنہری بالوں والی۔''

''میں سمجھ گیا تم کسے کہہ رہے ہو۔''

''پلان بہت سادہ ہے۔ تم پولیس والوں سے بات کرو گے کہ تم میں سے ایک آدمی ایک یرغمالی لڑکی کو لے کر جائے گا اور جب وہ یہاں سے بحفاظت نکل جائے گا اور پولیس اسے روکنے کی کوشش نہ کرے تو تم لوگ باقی یرغمالیوں کو چھوڑ کر نکل جاؤ گے اور بعد میں اس لڑکی کو بھی چھوڑ دوں گا۔''

ایلیک نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا اور اسی لمحے دروازے کے باہر آہٹ ہوئی اور فرینک پھرتی سے دروازے کی آڑ میں ہو گیا۔ اس کے پستول کا رخ ایلیک کی طرف تھا۔ دروازہ کھلا اور وین نے اندر جھانکا۔ اس نے ایلیک کو دیکھا۔ ''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں۔'' ایلیک نے ہچکچا کر کہا۔ ''شاید میرا پیٹ خراب ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وین کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ فرینک نے اس دوران میں پستول کا رخ ایلیک کی طرف کر رکھا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر بالکل تیار تھی۔ اگر ایلیک ذرا بھی اشارہ کرتا تو وہ اسے شوٹ کر دیتا اور اس کے بعد آنے والے کو بھی۔ مگر ایلیک نے عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے فرینک کو آزمانے سے گریز کیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی فرینک اس کے قریب آ گیا۔ ''تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب میری پیشکش کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم باہر جا کر ہماری مدد کرو

گے۔ شین ہے تم فرار ہو جاؤ اور پیچھے مڑ کر بھی نہ آؤ۔''

''مجھے صرف ایک فون کال کرنی ہوگی اور اس لڑکی کو چند گھنٹے اپنے قبضے میں رکھنا ہوگا۔ اگر تم میری مدد کرو گے تو میں تمہارے لیے اتنا تو کر ہی دوں گا۔''

الیگ کا ذہن اب زیادہ بہتر طور پر سوچ رہا تھا۔ ''تم نے اس لڑکی کا نام لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تم اسے جانتے ہو اور وہ بھی شاید تمہیں جانتی ہے۔''

''یقیناً۔''

''تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔'' فرینک نے رعونت سے کہا۔

''تب میں تمہاری بات کیوں مانوں؟''

''اس لیے کہ تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔'' فرینک نے اس کی کنپٹی میں پستول کی نال دھنسا کر کہا۔ ''یا نہیں رہنا چاہتے؟''

الیگ نے مشکل سے سر ہلایا۔ ''اسے دور ہٹاؤ کہیں پستول چل نہ جائے۔''

''یہ میری مرضی کے بغیر نہیں چلے گا اور جب میری مرضی سے چلے گا تو تم اپنے آپ کو مردہ سمجھنا۔''

''ٹھیک ہے میں تمہاری بات مان رہا ہوں۔ اب تم کیا کرو گے؟''

''گڈ! میں تمہیں باہر لے جاؤں گا اور تم اپنے ساتھیوں کو منتظر رکھو گے۔ یعنی وہ گولی وغیرہ چلانے سے گریز کریں گے۔ اس کے بعد وہی ہوگا جو میں نے کہا ہے۔''

الیگ نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ ایک منٹ بعد وہ واش روم سے یوں برآمد ہوا کہ فرینک اس کے عقب میں تھا اور اس نے اپنے پستول کی نال الیگ کے سر سے لگا رکھی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں الیگ کا پستول اس کی کمر سے لگا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ایلن اور وین نے اپنے ہتھیار تان لیے تھے اور وہاں سنسنی پھیل گئی تھی۔ وین غرایا۔ ''وہیں ہو تم .. چھوڑ دو اسے۔''

''آرام سے آرام سے۔'' الیگ نے دونوں ہاتھ آگے کیے۔ ''ہماری بات ہو گئی ہے یہ ہماری مدد کرے گا۔''

''تمہارے سر پر پستول رکھ کر۔'' وین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں اس کا سر اڑا دوں گا۔''

''تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گے۔'' الیگ نے سخت لہجے میں کہا پھر اس نے بتایا کہ فرینک کس طرح ان کی مدد کرے گا۔ یہ سنتے ہی ایشی نے چلانا شروع کر دیا۔

''یہ نہیں جانتے کہ یہ قاتل ہے مجھے مار دے گا۔''

''بکواس بند کرو۔'' ایلن دھاڑا۔ ''آواز نہ نکلے۔''

''کیا بھروسا ہے کہ یہ واقعی مددگار ثابت ہوگا یہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟'' وین نے پوچھا۔

''ہمیں اس پر بھروسا کرنا پڑے گا۔'' الیگ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ پھر یہ صرف ایک لڑکی کو لے کر جائے گا۔ اگر اس نے دغا کی تب بھی ہمارے پاس کچھ یرغمالی ہوں گے۔ ہم ان کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے یہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

وہ تینوں آپس میں بحث کر رہے تھے۔ فرینک نے مسکرا کر ایشی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں اپنی بات پر قائم ہوں انہیں چھوڑ دوں گا۔''

''تم مجھے مار دو گے۔'' ایشی نے نفی میں سر ہلایا۔

''سوچ لو کبھی تم نے ہی کچھ کیا تھا۔''

''ہاں کیونکہ وہ میری تھی تم نے کرنا تھی۔''

''بریف کیس میں رکھا ہے۔'' ایشی چونکی۔

''اس کا مطلب ہے تم نے اسے کھول کر نہیں دیکھا ہے۔'' فرینک نے کہا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے ان تینوں کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ''اب تمہاری زندگی میرے لیے اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔ وہ بریف کیس کہاں ہے؟''

''اس بیگ میں۔'' ایشی نے کاؤنٹر پر رکھے چند کیری کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے تم میرے ساتھ چلتے ہوئے اسے لے لو گی۔'' فرینک نے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' ایشی نے ذرا جرأت دکھائی۔ ''جب مجھے مرنا ہے تو میں تمہارے لیے آسانی کیوں کروں۔''

''اگر تم نے جانے سے انکار کیا تو میں اس لڑکے کو گولی مار دوں گا۔'' فرینک نے پستول کا رخ جان کی طرف کر دیا۔ وہ ان تینوں سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ اسے معلوم تھی کہ وہ اس پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ اس صورت میں باہر سے پولیس غلط فہمی کا شکار ہو کر ریڈ کر سکتی تھی۔ ایشی اور جان دنگ رہ گئے کچھ جان نے کہا۔

''مجھے کیوں ... دوست تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اس صورت میں ہم خاموش نہیں رہیں گے۔''

فرینک مسکرایا۔ ''میں سمجھ گیا تھا تم دونوں کے درمیان کوئی چکر ہے اسی لیے میں نے اس لڑکے کی دھمکی دی ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے پستول کا رخ جان کی طرف کر دیا۔ ''تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے صرف ایک منٹ

ہے۔ اگر تم نے ہاں نہ کی تو میں اسے شوٹ کردوں گا۔"

"تو کیا تم اس کے بعد یہاں سے نکل سکو گے؟" جان نے پوچھا۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" وہ بولا۔ "بیس سیکنڈ رہ گئے ہیں۔"

"او کے، میں تیار ہوں۔" ایشلی نے کہا۔

"تم اس کے ساتھ نہیں جاؤ گی۔" جان تیز لہجے میں بولا۔

"یہ عقل مند لڑکی فیصلہ کرچکی ہے۔"

اس دوران میں ان تینوں نے آپس میں بحث کرکے فیصلہ کرلیا۔ وہ ایشلی کو فرینک کے ساتھ جانے کی اجازت دینے کو تیار ہوگئے تھے۔ الیگ نے کہا۔ "ٹھیک ہے تم اسے لے جاسکتے ہو۔"

"یہ قاتل اسے ماردے گا۔" جان نے احتجاج کیا۔

"شٹ اپ۔" ویرن نے کہا۔ "اپنی زبان بند رکھو ورنہ تم پہلے مارے جاؤ گے۔"

"اس کا منہ بند کردو۔" فرینک نے ایشلی کی طرف اشارہ کیا۔ "دونوں ہاتھ بھی پشت پر باندھ دو۔"

وہاں ہر قسم کا ٹیپ موجود تھا اس لیے یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا اور ایک مضبوط ٹیپ لے کر اس سے ایشلی کے ہاتھ پشت پر کرکے باندھے گئے اور پھر اس کے منہ پر ٹیپ دائرے میں پورے سر پر گھما کر لگایا گیا تاکہ وہ کسی صورت اسے اتار نہ سکے۔ فرینک نے اپنی جیب سے ایک باریک کپڑے والا لچک دار غلاف نکال کر اپنے سر پر یوں چڑھالیا کہ اس کے خدوخال اس میں چھپ کر رہ گئے تھے مگر اسے باہر کا سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مختلف مواقعوں کے لیے اس قسم کی چیزیں اس کے پاس موجود ہوتی تھیں۔ اس نے ایشلی کو بازو سے پکڑا اور اسے کھینچ کر دروازے تک لایا، وہ مزاحمت کررہی تھی۔ اس دوران میں الیگ نے فون اٹھا کر نمبر ملانا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ فون براہ راست پولیس کے موبائل کنٹرول سینٹر سے ملا ہوا ہے اور وہاں شیرف نے اس سے بات کی۔

الیگ نے اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھا کہ اس کے ایک آدمی کو ایک یرغمالی کے ساتھ باہر جانے دیا جائے۔ اگر وہ محفوظ جگہ پہنچ گیا تو وہ باقی یرغمالیوں کو چھوڑ کر نکل جائیں گے اور جب باقی بھی محفوظ مقام پر پہنچیں گے تو پہلے جانے والی لڑکی کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یوں یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا۔ کسی قدر ردوکد کے بعد شیرف مان گیا۔ ویسے بھی وہ ڈھیلا آدمی تھا ورنہ اتنی دیر میں پولیس کی سرگرمی بڑھ جاتی۔

چاہیے تھی مگر وہ ان کا محاصرہ کرکے آرام سے بیٹھ گیا تھا۔ ایشلی سن رہی تھی اور اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار فرینک اسے لے کر یہاں سے نکل گیا تو پھر وہ اسے زندہ چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ الیگ نے فون رکھ کر سر ہلایا تو فرینک نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور باہر نکالتے ہوئے اسے اپنے سامنے کرلیا تاکہ اگر کوئی اسنائپر اسے شوٹ کرنا چاہے تو آسانی سے یہ کام نہ کرسکے۔

ان کے باہر آتے ہی چاروں طرف موجود پولیس ہوشیار ہوگئی۔ ایشلی مزاحمت کررہی تھی مگر فرینک اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ ایشلی کے دونوں ہاتھ پشت پر تھے اور فرینک نے اس کا بایاں بازو اپنے بائیں ہاتھ سے دبوچ رکھا تھا اور دائیں ہاتھ سے پستول اس کے سر سے لگا رکھا تھا۔ ایشلی کے ہاتھ فرینک کے کوٹ کی جیب میں موجود کسی سخت چیز سے ٹکرا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ یہ بغل میں پستول تھا۔ فرینک اسے کروزر کی طرف لے جارہا تھا۔ ایشلی اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالنے کی کوشش کررہی تھی اور ساتھ ہی اس نے مزاحمت تیز کردی تاکہ فرینک کو شبہ نہ ہو کہ وہ کیا کرنے جارہی ہے۔ وہ رک رہی تھی اور فرینک کو اسے دھکیلنا پڑ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ خود کو چھڑانے کی کوشش بھی کررہی تھی۔ ان سب باتوں کی وجہ سے فرینک کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ وہ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال رہی ہے۔

پولیس والے کاروں اور دوسری رکاوٹوں کی آڑ میں تھے اور ان کے ہتھیاروں کے رخ فرینک کی طرف تھے مگر شیرف کی طرف سے انہیں سوائے اشد ضرورت کے گولی چلانے سے منع کیا گیا تھا۔ کروزر خاصی دور کھڑی تھی اور اب فرینک پچھتا رہا تھا کہ اس نے اسے اتنا دور کیوں کھڑا کیا تھا۔ درمیان میں کسی نے روکا نہیں لیکن اس دوران میں وہ نامعلوم جگہوں پر چھپے ہوئے اسنائپرز کا آسان شکار ضرور تھا۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر ایشلی کو پاس کیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود خطرہ تھا۔ بالآخر وہ کروزر کے پاس پہنچا اور اس نے ایشلی کو فرنٹ سیٹ پر دھکیلنے کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اس کے قریب ہوا تو ایشلی کو موقع مل گیا، اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالنے کا۔ اس نے پستول کا دستہ پکڑا اور اسے باہر نکالا۔ اس کی انگلیاں اسے پوری طرح گرفت میں لینے کی کوشش کررہی تھیں۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔

ایشلی کی کوشش تھی کہ قاتل کو علم نہ ہو ورنہ وہ نہایت

آسانی سے پستول واپس حاصل کر لیتا۔ مگر فریک دروازہ کھول رہا تھا اور ساتھ ہی وہ ایشلی کی آڑ بھی لے رہا تھا۔ ایک طرف کروزر کی آڑ میں آ گیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ایشلی کو اندر دھکیلنے لگا تھا کہ اس کی نظر ایشلی کے ہاتھ پر گئی اور وہ چونکا۔ اسی لمحے ایشلی نے پستول پر گرفت حاصل کر لی اور نال کا رخ فریک کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دھماکا ہوا اور فریک لڑکھڑا کر پیچھے گیا مگر نال کا رخ نیچے تھا اور گولی فریک کی ران میں اتر گئی تھی۔ اس کے گرتے ہی ایشلی کروزر کے کھلے دروازے سے اندر گھس گئی۔ پستول ابھی تک فریک کے ہاتھ میں تھا اور وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اندر گھستے ہی ایشلی نے کھلے دروازے کو پوری قوت سے لات ماری اور وہ فریک کو لگا۔ وہ دوبارہ گر گیا اور دروازہ ردعمل میں واپس آیا۔ ایشلی نے اسے کھینچ کر اندر سے لاک کر لیا۔ اب وہ دوسری طرف سے نکلنے کی فکر میں تھی۔ اسی لمحے باہر سے گولیاں چلنے لگیں۔

فریک کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجبور اور بے بس ایشلی اسی کے ہتھیار سے اس پر وار کر دے گی۔ زخم کی تکلیف اور غصے نے اسے کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیا تھا اور جب وہ ہمت کر کے اٹھ رہا تھا، کروزر کے دزنی دروازے نے اسے پھر گرا دیا۔ فریک کے منہ سے گالی نکلی اور اس نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ بے شمار ہتھیار اس کی طرف رخ کیے ہوئے ہیں، پستول کا رخ کروزر کی طرف کیا اور گولیاں چلانے لگا۔ اس نے تین گولیاں چلائی تھیں کہ ایک گولی آ کر اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے پولیس والوں نے اسے گھیر کر بے دست و پا کر دیا تھا۔ کروزر کا دروازہ کھولا تو ایشلی سیٹ پر دبکی ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے فریک کی چلائی کوئی گولی اسے نہیں لگی تھی۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ یہ اصل میں ان لوگوں کا ساتھی نہیں بلکہ میامی کا ایک قاتل ہے اور اس نے اس کی سوتی ماں کو بھی قتل کیا تھا۔

☆☆☆

الیگ اور اس کے ساتھی مایوسی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پولیس نے فریک کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا تھا۔ ایک امید تھی اب وہ باقی نہیں رہی تھی اور انہیں اپنے بل بوتے پر یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ تینوں اس طرح باہر کی طرف متوجہ تھے کہ انہیں احساس نہیں ہوا کہ جان اور اس کے ساتھ خوب صورت عورت خاموشی سے وہاں سے کھسک گئے تھے اور وہ مختلف ریکس کی آڑ لیتے ہوئے واش روم کی طرف جا رہے تھے اور جب تک وہ تینوں متوجہ ہوتے وہ واش روم میں داخل ہو چکے تھے۔ ویئن اور پائلٹ ان کے پیچھے بھاگے اور اندر سے بند ہو جانے والے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب دروازہ ان کے دھکوں سے نہیں کھلا تو انہوں نے لاک توڑنے کے لیے فائرنگ کی۔ اس وقت جان خوب صورت عورت کو روشن دان سے باہر دھکیل رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی فرار کی فکر میں تھا مگر عورت اس کے ساتھ لگ گئی اور وہ اسے منع نہیں کر سکا تھا۔

فائرنگ کی آواز سن کر جان کی جان نکل گئی تھی اور عورت چوٹ کی پروا کیے بغیر دوسری طرف سر کے بل گئی تھی۔ جان تیزی سے روشن دان پر چڑھا اور اپنا وزن استعمال کرتے ہوئے دوسری طرف کودا۔ عقب سے فائر ہوا مگر گولی اسے نہیں لگی البتہ سر بچاتے ہوئے اسے ہاتھوں اور کندھے پر چوٹ آئی تھی۔ عقب میں موجود سوات کے جوان دوڑتے آ رہے تھے اور جیسے ہی روشن دان کی طرف سے کوئی نمودار ہوا، ایک رائفل نے برسٹ مارا اور آنے والا غائب ہو گیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے جان اور عورت محفوظ جگہ پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں سامنے کی طرف سے تیز فائرنگ کی آواز آئی اور چند منٹ بعد ڈراپ سین ہو گیا۔ روشن دان سے بھاگنے والا ویئن تھا جو مارا گیا۔ پولیس نے سامنے کی طرف سے ریڈ کیا اور پولیس والوں پر فائرنگ کرتے ہوئے الیگ بھی مارا گیا البتہ پائلٹ زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ تمام یرغمالی محفوظ رہے تھے۔

ایشلی اور جان پولیس سے نمٹ کر کیفے میں بیٹھے تھے۔ تمام یرغمالی فی الحال پولیس کی تحویل میں تھے۔ پولیس ان سے بیان اور ان کے پتے لے رہی تھی۔ جان نے پوچھا۔ ''اب تم کیا کرو گی؟''

''ماں کے پاس جاؤں گی اور اپنا اسٹور سنبھالوں گی۔'' ایشلی نے جواب دیا۔ ''تم کیا کرو گے؟''

جان نے شانے اچکائے۔ ''یہی جو کر رہا ہوں۔''

ایشلی نے اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ ''تب ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہمارا اسٹور موقع کی جگہ ہے لیکن ماں اکیلے اسے پوری طرح سے نہیں چلا پاتیں۔ میں اور تم ہوں گے تو کام ٹھیک سے ہو گا۔''

جان سمجھ رہا تھا، ایشلی اسے اصل میں کیا آفر کر رہی تھی اور وہ راضی ہو گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو ایشلی خوش ہو گئی۔

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبیدہ ارب جگی

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امت مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروف عمل ہیں۔ اس ربّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور میں موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس سے تمام عالم اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صیہونی یلغار کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں... اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

ساتواں حصہ
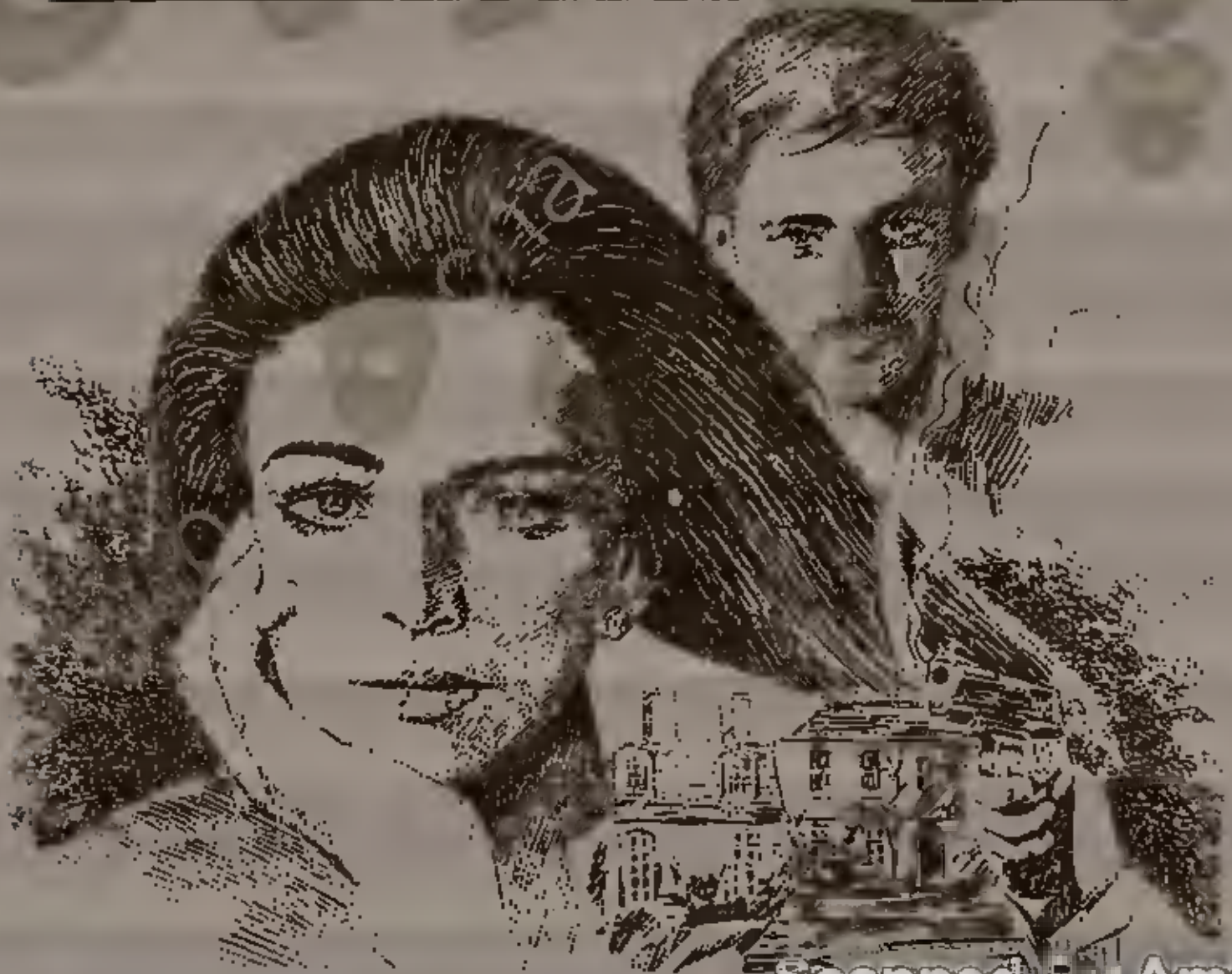
''ہوشیار... !دشمن آرہے ہیں۔''

زبیدہ چلائی۔ اس کی نگاہیں ہنوز بوٹ کی کھڑکی سے باہر دور اور دو نیم قوس کی شکل میں نظر آتے کوانڈر آئی لینڈ کے ساحل پر ہی جمی ہوئی تھیں، جبکہ زبیدہ کا خدشہ بھی عین آخری لمحات میں درست ثابت ہوا تھا۔ دو اسرائیلی اسپیڈ بوٹ تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھی چلی آرہی تھیں۔

ساحل پر موجود اسرائیلیوں کو ان کی بوٹ میں کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا اور یہی کچھ دیکھنے کے لیے دشمنوں نے دو تیز رفتار بوٹ ان کی طرف روانہ کر دی تھیں۔

روجر کو شاید پہلے ہی اس خدشے کی توقع تھی، یہی سبب تھا کہ وہ زبیدہ کی بات پر کچھ خاص دھیان دیے بغیر اپنے کام میں منہمک رہا اور دوسرے ہی لمحے زبیدہ کو ایک جھٹکا سا لگا... ان کی بوٹ نے تیزی سے موڑ کاٹا تھا اور اب اس کا رخ سمندر کی جنوبی سمت میں تھا۔ روجر نے بوٹ کا مکمل کنٹرول سنبھال لیا تھا مگر زبیدہ اس سے مطمئن نظر نہیں آرہی تھی۔ پلٹ کر روجر سے بولی۔

''ہم کس طرف جارہے ہیں؟''

''واپس لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہمارے پاس۔''

''ہم نہ واپس لوٹ سکتے ہیں اور نہ ہی ان تعاقب میں آنے والی دو اسپیڈ بوٹ کے حملوں سے خود کو بچا سکتے ہیں۔'' زبیدہ نے کہا تو روجر قہقہہ مار کے ہنسا۔ شاید موجودہ صورت حال میں اس کا دماغ چل گیا تھا۔ بولا۔

''میں جانتا ہوں، دونوں طرف موت کھڑی ہے لیکن میں اپنی جان اتنی آسانی سے ان مکار اور دھوکے باز یہودیوں کے حوالے نہیں کروں گا۔''

زبیدہ کو اس کے چلاتے ہوئے لہجے میں مایوسی کی اتھاہ گہرائی صاف محسوس ہوئی تھی، بولی۔ ''تمہاری آخری بات سے مجھے بھی اتفاق ہے لیکن جان بھی بچ سکتی ہے اور موقع ملنے پر ہم ان سے انتقام بھی لے سکتے ہیں۔ میں نے بوٹ میں دو عدد آکسیجن سلینڈر پڑے دیکھے ہیں وہ پہن کر ہم سمندر میں چھلانگ لگا کر تہِ آب جا کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں......'' اس کی بات نے روجر کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا بولا۔

''تمہارا بھی کسی ڈان گروپ سے تعلق لگتا ہے، اچھا ہے..... گیٹ ریڈی۔''

اگلے چند سیکنڈوں میں دونوں غوطہ خوری کا لباس پہنے سمندر میں چھلانگ لگا چکے تھے۔

ان کی بوٹ آگے نکل گئی..... اچھلے پانی کی پرہنگم سوجوں سے زبیدہ نے سطح آب سے ذرا سر ابھار کر صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی، جو خاصی امید افزا رہی۔ انہیں کودتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا۔ ابھی تک دشمن بوٹس ان کی بوٹ کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں اور اب تقریباً اس کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ مگر زبیدہ جانتی تھی کہ ایسا زیادہ دیر نہیں چلے گا، اس کا مشن اور تھا، وہ روجر کی طرح یہاں سے واپس پلٹ جانے کے لیے نہیں آئی تھی اور اب تک یہاں ان یہودیوں کے بیچ میں گھس کر انہیں کاری ضرب لگانے کے لیے اس کی پلاننگ ٹھیک جارہی تھی۔ اچانک اس کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔

سمندر میں غوطہ کھاتے ہی اس نے اپنا رخ ساحل کے بجائے جزیرے کی طرف ہی رکھا تھا۔ روجر نے اگرچہ اس کے اس اقدام پر اعتراض کیا تھا، جس کا زبیدہ نے اسے یہی جواب دیا تھا کہ ساحل دور تھا، وہاں تک پہنچنے کا ان کے پاس نہ موقع تھا اور نہ ہی وقت۔ جبکہ وہ جزیرے کے ساحل سے بہت قریب ہو چکے تھے، بے شک وہ ان کے لیے ''ریڈ زون'' کی حیثیت رکھتا تھا تاہم فوری طور پر جان بچانے کی سردست یہی ایک راہ نظر آتی تھی اور پھر یوں بھی زبیدہ کے مشن میں واپسی کا سفر نہ تھا......

یہ دونوں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر ہی اندر تیرتے ہوئے ایک جگہ پھر سطح آب پر ابھرے تو انہیں اپنے عقب میں ذرا دور تھوڑے لیتے سمندر میں دھواں سا اٹھتا دکھائی دیا۔ ان کی بوٹ کو شاید حملہ کر کے اڑا دیا گیا تھا۔ سامنے دیکھنے پر انہیں جزیرے کا ساحل دکھائی دیا، جو زیادہ دور نہیں تھا...... وہاں بہ ظاہر ویرانی کا راج نظر آتا تھا۔ زبیدہ کے ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ جزیرے کے جنوب مشرقی حصے کی طرف تھے...... ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ اسرائیلی بحریہ کی اصل عمارت کہاں تھی؟ جزیرے کے کل رقبے کا بھی اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ یہاں رک گئے۔ روجر بولا۔

''ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے...... یہ کوئی گمنام جزیرہ نہیں ہے...... کہ ہم منہ اٹھائے اندر داخل ہو جائیں۔'' زبیدہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور بولی۔

''ہاں! بہ ظاہر سامنے ویران ساحل نظر آنے والا علاقہ کسی وقت بھی ہمارے لیے اچانک موت کا پیغام لا سکتا ہے......''

''یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے ساحل پر پہنچتے ہی اس

کے بہ ظاہر خاموش اور تاریک دکھائی دینے والے جنگلوں سے ہم پر اندھی فائرنگ کردی جائے۔" زبیدہ بولی۔ انہوں نے اپنے چہروں سے ماسک ہٹائے ہوئے تھے۔ انہی خطرات سے بچنے کے لیے ہی زبیدہ نے ذوان کے ان دونوں گماشتوں کو استعمال کرنا چاہا تھا مگر اب یہ بھی ناکامی سے دوچار ہوچکا تھا۔ تب اسے یاد آیا اور اس نے پوچھا کہ آخر ہوا کیا تھا؟

"ان رذیل دھوکے بازوں نے ایک طرف تو پاس سے ایک بڑی ڈیلنگ کی تھی اور دوسری طرف ہم سے کامیاب مذاکرات کی آڑ میں ہماری ہی جڑیں کاٹنے لگے..." وہ بتا رہا... زبیدہ بہ غور اس کی باتیں سن رہی تھی......

دونوں سطح آب پر بس اسی قدر ہی ابھرے ہوئے تھے کہ فقط ان کی ناک اور منہ ہی باہر تھے۔

"ان دھوکے باز اسرائیلی یہودیوں نے خفیہ آپریشن کر کے باس چیک ڈوکر کو قتل کروادیا اور ہمارے بیشتر آدمیوں کو بھی بڑی بے دردی سے ہلاک کرڈالا...... ہمارے ایک ساتھی کو فقط ایس ایم ایس کرنے کا ہی موقع مل سکا لیکن بدقسمتی سے ہم اس وقت ان کی دسترس میں آچکے تھے۔" قدرے توقف کے بعد اس نے زبیدہ سے پوچھا۔

"تمہارا کس مافیائی گروپ سے تعلق ہے؟"

ٹھیک اسی وقت زبیدہ چونکی۔ گفتگو کے دوران اس کی نگاہیں سامنے ساحل پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ اسے وہاں کوئی شے متحرک نظر آئی تھی۔ ادھر جواب نہ ملنے پر روجر نے زبیدہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر وہاں چونکنے کے تاثرات بھانپ کر بے اختیار اس کی نظریں بھی سامنے ساحل کی طرف اٹھتی چلی گئیں۔ وہاں انہیں دو گاڑیاں رکتی ہوئی دکھائی دی تھیں......

"نیچے ہوجاؤ......" زبیدہ نے سرسراتی آواز میں کہا اور ماسک فوراً چہرے پر کھسکا کر دو پانی کے اندر چلی گئی۔

غوطہ خوری کے لباس میں فلیپر بھی شامل تھے، ان کی مدد سے یہ دونوں تیرتے ہوئے ذرا اور آگے بڑھے۔ پانی کے اندر یہ ایک دوسرے سے اشاروں میں ہی بات کرسکتے تھے۔ روجر اس وقت زبیدہ کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ کبھی کبھار اسے زبیدہ کی کسی بات سے اختلاف بھی ہوجاتا تھا... مگر اس کی ایک یہ خوبی بھی تھی کہ زبیدہ کے سمجھانے پر وہ بات اس کی سمجھ میں آجاتی تھی۔

یہ دونوں ساحل سے کچھ اور نزدیک ہو کر پانی کے اندر ہی ٹھہر گئے...... زبیدہ نے روجر کو اشارے سے رکنے اور ابھی پانی کے اندر ہی رہنے کا کہا اور خود پانی سے ذرا سا سر ابھار کر ایک بار پھر ساحل کی طرف دیکھا۔

دونوں گاڑیاں رک چکی تھیں۔ گاڑیوں سے تقریباً آٹھ، دس مسلح افراد نیچے اتر کر ساحل پر پھیل چکے تھے۔ اور ان میں سے بیشتر اپنی آنکھوں سے دوربین لگائے سمندر کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید انہیں کسی قسم کا شک ہوگیا تھا... یا پھر یہ معمول کی چیکنگ تھی...... بس ایک لمحے کے لیے زبیدہ نے یہ سب دیکھا، اس کے بعد وہ اندر ہوگئی تھی۔ اس نے اشارے سے روجر کو بتایا کہ ساحل پر نگرانی ہو رہی ہے۔ اسی دوران میں زبیدہ ذرا ٹھٹکی۔ روجر نے عجیب عجیب اشارے کرنے لگا۔ وہ پریشان سی ہوگئی لیکن جب اس کی بات سمجھی تو بے حد تشویش زدہ ہوگئی۔ روجر اشارے سے اسے بتا رہا تھا کہ اس کے ٹینک میں آکسیجن ختم ہو رہی ہے اور اسے سانس لینے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اب ایک تو کسی وقت بھی زبیدہ کا آکسیجن ٹینک بھی ختم ہونے والا تھا۔ دوسرے یہ کہ سانس لینے کے لیے اب ان کا سطح آب سے سر ابھارنا لازمی تھا.. پھر اچانک روجر کی حالت غیر ہونے لگی۔ ماسک کے اندر سے زبیدہ کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ روجر نے گھبرا کر اپنے چہرے سے ماسک ہٹا دیا اور ایک گہرا اور طویل سانس لینے کے لیے اس نے اپنا پورا سر ہی باہر نکال دیا۔

ٹھیک اسی وقت زبیدہ کو ہلکے پھلکے شور کے ساتھ سطح کے اوپر برسٹ چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سطح آب سے ذرا ہی نیچے تھی، اسی لیے فائرنگ کی آواز سن پائی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اردگرد کا پانی رنگین ہوتے دیکھا۔ یہ بدنصیب روجر کا خون تھا۔ زبیدہ یک دم ایک غوطہ مار کے گہرائی میں چلی گئی مگر دوسرے ہی لمحے اسے آکسیجن کی کمی کا احساس ہونے لگا، اپنا اس کے ٹینک میں بتدریج ختم ہونے والی آکسیجن کی وجہ سے تھا۔ وہ متوحش سی ہوگئی، اگرچہ "حبس دم" کی مشق اس نے کر رکھی تھی، لیکن یہ آخر کتنی دیر کام آسکتی تھی؟ اسے بہت جلد سانس لینے کے لیے سطح آب پر ابھرنا پڑتا، جس کا مطلب تھا اس کا حشر بھی روجر جیسا ہوتا......

وہ پیروں میں بندھے فلیپرز کی مدد سے تھوڑا اور آگے بڑھی، پھر ایک جگہ ٹھہر گئی۔

کئی منٹ اسی طرح بیت گئے...... اس نے اندازے سے اپنا رخ بدلا اور ذرا گہرائی میں تیرتی ہوئی اپنی موجودہ پوزیشن بدل لی...... اور پھر اسی وقت اس کا دم

وین کے پچھلے حصے میں مختصر سامان رکھا گیا تھا اور کچھ چھت پر بھی باندھا گیا تھا۔ اس کے بعد تین رو سیٹیں شروع ہوتی تھیں۔ آخری سیٹ پر حاجرہ، کلثوم اور حبیبہ موجود تھیں۔ درمیانی سیٹ پر دو ملازموں کے ساتھ جمشید حمادی براجمان تھے اور اس سے آگے والی سیٹ پر احمد حمادی، ڈاکٹر کمال اور حمزہ بیٹھے تھے۔ وین کی ایک ہیڈ لائٹ کام نہیں کر رہی تھی، دوسری سے کام چلایا جا رہا تھا۔

تاریک صحرا کے کھلے آسمان پر ستارے چمکتی جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ خنکی بڑھ گئی تھی اور سردی سی محسوس ہوتی تھی۔ وین کے شیشے بند تھے۔ ریت پر بنے بل کھاتے راستے پر وین مناسب رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ یہ راستہ ناہموار تھا اور موٹروے سے ہٹ کر تھا۔ جبکہ موٹروے ان کے دائیں جانب تقریباً پندرہ بیس میل کے فاصلے پر تھی اور اس طرف تھوڑے تھوڑے وقفے سے شعلے فضا میں پرواز کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں یقینی طور پر آتش و آہن کا کھیل جاری تھا۔ کبھی کبھار دھماکوں کی گونج یہاں تک بھی سنائی دے جاتی تو یہ سب بری طرح دہل جاتے ... اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے جمشید حمادی نے ڈرائیور کو اس صحرائی پگڈنڈی نما راستے سے بھی ہٹ کر سفر کرنے کا حکم دیا تو وہ مؤدبانہ بولا۔

''جناب! اس راستے سے ہٹ گئے تو صحرا میں راستہ بھٹک جائیں گے، جبکہ ایسے میں ہمارے پاس فیول کی بھی کمی ہے۔'' ڈرائیور طلال کی بات نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

آسمان پر بھی جنگی طیاروں کی گرج دار پروازیں جاری تھیں۔ شب و جوار میں غضب کا رن پڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ریڈیو سے نشر ہونے والی خبروں کے مطابق، اگرچہ امریکی اور اس کی ہمنوا اتحادی قوتوں نے عراق پر بھرپور حملہ کیا تھا مگر عراق پر صرف امریکی فوجیوں نے ہی اپنا تسلط قائم کیا تھا۔ اور ایک عرب نیوز کاسٹر اور تجزیہ نگار کے مطابق، امریکی فوجی بہت پہلے ہی ''غداروں'' کے ذریعے سی آئی اے کے ایجنٹوں کی صورت میں بغداد وغیرہ پر اپنا تسلط جما چکے تھے اور جن غداروں نے اپنا منہ کالا کیا تھا، انہیں حملے سے چند روز پہلے ہی ان کے بیوی بچوں سمیت خفیہ طور پر ایک امریکی طیارے C-130 کے ذریعے عراق سے نکال دیا گیا تھا اور ... ان کی ''باقیات'' کو اقتدار سونپ کر خود امریکیوں نے عراق کی اہم تنصیبات پر قبضہ جما لیا تھا۔ اس دوران چوروں، لٹیروں اور غنڈوں نے لوٹ مار اور عصمت دری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں جب کوئی عراقی امریکیوں سے مدد طلب کرتا تو یہ انہیں ٹکا سا جواب دے دیتے اگر کوئی کارروائی کرتے بھی تو صرف مزاحمت کاروں کے خلاف۔

ان امریکی فوجیوں کو سختی کے ساتھ پہلے ہی یہ ہدایات کر دی گئی تھیں کہ وہ لاء اینڈ آرڈر کے معاملات میں بالکل شامل نہ ہوں اور شہر میں جو غنڈے اور لٹیرے لوٹ مار کا بازار گرم کر رہے ہیں، انہیں ان سے نہ روکیں۔ اسی طرح امریکن مزید خوف و ہراس پیدا کرنے کے بعد اپنی اہمیت جتانے کے لیے اپنی اگلی کارروائی کریں ...

وین کے ریڈیو میں چلنے والی ان لرزا دینے والی خبروں نے انہیں اور زیادہ خوف اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا ... تاہم انہی خبروں میں ایک حوصلہ افزا خبر بھی تھی۔ تکریت اور موصل میں مزاحمت کاروں کی تحریک مزاحمت منظم ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ان کی وین بعقوبہ کی حدود کو کراس کر رہی تھی۔ ڈرائیور طلال نے ایک دو میل بعد وین کو موٹروے کی طرف موڑ دیا ..... یہاں کافی ٹریفک تھا اور راستہ جام تھا۔ وجہ ظاہر تھی، بغداد کی طرح بعقوبہ کے لوگ محفوظ مقامات کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔

ایک جگہ ان کی وین رک گئی۔ نیچے اتر کر صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ معلوم ہوا آگے پیٹرول پمپ تھا اور رش کے باعث راستہ جام تھا۔ گاڑیاں پیٹرول بھروانے کے لیے قطاروں میں کھڑی تھیں ..... صرف حمزہ اور ڈاکٹر کمال ہی ڈرائیور طلال کے ساتھ وین سے اترے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی گاڑیوں سے نیچے اترے ہوئے تھے اور آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ سب کے چہروں سے بے چینی، پریشانی اور ہراس ٹپک رہا تھا۔ یہاں کچھ امریکیوں کی گاڑیاں بھی نظر آئی تھیں جو نظم و ضبط کے لیے چلا چلا کر لوگوں کو قطار میں گاڑیاں کھڑی کرنے اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کرنے کی ہدایتیں کرنے میں مصروف تھے۔ حمزہ اور ڈاکٹر کمال کی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کریں، کیا نہ کریں؟ اگر باری کا انتظار کیا جاتا تو کئی گھنٹے بیت جاتے اور صورت حال مزید بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ طلال اس سلسلے میں ہوشیار اور چلتا پرزہ ثابت ہوا۔ اس نے جانے کس سے بات کی تھی۔ وہ واپس آ کر خاصی عجلت میں ان دونوں سے بولا۔ ''جلدی وین میں سوار ہو جائیے جناب! کام ہو گیا ہے۔''

حمزہ اور کمال حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ پتا نہیں

طلال نے کیا چکر چلایا تھا۔ بہر طور یہ لوگ دوبارہ وین میں سوار ہوئے اور بڑی مشکلوں سے جگہ بنا کر اس نے وین کا رخ موڑا اور بائیں جانب موڑ دے پر دوبارہ نشیب میں اتار دیا اور آگے دوڑا دی، دیکھنے والے یہی سمجھ رہے تھے کہ انہیں پیٹرول کی ضرورت نہیں... اور وہ آگے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

تھوڑی دور جانے کے بعد ہی طلال نے وین دوبارہ نشیب میں اتاری اور ایک بار پھر تاریک صحرا کا رخ کیا۔

کافی آگے جا کر طلال نے بتایا کہ قریب ہی ایک سرحدی گاؤں کے ڈیرے پر چوری کا پیٹرول مہنگے داموں فروخت ہو رہا ہے۔ وہاں زیادہ رش بھی نہیں ہے، پیٹرول بھرواتے ہی آگے نکل جائیں گے۔ اس کی بات پر سب نے اطمینان کا اظہار کیا اور اس کی ہوشیاری کی تعریف بھی کی۔ البتہ جمشید حمادی نے ایک حسرت زدہ آہ خارج کر کے ایک عبرت اثر بات ایسی کہہ ڈالی کہ ان کے دل رنجور سے ہو گئے۔

"آہ... یہ وقت بھی دیکھنا تھا کہ دنیا میں دوسرے نمبر پر پیٹرول پیدا کرنے والے ملک کے لوگ اپنے ہی ملک کے چور بازاروں سے پیٹرول خریدنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں، یہ مقام عبرت ہے....."

رات کے آخری پہر میں صحرا کے بیچوں بیچ سفر کرتے ہوئے یہ لوگ مذکورہ سرحدی گاؤں کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ یہاں واقعی گاڑیوں کا رش کم تھا، یا تو بہت کم لوگوں کے علم میں یہ مقام تھا یا پھر مجبوری کے باعث صرف وہی لوگ ہی یہاں سے نسبتاً مہنگے داموں پیٹرول کی خریداری کر رہے تھے جو زرا دولت مند تھے اور جنہیں نکلنے کی بھی عجلت تھی۔

یہاں بھی انہیں امریکیوں کا ہی تسلط نظر آیا...... مقامی لوگ بھی تھے۔ وین سے اترنے کے بعد انہیں ایک اور تلخ حقیقت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ تھکا دینے والے سفر کے بعد ذرا کمر سیدھی کرنے کی غرض سے سبھی لوگ وین سے نیچے اتر آئے تھے۔

یہاں پہنچ کر انہیں جس نئی تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تھا، اسے سب سے پہلے حماد نے محسوس کیا تھا اور سخت تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ان تینوں کا الگ ٹولہ بنا ہوا تھا۔ یہی سبب تھا کہ سب سے پہلے ڈاکٹر کمال نے حماد کے چہرے کے بدلتے تاثرات بھانپ لیے تھے، یہ تینوں اس پمپ کے اس حصے کے قریب موجود تھے، جدھر ایک بی ایم ڈبلیو کار میں پیٹرول بھرا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے کی دو گاڑیوں کے بعد ان کی وین کا نمبر آتا تھا، وہاں کچھ مسلح افراد کے علاوہ چند دوسرے لوگ بھی موجود تھے، ڈیرے پر صرف ایک ہی پیٹرول بھرنے والا "ڈسپینسنگ یونٹ" نصب تھا، پتا نہیں ان کے میٹر کی ریڈنگ ٹھیک بھی تھی یا نہیں لیکن کام "چلاؤ" تھا۔ ایک چھوٹا سا چھپر نما ٹین کا شیڈ بنا ہوا تھا اور اس پر دو بڑے بلب روشن تھے، ساتھ ہی چھوٹا سا آفس نما کمرہ تھا، اندر ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی، شیشے کی دیوار سے اندر بیٹھے تین افراد نظر آتے تھے، ان میں سے ایک گٹھے قد مگر مضبوط تن و توش کا آدمی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ اس کا سر انڈے کی طرح گنجا اور رنگ کالا تھا جبکہ اسی شخص کو دیکھ کر حماد اندر ہی ایک نامعلوم سی تشویش میں مبتلا ہوا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ اسے پہچان رہا تھا، چہرے مہرے سے بھی وہ اچھے نقش کا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک ساتھی بھی تھا... اس گنجے سر والے آدمی نے ایک اچٹتی سی نگاہ ان کے چہرے پہ ڈالی اور پھر اپنے ساتھی کے ساتھ ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس سے باتیں کرنے لگا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے کسی قسم کی ہدایت دے رہا ہو۔

"کیا بات ہے حماد! تم اس آدمی کو شاید پہچان رہے ہو؟" کمال نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"ہاں! بہت اچھی طرح... اس بدبخت کو کون نہیں پہچانتا....." وہ بدستور اسی آدمی کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ انداز دانت پیس کر رہ گئے جیسا تھا۔

"کون ہے یہ؟ تم اسے دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو رہے ہو؟ جبکہ اس کے انداز سے تو یہی لگ رہا ہے کہ وہ تمہیں نہیں پہچان رہا۔" کمال نے کہا۔ نینی بھی ساتھ ہی کھڑی تھی۔

"یہ جنرل واصدی کا چھوٹا بھائی ابن قیصی ہے.... ری پبلکن گارڈز میں شامل ایک غدار جنرل کا بھائی۔" اس نے گھمبیر انداز میں بتایا..... اور آگے بولا۔ "شکر ہے کہ یہ موذی ہمیں نہیں پہچان رہا ورنہ....." وہ کچھ سوچ کر ٹھہرا، پھر جلدی سے وہ اپنے ان دونوں دوستوں کو لیے وہاں سے ہٹ گیا۔ ہٹتے وقت [illegible] کہ گنجے سر والے ابن قیصی نے ان کی طرف نہ صرف اپنی گردن موڑ کے دیکھا تھا بلکہ اپنے ساتھ کھڑے ساتھی سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا بھی تھا.......

جمشید حمادی اور احمد وغیرہ سب ابھی وین کے قریب کھڑے تھے۔ یہ تینوں ان کے قریب پہنچے تو حماد نے جمشید حمادی سے کہا۔

''میرا ساتھی صرف میرا اللہ ہے اور اسی نے مجھے آگوسٹا کی تباہی کا مشن سونپا تھا ورنہ ہماری منزل کوئی اور تھی۔''

ایک لحاظ سے عابد کا یہ کہنا غلط بھی تو نہ تھا، وہ اور ناعمہ تو اپنی جان بچا کر جدہ کی بندرگاہ سے فرار ہو کر قبرص کی طرف گامزن تھے مگر ایک حادثے نے ان دونوں کو اسرائیلی آبدوز تک پہنچا دیا تو عابد اور ناعمہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر لبیک کہتے ہوئے، اسرائیل کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کرنے کا پختہ عزم کر بیٹھے تھے اور اس ''حادثاتی مشن'' میں کافی حد تک کامیاب بھی رہے تھے۔

کمرے میں ایک زوردار تڑاخے کی آواز گونجی تھی اور ساتھ ہی اسرائیلی ایڈمرل، اروت نیبو کی پھنکارتی ہوئی پُرغیظ آواز بھی ابھری۔

''اب اگر تم نے بغیر وقت ضائع کیے میرے سوال کا صحیح جواب نہیں دیا تو میں تمہیں اسی وقت شوٹ کردوں گا......'' یہ کہتے ہوئے اس خرانٹ یہودی افسر نے اپنے قریب کھڑے ایک اہلکار کی گن اچک لی اور اس کی نال عابد کے چہرے کی طرف کردی۔

عابد کے چہرے سے ذرہ بھر خوف کا ذرا شائبہ تک نہیں ابھرا تھا، اس کی جگہ ایک ازلی فدویانہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ رقص کناں تھی اور چہرہ پرسکون تھا...... وہ اسی طرح نیبو کی شعلہ برساتی آنکھوں کو گھورتا رہا اور بولا۔

''یہودی کتے! موت سے صرف تم جیسے بزدل اور ظالم لوگ ہی ڈرا کرتے ہیں، جاں فروش مجاہد نہیں، جنہوں نے تم جیسے غاصبوں کو ارضِ فلسطین سے نکال پھینکنے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے ایک لمحے کے لیے عابد کو خود پر بھی حیرت ہوئی تھی۔ ورنہ اس کا طریقۂ کار دیگر فلسطینی مجاہدوں سے ذرا ہٹ کر ہی ہوتا تھا۔ وہ کبھی اس طرح دوبدو دشمن کو للکارا نہیں کرتا تھا اور آخری حد تک اپنی جان بچانے کی حکمتِ عملی پر کاربند رہتا تھا اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ زندہ رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اپنے مظلوم فلسطینی مسلم بھائیوں کی مدد کر سکے مگر آج جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ وہ خود بھی اب ناعمہ کی زندگی سے مایوس سا ہو چلا تھا کہ اگر وہ جامِ شہادت نوش کر چکی تھی تو پھر وہ کیوں پیچھے رہتا......؟

اس کی للکار پر ایڈمرل اروت نیبو کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر پر لرزنے لگی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی خوں خوار غراہٹ برآمد ہوئی اور... اس نے اپنے بدہیئت ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنی رائفل کا عقبی کندا عابد کے چہرے پر رسید کردیا۔ عابد کے حلق سے کراہ آمیز چیخ بلند ہوئی اور وہ پیچھے کی جانب الٹ کر فرش بوس ہو گیا۔ اس کے بائیں جبڑے کی ہڈی شاید ٹوٹ گئی تھی۔ گال بھی پھٹ گیا تھا اور ہونٹ سے خاصا بڑا چیرا بھی لگ گیا تھا جس سے، بلکہ وہاں سے اب بُلبُل خون بھی بہنے لگا تھا۔ عابد شہری منہ کے بل زمین پر گرا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ جبڑے کی ہولناک اذیت کے مارے وہ کراہنے لگا۔

ایڈمرل نیبو کا طیش کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے بھاری بوٹ کی ٹھوکر رسید کر کے عابد کا اوندھا پڑا وجود سیدھا کردیا۔ پھر اس کی گردن پر بوٹ رکھ کے اس پر قدرے جھک کر خوں خوار لہجے میں بولا۔ ''تمہارا جرم اتنا سنگین تر ہے کہ مجھے تمہارے لیے موت کی سزا بھی کم محسوس ہوتی ہے۔ میں تمہاری زندگی کو موت سے بدتر کردوں گا کہ تم مجھ سے گڑگڑا کر موت کی بھیک مانگتے رہو گے۔''

عابد تکلیف کی شدت سہنے کے دوران بمشکل بولا۔ ''تم...... لوگ...... جہنمی کتو! بہت جلد اپنے انجام کو پہنچنے والے ہو۔''

اسی وقت عابد پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایڈمرل نیبو نے اسے اپنے بھاری بوٹوں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس پر شدید جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کمرا عابد کی دردانگیز چیخوں سے گونج رہا تھا ...

☆☆☆
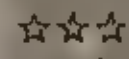
آگوسٹا 291 کے کپتان پریمانن نے اپنے جس ناپاک عزم کا اظہار کیا تھا، اس پر اگرچہ اس کے ساتھی کچھ پُرامید تو تھے اور اپنے کپتان کی بڑھک پر خوش ہو کر انہوں نے نعرے بھی بلند کر ڈالے تھے لیکن یہ سب کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ اول تو کنٹرول روم میں داخل ہونا ہی کارِ محال تھا۔ وہاں خطرناک نیوروٹیس کا رساؤ عمل پذیر ہو چکا تھا جو بھی اس کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ گھوڑے کے منہ جیسے تھوتھڑے والے ربڑ ماسک (کیمیکل گیس ماسک) پہن کر اس سے بچ تو جا سکتا تھا لیکن پیچیدہ قسم کے ماسک پہن کر ایک اینٹی ایئر میزائل کی باریکیوں کو جانچنا اور پھر مطلوبہ ٹارگٹ پر فائر کرنا آسان بھی نہ تھا، جو پہلے ہی جنگ میں پھنسنے کے

قریب تھا۔

اس کا اندازہ کپتان پریمانن کو بھی تھا لیکن اس پر اس بیش قیمت اسرائیلی ایٹمی آبدوز کو بچانے کا جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ وہ کسی صورت میں بھی اس آبدوز کو تباہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے اپنے ملک و قوم کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی خاطر ایک پاگل جنونی کپتان نے اپنے ایٹمی ٹیکنالوجی کے ٹاپ پروفیشنل عملے کی زندگیوں کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔

پریمانن نے اپنی کی سب سے پہلی کوشش میں آبدوز کے ہائیڈرولوجی سسٹم کو کارآمد بنانا چاہا تھا تاکہ وہ باہر کی دنیا سے رابطہ کر کے مدد تو حاصل کر سکے، کیونکہ "یونیٹ اسکیم" کے سلسلے کی ایک دوسری آبدوز K-9 بھی ان کے تقریباً شانہ بشانہ ہی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

تاہم ان سب باتوں کے باوجود آبدوز کو تباہی سے بچانے کی جس آخری کوشش کا کپتان سہارا لینا چاہ رہا تھا اگر اسے قلیل ترین وقت میں انجام دے دیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ کپتان پریمانن اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتا اور وہ تھا متبادل نظام، کیونکہ خوش قسمتی سے آبدوز میں یہ نظام موجود تھا۔ کپتان پریمانن نے اس سے کام لینے کا حکم جاری کیا۔ لہٰذا اس نے عملے کے دو آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ ری ایکٹر کو بند کرنے کا متبادل نظام حرکت میں لے آئیں۔ اس نظام کے ذریعے "ایمرجنسی ری ایکشن" کا عمل روکا جا سکتا تھا۔ جبکہ اس نظام کی قباحت صرف یہ تھی کہ اسے کسی سوئچ، بٹن یا خودکار آلے کے بجائے ہاتھ سے حرکت دی جا سکتی تھی۔ ایک آدمی ری ایکٹر کے اوپر جا کر ہاتھ سے ایک خصوصی آلے کے ذریعے اسکریو ڈھیلے کرتا۔

اس کام کے لیے کپتان پریمانن خود بھی تیار تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ کام ناممکن حد تک مشکل تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی اس جگہ بھی زہریلی گیس پھیل چکی تھی اور ری ایکٹر تک جانے کے لیے اسے آکسیجن ساتھ لے جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھی چھ سلنڈر لے آئے۔ ان میں سے ہر ایک پندرہ منٹ تک کام دے سکتا تھا۔

ایٹمی ری ایکٹر بند کیے بغیر سیل نمبر تھری کا میزائل فائر کرنا خطرناک ہوتا... کیونکہ فائر کے دوران ہی اس کے وارہیڈ کی تیج ہوتے ہی اس کی ایٹمی تابکاری سے یہ لوگ بھی زندہ نہیں بچ پاتے۔ یہ کام انجام دینے کے بعد ہی انہوں نے سیل تھری جا کر میزائل فائر کرنا تھا۔

ادھر دروازے کے پیچھے دبکی چھپی کھڑی نائمہ ان کی ایک ایک منصوبہ بندی سے واقفیت حاصل کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ چاہے اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے وہ کسی صورت میں بھی اس یہودی کپتان پریمانن کو یہ میزائل لیبیا کی بندرگاہ بن غازی پر داغنے کا موقع نہیں دے گی۔ چنانچہ جب یہ لوگ اپنے ناپاک منصوبے کی تیاری کرنے لگے تو نائمہ نے پل کے پل ایک حکمت عملی تیار کی، ابھی ان کا راستہ روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اصل عمل کمپارٹمنٹ نمبر 7 کے بجائے سیل نمبر تھری میں کھیلا جانا تھا، اس لیے وہ وہاں سے ہٹ کر سیل نمبر تھری کے کسی ترچھے گوشے میں گھات لگا کر بیٹھ گئی ...اور مقررہ وقت کا انتظار کرنے لگی۔ یہ تینوں کاندھے پر لادے ماسک چڑھائے اور ری ایکٹر کی طرف چل دیے۔

مخصوص والٹ کا دروازہ کھول کر جب یہ تینوں اندر داخل ہوئے تو انہیں اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز... سنائی محسوس ہوئی کہ یہ آواز معمول کی آواز نہ تھی۔ ان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جیسے اب یہ دروازہ کبھی نہیں کھلے گا۔ انہیں یہ سوچ کر بے اختیار جھرجھری سی آ گئی تھی مگر یہ اسے اپنا وہم خیال کر کے آگے بڑھ گئے۔

آبدوز کے دونوں ایٹمی ری ایکٹر کمپارٹمنٹ نمبر 7 کے نیچے واقع تھے۔ اس کمپارٹمنٹ میں سمندر کا بھورا پانی فرش پر پھیل چکا تھا۔ وہ تینوں اس تنگ سے راستے کی طرف بڑھے جو ری ایکٹر کی طرف جاتا تھا۔ اس راستے کے منہ پر ایک دائرہ نما دروازہ دکھتا تھا۔ بوتل کے ڈھکن کی طرح اس کے درمیان شیشہ لگا ہوا تھا، جس سے ری ایکٹر نظر آتا تھا۔ اس دروازے سے باہر درجہ حرارت چالیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔

پریمانن نے دروازہ کھولا تو گرمی کا ایک "بھبکا" ابھرا۔ جس کی حدت سے یہ تینوں ہی سمٹ گئے۔ دو انجینئر جو اس کے ہمراہ تھے، وہ محض اپنے کپتان کی وجہ سے ہی یہاں تک آنے کی ہمت کر پائے تھے ورنہ انہیں بہتری کی امید کم ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ وہ پریمانن کی اہلیت اور سابقہ کارناموں کے بھی معترف تھے۔

بہرطور وہ مزید ہمت کر کے ڈھکن نما دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اب وہ ایٹمی ری ایکٹر کے سامنے کھڑے تھے یہاں بے پناہ گرمی تھی، وہ ری ایکٹر کی طرف بڑھے، جس کے باہر چھ کونوں والے ساکٹ نظر آ رہے تھے۔ پریمانن نے اپنے دونوں انجینئر ساتھیوں کو نٹ کھولنے کا اشارہ کیا، وہ مخصوص آلوں کی مدد سے نٹ گھومتے

چیف میجر بارق شمعون نے حال ہی میں ایک ہنگامی میٹنگ بلائی تھی اور اس میں خصوصی طور پر ہنگامی سپر یمبر ز یڈنز کمانڈوز کے گروپ ''سات منکال'' نامی یونٹ کو بھی شامل کیا تھا۔

یاد رہے کہ یہ ''سات منکال''۔ وہی خطرناک تربیت یافتہ اسرائیلی کمانڈوز کا یونٹ تھا جس نے کچھ عرصہ قبل ہی تیونس آپریشن میں دو اہم فلسطینی مجاہدوں کو ایک مربوط اور منظم منصوبے کے ساتھ شہید کروایا تھا۔ یہ سات منکال درحقیقت ہگانہ کے سربراہ آرزر مین ہیری کی خصوصی اور ذاتی فورس تھی اور اس یونٹ کی تاریخ اتنی ہی قدیم تھی جتنی کہ آرزر مین ہیری جونیئر کے ہم نام دادا (آرزر مین ہیری) کی خود اپنی تھی اور اب اس یونٹ کو خود آرزر مین جونیئر ہی کنٹرول کرتا تھا۔

جس وقت محسن تل کرم پہنچا تو وہاں یاسر العربی کے خفیہ ٹھکانے پر۔۔۔ اسی سے متعلق ایک اہم میٹنگ جاری تھی اور وہ بھی اس میں شامل ہو گیا تھا مخبروں کے ذریعے انہیں ان سب باتوں کی اطلاع صبح ہی سے ان تک بھی پہنچ چکی تھی اور اب .... محسن واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اس سلسلے میں وہاں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔

''آپ سب لوگ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ سات منکال وہ قاتل اور سفاک اسرائیلی ایجنٹوں کا ٹولہ ہے جس نے ہمیں ناقابل تلافی نقصانات سے دوچار کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہم اپنے دو اہم ترین سربراہ مجاہدوں (ابو جہاد خلیل الوزیر) سے اس وقت محروم کر دیے گئے تھے جب موجودہ حالات میں ہمیں اپنے ان دو اہم کمانڈرز کی اشد ضرورت تھی۔''

خفیہ ٹھکانے کے ایک تہ خانے میں ''غضب خدا'' کے قائم مقام سربراہ یاسر العربی کی جوش بھری آواز گونج رہی تھی اور سب خاموشی سے سن رہے تھے۔

''ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری اسرائیلیوں کے خلاف تحریک مزاحمت اور تحریک آزادی زور پکڑ رہی ہے، سات منکال جیسے یونٹ کا حرکت میں آنا باعث تشویش ہے۔''

حاضرین میں سے ایک ساتھی نے مختصر انداز کا ایک نکتہ اٹھایا بولا۔

''محترم! کیا ہمیں اب سات منکال سے خوف زدہ رہنا پڑے گا؟''

محسن سمیت وہاں موجود دیگر ساتھیوں کا خیال تھا کہ اس شخص کے جملے پر ضرور یاسر العربی بھڑک اٹھیں گے لیکن ہوا اس کے برعکس اور حیران کن بھی۔ جب ان لوگوں نے انہیں ایک لمحے بھر کی دم بخود خاموشی کے بعد نہایت ٹھنڈے لہجے میں یہ کہتے سنا۔

''ہاں! ہمیں اس سات منکال یونٹ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت ہے .... مگر اس لیے نہیں کہ ہم اس کا مقابلہ کرنے سے کترائیں، ہرگز نہیں، یہ خوف بزدلانہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ حقیقت پسندانہ ہونا چاہیے اور احتیاط کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے اس کا مقابلہ کریں۔'' اپنی بات کی وضاحت میں انہوں نے آگے کہا۔

''شہید ابو جہاد اور خلیل الوزیر کی سات منکال کے ہاتھوں قتل کی اہم وجہ یہی تھی کہ ان محترمین نے سات منکال کو بہت ''آسان'' لیا تھا۔ حالانکہ پی ایل او کی جانب سے انہیں یہودیوں کے ان مذموم مشن سے آگاہ بھی کیا گیا تھا مگر .... آپ سمجھ گئے ہوں گے میری بات؟''

سب نے ان کی باتوں پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر اثبات میں ہلائے تھے۔

''اب میٹنگ کے دوسرے ایجنڈے کی طرف آتے ہیں۔'' لمحہ بھر کے لیے متوقف ہونے کے بعد وہ پہلے محسن کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئے۔

''ہم عزیزم محسن کو یہاں خوش آمدید کہتے ہیں .....''

اس پر محسن نے اپنے سر کو احتراماً اثباتی جنبش دی تھی۔ یاسر العربی آگے بولے۔ ''اس وقت اسرائیل سے آکٹوپس کی طرح جو فتنے چمٹے ہوئے ہیں، اس کی اصل وجہ .... ہگانہ آرمی کا چیف معون آرزر مین ہیری جونیئر ہے، جو یہ بھی اپنے ہم نام دادا کے نقش قدم پر چل رہا ہے ..... اس مردود یہودی کی محل نما رہائش گاہ ۔ یروشلم کے جنوب میں، نیودوم کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ''وائٹ کیسل'' میں ہے جہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا ..... یہ قابل نفرین شخص اپنی ''ہگانہ آرمی'' کی صورت، اپنے باپ دادا کے وقت سے یہودیوں اور اسرائیل کے لیے ''ایک بون'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ وائے افسوس کہ اب تک ہمارا دھیان اس کی طرف نہیں جا سکا ..... اور یہ تب تک کسی ہشت پا کی طرح دنیائے اسلام کے خلاف اپنی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر کرتا چلا گیا ..... شن بیتھ، الیا ہیتھ اور سات منکال اس کی واضح مثالیں ہیں .... اگرچہ اپنی چند روز کی پچھلی آل فلسطینی گروپس کی بین الاسربراہی میٹنگ میں پہلے بھی اس بات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اس آکٹوپس کی مکڑی کے جال کی طرح پھیلی ہوئی فول سازشوں کا مقابلہ

کرنے کے لیے ہم سب کو بیک وقت حرکت میں آنا پڑے گا اور اس سلسلے میں، میں قدم اٹھا چکا ہوں لیکن آخر میں ہیری جیسے فتنے کو ختم کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہ ہوگا، اس کے علاوہ، ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ... ہماری مدد میں ہمارے کچھ اور مسلم بھائی بھی اپنے اپنے طور پر ہمارے ساتھ اس کاز میں شامل ہیں۔ ہمیں ان سے متعلق بھی رپورٹیں ملتی رہتی ہیں۔

"بہر طور... آج مجھے فوری طور پر دوبارہ ہنگامی میٹنگ اسی لیے کرنا پڑی کہ میں آپ کو یہودیوں اور اسرائیل کی نئی سازش سے آگاہ کرسکوں۔ اسی لیے خدارا! بہت محتاط رہیے، جذبہ جنوں اپنی جگہ لیکن میں نہیں چاہتا کہ ہم ہر بار اسرائیلیوں کے لیے تر نوالہ ثابت ہوں۔ آخر میں آپ کو میں اپنے آئندہ کے لائحہ عمل سے آگاہ کرنا ضروری سمجھوں گا۔ جگانہ آرمی کے نزاکا یونٹ "سات منگال" کے مقابلے میں میں نے اپنے سات بہترین چھاپا مار گوریلوں پر مشتمل ایک فورس... "سات چھاتہ بردار"... تشکیل دینے کا فیصلہ کیا ہے... اور اس کی کمانڈ ایک سپر ایجنٹ... محسن کے سپرد کرتا ہوں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی ساتھی اپنی رائے یا اختلافی رائے رکھتا ہو تو وہ... برملا اس کا اظہار کرسکتا ہے۔"

یاسر العربی کی بات پر کسی کو اعتراض نہ ہوا تھا، سب نے ہی بہ یک زباں ان کے فیصلے کا احترام کیا تھا۔ محسن کا دل جوشِ مسرت سے دھڑکنے لگا تھا... اس کی گویا ایک دلی آرزو آج پوری ہورہی تھی۔

یاسر العربی نے آخر میں یہ بھی کہا کہ یعودوم میں واقع "ڈانٹ کیسل" پر دھاوا بولنے کے اس اہم ترین مشن میں روانگی سے سات روز قبل ان سات چھاتہ بردار یونٹ کو سخت قسم کی "ری فریشر ٹریننگ" سے گزارنا ہوگا.... اس کے بعد ہی انہیں یعودوم کی پہاڑیوں کی طرف روانگی کا حکم دیا جائے گا....

☆☆☆

کیپٹن ہیل نے لیلیٰ اور باقر وغیرہ کو یہی بتایا تھا کہ جنرل آئزک فرناش عموماً ڈیوڈ اسٹار کی عمارت کے "وار روم" میں ہی رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی بہترین رہائش گاہ بھی اسی باؤنڈری کے اندر تھی، لیکن وہ اس وقت کہاں موجود تھا؟ حتمی طور پر وہ یہ بتانے سے قاصر تھا۔

لیلیٰ اور باقر اپنے ساتھیوں سمیت ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈکوارٹر تباہ کرنے میں کامیاب تو ہوچکے تھے لیکن جب تک آئزک فرناش جیسا شیطان زندہ تھا، یہ مشن ان کے لیے ایک طرح سے ادھورا ہی تھا۔

ڈیوڈ اسٹار کی عمارت میں انہیں تلاش کے باوجود آئزک فرناش کا سراغ نہیں ملا تھا، جس کا یقینی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی ذاتی رہائش گاہ میں موجود ہو لیکن تازہ کار حملے کے بعد انہیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اب کہاں اور کدھر موجود ہوگا؟

لیلیٰ کے اس سوال پر کیپٹن ہیل نے یہی بتایا تھا کہ جنرل آئزک فرناش فرار ہونے والا آدمی نہیں ہے، وہ اس وقت بھی اپنی کسی خفیہ پناہ گاہ میں موجود ہوگا اور ان کی بیخ کنی کے لیے جال بن رہا ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ اب تک تل ابیب سے کمک طلب کرنے کے لیے بھی اقدامات اٹھا چکا ہو مگر لیلیٰ کا خیال مختلف تھا، چونکہ جنرل فرناش اگر یہاں موجود تھا تو اب تک اس نے اپنی ستم زدہ آدمی کی ریاست تباہ ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہوگی اور کمک، وہ بھلا اب کیونکر بلاتا؟ یہ ضرور ہوسکتا تھا کہ اگر وہ ادھر ہی کہیں موجود تھا تو وہ ان کی سرکوبی کے لیے اپنے کمانڈوز روانہ کرسکتا تھا... اور ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ لیلیٰ کا یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں نکلا تھا۔

بہرطور... مجاہدوں کا یہ مختصر ٹولہ کیپٹن ہیل کے بنگلا نما کوارٹر سے نکلا اور اس کے بتائے ہوئے بنگلے کی جانب پیش قدمی کی۔

ڈیوڈ اسٹار کی پوری اسٹیٹ اس وقت اپنے ہیڈکوارٹر سمیت آگ اور شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا...... ایکسپلوزرز کے ڈپو میں آگ لگنے کے باعث آتش زدگی اور تباہی کا دائرہ کار پھیلتا جا رہا تھا اور شدید دھماکے ہو رہے تھے۔

یہ چاروں... کیپٹن ہیل کی رہائش گاہ سے نکل کر ایک طرف کو بہ سرعت بڑھے تھے کہ اچانک ان پر کہیں سے برسٹ فائر ہوا۔ عبداللہ کی چیخ ابھری، وہ دھڑام سے گرا۔ علی اس سے آگے تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹ کر اپنی گن سے جوابی برسٹ داغا۔ اسی وقت اسے عقب میں چار پانچ وردی پوش گن بردار افراد دکھائی دیے۔ ادھر فائرنگ اور عبداللہ کی چیخ پر آگے دوڑتے ہوئے لیلیٰ اور باقر نے بھی رک کر بہ سرعت پوزیشن لی تھی اور علی کے برسٹ داغنے کے فوراً بعد ان دونوں نے بھی ان مسلح اسرائیلیوں پر برسٹ فائر کردیے تھے۔ علی کی فائرنگ سے ایک..... اور لیلیٰ وغیرہ کی فائرنگ سے تین اسرائیلی جہنم واصل ہوکر

حاصل کر چکا تھا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ راکٹ فائر کر دیا جس نے کنکریٹ کے فرش کے پرخچے اڑا دیے جبکہ لیلیٰ اندر دوسرے کمرے کے فرش پر گری اور گرتے ہی اس نے دروازے کو بھی لات رسید کر دی۔ ایک دھڑاکے سے کمرے کا فولادی دروازہ بند ہوا تھا۔ لیلیٰ کے لیے اتنا وقفہ ہی کافی تھا۔ اس نے اپنی پشت سے واتھر پی۔ اڑتیس کا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا، اسی وقت ایک زوردھماکا ہوا اور... اس کمرے کا دروازہ بھی پاش پاش ہو کر گر پڑا۔ جنرل فرناش اپنے خطرناک ہتھیار سے برابر کام لے رہا تھا۔ لیلیٰ کو ابھی تک اپنے بائیں شانے کی تکلیف کو سہلانے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا، جہاں سے جریان خون بند کرنے کی سردست کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

دروازہ اڑتے دیکھ کر لیلیٰ نے تیزی سے حرکت کی، شانے کی تکلیف کے باعث اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہ بھی خارج ہو جاتی تھی۔ یہ کمرا بھی کم بڑا نہ تھا مگر یہاں عام گھریلو فرنیچر کے بجائے، آہنی میزیں، کرسیاں اور دیگر آلات نظر آ رہے تھے جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جنرل فرناش نے یہاں بھی ایک وار روم قائم کر رکھا تھا۔ وہ جلدی سے آگے سرک کر ایک ایسی ہی میز کے عقب میں چلی گئی اور فوراً اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر پر باقر سے رابطہ کرنے لگی مگر اسی وقت جنرل فرناش مہیب عفریت کی طرح غراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ راکٹ پسٹل ہنوز اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا، لیلیٰ نے اپنے واتھر سے اس کے پسٹل والے ہاتھ پر نشانہ تاک کر فائر کر دیا۔ واتھر کی نال نے شعلہ اگلا اور جنرل فرناش کے ہاتھ سے راکٹ پسٹل نکل گیا۔ وہ بری طرح بدکا۔ لیلیٰ نے اس کے سینے کا نشانہ لیا، مگر وہ شاطر، لیلیٰ کا اندازہ لگاتے ہی برق رفتاری سے حرکت میں آیا، اور پھرتی سے پلٹا۔ گولی چلی، نشانہ خطا گیا۔ جنرل فرناش نے بھی کسی میز کی آڑ میں گھات لگائی تھی۔ لیلیٰ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ بڑے جاں گسل اور مہیب لمحات تھے، کسی بھی وقت دونوں میں سے کوئی ایک اپنی جان سے جا سکتا تھا۔ لیلیٰ نے ٹھیک ٹھیک اندازہ قائم کیا کہ جنرل فرناش... اب تک اپنے مہلک ہتھیار پر قبضہ جما چکا ہو گا.....؟

اسی وقت اس کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اسی جگہ ایک دھماکا ہوا۔ لیلیٰ نے اس بڑی سی فولادی میز کو فضا میں اڑتے اور ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیزی کے ساتھ ایک دوسری میز کی آڑ میں ہو گئی۔ اس کا بروقت قیاس درست ثابت ہوا تھا۔

اسی وقت لیلیٰ کو باقر کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

''لیلیٰ ! تم خیریت سے ہو؟'' وہ لرز گئی۔ آواز اسی پچھلے کمرے سے آئی تھی جدھر سے لیلیٰ اور جنرل فرناش کے، بیچ اس خونریز معرکے کی ابتدا ہوئی تھی.....

باقر کی آواز سن کر لیلیٰ اس لیے متوحش ہو گئی تھی کہ وہ یعنی باقر نہیں جانتا تھا کہ اس کا (لیلیٰ کا) اس وقت کس موذی اور خطرناک دشمن سے سامنا ہو رہا ہے۔ نیز جنرل فرناش کے پاس راکٹ پسٹل جیسا خطرناک اور مہلک ہتھیار بھی تھا۔ اب ایک سنگین قسم کی صورت حال یہ درپیش تھی کہ اگر لیلیٰ، باقر کو خبردار کرتی تو جنرل فرناش کو اس کی موجودگی کا علم ہو جاتا اور وہ اس کی آواز سنتے ہی بلادریغ اس پر راکٹ فائر کر دیتا.. اگر خاموش رہتی تو باقر اس سفاک موذی شیطان کی زد میں آ سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کے ہمراہ علی بھی ہو.... وقت نہیں تھا، فیصلہ جلدی کرنا تھا۔ گزرتے وقت کی ٹک ٹک.... جیسے تیزی موت کی دستک دے رہی تھی... اور اسی وقت جب لیلیٰ نے کمرے کی جامد خود فضا میں کسی کے سرکنے کی آہٹ سنی تو دہل گئی۔ جنرل فرناش شاید دوسرے کمرے کی طرف سرک رہا تھا، جدھر باقر اور علی اپنے ایسے دشمن کی خطرناک موجودگی سے پوری طرح واقف بھی نہیں تھے اور تب پھر لیلیٰ نے اللہ کا نام لیا اپنی میز کی آڑ سے ابھر کر حلق کے بل زور سے چلائی۔

''ہوشیار! اندر فرناش موجود ہے، اس کے پاس ایک خطرناک ہتھیار ہے.....''

دروازے کی طرف سرکتے ہوئے فرناش نے لیلیٰ کی توقع کے بالکل برعکس ایک خطرناک حرکت کی تھی، اس نے پلٹ کر لیلیٰ کو نشانہ بنانے کے بجائے اپنی پیش قدمی جاری رکھی بلکہ اس میں تیزی بھی دکھائی اور دروازے سے باہر کو لپکا۔ لیلیٰ کے تصور میں بھی یہ نہ تھا کہ مکار فرناش ایسی حرکت کر بیٹھے گا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اپنی جان کی پروا کیے بغیر فرناش کے عقب میں دوڑی کہ شاید وہ اس کی آواز پر اپنے تعاقب میں آتا محسوس کر کے، عین آخری لمحات میں باقر کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لے اور اس کی طرف پلٹ پڑے مگر وہ شاطر نہیں پلٹا۔ پھر جیسے ہی لیلیٰ دروازے تک پہنچی، اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ باقر پچھلے والے کمرے کے وسط میں کھڑا اپنی گن سنبھالے فرناش پر برسٹ فائر کرنے کی سعی کر رہا تھا

کہ فرناش کے پسٹل سے راکٹ نکل دیا جو سیدھا باقر کے سینے سے ٹکرایا۔ ایک جگر پاش چیخ لیلیٰ نے اپنے محبوب ساتھی کی سنی اور پھر وہ جیسے سکتے میں آگئی۔ اسے اس بات کا بھی ہوش نہ رہا کہ فرناش آخری گل کھلا کر اب اس کی طرف پلٹا تھا مگر اپنے پسٹل کو خالی پا کر اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ خود اب لیلیٰ کے نشانے پر آگیا تھا مگر اس مکار نے لیلیٰ کے "خمناک" سکتے سے فائدہ اٹھایا اور بھاری پسٹل اس پر کھینچ مارا... جو لیلیٰ کے زخمی شانے سے ٹکرایا۔ اسے تکلیف کا کیا احساس ہوتا تھا جو اس وقت اپنے محبوب ساتھی باقر کی ہیبت کذائی دیکھ کر ہو رہی تھی تاہم وہ جیسے ہوش میں آگئی تھی۔ اس نے اپنے وانتھر سے اس موذی پر تلے اوپر دو تین فائر کر ڈالے مگر وہ سفاک درندہ دروازے کے قریب پہنچ کر تب تک باہر نکل جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لیلیٰ فرش پر گرے تڑپتے باقر کی طرف متوجہ ہوئی... وہ خون میں لت پت پڑا آخری سانسوں کی ان گھڑیوں میں تھا جو اگر ایک بار ٹھہر جائیں تو پھر کوئی واپس نہیں لوٹا کرتا... اس سے تو بولا بھی نہیں جا رہا تھا... ادھر لیلیٰ، باقر کی یہ حالت دیکھ کر جیسے خون کے آنسو رو پڑی...

"میری... فکر... چھوڑو... وہ... دشمن... جانے نہ پائے..."

باقر اس سے فقط اتنا ہی کہہ پایا اور اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ لیلیٰ نے اپنی آنکھیں موند لیں اور ایک ہاتھ سے باقر کی کھلی رہ جانے والی آنکھیں بند کر دیں... پھر اگلے ہی لمحے لیلیٰ ایک زخمی للکار سے مشابہ چیخ خارج کرتی ہوئی فرناش کے تعاقب میں دوڑی... مگر وہ درندہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ ابھی علی سے رابطہ کرنا چاہتی تھی کہ علی کی کال اسے موصول ہوئی۔

"لیلیٰ! آپ خیریت سے ہیں؟ میں چھت پر ہوں، یہاں کچھ بچے ہوئے دشمنوں سے ہمارا مقابلہ ہوا تھا، وہ مارے گئے مگر باقر کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ایک اطلاع ہے، یہاں ایک ہیلی کاپٹر تیار حالت میں موجود ہے۔ کیا خیال ہے اسے تباہ کر دیا جائے؟... اوور..."

اس کی بات سن کر اور باقر کے ذکر پر لیلیٰ کا دل دکھی ہوا تھا، تاہم وہ اپنے آنسو پیتے ہوئے بولی۔ "علی! میں ٹھیک ہوں، تم چھت پر ہی رہو۔ میں اصل دشمن، جنرل فرناش کے تعاقب میں ہوں۔ مجھے بتاؤ چھت کا زینہ کس طرف ہے؟... اوور!"

علی نے اسے بتا دیا۔ لیلیٰ آگے بڑھی۔ اسے پوری توقع تھی کہ تنہا ہونے کے بعد فرناش راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرے گا، وہ اسی طرف کو دوڑی۔ اسے فرناش کہیں دکھائی نہیں دیا، پھر اس نے زینے کی طرف رخ کیا تو اچانک ٹھٹکی۔ اسے اوپر چھت سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ اپنے زخمی شانے پر ہاتھ رکھے، تیزی سے زینے طے کرنے لگی۔

ابھی وہ سرے پر پہنچی تھی کہ اس نے ہیلی کاپٹر کی مخصوص گڑگڑاہٹ سنی۔ وہ سامنے آگئی۔ اس نے دیکھا، ہیلی کاپٹر کے اندر جنرل فرناش کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے سوار تھا، جبکہ علی، جو خود خاصا زخمی حالت میں تھا، ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنرل فرناش جیسے دشمن کو فرار ہوتا دیکھ کر لیلیٰ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے قہر و غضب کی نگاہوں سے ہیلی کاپٹر کے شیشے کے دوسری طرف جنرل فرناش کو دیکھا۔ اسے اس کے مکروہ چہرے پر خبیثانہ مسکراہٹ تیرتی ہوئی محسوس ہوئی... جیسے لیلیٰ سے کہہ رہا ہو...

"تم میری گرد کو بھی نہیں پا سکتیں..."

لیلیٰ نے اپنا وانتھر آگے کیا اور ایک جوشِ غیظ تلے ، زیر ٹریگر دباتی چلی گئی... صرف دو گولیاں فائر ہوئی تھیں اس کے بعد وانتھر خالی ہو گیا تھا اور ان دو گولیوں نے ہیلی کاپٹر کے بلٹ پروف شیشے کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اسی وقت ہیلی کاپٹر اوپر کو اٹھا علی جیسے تیسے اس کے پچھلے حصے میں سوار ہو گیا تھا مگر اس طرح کہ وہ آدھا نیچے جھول رہا تھا اور نصف اوپر تھا۔ جنرل آرنک فرناش کی نظریں، چونکہ سامنے کھڑی لیلیٰ پر جمی ہوئی تھیں، اسی لیے وہ شاید زخمی علی کی اس "کارگزاری" کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیلیٰ نے دوڑ لگائی... اور جیسے ہی ہیلی کاپٹر اس کے سر کے پاس سے اٹھنے لگا، کوئی چارہ نہ پا کر لیلیٰ نے اچھل کر اس کے لینڈنگ اسکڈ کو پکڑ لیا... جوش تلے وہ یہ حرکت تو کر گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اسے اذیت کا احساس ہوا، اس کے زخمی شانے کی تکلیف کا جیسے بند کھل گیا... اور جلد ہی اسے لگا کہ وہ زیادہ دیر تک ہیلی کاپٹر کے لینڈنگ اسکڈ نہیں تھام سکے گی مگر وہ بھی ایک باہمت مجاہدہ تھی، ایسے کئی کڑے حالات سے وہ گزر چکی تھی، تاہم وہ ایک انسان بھی تھی، اس نے زخمی شانے کی اذیت کو پینے کے لیے اپنے ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیے۔ ہیلی کاپٹر اوپر اٹھتا چلا گیا اور ایک طرف کو پرواز کر گیا۔ نیچے ڈیوڈ اسٹار کی پوری اسٹیٹ کسی جہنم کی طرح دہک رہی تھی۔

لیلیٰ نے اپنا بوجھ کم کرنے کی خاطر اپنی کمانڈو کٹ اتار پھینکی تھی۔ ادھر علی نے بھی لیلیٰ کو اس حالت میں دیکھا تو

سنبھل کر قدم اٹھاؤ۔" ڈی کارلو کو شاید اس کی بات سمجھ میں نہ آئی، تاہم وہ خاموش مگر الجھن آمیز نظروں سے مادام میڈوسا کا چہرہ تکتا رہا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم خود کو یہاں لندن (یو کے) میں تنہا مت سمجھو، ہم تمہارے ساتھ ہیں... اور جو یہاں اکیلے تنہا اور بے یارومددگار ہیں، وہ ایسے ہی رہیں گے لیکن ہماری اشتعال انگیزی یہاں ان کی پوزیشن مضبوط کرے گی بلکہ انہیں تحفظ بھی فراہم کرے گی۔"

میڈوسا کا اشارہ ڈاکٹر کمال اور حماد کی طرف تھا جسے ڈی کارلو شاید نہیں سمجھ پایا تھا یا پھر وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سر پر فقط ایک ہی دھن سوار تھی اور وہ تھی ڈاکٹر کمال سے انتقام لینا۔ وہ میڈوسا کی باتوں سے بیزار ہونے لگا تھا اور اسے سخت پچھتاوا بھی ہوا کہ اپنے باپ کے نہنے میں آکر اس نے ادھر آکر غلطی ہی کی تھی۔

مادام میڈوسا کی عقابی نگاہوں نے بھی اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے۔ اس کی طرف تکتے ہوئے بولی۔ "تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟"

"جی سمجھ رہا ہوں۔" وہ بے دلی سے بولا۔ میڈوسا نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے لمحے بھر کے لیے کچھ سوچا اور پھر اسے دوسرے انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھو......! ہماری نگاہ میں دشمن کو ہلاک کر دینا ایک بہت چھوٹا انتقام ہوتا ہے جبکہ اسے اپنا غلام بنا کر اس سے اپنے ملک، اپنی قوم کو فائدہ پہنچا کر انتقام لینا، اسے ہلاک کروا لینے سے کہیں درجہ بہتر ہے...... ذرا تصور کرو...... مسٹر ڈی! تمہیں یہ کیسا لگے گا، جب تمہارا دشمن ڈاکٹر کمال ہمارے مفاد میں یہ سب کر رہا ہو اور اسے پتا بھی نہ ہو؟"

"میں سمجھا نہیں؟" ڈی کارلو نے الجھن آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا کیونکہ مادام کی بات پر اس کا جی قہقہہ لگانے کو چاہا تھا جو شاید کمال جیسے انسان کو نہیں جانتی تھی کہ وہ کسی یہودی کی غلامی سے زیادہ موت کو ترجیح دینا زیادہ بہتر سمجھتا۔ تاہم خاموش رہا۔

ڈی کارلو بے شک اس کا ہم مذہب و ہم وطن سہی لیکن میڈوسا کے اصول کے مطابق یہ بات خلاف تھی کہ وہ اس سے کوئی ایسی بات کرے جو ان کے دیرینہ اور خفیہ منصوبوں کا حصہ تھی۔ وہ بولی۔

"سب باتوں کا تمہیں دھیرے دھیرے علم ہوتا رہے گا۔ ابھی صرف تم اپنا کیس جلد از جلد ختم کرنے کی فکر کرو اور تمہارے لیے یہ ایک اچھا موقع بھی ہے، کیونکہ اس وقت کمال وغیرہ لندن سے غائب تھا...... میں بھی تمہاری مدد کروں گی۔"

"ڈاکٹر کمال وغیرہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"وہ عراق میں امریکا اور اس کے اتحادی حملوں میں پھنس چکے ہیں۔"

ڈی کارلو کے علم میں بھی یہ بات تھی تاہم اس کے سوال کرنے کا اصل مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "تو پھر ایسے میں آپ ان کے خلاف کیا کریں گے؟"

"ہم اسے عراق سے نکالنے کی کوشش کریں گے اور یہ ہمارے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ امریکیوں کی صورت میں وہاں ہمارے خیر خواہوں کی کوئی کمی نہیں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ کی باتیں سن کر مادام!" بالآخر ڈی کارلو جو ایک آرام دہ صوفے میں دھنسا بیٹھا تھا رخصت ہونے کی غرض سے اٹھ کر بولا۔

"میں پھر آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

مادام میڈوسا چند ثانیے اسے سوچتی نگاہوں سے تکتی رہی پھر وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مصافحے کے لیے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "مجھے امید ہے کہ تم میری باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کرو گے۔"

"یقیناً۔" ڈی کارلو نے بے تاثر مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر رخصت ہو گیا۔ ڈیکنا میتھ نکارپ کے دفتر سے نکلتے وقت اس نے مادام میڈوسا کے لیے زیر لب "بچ" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

ڈی کارلو کے رخصت ہوتے ہی میڈوسا اٹھ کر اپنے شاہانہ آفس روم میں گئی اور بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر براجمان ہو گئی۔ چند ثانیے وہ اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتی رہی، اس کے بعد اس نے اپنی ایجنٹ جزبیلا کو بلایا جو اسی کی ہدایت کے مطابق تھوڑی دیر پہلے ایک دوسرے کمرے میں موجود ایک بڑی سی اسکرین کے سامنے بیٹھی اپنی باس (مادام میڈوسا) اور ڈی کارلو کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے ساتھ ڈی کارلو کے چہرے کا بھی جائزہ لیتی جا رہی تھی۔

"کیا رائے ہے تمہاری؟" مادام میڈوسا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں مادام!" جزبیلا اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولی۔

"میرا بھی خیال تم سے کچھ مختلف نہیں ہے، جز!"

میڈ وسا بولی۔

"میرا خیال ہے ڈی کارلو پر اس پاکستانی ڈاکٹر کمال احمد سے انتقام لینے کا خونی بھوت سوار ہے اور وہ اس سے انتقام لیے بغیر نہ چین سے بیٹھتا نظر آرہا ہے اور نہ ہی وہ ہماری کسی نصیحت کو خاطر میں لانے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔" جز بیلا نے تبصرہ کیا۔

"ہوں۔۔" مادام میڈ وسا نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی اور آگے بولی۔

"مگر اس کی یہ روش ہمارے دیرینہ منصوبے کی ایک بڑی رکاوٹ بھی بن سکتی ہے، جبکہ چیف آئزر مین کی طرف سے ہمیں سختی سے یہ ہدایت ملی ہوئی ہے کہ ڈاکٹر کمال کو زندہ حالت میں جلد از جلد ان کی وائٹ کیسل کی تجربہ گاہ میں پہنچایا جائے ...."

"مادام! کیا میں جان سکتی ہوں کہ چیف آئزر مین ڈاکٹر کمال میں اتنی دلچسپی کیوں رکھے ہوئے ہیں؟ انہیں آخر کیسا تجربہ مقصود ہے؟" جز بیلا نے اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بالآخر پوچھ ہی لیا۔ اس پر مادام اپنی کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر کمال ایک مائیکرو بیالوجسٹ ہے..... اس سے بڑھ کر ایک اعلیٰ دماغ اور غیر معمولی ذہانت کا حامل انسان بھی ہے۔ اپنے شعبے میں وہ اس قدر وسیع ذہن اور معلومات رکھتا ہے کہ اسے اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہے، بلکہ میں اپنی طرف سے اس کی تعریف میں کچھ ایڈ کرنا چاہوں تو میں یہی کہوں گی کہ اس کی ذہانت کے آگے اس کا اپنا شعبہ بھی محدود ہو کر رہ جاتا ہے یہی سبب ہے کہ وہ اس میں نئے نئے تجربات کرتا رہتا ہے، اس حقیقت کا صحیح معنوں میں مجھے اس وقت پتہ چلا تھا جب میں نے ایک پاکستانی مسلم برقع پوش عورت کے روپ میں اس کی ریکی کی تھی اور اس کے بعد بھی میں نے نیفز یونیورسٹی کے "ریسرچ کلب" میں جا کر اس کے تھیسس، نوٹس اور مختلف اسائمنٹ کا نہ صرف چوری چھپے مطالعہ کیا تھا بلکہ زسپائی کیمرے کے ذریعے اس کی کاپی بھی کرالی تھی اور وہ سب میں "وائٹ کیسل" بھیج چکی ہوں لیکن چیف آئزر مین خود بھی اس سے متعلق ڈاکٹر کمال کو جانتے ہیں۔" میڈ وسا نے صراحت سے بتایا۔

"اوہو۔ تو اس کا مطلب ہے، وہ ڈاکٹر کمال سے کوئی ایسا کام لینا چاہتے ہیں جو......"

"ہاں۔۔!" مادام میڈ وسا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "بگانہ جنگ عظیم کے دور سے ہی وجود میں آ چکی تھی، اگرچہ وہ اس وقت فرد واحد یعنی صرف چیف کے گرینڈ پا آئزر مین ہیری تک ہی محدود تھی، ہٹلر جو پوری دنیا پر قابض ہونے کے خواب دیکھے ہوئے تھا وہ اسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے نت نئے طریقوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ اس کے لیے وہ مہلک آتشیں ہتھیاروں کی فیکٹریاں ہی نہیں بلکہ سائنسی خطوط پر لیبارٹریاں بھی قائم کرتا رہتا تھا۔ جہاں مائنڈ کنٹرول ٹیکنالوجی سے لے کر الیکٹرو میگنیٹیو ڈیوز اینڈ ایٹامک ویپن اور کیمیائی ہتھیاروں تک تجربات کیے جاتے تھے اور اس کے لیے ہٹلر نے دنیا بھر سے سائنٹسٹ کی ایک کھیپ ان خفیہ تجربہ گاہوں میں جمع کر رکھی تھی۔ آج بھی جن خطوط پر مہلک ہتھیار بنائے جا رہے ہیں، ان میں کہیں نہ کہیں جنگ عظیم کے دور کے چوری کیے ہوئے ادھورے اور تیار شدہ فارمولوں کا دخل ہوتا ہے۔

"گرینڈ پا کے ہاتھ بھی ایسا ہی ایک ادھورا فارمولا لگا تھا.... وہ عرصے تک اس میں اپنا سر کھپاتے رہے، ڈرتے ڈرتے کسی سے مدد بھی چاہی۔ کچھ پیش رفت ہوئی کچھ نہیں لیکن جنگ عظیم کے دور کا وہ مہلک فارمولا اب بھی ادھورا ہی پڑا ہے۔۔ اس کے لیے اگرچہ اب چیف آئزر مین ہیری جونیئر نے اپنی وائٹ کیسل کی خفیہ تجربہ گاہ میں قابل سائنس دانوں کی پوری ٹیم لگا رکھی ہے، کچھ مزید پیش رفت بھی دیکھنے میں آئی بلکہ یہاں تک کہ اب صرف ایک آخری الجھن باقی ہے اور وہی الجھن سب سے اہم اور بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے، اور یہ وہی الجھن ہے جس کے بنیادی نکتے پر سوئے اتفاق، یہ پاکستانی قابل ڈاکٹر کمال احمد کام کر رہا ہے۔..."

مادام میڈ وسا کی اس سلسلے میں صراحت سننے کے بعد جز بیلا بولی۔ "اس کا مطلب ہے ڈاکٹر کمال ہمارے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔"

"ہاں! ہمارے لیے نہیں بلکہ پورے اسرائیل اور اس کے دیرینہ وسیع تر مفادات کے لیے بھی۔"

"آف کورس مادام! لیکن ڈی کارلو انتقام میں اندھا ہو کر کہیں..... ڈاکٹر کمال کو......"

"ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں ڈی کارلو کو ہلاک ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن ہماری ابتدائی کوشش یہی ہوگی کہ اسے مزید سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کا باپ جسٹن ڈیوڈ امریکی پارلیمنٹ میں ایک معتبر حیثیت رکھتا ہے۔"

تھوڑے توقف کے بعد وہ بولی۔ "جز! تم ایک کام

کردو، ڈی کارلو پر کڑی نظر رکھو، بلکہ کسی کی مستقل ڈیوٹی لگادو
کہ وہ اس کے معمولات پر نگاہ رکھے۔ وہ ڈاکٹر کمال احمد
کے سلسلے میں کون سا اگلا انتقامی قدم اٹھانے والا ہے۔ ہمیں
اس بے وقوف کو اس مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا
ہے۔" مادام میڈوسا کی بات پر جزیلا نے مؤدبانہ انداز
میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

☆☆☆

ڈی کارلو کی مادام میڈوسا کے ساتھ یہ ملاقات، اس
کے لیے حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ
میڈوسا کی بات سمجھ رہا تھا لیکن اس کے خیال کے مطابق وہ
ڈاکٹر کمال احمد کے خلاف اس طرح کی لمبی چوڑی پلاننگ
میں پڑ کے... وقت ہی برباد کرتے اور حاصل نہیں کچھ
بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ ڈی کارلو اس کا فوری حل چاہتا
تھا۔ بہ قول اس کے وکیل بیرسٹر ہاکن کے کمال، جیلی اور
حماد سمیت عراق میں پھنس چکا تھا... ورنہ تو وہ خود ہی کمال
سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے پر تولے بیٹھا تھا۔ اس نئی
صورت حال نے اسے بھی بری طرح الجھا دیا تھا... تاہم
ہاکن نے اسے امید دلائی تھی کہ کمال وغیرہ کے اس غیاب
پر اس کے خلاف عدالت میں دائر کیس کی افادیت اب
ماند پڑنے لگی تھی۔

بہر طور... ڈی کارلو جب ریجنٹ میں واقع اپنے
لگژری اپارٹمنٹ میں پہنچا تو اسے اپنے وکیل بیرسٹر ہاکن کا
فون موصول ہوا۔ اس نے ڈی کارلو کو ایک بڑی اہم اور سنسنی
خیز خبر سے آگاہ کیا تھا۔ جیلی کے باپ پولیس چیف جان سوئیز
نے ڈاکٹر کمال اور حماد وغیرہ کے خلاف اپنی بیٹی جیلی کو اغوا
کر کے کسی نامعلوم مقام پر لے جانے کی رپورٹ کروادی تھی
اور اب لندن کی پولیس کمال اور حماد کو تلاش کر رہی تھی
... اس سلسلے میں پولیس نے "لندن" میں واقع ڈاکٹر کمال کے
بڑے بھائی ظہیر کے گھر پر بھی چھاپا مارا تھا اور تفتیش کے سلسلے
میں اسے پولیس اہلکار اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

اس خبر پر ڈی کارلو کو ایک جھٹکا لگا۔ خیر اپنی جگہ لیکن
آج اسے اس حقیقت کا پتا چلا تھا کہ اس کے دشمن ڈاکٹر کمال
کا یہاں ایک بھائی بھی اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا... پھر
سوچ کر ڈی کارلو کی آنکھوں میں سفاکانہ مکاری عود کر آئی
اور وہ ہولے سے بڑبڑایا... "واؤ... مجھے آج پتا چلا ہے
کہ میرے شکار کا یہاں لندن میں ایک خاندان بھی آباد
ہے۔ ویل ڈن ڈاکٹر کمال... تم نہیں تو تمہارے بھائی کی
فیملی ہی سہی..."

☆☆☆

ظہیر احمد کو اپنے بھائی ڈاکٹر کمال کی اتنی فکر نہ تھی جتنی
اس کی بیوی پروین کو ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی جب کمال کافی
عرصے سے ان کے ہاں ملنے نہ آسکا تو پروین نے ہی ایک
دن اپنے شوہر سے کہا۔

"ظہیر! کمال بھائی کی کوئی خیر خبر ہی لے لیتے...
کہاں اور کس حال میں ہیں؟ کافی دنوں سے آئے نہیں؟"

ظہیر، جو آج کل خود ایک نئی مشکل سے دوچار تھا، چڑ
کر بولا۔ "وہ کس حال میں ہوگا، جہاں ہوگا ہم سے اچھا ہی
ہوگا۔ آجائے گا، جب اس کا موڈ ہوگا......"

اپنے ناشکرے شوہر کی بات پر پروین کو دکھ
ہوتا، تاہم وہ بولی۔ "پھر بھی آپ ہی کسی دن وقت نکال کر
لیڈز چلے جائیں۔ میں نے تو فون بھی کیا تھا، کچھ پتا نہیں
چل سکا ان کا۔"

بیوی کی بات پر ظہیر جھنجلا کر بولا۔ "مجھے تنگ نہ کرو
میں پہلے ہی پریشان ہوں بہت۔"

"ارے! خیریت؟ آپ کو کیا پریشانی ہوگئی؟"
پروین قدرے چونک کر بولی تو ظہیر اس کی طرف گھورتے
ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"اچھا! جیسے تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں...... راشدہ بہن
کے خطوط نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب ثمینہ بہن
کے بھی سفارشی خط آنے لگے ہیں... کہ ہمیں راشدہ بہن کی
مدد کرنی چاہیے...... کمال بھی اسی وجہ سے نہیں آرہا یہاں،
کہیں بہنوں والا بکھیڑا اس کے گلے نہ پڑ جائے۔ ہونہہ۔"

"کمال بھائی نے بہنوں کے لیے بہت کچھ کیا
ہے، وہ کبھی انہیں برا بھلا نہیں کہہ سکتیں..."

"ہاں... ہاں... ایک میں ہی برا ہوں... میں
نے تو کچھ نہیں کیا..."

اس نے آنکھیں نکالیں تو پروین بات ختم کرنے کی
غرض سے بولی۔ "اچھا بھئی اب اس بحث کو چھوڑیں،
آپ راشدہ بہن کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟"

"وہی پرانا مسئلہ ہے...... راشدہ کا نکھٹو شوہر ہمارا نام
لے کر اس بے چاری کو بلیک میل کرتا رہتا ہے کہ تمہارے دو
دو بھائی باہر عیش کر رہے ہیں، اسے کوئی نہیں پوچھ رہا۔"

"تو پھر؟" پروین نے سوالیہ نگاہوں سے ظہیر کی
طرف دیکھا۔

"میں ثمینہ کو اسپانسرشپ کے کاغذات روانہ کر چکا
ہوں... ایک اسسٹنٹ پذیرفتہ امیگریشن ایکسپرٹ سے مدد

بھی ہے۔ بقول اس کے کیس جینوئن ہے، جلد ہی ہونے کی توقع ہے۔''

''ارے۔۔۔! اتنی بڑی خوشی کی بات! آپ نے مجھے نہیں بتائی؟'' پروین خوش ہو کر بولی۔ ''سچ ظہیر! بہت مزہ آئے گا نا جب راشدہ بھی یہاں آ جائے گی۔۔۔ یہاں تو سب ہی گوریاں ہیں۔ کوئی اپنا نہیں۔ اب راشدہ بہن خیر سے آ جائے گی تو۔۔۔۔''

''اچھا۔۔۔ بس بس۔۔۔ زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ابھی ذمے داری بھی بڑھ جاتی ہے۔۔۔ انہیں سیٹل بھی ہمیں ہی کرنا پڑے گا یہاں۔''

''تو آپ کے لیے کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟ سچ پوچھیں ظہیر! آپ اپنی ایک دکھی بہن کے لیے بہت بڑا نیکی کا کام کر رہے ہیں۔۔۔ اللہ آپ کو بہت اجر دے گا۔'' وہ بولی تو ظہیر ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''ہاں پروین! سچ پوچھو تو۔۔۔ ایک دکھی بہن سے کام آ کر مجھے خود بھی دلی راحت محسوس ہو رہی ہے۔۔۔ اس بے چاری کے خطوط نے خود مجھے بھی پریشان کر رکھا تھا۔۔۔''

ظہیر بھی انسان تھا۔ وقت اور حالات نے اسے سخت گیر اور چڑچڑا بنا ڈالا تھا ورنہ دل کا وہ اتنا برا بھی نہ تھا۔۔۔ پروین تو اپنے شوہر کی اس طبیعت اور مزاج کا علم تھا۔ اسے بھوڑم پڑتا دیکھ کر اپنے دیور کامل کے بارے میں دوبارہ ذکر چھیڑ دیا تو ظہیر نے ہامی بھرلی کہ وہ خود ہی اس کی کوئی خیر خبر لینے کے لیے نیدرلینڈز جائے گا۔۔۔ اور پروین مطمئن ہوئی۔

مگر اس کا یہ اطمینان زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ یہ وہ وقت تھا جب ظہیر احمد صبح کے وقت اپنے اسٹور جانے کی تیاری کر رہا تھا اور اسی وقت دروازے پر پولیس آ گئی جس نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

☆☆☆
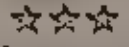
جزیرے پر اس وقت شام کی سیاہی اترنے لگی تھی۔ تھوڑے انتظار کے بعد زبیدہ آگے بڑھی اور وہ گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں ہوتی۔۔۔ محتاط روی کے ساتھ مچان نما چوکی کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی متلاشی نگاہیں مچان پر کھڑے ان دونوں اسرائیلیوں کی حرکات و سکنات پر ہی مرکوز تھیں۔۔۔ وہ باری باری اندر باہر ہو رہے تھے اور کبھی تو ایک ساتھ ہی کھڑے ہو کر آنکھوں پر دوربین لگا کر گرد و پیش دیکھنے لگتے تھے۔ پھر کبھی دونوں ہی اندر جا کر بیٹھ جاتے تھے۔

اس بار جب زبیدہ مچان سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر رکی تو اس نے تھوڑا ٹھہر کر انتظار کیا اور پھر چند سیکنڈوں بعد ہی جب اس نے دیکھا کہ وہ دونوں اندر چلے گئے ہیں تو وہ نہایت آہستگی سے آگے بڑھی کہ کوئی پتا بھی ''کھڑکنے'' نہ پائے۔ کوئی بعید نہ تھا کہ ان کی مچان میں ایسا کوئی سینسر لگا ہوتا جو ہلکی سی قریبی آہٹ پر انہیں چونکنے پر مجبور کر دیتا۔۔۔ اور وہ اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔ ویسے بھی جوں جوں جزیرے پر شام اترنے لگی تھی ایک سودم بخودی خاموشی چھانے لگی تھی۔ جس کے ''پتا کھڑکا اور دل دھڑکا'' والی صورت حال طاری تھی۔۔۔ پھر وہ جلد ہی ان جڑواں تنوں والے درخت کے نزدیک جا پہنچی جس پر مچان بنی ہوئی تھی۔۔۔ زبیدہ کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ اس کی یہاں جزیرے میں موجودگی کا سر دست دشمنوں کو علم نہ ہونے پائے ورنہ اس کی اگر یہاں ایک بار ''ڈھنڈیا'' پڑ جاتی تو صورت حال نازک ہو سکتی تھی اور اصل مشن بھی متاثر ہونے کا احتمال رہتا۔ وہ اصل ہدف یعنی ''اسپائی اسٹیشن'' پہنچنے تک دشمنوں کو اپنی گرد سے بھی بچانا چاہتی تھی۔

بہرطور۔۔۔ میدان قدرے صاف دیکھ کر اس نے پھر پیش قدمی کی۔۔۔ اوپر پہنچنے کا اسے کوئی ذریعہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کا صاف مطلب تھا یہ لوگ اوپر نیچے آنے جانے کے لیے کسی رسی نما سیڑھی کا استعمال کرتے ہوں گے اور بعد میں اس رسی نما سیڑھی کو اوپر کھینچ لیتے تھے۔

زبیدہ کی بھانپتی ہوئی نگاہوں نے درخت سے جھولتی ان ''جٹاؤں'' (داڑھی نما جڑوں) کو دیکھ لیا تھا جن سے وہ بہ آسانی رسی کا کام لے کر اوپر پہنچ سکتی تھی اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ یہ سب جلد کرنے کا متقاضی تھا لہٰذا اس نے بہ سرعت حرکت کی اور ان جھولتی جٹاؤں کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ بروئے کار لاتے ہوئے وہ بالآخر جھونپڑی نما مچان تک جا پہنچی۔ جھونپڑی کی چاروں دیواروں میں بھی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں اور اندر سے روشنی کی کرنیں باہر بھی پھوٹ پڑ رہی تھیں۔ زبیدہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ مچان کے چوبی تختے پر آواز پیدا کیے بغیر اکڑوں بیٹھے دھیرے دھیرے اس کے دروازے کی طرف سرکنے لگی۔

مچان کی چھت سے ذرا ہی اوپر گھنا درخت پھیلا ہوا تھا۔ وہ جھونپڑی کی چوکھٹ تک سرک آئی اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہی ہوا جس کا زبیدہ کو اندازہ تھا۔ ایک ہتھیار بدست آدمی باہر نکلا وہ اکیلا ہی تھا۔۔۔ زبیدہ تھوڑا پیچھے ہو

سرتی... اور ہلکی سی ہڑبڑ کی آواز پیدا کی۔ وہ آدمی فوراً اس طرف متوجہ ہوا... چند قدم اس طرف آیا اور اسی وقت جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ زبیدہ نے اس کی گردن پر رگ حساس والی جگہ پر اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کا کنارا وار کیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے گرنے سے سنبھالا بھی دیا تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ اب اس کا اندر موجود دوسرا ساتھی کسی وقت بھی باہر آسکتا تھا اسی لیے زبیدہ نے اپنے مغلوب شکار کا پہلے تو ٹینٹوا دبا کر اسے بے ہوشی کی سی حالت میں جہنم واصل کیا۔ اس کے بعد اس کی بڑی گن کو نظرانداز کر کے ایک اسٹرلنگ پستول اور اس کی پنڈلی سے چپکا ہوا ایک فولڈنگ چاقو نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ٹھیک اسی وقت دشمن کا دوسرا ساتھی اندر سے برآمد ہوا...... اسے شاید کچھ شبہ ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سیدھا اسی طرف آیا تھا۔ اس کی یہ حرکت زبیدہ کے لیے غیر متوقع ہی تھی، لہٰذا اس نے بھی وقت ضائع کیے بغیر اسی وقت جب دشمن اپنی گن کا رخ اس کی سمت کر رہا تھا، ہاتھ میں پکڑا چاقو اس کی طرف اچھال دیا جو سیدھا دشمن کی گردن میں پیوست ہوگیا۔ اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابلا، جس کا مطلب تھا چاقو نے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی تھی۔ پھر وہ تیورا کر پہلے مچان کی چوبی ریلنگ سے ٹکرایا، وہ ٹوٹی اور پھر دشمن گویا اپنی لاش لیے مچان سے نیچے جا گرا......

میدان صاف پا کر زبیدہ تیزی سے حرکت میں آئی...... ایکشن کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اب اس نے جو کرنا تھا وہ فوراً کرنا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اندر جھونپڑے کا رخ کیا۔ وہاں ایک لکڑی کی میز اور دو کرسیوں کے علاوہ ایک کونے میں بڑا سا میٹرس بھی بچھا ہوا تھا۔ دونوں شاید باری باری اس پر سوتے تھے۔ میز پر کچھ ایسے آلات بکھرے نظر آئے تھے جو لاسلکی رابطوں میں کام آنے کی نشاندہی کر رہے تھے۔ ایک ... کیبنٹ بھی تھی۔ زبیدہ نے چند منٹوں کے اندر ہی سارے جھونپڑے کی تلاشی لے ڈالی اور اسی دوران میں اسے کوئی خاص قابل ذکر شے دکھائی نہ دی تھی۔ البتہ جب وہ دشمنوں کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر درخت سے نیچے اتری اور دوسرے مردہ شکار کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے اسے دو چند کام کی چیزیں ملیں۔ ایک تو پاکٹ سائز ڈیجیٹل ڈائری تھی۔ وہ اس کا تفصیلی جائزہ لینے لگی تو اسے ایک کارآمد چیز نظر آہی گئی، یہ اسپائی اسٹیشن کا نقشہ و میپ تھا مگر اس میں بھی کوئی خاطر خواہ سود مند بات اسے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بجز اس کے کہ اس میں صرف اسپائی اسٹیشن کی جائے وقوع کے بارے میں بتایا گیا تھا جبکہ کل وقوع کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں تھی۔ کچھ سوچ کر زبیدہ نے وہ ڈائری اپنے پاس رکھ لی جبکہ دوسری شے ایک سینسر زیپ ڈیوائس تھی۔ یہ اسے قدرے کام کی شے محسوس ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی خفیہ پیش قدمی کو محفوظ طریقے سے آگے بڑھا سکتی تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں سے خفیہ ٹرانسمیٹر پر رابطہ کرنے کی سعی چاہی تو خوش قسمتی سے اس بار اس کا رابطہ خالد بن جنید سے ہوگیا۔

''ہیلو... ہیلو... زبیدہ کالنگ...... اوور۔''

دوسری طرف سے پہلے ہلکے سے اصلاتی شور کی آواز آتی رہی اس کے بعد وہ بتدریج واضح ہوتی چلی گئی......

''یس... اٹ از... خالد کالنگ... زبیدہ! تم کدھر ہو؟ فوراً اپنی خیریت سے مطلع کرو... اوور......''

دوسری جانب سے خالد بن جنید کی آواز ابھری تھی۔

''میں اس وقت کوانڈو آئی لینڈ میں ہوں...'' اور پھر اس نے مختصر ترین لفظوں میں خالد کو اب تک کی ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

انجینئر نے اسے بتایا تھا کہ کوانڈو آئی لینڈ تک ان کی پیش قدمی کا ذریعہ وہ کھاڑی تھی جدھر اسرائیلیوں کی ایک چوکی قائم تھی۔ اگر یہ لوگ کسی طرح اس چوکی پر کامیاب حملہ کر کے وہاں سے اس کے بتائے ہوئے راستے سے کوانڈو آئی لینڈ کے اس نسبتاً محفوظ ساحلی علاقے تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی منزل آسان ہو سکتی ہے...... وغیرہ۔

مزید کچھ اور راہنمائی کرنے کے بعد زبیدہ نے رابطہ منقطع کر دیا اور پھر آگے قدم بڑھا دیے...

شام گہری ہونے لگی تھی۔ رات کا اثر جزیرے میں نمایاں ہونے لگا تھا... وہ ڈیجیٹل ڈائری سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق مقصد بہ مقام تک پہنچنے کے لیے اپنے راستوں کا تعین کر رہی تھی۔ راستہ طویل تھا...... لیکن وہ تیز تیز قدموں اور محتاط روی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ دیر چلتے رہنے اور کچھ دیر ستانے کے بعد وہ کم از کم رات کے آخری پہر تک تو اپنی منزل تک پہنچ ہی جائے گی۔

راستہ سارا جنگلاتی تھا۔ موٹے چوڑے پتوں والے پودے، قدِ آدم جھاڑیاں اور گھنے چھتنار درخت... ایک مقام پر تو اس کا سانپ سے بھی واسطہ پڑا جو خاصا موٹا اور سیاہ رنگ کا تھا۔ وہ تو اس کی پھنکار سن کر ہی چونکی تھی اور اس سے

بجھی سے بغیر فوراً اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ پنسل ٹارچ اس نے ہاتھ میں ہی پکڑ رکھی تھی جسے وہ بوقت ضرورت کے وقت ہی روشن کرتی تھی۔

کہیں کہیں بلند و بالا اور گھنے پیڑوں کی وجہ سے اوپر کھلا آسمان بھی ڈھک جاتا تو اندھیرا اس قدر ہو جاتا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ رکی نہیں اور اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔ ایک مقام پر وہ ذرا اطراف کا جائزہ لینے کے لیے تھوڑی دیر رکی اور پھر چل پڑی تھی۔ کئی ایک مقام پر اسے "بوبی ٹریپ" سے واسطہ بھی پڑ رہا تھا مگر اس کے پاس "مینٹر بیپ ڈیوائس" ہونے کی وجہ سے وہ ان سے بچ کر آگے بڑھتی رہی۔ اگر وہ ان چھپے ہوئے ٹریپس میں آ جاتی تو نہ صرف اس کی یہاں موجودگی آشکار ہو جاتی بلکہ وہ خود بھی پھنس جاتی۔

بہرحال ایک گھنٹے کی مسلسل مسافت کے بعد وہ رک گئی۔ اسے سامنے کچھ نظر آیا تھا۔ پہلے تو چند ثانیے ٹھہر کر اس نے اپنی قدرے پھولی ہوئی سانسوں کو ہموار کیا پھر مال غنیمت کے طور پر میسر آئی ہوئی انفرا ریڈ دوربین آنکھوں سے لگا کر اس نے دور نظر آنے والی شے کو دیکھا اور بری طرح ٹھٹک گئی۔ اسے ایک چھوٹی سی پتھروں پر مشتمل ... عمارت دکھائی دی تھی۔ جس کا رقبہ کچھ زیادہ بڑا تو نہ تھا لیکن یہ بھی اسے اہم نوعیت کی ہی محسوس ہوئی تھی۔ وہ دوربین لگائے اب بڑے غور سے اس عمارت کا جائزہ لینے میں مصروف ہوئی ....

عمارت خیالے رنگ کی تھی۔ اس کی چھت پر بڑے بڑے انٹینے لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کھڑکیاں بھی تھیں اور سامنے دو دروازے تھے ایک چھوٹا اور دوسرا نسبتاً بڑا گیٹ نما دروازہ تھا۔ چھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مسلح افراد بھی گشت کرتے دکھائی دیے۔ ان کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ تھی۔ ممکن تھا اندر بھی کچھ لوگ ہوتے۔ یہ عمارت کے سامنے کا زاویہ تھا۔ زبیدہ نے اپنی آنکھوں سے دوربین ہٹائی اور جیب سے ڈیجیٹل ڈائری نکال کر اس کا جائزہ دینے لگی... وہ اس کی ریکنگ کرتی رہی اور بالآخر اس عمارت کی اسکرین پر شبیہ ابھری اور ساتھ ہی عمارت کا نام بھی مینشن ہونے لگا ... اور پھر دوسرے ہی لمحے زبیدہ کی کنپٹیاں فرط جوش سے سنسنانے لگیں۔ جب اسے پتا چلا کہ یہ عمارت درحقیقت اسپائی اسٹیشن کا بیس کیمپ تھی... جسے چارجنگ سینٹر کا نام دیا گیا تھا... زبیدہ ہونٹ سکیڑے بہ غور...... سوچنے لگی کہ اگر وہ کسی طرح اس عمارت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کی مطلوبہ منزل تک رسائی بھی آسان ہو سکتی تھی۔ ٹھیک

اسی وقت اسے اپنے عقب میں آہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ پلٹی اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً اپنی آنکھوں سے دوربین لگائی چاہی اور تبھی اندھا دھند گئی۔ کسی نے اس پر بھاری کند شے سے وار کیا اور پھر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا...

☆☆☆

"ہمارے پیچھے شاید کوئی گاڑی آ رہی ہے"

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ایک ملازم ریاض نے مطلع کیا۔ عام حالات میں یہ کوئی ایسی خاص چونکانے والی بات نہ ہوتی۔ کیونکہ اس وقت ہر کوئی یہاں اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے پیٹرول پمپ میں جو حالات ... پیش آئے تھے، ان کی رو سے سب کے دل دھڑکے ہوئے تھے..... لہٰذا ریاض کی بات پر سب ہی چونکے تھے۔ جیپنی اپنے حواس پر قابو پانے ہوئے تھی۔ جبکہ حماد ریاض کی بات پر چونکا تھا۔ پھر اس نے بھی گردن گھما کر عقب میں دیکھا تھا۔ پیچھے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ احمد حمادی اور اس کے باپ جمشید حمادی نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔

"گاڑی کی رفتار بڑھا دو۔" جمشید حمادی نے... بہ آواز بلند ڈرائیور طلال سے کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں انکل اس کا۔" حماد نے کہا۔ "گاڑی کی یہی رفتار رہنے دی جائے... ذرا پتا تو چلے معاملہ کیا ہے؟"

"ضروری تو نہیں کہ یہ ہمارا کوئی دشمن ہی ہو؟" ڈاکٹر کمال نے کسی خیال سے کہا۔

"ہاں۔" حماد نے مختصراً کہا تھا۔

ویگن میں موجود ان لوگوں کی تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا... سفر جاری تھا۔ تھوڑا وقت مزید بیت گیا اور اسی دوران انہیں احساس ہوا کہ پیچھے آنے والی گاڑی واقعی ان کے تعاقب میں آ رہی تھی۔ اسی دوران میں جمشید حمادی کی آواز ابھری۔

"میرا خیال ہے کہ گاڑی کی رفتار بڑھا دی جائے۔" اس بار حماد نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ طلال نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

ناہموار صحرائی راستے پر ویگن ہچکولے کھاتی دوڑنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت عقب سے گولی چلنے کی آواز ابھری۔ سب گھبرا گئے۔ اس کے فوراً بعد یکے بعد دیگرے دو تین گولیاں چلیں اور ایک گولی ویگن کے عقبی شیشے کو توڑتی

ہوئی دریاض کے ساتھ بیٹھے ادھیڑ عمر ملازم کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ اس کے حلق سے بھرپور چیخ برآمد ہوئی اور وہ ڈھلک کر اپنے قریب بیٹھے ریاض کے سر تھ جا لگا۔ وین نے محدود ماحول میں خواتین کی دہشت زدہ چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ ڈرائیور کا ہاتھ بھی لمحے بھر کو اسٹیئرنگ پر بہکا تھا۔ وہ سب بری طرح متوحش ہوگئے تھے۔ حماد حلق کے بل چلایا۔

"گاڑی کی اسپیڈ بڑھادو...."

صورت حال کو دیکھتے ہوئے طلال سنبھلتے ہوئے پہلے ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ ڈاکٹر کمال کے چہرے پر فکر و پریشانی عود کر آئی تھی۔ وہ بولا۔ "کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں ہے؟"

اس کی بات کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ اس خاموشی سے اسے جواب بھی مل گیا۔ جو ظاہر ہے نفی میں ہی تھا۔

اسی وقت ایک تواتر کے ساتھ عقب میں فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا... سب لوگ نیچے کو جھک گئے تھے۔ حبیبہ اور دیگر خواتین نے اونچی آوازوں میں رونا شروع کردیا تھا۔ حماد ان سب کو تسلیاں دینے کی کوشش میں مصروف تھا جبکہ خود وہ بھی بری طرح خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ جینی قدرے حوصلے سے کام لیتے ہوئے بچی اور عمر رسیدہ خواتین (ام کلثوم اور حاجراں) کو سنبھالا دینے کی سعی میں مصروف تھی۔ حماد نے بچی سیٹ سے ذرا سر ابھار کر ٹوٹی ہوئی عقبی اسکرین سے پیچھے دیکھا اور قدرے سکون کی سانس لی اور بولا۔

"وہ پیچھے رہ گئے ہیں... گاڑی کی رفتار بڑھائے رکھو۔"

اس کی بات گویا سب کے لیے مژدہ جاں فزا ثابت ہوئی۔ سب سیدھے ہوکر بیٹھ گئے مگر ان کا یہ اطمینان زیادہ دیر نہ رہ سکا تھا کیونکہ اسی وقت ڈرائیور کی لرزتی ہوئی آواز ابھری تھی۔

"وہ...وہ...بس... سامنے... وہ... دیکھو۔"

اس وقت سب لامحالہ پیچھے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کی آواز پر متوجہ ہو کر انہوں نے سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا تو مارے دہشت کے تقریباً سب ہی چلا اٹھے... مسلح افراد کا ایک پورا ٹولہ ان کے راستے پر موجود تھا اور وین کی ہیڈ لائٹس میں وہ سب صاف دکھائی دے رہے تھے۔

"گاڑی مت روکنا، دائیں جانب موڑ لو۔" حماد نے چلا کر کہا۔ طلال نے یہی کیا اور یکدم وین کا اسٹیئرنگ دائیں جانب کو گھما دیا مگر یہ کوشش بھی بارآور ثابت نہ ہوسکی جس کا خمیازہ ڈرائیور طلال کو ہی سب سے پہلے اپنی بھیانک موت کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

وین نے پیچھے کی سمت کو گھوما ہی تھا کہ برسٹ فائر ہوا۔ گولیوں کی پوری بوچھاڑ وین کی ونڈ اسکرین توڑتی ہوئی ڈرائیور طلال کے چہرے پر پڑی۔ اس غریب کو چیخنے کا بھی موقع نہ ملا اور وہ وہیں ڈھلک کر ڈھیر ہوگیا۔ وین بے قابو ہوگئی۔ جبکہ اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا خلا بھٹ کا شکار ہوگیا کیونکہ طلال کے دھڑ پر آدھا سر بچا رہ گیا تھا اور وہ اسی حالت میں حماد کے اوپر آ رہا تھا۔ حواسوں کو معطل کردینے والے اس حادثے کے باوجود البتہ ڈاکٹر کمال نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔ وہ چونکہ ڈرائیور طلال کی سیٹ کے بالکل پیچھے ہی بیٹھا تھا اس لیے اس نے آگے کو قدرے جھک کر وین کا بے قابو ہوتا اسٹیئرنگ تھام لیا تھا۔ طلال کا چونکہ اوپری دھڑ حماد پر جھک گیا تھا لیکن اس بدنصیب کا نچلا دھڑ ابھی سابقہ حالت میں تھا اور اس کا ایک پیر ابھی تک ایکسیلیٹر پر تھا، جو دبا رہ گیا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر کمال کے مقدور بھر اسٹیئرنگ سنبھالنے کی سعی نے فوری طور پر وین کو الٹنے سے تو بچا لیا تھا مگر یہ کوشش زیادہ دیر تک ثمر آور نہ رہ سکی تھی۔ مسلح صحرائی ٹولے نے وین کے ٹائروں پر گولیاں داغی تھیں۔ ٹائر برسٹ ہونے کے دھماکے سے وہ سب گونجے اور وین مست ہاتھی کی طرح دائیں بائیں جھوم کر بالآخر رک گئی۔ وحشت کا ایک طوفان سا اٹھا تھا اور سب کو شدید گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔

اسی وقت وین کے سائڈنگ دروازے مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ کھلنے لگے اور بیک وقت کئی گنیں ان کی طرف اٹھتی چلی گئیں اور ساتھ ہی ایک کرخت آواز گونجی۔

"سب لوگ اپنے ہاتھ اپنی گردنوں کے پیچھے موڑ کر وین سے باہر آجاؤ۔ کسی نے ذرا بھی چالاکی کی تو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔"

خواتین نے بین کرنا شروع کردیا تھا جنہیں خونخوار غراہٹ کے انداز میں ڈپٹ کر خاموش کروا دیا گیا... یہ لوگ سب باری باری وین سے نیچے اتر آئے۔ خوف سے ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ جینی کو بھی اب اپنے حواسوں پر قابو نہ رہا تھا اور اس کا خوبصورت چہرہ اس وقت خوف سے پیلا زرد ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر کمال اور حماد ان... صحرائی راہزنی ٹولے کا جائزہ لینے رہے تھے۔ اگرچہ ان کی اپنی ذہنی حالت و کیفیت دگرگوں تھی۔

یہ سب کل دس بارہ کی تعداد میں تھے۔ سب ہی لمبے تڑنگے اور خاکستری رنگ کے چہروں والے بدقماش ہی نظر

آتے تھے۔ ان میں جو نسبتاً گھٹے قد اور گینڈے جیسی جسامت کا آدمی تھا، وہ اس ٹولے کا سردار نائپ شے ہی دکھائی پڑتا تھا۔ اس کے سیاہ رو چہرے سے سنگ دلی اور بے رحمی ہویدا تھی اور آنکھوں سے، دل دہلا دینے والی دہشت مترشح ہو رہی تھی۔ ان کے قریب اونچے ہڈوں والی دو گاڑیاں تھیں، جن کے ٹائر غیر معمولی طور پر چوڑے اور سسپنشن بہت اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ نمایاں طور پر یہ گاڑیاں صحرا میں بہ آسانی دوڑنے کے لیے ہی بنائی گئی تھیں۔ اضافی ہیڈ لائٹس بھی نصب تھیں جس کے باعث وہاں اس وقت دن کا سماں لگتا تھا۔

اس دوران میں ایک عجیب بات ہوئی۔ ایک گاڑی اور بھی۔۔۔۔۔۔ نمودار ہوئی، وہ چونکے تھے، حماد اور کمال وغیرہ بھی سمجھے تھے کہ یہ وہی گاڑی تھی جو ان کے تعاقب میں تھی۔ وہ گاڑی قریب آ کر رکی اور اس کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ انہیں دیکھ کر حماد اندال کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور چہرہ یکدم دھواں دھواں سا ہونے لگا۔ وہ ان دونوں کو پہچان چکا تھا، ایک تو ابن قصی تھا، جبکہ دوسرا اس کا وہی ساتھی تھا جسے اس نے ڈیرے پر اس نے قصی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پایا تھا۔۔۔۔

حماد نے دیکھا قصی کے سیاہ رو چہرے پر بڑی مکارانہ مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ ان کی طرف اسی نظروں سے تکتا ہوا راہزنوں کے سردار کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں یوں آپس میں بے تکلفی سے ملے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

"رشید۔۔۔! نئے مہمان مبارک ہوں تمہیں۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ یہ لوگ گئے ہاتھ سے۔۔۔" قصی نے سردار رشید کے نام سے پکارتے ہوئے کہا تو حماد اور جمشید حماد کے بشروں پہ طاری تشویش کے سائے مزید گہرے ہو گئے۔

"جاتے کیسے بچ کر۔۔۔۔ تمہاری بروقت اطلاع پر میں اپنے ٹولے سمیت یہاں آن پہنچا تھا۔" راہزنوں کا سردار رشید بولا۔ ان کی گفتگو سے یہ بات اب حماد وغیرہ پر عیاں ہونے لگی تھی کہ ان دونوں خبیث شیطانوں کا آپس میں پرانا گٹھ جوڑ تھا۔ نیز راہزنوں کے اس ٹولے کو ادھر متوجہ کرنے میں بھی یقیناً قصی کی ہی شرارت کا دخل ہوگا۔

"چلو اب وقت ضائع کیے بغیر شکار آپس میں بانٹنے کی بات کرو، مجھے یہاں سے واپس لوٹنا بھی ہے۔" قصی نے ایک نظر ان سے مڑے ان سب قیدیوں پر ڈالتے۔۔ وہ رشید سے کہا تو وہ مکروہ لہجے میں بولا۔

"شکار بھی بانٹ لیں گے۔۔۔۔ برادر قصی! لیکن میں یہ گوری چمڑی والی حسینہ اور وہ نازک سی نوعمر دوشیزہ تمہارے حوالے ہرگز نہیں کروں گا۔" رشید کا اشارہ جینی اور حبیبہ کی طرف تھا۔ اس کی آنکھوں سے بلا کی ہوس کاری اور شیطانیت ٹپک رہی تھی۔ حماد اور ڈاکٹر کمال اس کی لغو بیانی پر اندر ہی اندر سنگ کر رہ گئے تھے۔ ان شیطان رشید کے منہ سے اپنی بہن حبیبہ کے لیے یہ الفاظ ناقابل برداشت تھے۔

جواب میں قصی بھی خباثانہ مسکراہٹ کے ساتھ رشید کی طرف دوستانہ انداز سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جانتا ہوں میں تمہاری فطرت کو، تمہیں تمہارے شکار مبارک ہوں۔ مجھے صرف شائل اندال کی بیوہ اور بیٹا حماد اندال چاہئیں، ہم ان کے سر قلم کر کے اپنے آقاؤں کو طشت میں سجا کر پیش کریں گے۔۔۔ تاکہ ہماری حکومت آئندہ مستحکم ہو سکے۔" نامراد قصی کی بات پر حماد اور اس کی ماں اندر سے لرز گئے۔ حاجراں بے چاری کو تو غش آ گیا۔

ادھر رشید ایک شیطانی قہقہہ اگل کر قصی سے بولا۔

"کٹھ پتلی حکومت کیوں نہیں کہتے۔۔۔۔"

"ایک ہی بات ہے، برادر! اس حکومت کے تو بروادم جنرل نے خواب دیکھے تھے۔۔۔۔۔ آج ان کی تعبیر کا وقت ہوا چاہتا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ کٹھ پتلی کی پشت پر سپر پاور ہو تو پھر کیا ڈر۔۔۔۔ لیکن ہمارا بھی خیال رکھنا ہوگا تمہیں۔۔۔۔؟"

"تمہیں کب روکا ہے؟" قصی نے کہا۔ "جاؤ۔۔۔۔ بخدا تمہارے حوالے ہے، اس کے بے چنگیز خان بن جاؤ۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔"

آخری پہر کے اس شب گزیدہ صحرا میں، ان دونوں شیطانوں کے قہقہے، ڈرے سہمے دلوں میں ہولناک قیامت جگا رہے تھے۔

☆☆☆

اسرائیلی بحریہ کے ریئر ایڈمرل، اروو ت یہود نے عابد شنکھری کو مار مار کر ادھ موا کر ڈالا تھا۔ عابد کی دردناک چیخیں اب گھٹی گھٹی کراہوں میں بدل گئی تھیں اور اس پر نیم بے ہوشی سی طاری ہونے لگی تھی۔۔۔۔ یہود نے باؤلے کتے کی طرح چلا کر اپنے آدمیوں سے تحکمانہ کہا۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔۔۔۔ میں اسے اتنی آسانی سے مرنے نہیں دوں گا۔۔"

دو آدمی فوراً حرکت میں آئے۔ ایک نے نڈھال عابد کو بے دردی سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ دوسرے نے اس کے

ستے ہوئے چہرے پر پانی کی بالٹی الٹ کر انڈیل دی۔ چھت کی وسط میں ایک فولادی چرخی جھول رہی تھی...... جس کے ساتھ آہنی زنجیر کے دو سرے منسلک تھے، عابد کو سہارا دے کر کھڑا کیا گیا اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر زنجیروں میں جکڑ دیے گئے اور پھر ایک چرخی کھینچ کر عابد کو ننگے فرش سے دو فٹ اوپر اٹھالیا گیا۔ اب وہ فضا میں معلق تھا۔

اس کا سر سینے کی طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ وہ دائیں بائیں جھول رہا تھا... یعود نے اس کے سر کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور چہرہ اوپر کو اٹھالیا اور بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا... "میرے سوال کا جواب دو..... تمہارے اور کتنے ساتھی تمہارے اس مشن میں شامل ہیں؟"

"ایک ...ایک سو... ایک ہزار.....ایک کروڑ... تت.....تم......کتے یہودی! کتنوں کو مارو گے...؟" عابد نے تختۂ مشق بنے رہنے کے باوجود.... جرأت رندانہ کا مظاہرہ کیا ... اور یعود کا مکروہ چہرہ جیسے غصے کے باعث مسخ ہو کے رہ گیا۔ آنکھوں سے غیظ و غضب کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں اور پھر اس نے نفرت و غیظ کے مارے ....اپنے قریب کھڑے ایک آدمی سے گن جھپٹ لی اور اس کا لاک اوپن کر کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب اس کی گن کی نال، عابد کے جھولتے ہوئے وجود پر عین سینے کے مقام کا نشانہ لیے ہوئے تھی۔

عابد نے نیم باز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اسے اپنی موت صاف دکھائی دینے لگی ... یعود کی انگلی رائفل کی لبلبی پر...... ایک ذرا حرکت کی منتظر تھی معاً ہی .... کمرے کے کھلے دروازے سے ایک اہلکار اندر داخل ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر ایڈمرل یعود کے کان میں کچھ کہا، جسے سن کر وہ بری طرح ٹھٹکا..... کچھ سوچ کر اس نے لبلبی سے اپنی انگلی ہٹا دی اور پھر عابد کو معاندانہ نظروں سے گھورتا ہوا، اسی آدمی کے ساتھ تیزی سے پلٹا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا... باقی سب بھی کمرے سے نکل گئے۔ دروازہ دھڑام سے بند ہو گیا۔ حالت ابتر...... کے باوجود اس کے زخمی چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

پیغام لانے والے نے فقط اس سے یہ کہا تھا کہ جزیرے سے ایک جاسوس عورت کو پکڑا گیا ہے، شبہ ہے کہ وہ اسی شخص (عابد) کی ساتھی ہے.....یعود کے لیے... ظاہر ہے یہ خبر معمولی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ اس وقت عالم طیش میں عابد کے سینے میں گولی اتارنے کا پکا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر اس اہم اطلاع پر کچھ سوچ کر اس نے اپنا یہ ارادہ بدل ڈالا تھا۔

پکڑی جانے والی جاسوس زبیدہ ہی تھی، جسے خفیہ گشتی کمانڈوز نے میں پوائنٹ کے قریب سے پکڑا تھا اور اس کے سر پر بھاری گن کا کندا رسید کر کے بے ہوش کر دیا گیا تھا اور پھر اسے اسی حالت میں ایک گاڑی میں ڈال کر اسپائی اسٹیشن کے ایک دوسرے ٹارچر سیل میں پہنچا دیا گیا تھا۔

اسے ہوش میں لایا جا چکا تھا۔ یعود جب اس کمرے میں پہنچا تو زبیدہ مکمل طور پر ہوش میں آچکی تھی... اور خود پر اس نے دانستہ خوف اور سراسیمگی طاری کر رکھی تھی... جیسے وہ کوئی عام سی عورت ہو... یعود پہلے تو اسے قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر غور کرنے پر اس کے چہرے پر تھوڑا الجھن کے آثار نمودار ہوئے...

"کون ہو تم؟"

"مم... میں ... ڈڈ... ڈیمیا ہوں۔" زبیدہ نے اپنی "ایکٹنگ" جاری رکھی۔

"کون ڈیمیا؟" یعود نے اپنی بھویں سکیڑیں۔

"چچ..... چیک کی محبوبہ... ڈیمیا...." زبیدہ نے جواب دیا اور کچھ سوچ کر ہی اس نے یہ کہا تھا، جو ایک طرح سے اندھیرے میں تیر چلانے کے ہی مترادف تھا لیکن یہ تیر ٹھیک نشانے پر ہی لگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا...... کیونکہ اس جواب پر یعود نہ صرف ذرا چونکا تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں تشکیک کے سائے اب کسی پرسوچ تاثرات میں بدلتے دکھائی دینے لگے تھے تاہم وہ اتنی آسانی سے اس پر اعتبار کرنے والا بھی نہ تھا البتہ زبیدہ کے تخویف بھرے لہجے اور سراسیمہ حرکات و سکنات نے اسے کچھ ڈگمگا دیا تھا۔ پھر زبیدہ کے پاس ایک ایسا "ادھورا سچ" بھی تھا جس نے اس کے اندھیرے میں پھینکے ہوئے تیر کی "افادیت" بھی... دوچند کر دی تھی...

کیونکہ یہاں تک تو حقیقت ہی تھی کہ چیک ڈوکر کے جو دو ساتھی، چیک اور روجر، واند و مذاکرات کے سلسلے میں یہاں آئے تھے، زبیدہ بھی اپنے منصوبے کے تحت ان کے ساتھ تھی، اور خود کو ان کے سامنے (کھاڑی میں موجود اسرائیلی چوکی میں) وہ ڈیمیا کے نام سے اور خود چیک کی "گرل فرینڈ" کی حیثیت سے متعارف کروا چکی تھی۔ اور یہ معلومات یقیناً ان کے روانہ ہونے سے پہلے ہی یہاں پہنچ دی گئی تھیں۔ زبیدہ کے ذہن میں اس طرح کا سارا خاکہ پہلے سے موجود تھا۔ لہٰذا اب وہ اسے ہی بروئے کار لانے کی کوشش کرتے ہوئے یعود کو ڈاج دے رہی تھی۔ تاہم بات اتنی ہی بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس قدر آسان .... کیونکہ

اگر یہ لوگ اس کی بات پر یقین کر بھی لیتے تو پھر بھی وہ اسے یعنی زبیدہ کو زندہ نہیں چھوڑتے کیونکہ یہاں غلطی سے بھی آنے والے کسی عام آدمی کو یہ ہرگز بھی زندہ واپس جانے دینا بھی ان کے اصولوں کے خلاف تھا اور اس حقیقت کا اندازہ زبیدہ کو بھی بخوبی تھا، چنانچہ وہ پہلے ہی ایک دوسری پلاننگ پر عمل پیرا تھی۔

یعقوب نے پوچھ گچھ کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے اس سے اگلا سوال کیا۔ "تم کب سے ان لوگوں کے ساتھ ہو؟"

زبیدہ کو اب اس کے ہر سوال کا جواب اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بہت سوچ سمجھ کر دینا تھا، بولی۔ "یہ دونوں مجھے پانچ سو سنہ ایک ہوٹل میں ملے تھے۔ وہیں میں نے ان کی گفتگو سن لی تھی اور مجھے پتا لگا کہ یہ دونوں اس جزیرے سے نکل کر آئی لینڈ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہوئے ہیں۔ جدھر میں اور میرے ساتھی بھی جانا چاہتے تھے مگر افسوس... کہ ان دونوں نے مجھے پکڑ لیا۔" ... وہ یہ کہتے ہوئے باقاعدہ رو پڑی... مگر یعقوب اس کی بات سن کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ اب تک یہی سمجھا تھا کہ ان کے راز سے صرف مسنگل کا مافیائی باس چیک ڈوگر ہی واقف تھا مگر یہاں تو یہ غائب نظر آنے والی لڑکی بھی اتنے اس جزیرے کے بارے میں علم تھا۔ ضرور اس کے اور ساتھی بھی ہوں گے... وہ خاصا پریشان ہو گیا۔

اس نے بڑی محنت سے اس اسرائیلی منصوبے کو اب تک راز میں ہی رکھا تھا۔ مگر جانے کس طرح ایک مافیائی گروپ کا چیف چیک ڈوگر اس سے نہ صرف واقف ہو گیا، بلکہ ثبوت کے طور پر اس نے یہ بات آشکار کرنے سے پہلے ... نہایت خاموشی سے یہ راز اڑا لیے تھے جن میں اسپائی اسٹیشن کے بارے میں ساری مفصل اساس اور اہم معلومات شامل تھیں...

چیک ڈوگر کا گروہ بڑے پیمانے پر بلیک میلنگ کا کام کرتا تھا اور ملک کی بڑی اور اہم سیاسی و غیر سیاسی شخصیات کو بلیک میل کر کے بڑی بڑی رقمیں بٹورا کرتا تھا۔ بسا اوقات تو حکومتوں کو بھی اسی طرح ان کے اہم راز اڑا کر انہیں بھی بلیک میل کرتا۔

کسی طرح جب چیک ڈوگر کو اٹلی اور اسرائیل کے درمیان ہونے والے اس خفیہ معاہدے کی بھنک پڑی کہ اسرائیل نے اپنے حلیف اٹلی سے اس قسم کا معاہدہ کیا ہے اور مسنگل میں واقع ایک جزیرہ بھاری معاوضے اور کرائے پر لیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہاں سے علاوہ بھی اٹلی کو اور بھی فاصلے پر پہنچنے کا پابند تھا، نیز یہاں اسرائیل اپنا ایک خفیہ اسپائی اسٹیشن تعمیر کرنے کا، درحقیقت بحیرۂ روم میں اپنا عسکری کنٹرول حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یوں وہ لیبیا اور اس کے قرب و جوار میں واقع عرب ممالک پر نہ صرف نظر رکھتا، بلکہ اہم مقصد لیبیا سے فلسطین جانے والی امداد اور ہتھیار وغیرہ کے بحری جہازوں کو بآسانی تباہ بھی کر سکتا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، اس ضمن میں اسرائیل کے اٹلی کے ساتھ بہت پرانے مراسم تھے... دراصل اسرائیل نے اپنے مخصوص پروپیگنڈا اسٹائل میں اٹلی کو خوف زدہ کر رکھا تھا کہ بحیرۂ روم کی ساحلی پٹی پر جتنے بھی اسلامی ممالک ہیں وہ متحد ہو کر کسی وقت بھی اٹلی کے لیے کوئی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں... وغیرہ۔

بہرطور یہ بین الاقوامی طور پر رائج اصولوں کے منافی ایک معاہدے کی اہم خفیہ دستاویز...... چیک ڈوگر کی مافیائی تنظیم "بلیو شارک" کے ہاتھ لگ گئی اور ان کے اس اہم راز کو اشکار رکھنے کی بجائے انہوں نے اسرائیلیوں سے ایک بھاری رقم بطور "بھتے" کے مقرر کرانے کی ٹھانی۔ ادھر اسرائیلیوں نے انہیں مذاکرات کی آڑ میں ڈاج میں رکھا اور دوسری طرف درپردہ انہوں نے اپنے کمانڈو ان کے پیچھے لگا دیے، جنہوں نے نہ صرف وہ اہم راز اڑا لیے بلکہ بلیو شارک کے چیف چیک ڈوگر کا ہی خاتمہ کر ڈالا۔

اسرائیلی کمانڈوز نے بڑی خاموشی، چابکدستی اور مکاری سے یہ آپریشن نمٹایا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی کہ آخر ہوا کیا تھا؟ اور کیوں ہوا تھا؟

بہرطور...... زبیدہ نے دانستہ یعقوب سے ایسی بات کی تھی جو اسے اندر سے چونکا گئی تھی، یہی سبب تھا کہ اس نے فوراً پوچھ ہی لیا۔ "تمہارا یہاں آنے کا کیا مقصد تھا؟"

اس نے بالآخر زبیدہ سے وہی سوال کیا جس کی اسے توقع تھی، جواباً بولی۔ "میں درحقیقت چپ اور رو رو کر بے وقوف بنا رہی تھی...... میں خود فوڈ آئی لینڈ میں ایک خفیہ مہم جوئی کا ارادہ رکھتی تھی، مگر ہمارے پاس وسائل کی کمی تھی۔ ہمیں پتا لگا تھا کہ اس جزیرے میں بازنطینی اور رومی سلطنت کے دور کا کوئی خزانہ دفن ہے، ہم اسی کی کھوج میں تھے... پہلے میں اس کا کھوج لگانے کے بعد واپس جا کر اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرتی اور پھر ہم دوبارہ پوری تیاری کے ساتھ یہاں آتے۔"

خزانے کے ذکر پر یعقوب کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ "خزانہ" اور "خزانے کی"

"تلاش" ابتدا ہی سے اور اب بھی دور جانے کب تک...... بنی نوع انسان کے لیے سنسنی اور لالچ کا ہی باعث رہا ہے... ایڈمرل یعقوب کی بات اگرچہ اور بھی تھی مگر حقیقت پھر وہی تھی کہ... وہ اس خزانے کو حاصل کر کے اپنے ملک "اسرائیل" کو فائدہ پہنچانے کا سوچ رہا تھا، ان دنوں ویسے بھی اسرائیل پر بھارت کی طرح خطرناک ہتھیاروں کی خریداری کا جنون سوار تھا اور اس کے لیے اسرائیل کو ایک خطیر سرمائے کی ضرورت تھی...... بہت سا سرمایہ تو اس کا فلسطینیوں سے جوابی کارروائی میں ضائع ہو چکا تھا جو اب بھی ہو رہا تھا...

یہی سبب تھا کہ یعقوب ابھی تک زبیدہ کی باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے سب سے پہلے تو زبیدہ کو ورچوئل سیل سے نکلوا کر ایک نسبتاً بہتر کمرے میں منتقل کرنے کا حکم جاری کیا۔ وہ اس سے اس بارے میں اب تفصیلی گفتگو کرنے کے موڈ میں تھا جبکہ ادھر زبیدہ بھی جانتی تھی کہ اس کا یہ "حربہ" زیادہ دیر کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا مقصد تو محض اتنا تھا کہ اول تو وہ فوری طور پر ان کی بربریت سے محفوظ رہے، دوسرا یہ کہ وہ اسے ایک عام "خانہ آزما" سمجھتے ہوئے اسے معمولی عورت سمجھ کر نظر انداز نہ رکھیں اور تب تک اسے کوئی "گل" کھلانے کا موقع مل سکے۔

☆☆☆

یہ بالکل آخری اور اہم لمحات تھے... جس کا اندازہ دونوں کو تھا۔ یہی سبب تھا کہ ان نازک اور سنگین تر حالات میں کوئی بھی ایک دوسرے کے ہاتھوں زیر نہیں ہونا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی کپتان پریمانن نائمہ پر جھپٹا وہ بھی اس سے غافل نہ تھی۔ ایک جنونانہ سی کیفیات کا اس وقت وہ خود بھی شکار تھی اور... کسی صورت میں بھی وہ اس یہودی کپتان کو اپنے خطرناک منصوبے میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے ایک ایسے وقت میں جبکہ ہر کوئی اپنی جانیں بچانے کے لیے کوشاں تھا اور آبدوز بھی تباہی سے دوچار ہونے پر تھی، یہ دونوں اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھے...

نائمہ کے ہاتھ سے ابھی ربڑ ماسک نہیں چھوٹا تھا، چنانچہ جیسے وہ اس پر دوبارہ جھپٹا، نائمہ نے اس کی ناک پر اپنی تیز نکیلی انگوٹھی والا پنچ رسید کر دیا۔ پریمانن کا دماغ جھنجھنا گیا، مگر اس نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے دباتا ہی چلا گیا، نائمہ کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ وہ عین آخری اور فیصلہ کن لمحات میں بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھی اور سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے نازک وجود کی ساری ہمت کو مجتمع کرتے... ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی جس میں ابھی ربڑ ماسک دبا ہوا تھا، وہ بھاری ماسک پریمانن کی کنپٹی پر لگا۔ اس کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی لیکن گردن اس نے پھر بھی نہیں چھوڑی تھی۔

آبدوز کے بگل اور خطرے کے سائرن بری طرح چیخ رہے تھے... نائمہ نے بھی ہمت نہیں ہاری اور دوسرا وار کیا۔ اس بار جیسے اس نے پریمانن کی گرفت کمزور محسوس کی۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپی۔ پریمانن کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی جیسے نائمہ پر بھی جنون طاری ہو گیا۔ اس نے پھر پریمانن کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر ربڑ ماسک کے ذریعے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ اسی وقت نائمہ کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ شاید تارپیڈو روم اوپن ہونے کے بعد... وائلٹ تھریٹ اور قریب کے میزائل چیمبر کی زہریلی گیس اب پوری آبدوز میں پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ نائمہ نے فوراً ..... (کیمیکل گیس ماسک)...... اپنے چہرے پر چڑھا لیا ...اسی وقت پریمانن پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ کھانس کھانس کر دہرا ہو گیا اور پھر اپنا سینہ پکڑے فرش پر گر گیا۔ نائمہ نے دیکھا اس کے منہ اور ناک سے نیلے رنگ کی جھاگ بہنے لگی... وہ خطرناک نیورو گیس کی زد میں آ گیا تھا۔ اس کی موت کی تصدیق ہونے کے بعد جب نائمہ کو تسلی ہو گئی کہ اب کوئی بھی... میزائل فائر نہیں کر سکتا تو اسے...... اب اپنی جان بچانے کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ کنٹرول روم کی طرف دوڑی۔ آبدوز تباہ ہونے کے قریب تھی اور اس کے سائرن کی گونج نائمہ کو اپنی محسوس ہونے لگی تھی... وہ کنٹرول روم پہنچی تو وہاں عجیب سماں دیکھنے میں آیا..... نیورو گیس نے وہاں سب کو سراسیمگی اور جنونی بنا رکھا تھا... کچھ گرے ہوئے سسک رہے تھے، مر رہے تھے اور جو زندہ تھے وہ ربڑ ماسک کی کمی کے باعث ایک دوسرے سے چھیننے کے لیے کوشاں تھے اور اس چھینا جھپٹی میں... وہ خود بھی اس زہریلی نیورو گیس کا شکار ہو کر سینہ پکڑے گر رہے تھے... یہ سب اسرائیلی نیوی ٹیکنالوجی کے ٹاپ پروفیشنل تھے وہ ان کا یہ انجام دیکھ کر مطمئن بھی ہو رہی تھی کہ وہ اور عابد اسرائیلیوں کو ایک بڑا دھچکا پہنچانے کے اس نیک مشن میں کامیاب ہو چکے تھے، اگرچہ خود ان کی جانیں بھی داؤ پر لگ چکی تھیں لیکن اب موت بھی آ جاتی تو انہیں کوئی غم نہ ہوتا...

نائمہ کو ڈر تھا کہ...... کہیں اس سے بھی کوئی رسک

ایک کاڑھی دلدل جیسا دھبا دکھائی دینے لگا..... ایک بار پھر وہ ایک نئے عزم اور جوش کے ساتھ تیرنے لگی... پانی کی سطح پر ابھرتے وقت وہ دور نیلگوں ساحل کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ دور نیلگوں کوہستانی بھی تھی۔

وہ اب نارمل رفتار کے ساتھ مذکورہ سمت میں تیر رہی تھی..... جو سیاہ گاڑھی دلدل جیسا دھبا اسے سامنے نظر آرہا تھا، وہ دیکھنے میں تو قریب ہی محسوس ہوتا تھا..... لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے بھی اسے ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے تھے..... وہ ایک ایسے ساحل پر آن لگی تھی، جہاں بہت سخت سڑاند اور "کیچ" پھیلی ہوئی تھی.....نائمہ کا سانس پھولا ہوا تھا..... اور وہ بے دم ہوکر کیچڑ زدہ ساحل پر منہ کے بل جا گری تھی..... اور پھر اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا.....

اس کے عقب میں سمندر پرسکون تھا اور اوپر تاریک آسمان خاموش۔

☆☆☆

کنٹرول روم میں نادرن سی چینل کے سیکٹر آٹھ کے گہرے پانیوں میں موجود کسی خوابیدہ آبی عفریت کی طرح تیرتی ہوئی، اسرائیلی یو بوٹس سیریل کی دوسری اہم ایٹمی آبدوز "آگوستا 9 - k" جس کے اندر..... آر ایس ایم۔18 قسم کے ایٹمی میزائل نصب تھے۔ اس کے صوت گیر مشین کنٹرول کرنے والے..... اسرائیلی سیرین افسر "سونار چیف" گوریان ڈین کے چہرے پر اس وقت ہوائیاں اڑ رہی تھیں... اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں، اپنے سامنے کنٹرول پینل کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، ان میں ناقابل یقین قسم کے تاثرات تھے۔

اسے سمندر میں آگوستا 291 ایک دہکتے ہوئے انگارے جیسے بڑے شہتیر کی طرح سمندر میں غرقاب ہوتی نظر آرہی تھی۔ وہ پاگل ہوگیا..... "اوگاڈ..... اوگاڈ... ٹی ٹی ٹی... یہ... یہ... یہ... ہم... میں کیا دیکھ رہا ہوں.....؟ ناقابل یقین..... یہ کیسے اور کیوں ہوگیا؟" وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑایا۔

اس نے فوراً ایک لیور کھینچ کر ایک خبرداری کا بگل بجا دیا..... اور ساتھ ہی ایک مائیک نما آلہ لے کر اس نے پاگلوں کی طرح چلا چلا کر "ڈے ڈے..... ڈے ڈے....." کہنا شروع کردیا۔

تھوڑی ہی دیر میں آبدوز کے اندر کھلبلی مچ گئی۔ کمانڈ پوسٹ آفیسر سمیت عملے کے دیگر لوگ سونار چیف گوریان کے کمرے میں موجود، پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسکرین پر آبدوز 291 کو تباہ اور غرقاب ہوتے دیکھ رہے تھے۔

"یقین نہیں آتا یہ کیسے ہوگیا؟ کوئی اطلاع بھی نہیں کی ہمیں.....؟ اوہو" کمانڈنگ آفیسر پیتراج نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہہ کر سونار چیف کو دیکھا۔

"یہ آبدوز تو مسلسل ہمارے رابطے میں تھی..... ہمیں تو ایسا کوئی مدد یا سے او ایس کا پیغام نہیں موصول ہوا تھا ان کی طرف سے؟ پھر یہ سب کیسے ہوگیا؟"

"اسے تباہ کیا گیا ہے اور تباہ کرنے سے پہلے اس کے ہائیڈرو فونز سب سے پہلے خراب کیے گئے ہوں گے۔"

"اوہو، یہ آگوستا 291 ہماری یو بوٹس سیریز کی ایک اہم ترین آبدوز تھی۔ یہ اسرائیل کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے... ہم تو برباد ہوگئے... یہ ضرور فلسطینی حریت پسندوں کی کارستانی ہے۔" اسرائیلی کمانڈنگ افسر پیتراج کا غم سے برا حال ہورہا تھا۔

"الل... لیکن یہ کونسے گروپ کی کارروائی ہوسکتی ہے؟ اور پھر اتنی بڑی کارروائی؟" سونار چیف گوریان ڈین ابھی تک بوکھلایا ہوا تھا۔ یہ آبدوز کی صوت گیر (sonar) مشین کنٹرول کرنے والا افسر تھا۔

"میں سمجھ گیا۔" معاً پیتراج دانت پیس کر بولا۔

"یہ یقیناً "غضب خدا" گروپ کی کارروائی ہوگی، انہوں نے اپنے سربراہ خلیل انوزیر اور ابو جواد کے قتل کا بدلہ لیا ہے۔"

ان دونوں کو اس بحث میں الجھا پا کر ایک اور افسر نے مداخلت کرتے ہوئے ان کی توجہ دوسری طرف دلاتے ہوئے کہا۔

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں..... کوانڈو آئی لینڈ میں اس وقت ریئر ایڈمرل جناب اروورت یعود موجود ہیں، انہیں اطلاع کرو فوراً۔" اس کے تھوڑی دیر بعد کمانڈنگ افسر پیتراج لرزتے ہاتھوں سے ہائیڈرو فونز کے آلات سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔

☆☆☆

بڑے جاں گسل لمحات تھے۔ مگر لیلیٰ نے ہمت ہارنا کب سیکھا تھا؟ اس کی تو جیسے پرورش ہی ایسے ہی حوادث کی گود میں ہوئی تھی..... اس نے ایک مجاہد گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جہاں اس نے اپنے بھائی کو، اور پھر اپنے منگیتر کو اسرائیلی غاصبوں سے نبرد آزما دیکھا تھا اور اب اس کا محبوب ساتھی..... بالآخر بھی جام شہادت نوش کرچکا تھا تو وہ کیوں پیچھے رہتی۔ وہ جنرل آئزک فرناش جیسے یہودی شیطان کو جہنم واصل

کرنے کے لیے اور اپنے محبوب ساتھی باقر کی اس مردود کے ہاتھوں ہلاکت کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

جنرل آئزک فرناش نے دوبارہ اپنے ہیلی کاپٹر کو غوطہ کھلانا چاہا، مگر اسی وقت زخمی ہونے کے باوجود علی اس کے سر پر جا پہنچا... مگر نیچے جھولتی لیلیٰ کی بھی فکر تھی، جس کا حل اس نے فوری طور پر یہ نکالا تھا کہ رسی اس نے نیچے جھولتے رہنے دی تھی مگر اس کا دوسرا سرا اب خود پکڑے رکھنے کے بجائے... ایک کونے ہک کے ساتھ باندھ دیا تھا... ادھر علی اور جنرل آئزک کے درمیان دوبدو معرکہ شروع ہو گیا تھا... دونوں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے...

فرناش نے بھی ہیلی کاپٹر کو آٹو پائلٹ پر رکھ دیا تھا۔

جنرل فرناش نے پستول نکالنے کی سعی کی مگر علی نے اس کے پستول والے ہاتھ پر زور سے جھپٹا مارا تھا۔ پستول چھوٹ کر نیچے فرش پر کہیں لڑھک گیا... فرناش نے ایک موقع پاتے ہی علی کی ٹھوڑی پر اپنے بھاری ہاتھ کا گھونسا جڑ دیا... وہ پیچھے کو الٹ گیا۔ فرناش بھیڑیے جیسی غراہٹ کے ساتھ اس پر دوبارہ جھپٹا اور اسی وقت اس کے ہاتھ میں ایک آہنی راڈ آ گئی۔ وہ راڈ اس نے علی کے سر پر رسید کر دی۔ علی کے حلق سے ایک اذیت ناک کراہ خارج ہوئی... اس کا ذہن ڈوبنے لگا، لیکن اس وقت اسے خود سے زیادہ اپنی لیلیٰ کی فکر تھی... اس نے خود کو سنبھالا دیا۔ اسی وقت فرناش اس پر دوبارہ راڈ سے حملہ آور ہوا تو علی نے اس کے پیٹ پر لات رسید کر دی، جو زیادہ کارآمد تو ثابت نہ ہوئی، تاہم اس سے فرناش کا توازن تھوڑا بگڑا اور راڈ کا وار علی کے سر کے بجائے اس کے بائیں کاندھے پر پڑا۔ درد کی ایک جاں کش لہر جیسے علی کے پورے وجود میں اتر گئی... مگر ہمت نہیں ہاری۔ اسے خوب احساس تھا کہ وہ اس وقت اپنے ایک بڑے دشمن سے برسرِ پیکار تھا... جو نہ جانے کتنے ہی بے گناہ اور مظلوم فلسطینیوں کا قاتل بھی تھا...

وہ سنبھلا اور پھر ایک نئے جذبۂ جنوں کے ساتھ فرناش پر پل پڑا... ادھر لیلیٰ نے جھولتی رسی کو دوبارہ تھام کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا تھا... ایک جوش تھا وہ اپنے زخم کو بھی بھلا بیٹھی تھی... اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار باقر کا چہرہ گردش کر رہا تھا... وہ انتھک کوشش کے بعد وہ ہیلی کاپٹر کے اندر تھی... وہاں اس نے دیکھا کہ فرناش اور علی آپس میں نبرد آزما تھے لیکن علی کے مقابلے میں فرناش کا پلڑا بھاری تھا... ادھر فرناش کی نظر جب سامنے کھڑی لیلیٰ پر پڑی تو اس کے چہرے پر ایک ساتھ کئی حیرت و خوف کے تاثرات نمودار ہو گئے... لیلیٰ... جوش بھرے سرخ چہرے اور شعلے برساتی لال انگارہ آنکھوں سے جنرل فرناش کو گھور رہی تھی... نہ جانے پھر کیا ہوا شاید یہ لیلیٰ کی وحشت کا اثر تھا یا پھر فرناش کے دل و دماغ پر خوف غالب آ گیا تھا کہ اس نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی... آٹو پائلٹ کا بٹن آف کر کے اس نے ہیلی کاپٹر کا رخ سامنے سنگلاخ پہاڑیوں کی طرف کر دیا اور ساتھ ہی آٹو سسٹم بھی لاک کر دیا... اور پاگلوں کی طرح قہقہہ لگا کر بولا...

"آؤ... بچو! مارو مجھے... مگر تم دونوں بھی نہیں بچ پاؤ گے اب... ہا... ہا... ہا۔"

اس پر وہی پرانا جنونی دورہ طاری ہو گیا تھا، جو شکست کھاتے وقت اس پر حاوی ہو جایا کرتا تھا۔

"لیلیٰ! یہ سنبھالو..." اچانک علی نے چلا کر کہا اور ساتھ ہی اس نے ایک پیراشوٹ اس کی طرف اچھال دیا... وہ دونوں سیٹوں کے درمیان تھا... اور اس کا آدھا حصہ نظر آ رہا تھا۔

لیلیٰ نے صورتحال کی نزاکت اور خطرناکی کو بھانپتے ہوئے بسرعت پیراشوٹ چڑھا لیا... فرناش نے اس کی طرف پیش قدمی کرنا چاہی تو علی نے اسے دبوچ لیا... اور دوبارہ چیخ کر لیلیٰ سے بولا۔

"لیلیٰ! خدا کے لیے کود جاؤ... وقت نہیں ہے... تمہیں زندہ رہنا ہے..."

لیلیٰ چونکی، اسے اب پتا چلا تھا کہ پیراشوٹ ایک ہی تھی، جو علی نے اس کی طرف اچھال دیا تھا... مگر لیلیٰ کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے ساتھی کو موت کے منہ میں چھوڑ دے... وہ آگے بڑھی... وہ علی کو بھی اپنے ساتھ لے کر ہیلی کاپٹر سے نیچے کودنا چاہتی تھی... مگر علی فرناش سے لپٹا ہوا تھا... اور فرناش اس سے۔

پہاڑیاں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں... ادھر دونوں جیسے ہی لیلیٰ کے قریب آئے... علی نے لیلیٰ کو دھکا دے دیا... لیلیٰ ہیلی کاپٹر سے نیچے جا گری... اس کا پیراشوٹ کھل گیا مگر اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا... ہیلی کاپٹر... ایک پہاڑی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا... کسی بم کی طرح بلاسٹ ہوا اور آگ کے سلگتے ہوئے گولے میں تبدیل ہو کر جلتے ٹکڑوں کی صورت... سنگلاخ ڈھلوانوں میں بکھرتا چلا گیا...

(جاری ہے)

بنگلا برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت اس کے لان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مہمانوں میں شہر بھر کے بڑے تاجر، سیاست کے کھلاڑی، سرکاری افسران، شوبز کے لوگ۔ گویا شہر بھر کی کریم یہاں جمع تھی۔ یہ بنگلہ منظر کا تھا۔ جس نے گارمنٹس کی دنیا میں خاص پہچان بنا رکھی تھی۔ یورپ اور امریکا کی کمپنیوں میں خاصا نام تھا اس کا اور یہ مقام اسے مقامی ہنرمندوں نے دلوایا تھا جن کو وہ چند ٹکے بطور محنتانہ ادا کرتا تھا اور کئی گنا زیادہ منافع کما لیتا تھا۔

انتقام

پرویز بلگرامی

کہتے ہیں کہ بل کھاتی ناگن اور ناکام عاشق کا انتقام بہت دہشت ناک ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس کی ناکامیوں نے اسے ایسی طاقت بخشی تھی جس کے بل پر اس نے اپنے تمام مطلوبہ بدلے کس بل بخوبی نکال دیے تھے...... ان کے سروں پر گویا یوم حساب کا عذاب نازل کردیا تھا۔

گن گن کر بدلہ لینے کا ایک انوکھا طریقہ

اور عبرت انگیز منظر
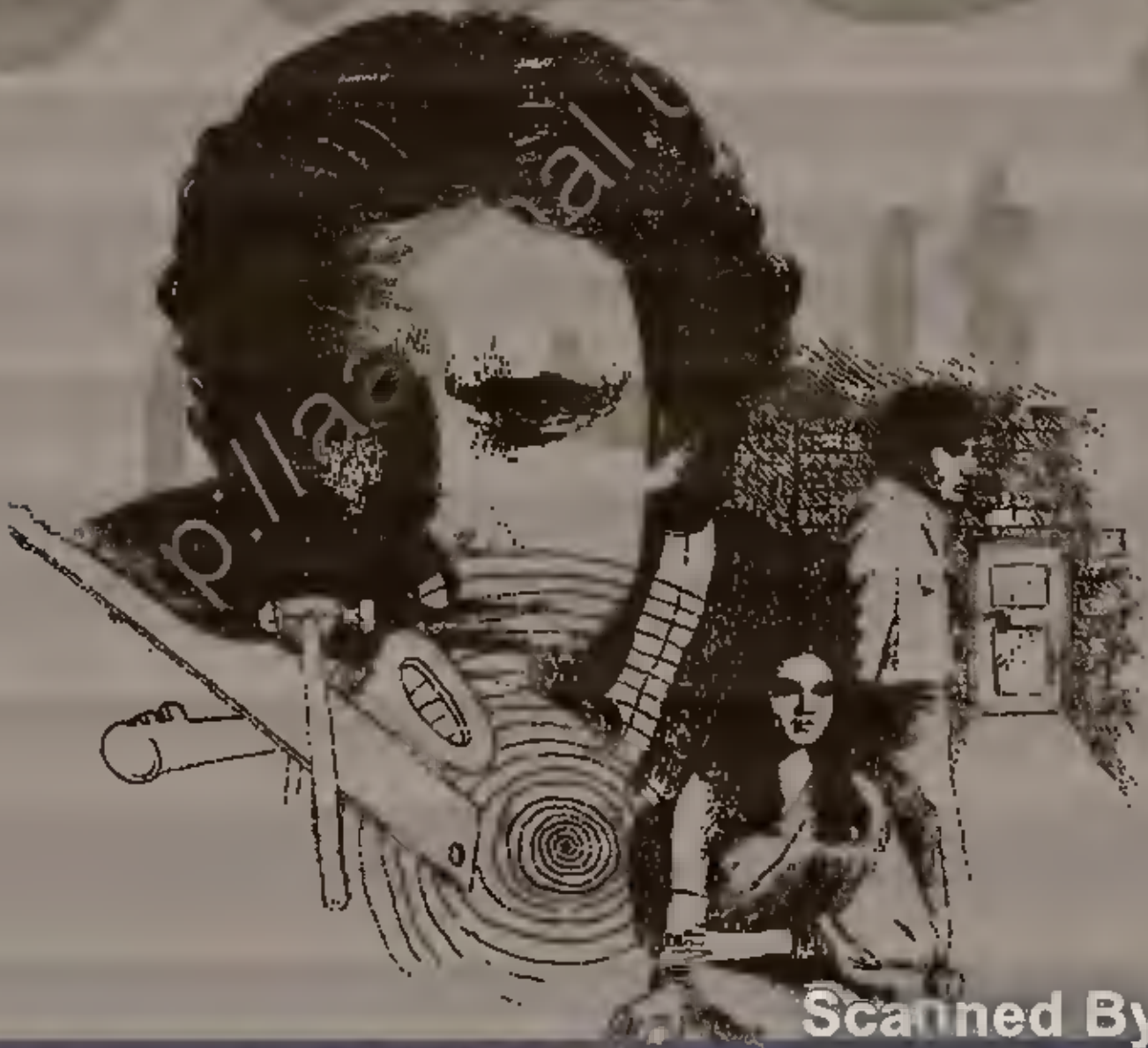
منافع کا گراف کیا تھا یہ بینک اکاؤنٹ سے واضح تھا۔ جو اسے شہر کی اہم شخصیت بنانے میں کردار ادا کررہا تھا۔

شہر کی اہم شخصیت ہونے کی وجہ سے ہی آج یہاں اتنے لوگ جمع تھے۔ کہنے کو یہ انگیج منٹ پارٹی تھی مگر اس کا اصل مقصد رابطے بحال کرنا تھا۔ پارٹی میں شہر کی کریم آئی ہوئی تھی۔ یہی لوگ سیاہ کو سفید کرنے والے تھے جن سے بہت سارے کام نکلتے تھے۔ ڈیل کے لیے مواقع فراہم ہوتے تھے۔

ثنا جس کی منگنی ہونے والی تھی لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی تھی۔ یہ تمام لڑکیاں شہر کے باحیثیت گھروں کی تھیں۔ اس لیے بے تکلف بھی تھیں۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ ایک طرف نوجوانوں میں گھرا راحیل بیٹھا تھا۔ یہی ثنا کا منگیتر تھا۔ وہ بھی ایک بڑے بزنس مین کا بیٹا تھا۔ اس کے والدین سمجھ رہے تھے کہ ان کے بیٹے کی قسمت مزید جاگ اٹھی ہے۔ وہ اس خوشی میں ایک اور پارٹی دینے کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ دراصل انہیں ان مہمانوں میں سے کئی ایک کام کے بندے دکھائی دے گئے تھے اور وہ بھی ان کو نظروں میں رکھ چکے تھے۔ ان سے کچھ کام لینا چاہتے تھے۔ پورٹ پر ان کے کئی کنٹینر پھنسے ہوئے تھے وہ نکلوانے کی تدبیر کرنا چاہتے تھے۔ تبھی ایک بندے نے آکر ان کے کان میں کچھ کہا اور وہ گھبرا کر اٹھ گئے۔

بیگم ان کو باہر جانے تک دیکھتی رہیں۔ راحیل نے بھی ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اپنی باتوں میں مشغول ہوگیا۔ اس لیے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ وہ انڈر دی ٹیبل کام کرانے کے عادی تھے اس لیے ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کے قائل نہ تھے۔

راحیل دوستوں میں گھرا بیٹھا تھا اور ٹیبل پر رکھی ڈرنک سے دل بہلا رہا تھا۔

"یار تو کیسا شوبز مین ہے۔ اس سے شوق نہیں کرتا۔" راحیل نے گھونٹ لے کر ایاز سے کہا۔

"نہیں یار...... مجھے وومٹنگ ہوجاتی ہے۔"

"تمہارے ڈیڈ تو سنا ہے نیٹ پی لیتے ہیں؟" راحیل نے سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں انہیں عادت ہے مگر مجھے نہیں......" ایاز نے منہ بنا کر جواب دیا اور جوس کا گلاس اٹھالیا۔

کھانے کا دور کب کا ختم ہوچکا تھا۔ یہ لوگ مرغن غذا کو ہضم کرنے کی ترکیب کے لیے بیٹھے تھے۔ باقی مہمان بھی آہستہ آہستہ جانا شروع ہوگئے تھے۔ رات کے تقریباً بارہ بجے تک لان خالی ہوگیا۔ اب صرف گھر والے رہ گئے تھے۔ راحیل کے ڈیڈی درمیان میں اٹھ کر گئے تھے تو اب واپس آئے تھے۔

"چلو بچو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" بیگم نادرہ نے ان سب کو مخاطب کیا اور شوہر کی بانہیں پکڑ کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆

راحیل اور ثنا کے خاندان یورپی ثقافت کے علمبردار تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں جسے زندگی گزارنا ہے ان دونوں کو خوب مل بیٹھ لینا چاہیے تاکہ زندگی میں آسانیاں پیدا ہوسکیں۔ دونوں ایک دوسرے کو جان سکیں۔ یوں بھی کافی عرصے سے ثنا اور راحیل ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل رہے تھے، اس لیے آپس میں اتنے بے تکلف تھے۔ اس وقت جب تمام مہمان جاچکے تھے۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے بحث میں حصہ لے رہے تھے۔

"آپ کچھ بھی بولیں مگر میں تو یہی کہوں گا کہ آپ نے غلطی کی ہے۔ کارخانے کو اس طرح بند نہیں کرنا چاہیے تھا۔" راحیل نے ملک صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ یونین والے سر پر چڑھ کر ناچنے لگے تھے اس لیے میں نے فیکٹری بند کرنا ہی مناسب سمجھا۔" ملک صاحب نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"تو یہی آپ کی غلطی تھی۔ آپ کو چاہیے تھا کہ یونین کو خرید لیتے...... پیسے کی کمی ضرورت نہیں ہوتی...... وہی لوگ جو مزدور کے حقوق کے لیے آواز اٹھا رہے تھے آپ کی طرفداری شروع کردیتے۔" راحیل نے کہہ کر ثنا پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "دراصل ہم جذبات میں بہہ جاتے ہیں...... ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہر مسئلے کا حل ضرور ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہی ایک حل تھا کہ یونین کے عہدے داروں کو خرید لیا جاتا۔"

بیگم نادرہ جو اتنی دیر سے خاموش تھیں بولیں۔

"آپ نے فیکٹری بند کردی...... اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ کئی سو مزدور بے روزگار ہوگئے۔ اب وہ بے روزگاری کا غصہ اپنی اپنی بیویوں پر اتاریں گے۔ گھر میدان جنگ بنا رہے گا...... آپ لوگ اس رخ پر کیوں غور نہیں کرتے...؟"

"ارے بھائی عورتوں کے حقوق کے لیے تمہاری تنظیم کافی ہے نا۔ عورتوں پر مرد ظلم کریں گے تو تمہارے لیے مواقع نکلیں گے۔ تم ان کے لیے شور مچاؤ گی۔ ریلیاں

نکالوگی۔ چلیے کرو گی۔ ہاہاہا۔"

وہ سب باتیں کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون جس ٹیبل پر رکھا تھا وہ ملک نظیر کے عقب میں ہی تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں ڈی ایس پی نواز بول رہا ہوں۔ آپ سے ایک ریکوئسٹ ہے۔"

"جی فرمائیں۔" ملک نے بہ ظاہر نرم لہجے میں کہا۔ جب کہ ان کی تیوری پر بل آ گئے تھے۔ وہ پولیس والوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ پولیس والے ابتدا میں نرمی سے پیش آتے ہیں اور پھر تار عنکبوت بن کر جکڑ لیتے ہیں۔ یقیناً ان کے کسی بندے نے کوئی ایسی غلطی کی ہے جس کی وجہ سے پولیس والے ان کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ اب اس ڈی ایس پی کو کیسے سنبھالنا ہے یہ وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ اسی لیے نرم لہجہ اختیار کیے ہوئے تھے کہ ڈی ایس پی کی آواز آئی۔ "سر جی ہمارے علاقے میں ایک لڑکی کا قتل ہوا ہے یا اس نے خودکشی کی ہے ابھی یہ بات کلیئر نہیں ہوئی ہے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ہی پتا چلے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کے پاس سے ایک موبائل فون ملا ہے جس میں آپ کا نام اور کچھ تصاویر ہیں۔"

"کسی لڑکی کے موبائل میں میری تصویر؟" ملک صاحب گویا اچھل پڑے تھے۔

"جی ہاں اسی لیے تو ہم نے آپ کو تکلیف دی ہے۔ ایک کچی بستی کی لڑکی کے موبائل میں آپ جیسے بندے کی تصویر...... اسی مسئلے کو حل کرنے......"

"مقتولہ کا کیا نام تھا؟" ملک صاحب نے اس کی بات کو درمیان میں کاٹ کر پوچھا۔

"ایک انسپکٹر کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں...... وہ تمام باتیں آپ کو بتائے گا۔ امید ہے آپ تعاون کریں گے۔"

"جی ضرور آپ بھیج دیں۔" کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ نوکر نے ایک تشتری میں تین کارڈز رکھ دیے۔

دو وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر ملک جی نے کہا۔

"یہ اخباری رپورٹر بھی نا...... ذرا ذرا سی بات پر پہنچ جاتے ہیں۔" پھر نوکر کی طرف دیکھ کر بولے۔ "ان دونوں کو انتظار کرنے کا کہہ دو۔" کہتے ہوئے انہوں نے تیسرا کارڈ اٹھا لیا اور اسے دیکھتے ہی کہا۔ "ہاں اسے بیٹھک میں لے آؤ۔"

حکم ملتے ہی نوکر واپس مڑ گیا اور ملک جی نے داماد کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کوئی انسپکٹر آیا ہے...... پتا نہیں کس کا قتل ہوا ہے اور اس کے موبائل میں میری تصویر ہے .. مجھے بھی دلچسپی ہو گئی ہے کہ میں بھی دیکھوں کہ وہ کون لڑکی ہے۔"

"ملک جی کچھ تو خیال کریں...... بچوں کے سامنے کہہ رہے ہیں کہ میں لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" بیگم نادرہ نے شوہر کو گھرکا۔

"اری نیک بخت، وہ لڑکی مر چکی ہے...... ہم بزنس مین ہیں اگر دس دوست تو سو دشمن ہوتے ہیں...... ایک انجان لڑکی کے موبائل میں میری تصویر کیوں ہے۔ وہ کون ہے میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔" ملک جی نے جواب دیا۔

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟" اندر والے دروازے پر کھڑے پولیس وردی میں ملبوس شخص نے کہا۔

"آ جائیں ...... جو پوچھنا ہے پوچھیں۔" ملک جی نے جواب دیا۔

"ملک جی۔ مجھے انسپکٹر آصف کہتے ہیں...... بے وقت آمد پر معذرت چاہتا ہوں ...... مجھے معلوم ہے آج آپ کے یہاں ایک بہت بڑی پارٹی تھی اور آپ لوگ اس تھکن کو مٹا رہے ہوں گے مگر کیا کروں...... نوکری ہی ایسی ہے۔" وہ بولتے ہوئے رکا پھر سب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بولا۔ "ہمیں حیرت ہے کہ کچی بستی کی ایک لڑکی کے موبائل میں آپ کی تصویر کہاں سے آ گئی۔"

"لڑکی کا نام کیا تھا؟" ملک نظیر نے پوچھا۔

"وہ لڑکی کئی ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ سب نے اپنی اپنی پسند کا نام دے رکھا تھا۔" پھر وہ کچھ آگے بڑھا۔ ملک جی کے بہت قریب آ گیا۔

"محترم انسپکٹر صاحب شاید آپ نہیں جانتے کہ اس وقت آپ کس کے گھر میں بیٹھے ہیں...... آپ کس تھانے سے آئے ہیں؟" راحیل نے تیز لہجے میں کہا۔

"راحیل صاحب میں اچھی طرح سے ملک صاحب کو پہچانتا ہوں ... اور ہاں آپ کو بھی پہچانتا ہوں ... اس موبائل میں آپ کے بارے میں بھی کچھ باتیں ہیں جو میں بعد میں بتاؤں گا۔ رہا سوال میں کس تھانے سے آیا ہوں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی تعاون کریں گے، اگر زور سے بولیں گے تو باہر بیٹھے صحافی حضرات سن لیں گے اور اس میں آپ اور آپ کے ہونے والے سسر کی بدنامی ہو گی۔" انسپکٹر نے راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے

ہیں؟ کچی بستی کی کسی لڑکی کے موبائل میں میرے بارے میں کچھ کیسے ہوسکتا ہے۔'' راحیل حیران ہوا تھا۔

''جی ہاں آپ کے بارے میں ہی نہیں اس وقت یہاں جتنے لوگ موجود ہیں سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہوا ہے۔''

''میرے بارے میں بھی؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''جی ہاں ....آپ کے بارے میں بھی۔''

''میری این جی او میں ہر روز بہت سی لڑکیاں آتی ہیں۔ سب کا نام یاد رکھنا ضروری بھی نہیں ہے مگر وہاں آنے والی ہر لڑکی میرا نام جانتی ہوگی۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے اگر یہ تو عجیب کیا ہے؟'' نادرہ نے منہ بنا کر کہا۔

''اور میں ایک پروڈکشن ہاؤس کا مالک ہوں میرے پاس بھی ہر روز بہت سی لڑکیاں آتی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی لڑکی یہ کہے کہ مسٹر ارباز سے میری واقفیت ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔'' ارباز تیز لہجے میں بولا۔ ان سب کو احساس تھا کہ وہ دولت کا انبار رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے افسران سے ان کی واقفیت ہے۔ ایک معمولی انسپکٹر کی حیثیت ہی کیا ہے۔

''مسٹر ارباز میں یہ بتا دوں کہ اس میں جس کا بھی ذکر ہے اس کے بارے میں مکمل معلومات بھی ہیں۔ یہ سب بھی لکھا ہے کہ اس سے کب کہاں، کس وقت اور کن حالات میں ملاقات ہوئی۔ یعنی وہ اس آدمی سے پوری طرح نزدیک رہی ہے اور میرا دعویٰ ہے کہ یہاں موجود یعنی جس کا بھی ذکر آیا ہے سب اس کی تباہی کے ذمے دار ہیں۔''

''مسٹر انسپکٹر آپ الزام لگا رہے ہیں۔ ٹھہریے میں ابھی آپ کے افسران سے بات کرتا ہوں۔'' راحیل نے موبائل نکالا تھا کہ انسپکٹر بول پڑا۔

''مسٹر راحیل۔ مت بھولیں کہ باہر میڈیا والے موجود ہیں ... میں آپ کے بارے میں سب سے آخر میں بتانا چاہتا تھا کیونکہ آپ اس گھر کے ہونے والے داماد ہیں مگر لگتا ہے کہ آپ سے ہی شروع کرنا ہوگا.... رہا سوال میرے افسران کا تو میں اپنی مرضی سے نہیں آیا ہوں۔ مجھے بھیجا گیا ہے۔ وہ سب بھی چاہتے ہیں کہ اس گھر کی عزت برقرار رہے۔''

راحیل جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ملک صاحب نے انسپکٹر کو غصے سے گھورا اور پھر کہا۔ ''آپ کو بتا دوں کہ میرا نام ملک نظیر ہے......''

''مجھے معلوم ہے۔'' انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے میں سیدھا یہاں آیا ہوں ...ایک بات اور بتا دوں کہ ابھی یہ بات پریس تک پہنچی نہیں ہے صرف میں اور ڈی ایس پی صاحب جانتے ہیں اور وہ آپ کی عزت بچانا چاہتے ہیں اسی لیے مجھے خفیہ طور پر بھیجا ہے۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ مجھ سے تعاون کرتے ہیں یا باہر بیٹھے میڈیا والوں کو میں خود اندر بلا لوں .... خیر ان باتوں کو چھوڑیں یہ بتائیں کہ کیا آپ اس لڑکی کو نہیں جانتے تھے؟'' وہ کچھ آگے بڑھا۔

''ارے بابا میں نے کہا نا کہ میرے دفتر میں ہر روز درجنوں لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔ میں کس کس کو پہچانتا رہوں گا۔''

''غور سے دیکھیں شاید پہچان جائیں۔'' اس نے موبائل کو آن کیا پھر جھک کر بولا۔ ''اس لڑکی نے خودکشی کی ہے مگر کس وجہ سے یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو میں صرف یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ اس کی خودکشی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔''

''تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اسے خودکشی پر اکسایا ہے؟'' ملک صاحب کا لہجہ تیز تھا۔

''میں نے ایسا تو کچھ کہا نہیں... آپ جیسے بڑے بزنس مین پر میں ایسا الزام کیسے لگا سکتا ہوں۔ ذرا دیکھیں شاید آپ اسے پہچانتے ہوں۔'' اس نے موبائل آگے کر دیا۔

ملک نظیر نے ایک اچٹتی سی نظر اس موبائل پر ڈالی اُن کے چہرے پر سناٹا سا چھا گیا۔ جیسے وہ جرم کے حصے دار رہے ہوں۔ وہ اس لڑکی کو پہچان گئے تھے۔

''کیوں..... اسے آپ نے کہیں دیکھا ہے؟ پہچانتے ہیں؟'' انسپکٹر آصف نے پوچھا۔

''جی .. جی ہاں۔'' ملک نظیر نے پیشانی پر آئے پسینے کو رومال میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام مہوش ہے۔ یہ .... یہ میرے دفتر میں کام کرتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک یتیم نیبر لڑکی ہے اور اپنے ایک ماموں کے ساتھ رہتی ہے۔''

''جی ہاں وہ ایک یتیم لڑکی تھی .. میں یہ بھی بتا دوں کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی مگر یہ ماں بننے والی تھی.... شاید اسی لیے اس نے خودکشی کر لی کہ بچے کے باپ نے اسے اپنا نام دینے سے انکار کر دیا ہوگا۔'' کہتے ہوئے وہ ایک خالی کرسی پر جا بیٹھا۔ پھر ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ نہ بھی بتاتے تو میں یاد دلا دیتا، اس لیے کہ وہ اس موبائل کو بطور ڈائری استعمال کر رہی تھی۔ ایک طویل نوٹ اس نے لکھا ہے کہ کس طرح وہ آپ تک

پہنچی اور کس طرح اس نے نوکری حاصل کی۔" وہ بولتے بولتے رکا اور پھر گہری سانس لے کر انتہائی ڈرامائی انداز میں بولا۔ "مزے کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنی اس ڈیجیٹل ڈائری میں لکھا ہے کہ اس نے کس وجہ سے نوکری چھوڑی...... وجہ اگر آپ بتادیں تو زیادہ بہتر ہے۔"

انسپکٹر کی بات پر ملک جی کا چہرہ جھک گیا۔ پیشانی عرق آلود ہوئی۔ وہ نظریں نہیں اٹھا پارہے تھے۔ انہیں خاموش دیکھ کر سب کے چہروں پر سوالیہ نشان سا نظر آنے لگا تھا۔ ماحول میں عجیب سی گھٹن در آئی تھی۔ ہر چہرے پر ایک ناگواری کیفیت تھی۔ سب اپنی اپنی جگہ فکر میں غلطاں تھے۔ سب کی نگاہیں ملک جی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ بالآخر ثنا نے خاموشی کی چادر پر پہلا وار کیا۔

"ڈیڈ... ہم سب جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے نوکری کیوں چھوڑی۔" اس نے اپنے صوفے کو تھپتھپا کر کہا۔

ملک جی نے ایک نظر سب پر ڈالی پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ٹہلنے کے انداز میں کئی قدم آگے بڑھائے جیسے وہ ذہن میں اٹھتے ہوئے طوفان کو دبانا چاہتے ہوں پھر انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "یہ آج سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں جرمنی کی ایک فرم سے معاہدے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اگر وہ فرم مجھ سے کاروبار پر راضی ہوجاتی تو میرے وارے نیارے ہوجاتے کیونکہ اس فرم کا آرڈر بہت بڑا تھا۔ وہ لوگ جرمنی کے علاوہ کئی دیگر ممالک میں بھی گارمنٹ سپلائی کرتے تھے۔ اس فرم کو کیسے ہاتھ میں لیا جائے میں اسی فکر میں تھا کہ ایک نئی الجھن سامنے آگئی۔" وہ بولتے بولتے رکے پھر ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام کو جوڑا۔ "میں جیسے ہی دفتر پہنچا۔ ایک نئی لڑکی مونا منیجر کی شکایت لے کر آگئی۔ ہوا یہ تھا کہ ایک لڑکی ریناؔ کو منیجر نے دفتر ٹائم کے بعد روک لیا تھا۔ اس لڑکی کا کہنا تھا کہ منیجر نے دست درازی کی تھی۔ مونا کا کہنا تھا کہ منیجر کو سزا دی جائے۔"

"مگر آپ نے اسے سزا نہیں دی۔" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے مونا سے کہا کہ غلطیاں انسان سے ہوجاتی ہیں۔ منیجر کو سمجھادوں گا کہ وہ رینا سے معافی مانگ لے اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرے مگر مونا اڑ گئی تھی کہ اسے نوکری سے برخواست کیا جائے۔ مونا یہی لڑکی ہے جس کی تصویر انسپکٹر نے دکھائی ہے۔" اپنی بات ختم کر کے وہ واپس کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

"واہ ڈیڈ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ لڑکی کی عزت اتنی سستی ہے؟ کوئی بھی ہاتھ ڈالے اور پھر معافی مانگ لے؟ نہیں ڈیڈ... یہ بہت بڑی بات ہے۔ آپ کو اس لڑکی کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔" ثنا نے باپ کو ملامت کی۔

"بیٹا میں مجبور تھا۔ میں بزنس کرنے بیٹھا ہوں۔ انصاف دلانا عدالت کا کام ہے۔ پھر غلطیاں تو سب سے ہوتی ہیں اسی لیے میں نے مونا کی بات پر توجہ نہ دی۔"

"ملک جی یہ فون ہی نہیں نوٹ بک بھی ہے۔ لڑکی نے اس میں ایک ایک بات لکھ رکھی ہے۔ آپ نے ادھوری بات بتائی ہے۔"

"لڑکی نے خودکشی آج کی ہے جب کہ وہ میرے یہاں ایک سال پہلے ملازمت کر رہی تھی۔ اس کی خودکشی سے ہمارا کیا تعلق؟" ملک جی نے ناگواری سے جواب دیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

"جیسے ہی میں بتاتا ہوں کہ آپ سے اس کا تعلق کیا تھا یہ سب اس نے اس ڈیجیٹل ڈائری میں لکھا ہے، سنیے......" اس نے موبائل میں پڑھنا شروع کردیا۔ "ان پیسے والوں کی نظروں میں لڑکی کی عزت کی کوئی وقعت نہیں۔ میں نے انصاف مانگا تھا مگر مجھے دھمکی دی گئی۔ دبانے کی کوشش کی گئی۔ کہا گیا کہ یہ دفتر ہے یہاں سیاست نہیں چلے گی۔ اگر نوکری کرنا ہے تو زبان بند رکھنی ہوگی۔ یعنی اگر کسی کی عزت لٹ رہی ہے تو لٹنے دو۔ زبان بند رکھو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میں بھولنا بھی چاہوں تو بھول نہیں سکتی، میں بیٹھی کام کر رہی تھی کہ چپراسی نے آکر کہا کہ آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں کیونکہ میں نے آنے کے ساتھ بڑے صاحب کی پی اے سے کہہ دیا تھا کہ مجھے بڑے صاحب سے ٹائم لے کر دیں۔ میں نے جو اپلی کیشن دی ہے اس کا جواب بڑے صاحب کی زبان سے سننا ہے۔ چپراسی کی بات سن کر میں خوش ہوگئی کہ صاحب نے میری اپلی کیشن پر ایکشن لیا ہے۔ میں خوش خوش ان کے کمرے میں پہنچی۔ وہ اپنی بڑی سی کرسی پر بیٹھے مجھے آتے ہوئے بغور دیکھ رہے تھے۔ جب میں ان کے قریب پہنچی تو انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"بیٹھو۔" میں بیٹھ گئی تب انہوں نے کہا۔ "یہ لیٹر تم نے لکھا ہے نا؟" میں نے جواب میں سر ہلا دیا تب انہوں نے کہا۔ "اب بتاؤ ہوا کیا تھا؟" میں نے جواب دیا۔ "منیجر صاحب نے رینا کو کمرے میں بلایا اور پھر اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی۔" میرے خاموش ہوتے ہی وہ

بولے۔ ''ہوں..... تو اب کیا کیا جاسکتا ہے؟'' اس پر میں بولی میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ ریتا کو انصاف دلایا جائے تو وہ بولے۔

''جی ہاں اسے انصاف ملے گا مگر میں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ یہ دفتر ہے یہاں سیاست نہیں چلتی... تمہیں دو کام کرنا ہیں'' میں نے کہا۔

''جی فرمائیں۔'' تو وہ بولے۔ ''یہاں دو لفافے پڑے ہیں ایک میں ترقی کا پروانہ ہے اور دوسرے میں ریزیگنیشن۔ اگر منیجر کو معاف کرنے پر تیار ہو تو ترقی والا لفافہ اٹھالو۔''

اس جواب پر میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں پوچھنے پر مجبور ہوگئی کہ کیا منیجر کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے؟ تو وہ گویا ہوئے۔ ''غلطیاں انسان سے ہوتی ہیں..... منیجر اس کمپنی کے لیے بہت ضروری ہے'' اور میں سمجھ گئی کہ یہاں انصاف نہیں ملے گا اس لیے میں ریزیگنیشن لیٹر والا لفافہ اٹھا کر باہر نکل آئی۔''

انسپکٹر نے موبائل پر لکھی تحریر پڑھ کر موبائل بند کر کے تمام لوگوں کے چہروں کا معائنہ کیا۔ وہاں بیٹھے ہر ایک کی نظر اس وقت ملک جی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ سب کے سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ ایسا کیوں کیا۔ بالآخر بیٹے نے اس خاموشی کا پردہ چاک کیا..... وہ بولا۔

''ڈیڈ یہ آپ نے اچھا نہیں کیا..... آپ نے اس لڑکی کی فریاد اس لیے نہیں سنی کہ آپ کی نظروں میں منیجر اہم تھا؟''

''بہت غلط بات ہے نظیر! تمہیں اس لڑکی کی باتوں پر توجہ دینا چاہیے تھی۔ وہ ایک لڑکی پر ہونے والے ظلم کے خلاف شکایت لے کر گئی تھی اور تم نے اسے نوکری سے نکال دیا۔ یہ بہت برا کیا۔'' نادرہ نے شوہر کو جھڑکا۔

''نادرہ بیگم! کاروبار جذبات کے سہارے نہیں چلتا..... بزنس کا پہلا اصول ہے اپنا منافع دیکھو..... منیجر میرے لیے زیادہ اہم تھا۔''

''واہ ڈیڈ آپ نے بزنس کو دیکھا اور انسانیت کو بھلا دیا۔'' ارباز نے بھی باپ کو لتاڑا۔ کچھ بھی ہو اس میں کسی حد تک انسانیت کی بو باس تھی۔ وہ کیمونزم کو پسند کرتا تھا اور حمایت بھی کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی ماں اسے ناپسند کرتی تھی مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ خود میں مست رہنے والا انسان تھا۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا کہ کسی طرح اس کی کوئی فلم یورپی منڈی تک پہنچ جائے اور کوئی بڑا انعام جیت لے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ باپ کے پیسوں کو کام میں لا رہا تھا۔ اب یہ اس کی قسمت تھی کہ ابھی تک اس کی ایک بھی فلم کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

''یہ جو تم انسانیت انسانیت کی رٹ لگائے رکھتے ہو یہ اس وقت تک ساتھ دے گی جب تک میرا بزنس ہے اور بزنس کے لیے عقل کا استعمال کرتے رہنا پڑتا ہے۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔''

''کیا ٹھیک کیا... ایک لڑکی کو انصاف تک نہیں دیا..... چھی چھی مجھے تو سوچ کر شرم آ رہی ہے کہ میرا باپ اپنے مفاد کے لیے اتنی بڑی ناانصافی کرے گا۔'' ثنا چپ نہ رہ سکی۔

''اگر ملک صاحب کی جگہ آپ ہوتیں تو کیا کرتیں؟'' یکایک انسپکٹر نے ثنا سے سوال کردیا۔

سوال سن کر ثنا لمحے بھر کو خاموش ہوئی مگر فوراً ہی بولی۔ ''انسپکٹر آپ نے ایک ایسا سوال کردیا ہے جس کا جواب نہ چاہتے ہوئے بھی دے رہی ہوں..... میں اس لڑکی کو انصاف ضرور دلاتی۔''

''نہیں..... آپ ایسا نہیں کرسکتی ہیں کیونکہ اس ڈائری میں آپ کے بارے میں بھی لکھا ہوا ہے۔''

''میرے بارے میں؟'' ثنا کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں..... اس کے ساتھ آپ نے کیا برتاؤ کیا تھا اور کب کیا تھا یہ اس نے اپنی ڈیجیٹل ڈائری میں لکھا ہے..... میں پڑھ کر سناتا ہوں۔'' انسپکٹر نے ثنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر موبائل کو اپنی آنکھوں سے کچھ قریب کیا اور اس میں لکھی تحریر پڑھنے لگا۔ ''آج میری زندگی کا ایک نیا باب رقم ہوا ہے... میں نے پرسوں ملک نظیر کی نوکری کو لات ماری اور اس دکان میں سیلز گرل بن کر آگئی۔ یہ دکان لیڈیز کاسٹیوم کے لیے شہر بھر میں مشہور ہے۔ یہاں صرف بڑے گھروں کی خواتین آتی ہیں۔ اس دکان میں میری طرح کی آٹھ دس لڑکیاں کام کررہی ہیں جو مجبوری کے ہاتھوں بکی ہوئی ہیں۔ گھر چلانے کے لیے یہ میڈم کی باتیں سنتی ہیں۔ ان کی گھرکیاں سہتی ہیں اور منہ سے کچھ بول نہیں پاتیں۔ یہاں بھی معاشرتی ناہمواریوں کا سانپ پھن کاڑھے بیٹھا ہے۔ اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ بات کتنی معمولی سی تھی جسے اس امیرزادی نے بڑا بنادیا اور میڈم نے بھی اسی کا ساتھ دیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک امیرزادی ملبوسات کی خریداری کے لیے آئی۔ موٹا بھدا جسم جس پر اس نے ٹائٹ ٹاپ پسند کیا اور ٹرائل روم میں جب اسے پہن کر باہر آئی تو میری ہنسی نکل گئی بس اس امیرزادی کو غصہ آگیا اور وہ چیخ پکار کرنے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اس کا

مذاق اڑا رہی ہوں۔ وہ تھپڑ میرے منہ پر مار کر چلی گئی۔ میڈم میری بات کیا سنتیں انہوں نے اسے میری بدتمیزی گردانی اور مجھے نوکری سے نکال دیا، ان کے بقول میں نے ملک نظیر کی بیٹی ثنا کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔ گویا ملک نظیر کا آسیب یہاں بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آ گیا تھا۔ اب مجھے پھر سے نوکری... تلاش کرنا تھی۔" انسپکٹر نے فون آف کر کے ثنا کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیوں بی بی کیا یہ بات غلط ہے...؟ آپ نے اس لڑکی کی نوکری نہیں کھائی؟"

"اف... اس دن ایک چھوٹی سی بات پر میرا اور راحیل کا جھگڑا ہوا تھا۔ میرا دماغ پہلے سے ہی گرم تھا۔ اسے میرے شاپ پر ہنستے دیکھ کر میں غصے پر قابو نہ رکھ سکی اور اسے دھتکار دے کر نکل آئی... مجھے کیا پتا تھا کہ اس بات پر اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا۔" ثنا نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"یہ کوئی اتنی بات نہیں ہے جس کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ ایسی باتیں تو عام ہیں۔" راحیل نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے زاری تھی۔ "پلیز ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کر کے شرمندہ نہ کریں... جو پوچھنا ہے پوچھیں اور جائیں۔"

"مسٹر راحیل میں مارک کر رہا ہوں کہ میرے آنے سے سب سے زیادہ آپ ناخوش ہیں اور آپ اپنے ملک ہونے کا رعب بار بار ڈال رہے ہیں۔"

"میں نے غلط نہیں کہا۔ آپ نے آ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیا ہے۔ سب کی خوشی کو مٹی میں ملا دیا ہے۔"

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں نے ایک بات کہی تھی کہ اس ڈیتھ ڈائری میں آپ کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے۔"

"اگر کسی لڑکی نے میرے بارے میں کچھ لکھا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں ایک مشہور بزنس مین ہوں۔ سیاست میں بھی دخل رکھتا ہوں۔ بہت جلد باقاعدہ سیاست میں آنے والا ہوں۔"

"مگر جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ اگر پریس میں چلا گیا تو سیاست تو دور رہی آپ کے گھر والے بھی آپ سے دور ہو جائیں گے۔" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔

"میں نہ تو چور ہوں اور نہ ایسا کوئی جرم کیا ہے جس پر شرمندگی ہو...... ایسا کیا لکھا ہے ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"وہ بھی سناؤں گا اگر آپ نے اس لڑکی کو پہچاننے سے انکار کیا تو اگر پہچان لیں تو بات دیگر ہے۔ پہلے آپ اس کی تصویر دیکھیں۔" انسپکٹر کہتا ہوا اس کے قریب چلا گیا اور موبائل کو آن کرتے ہوئے بولا۔ "پہلے آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں پھر میں کچھ کہوں گا۔" اس نے موبائل کی اسکرین اس کے چہرے کے آگے کر دی۔

راحیل نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک اچٹتی ہوئی نظر اسکرین پر ڈالی۔ جیسے ہی اس کی نظر اس تصویر پر پڑی وہ بری طرح چونک گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ گھبراہٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

"کیوں جناب۔ اب کچھ بولنا پسند کریں گے یا میں اپنی زبان کو تکلیف دوں... کیا آپ اس لڑکی کو پہچانتے ہیں؟"

"جی... جی ہاں میں اسے پہچانتا ہوں۔"

"کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ آپ کو کہاں اور کب ملی تھی۔ آپ نے اس کے ساتھ کتنا وقت گزارا؟" انسپکٹر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"یہ... یہ آج سے ایک سال قبل کی بات ہے۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہ امپورٹر تھا۔ چائے منگوائی اور کھیپتا تھا۔ غیر ممالک میں اس کی اچھی ساکھ تھی مگر میری نظروں میں اس کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بدفطرت شخص تھا۔ لڑکیوں کی زندگی سے کھیلنا اسے بہت پسند تھا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ مجھے اس سے ایک کام تھا اس لیے میں نے اسے فون کیا تو وہ بولا کہ وہ دفتر میں ہے۔ اگر ضروری کام ہے تو وہیں پہنچ جاؤ... اتنی رات کو وہ دفتر میں بیٹھا ہے۔ یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔ میں اسی بارے میں غور کرتا ہوا اس کے دفتر پہنچ گیا۔ ابھی بات شروع کرنے سے پہلے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی دیر تک کیوں بیٹھتا ہے تو وہ بہانے بنانے لگا۔ اسی وقت ایک لڑکی دفتر میں داخل ہوئی۔ وہ صورت شکل سے بہت معصوم لگ رہی تھی۔ ایسی لڑکی اتنی رات کو کیوں آئی ہے؟ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ اسے لے کر دفتر ہی کے ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"اچھے دوست میں تو چلا۔" اس نے جواب میں کہا۔

"اچھی بات ہے دروازہ کھینچ کر لاک کر دینا۔" میں سوچنے لگا کہ اتنی معصوم صورت اور یہ کرتوت۔ دراصل میں نے اسے غلط راہوں کی راہی سمجھا تھا۔ ابھی اٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ برابر والے کمرے سے لڑکی کی دبی دبی آواز آئی کہ پلیز مجھے چھوڑ دیں، دور رہیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے لڑکی کو دھوکے سے بلایا ہے۔ میرا غصہ آسمان پر پہنچ گیا اور میں

دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ شر پسندی پر آمادہ تھا اور وہ لڑکی اس کے چنگل سے بچنے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اندر جاتے ہی دوست کو دھکا دیا اور لڑکی کو کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ دوست میرا چہرہ دیکھ کر کانپ گیا تھا، اس لیے وہ کچھ بھی بولا نہیں۔ باہر آ کر میں نے لڑکی سے کہا۔

''یہاں کیوں آئی تھیں؟ کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی سونا..... میرا نام سونا ہے..... انہوں نے مجھے نوکری دینے کے لیے بلایا تھا۔''

''اتنی رات کو کس آفس میں کام ہوتا ہے..... اتنا بھی نہیں سوچا..... اب گھر جاؤ اور شکر ادا کرو کہ میں اس وقت وہاں موجود تھا..... یہ لو کارڈ..... افتخار صاحب سے جا کر ملنا اور کہنا کہ مجھے راحیل صاحب نے بھیجا ہے۔'' میں کارڈ اسے دے کر اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

''اگلے دن وہ دفتر آئی۔ افتخار صاحب اسے لے کر میرے پاس آ گئے کہ میرے ڈیپارٹمنٹ میں تو کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ ہی اسے اپنے پاس رکھیں کیوں کہ دو دن بعد مسز رمیز نا تک لیو پر جا رہی ہیں۔ تب تک یہ آپ کا کام سنبھالیں گی۔ میں نے اسے اپنی سیکریٹری کے طور پر رکھ لیا۔''

راحیل خاموش ہوا تو انسپکٹر نے کہا۔ ''اور آپ نے اسے سیکریٹری کی جگہ دے کر اس کی موت کا سامان کر دیا۔ اس کی خودکشی کی ایک وجہ آپ کی حرکت بھی ہو سکتی ہے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ تقریباً دس ماہ قبل نوکری چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

''کیوں؟ اس نے کیوں نوکری چھوڑ دی، کیا آپ بتانا پسند کریں گے یا میں اس کی ڈائری سے وہ وجہ بتاؤں؟'' انسپکٹر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اس نے ایک ماہ میں ثابت کر دیا تھا کہ وہ بہت محنتی ہے۔ کام میں دلچسپی لینے والی ہے۔ اس کے کام سے میں بہت خوش تھا۔ اسی وجہ سے اسلام آباد میں ایک بڑی کمپنی سے کانٹریکٹ سائن کرانے جانے لگا تو اسے بھی ساتھ لے لیا۔ اسلام آباد میں میرے دوستوں کی کمی نہیں۔ میرے ساتھ سونا غرض حسین لیے ہر جگہ جاتی تھی۔ اس کا معصوم حسن دیکھ کر میرے دوست بھی تعریف کیے بغیر نہ رہتے۔ کئی ایک نے مذاق بھی کیا کہ میں اسی کی وجہ سے اسلام آباد آیا ہوں۔ ان کی باتیں سن کر میں انکار پر انکار کرتا رہا کہ وہ صرف میری سیکریٹری ہے اور کچھ نہیں مگر وہ مان کر نہیں دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں پارسا بننے کا ڈھونگ کر رہا ہوں۔ وہ تمام دوست میرے بچپن کے ساتھی تھے اس لیے کھل کر مذاق چلتا تھا۔ انہی میں سے کسی نے مجھے مذاقاً سوفٹ ڈرنک میں کچھ ملا کر پلا دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا..... '' وہ بولتے بولتے رکا اور خاموش ہو کر اپنے پیروں کو دیکھنے لگا۔

''جی بولیں..... پھر کیا ہوا تھا؟'' ثنا بولی۔

راحیل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسی وقت بیگم ملک بولیں۔ ''بولو خاموش کیوں ہو گئے؟ کوئی غلطی ہوگئی تھی؟ اس عمر میں تو ہوتی ہی رہتی ہے۔''

''ڈرنک لے کر میں ہوٹل واپس آیا اور ڈکٹیشن کرنے کے لیے سونا کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں کچھ ہی دیر بیٹھا تھا کہ مجھے اپنے اندر ایک آگ سی بھڑکتی محسوس ہوئی اور میں انسان سے جانور بن گیا۔ وہ روتی رہی، چلاتی رہی مگر مجھے رحم نہ آیا پھر جب طوفان کا زور ٹوٹا تو میں نے اس سے معافی مانگی۔ تلافی کے لیے ایک لاکھ روپے دینے چاہے مگر وہ رقم کی گڈی میرے منہ پر مار کر چلی گئی۔ اس کے بعد پھر اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔'' راحیل خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔

''راحیل صاحب آپ نے بہت ایمانداری سے اور بہت بہادری سے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس ڈائری میں ہے۔ یہ باتیں کوئی اور اپنے ہونے والی سسرال میں نہیں بتا سکتا مگر آپ نے بتا کر ثابت کر دیا کہ آپ اوپر سے جیسے بھی نظر آتے ہوں مگر حقیقت میں ایک اچھے انسان ہیں۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ پھر اس غلطی میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ آپ شکار بن گئے۔ دوستوں کے مذاق کا شکار۔''

''میں نے یہ سب صرف اس لیے بتایا کہ یہ باتیں میرے ضمیر پر بوجھ تھیں۔ مجھے اس لڑکی سے واقعی ہمدردی تھی۔ کراچی واپس آ کر بھی میں نے اسے بہت ڈھونڈا مگر وہ مجھے نہیں ملی۔ پھر وقت کی گرد نے اس بات کو ڈھک دیا اور میں اسے بھولتا چلا گیا مگر اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ واقعی میں اس کی خودکشی کا ذمے دار ہوں۔''

''جھوٹے، مکار، فریبی..... ایک لڑکی کی زندگی برباد کر کے کہہ رہے ہو کہ یہ بات میرے ضمیر پر بوجھ ہے..... تمہیں ڈوب مرنا چاہیے تھا..... '' ثنا چیخ کر بولی۔

''غلط..... تم نے سنا نہیں کہ اس نے کیا کہا..... اسے سوفٹ ڈرنک میں دوا دی گئی تھی یہ سانحہ ہوا۔'' ملک جی نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ ایسا لڑکا جو بزنس میں ان کے برابر ہے دوسرا نہیں ملے گا۔

''یہ ایک اعلیٰ کردار کا لڑکا ہے..... جو کچھ ہوا اس میں سارا قصور اس کا نہیں ہے۔'' بیگم صاحبہ بھی بول پڑیں۔ اس

لیے کہ وہ بھی نزاکت کو سمجھ رہی تھیں۔

"نہیں آپ اس کے ذمے دار نہیں ہیں۔ وہ دس ماہ قبل آپ کے ساتھ تھی اور خودکشی کل کی ہے۔" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"مگر یہ اس خودکشی میں حصے دار ہے۔ اس نے ایک لڑکی کی زندگی برباد کی ہے۔۔۔ میں شو بزنس میں ہوں۔ میرے سامنے بہت بڑی تعداد میں لڑکیاں آتی ہیں مگر میں نے کسی کی زندگی سے کھیلنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔" ارباز نے نفرت بھرے انداز میں رحیل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ارباز! اگر میں یہ کہوں کہ اس کی خودکشی کے ذمے دار آپ بھی ہیں تو؟"

"انسپکٹر صاحب الزام کسی پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔"

"یہ الزام نہیں حقیقت ہے کیونکہ اس کی خودکشی کے ذمے دار آپ بھی ٹھہرائے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ آپ کے بہت قریب رہ چکی ہے۔" انسپکٹر نے ڈرامائی انداز میں انکشاف کیا۔ اس کی اس بات پر سب ہی چونک گئے۔ تمام لوگوں کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ اب تک جو لوگ انسپکٹر پر غصہ دکھا رہے تھے سب کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں مگر ارباز کی اکڑ ہنوز قائم تھی اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"انسپکٹر صاحب الزام لگانا بہت آسان ہے۔"

"یہ الزام نہیں ارباز آپ بھی اس لڑکی کو جانتے تھے۔ شاید یاد آ جائے کہ کبھی آپ بھی اس سے ملتے رہتے تھے۔" انسپکٹر چلتا ہوا اس کے نزدیک آن کھڑا ہوا پھر اس نے موبائل میں موجود تصویر کو اس کے سامنے کر دیا۔

تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ ایسے چونکا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ "یہ۔۔۔ یہ کہاں ہے؟ پہلے یہ بتائیں مس حسن ہیں کہاں؟"

"اچھا تو آپ اسے مس حسن کے نام سے جانتے تھے۔۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ اب یہ بھی بتا دیں کہ یہ آپ سے ملی کس طرح اور آپ کے کتنے قریب تھی؟"

"مس حسن کو میرے ایک دوست نے میرے پاس بھیجا تھا۔ اسے نوکری کی ضرورت تھی اور مجھے اپنے پروڈکشن ہاؤس کے لیے ایک ٹیلی فون آپریٹر کی۔ کچھ ہی دنوں میں ثابت ہو گیا کہ وہ فطرتاً معصوم تھی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب آنے لگی تھی۔ حالانکہ میرا تعلق شو بزنس سے ہے اور ہمارے گرد لڑکیوں کا ایک ہجوم لگا رہتا ہے مگر اس لڑکی میں ایک الگ بات تھی کہ میں اس کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔"

اللہ کی قدرت

اللہ وہ ہے جو نیل نامی مچھلی کو روزانہ سمندر میں 33 ٹن گوشت کھلاتا ہے۔ جبکہ ایک ٹن میں 28 من ہوتے ہیں اور 33 ٹن میں 924 من۔ ایک من میں 40 کلو۔

ٹوٹل۔ 36960 کلوگرام بنتا ہے۔

سبحان اللہ..... تو پھر ہم 3 وقت کی روٹی کے لیے اتنا کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ بس صرف اللہ ہی سے مانگو۔ جو دیتا ہے خوشی سے اور کہتا نہیں کسی سے۔ جو رب سے نہیں مانگتا وہ سب سے مانگتا ہے۔

مرسلہ۔ شاہین تبسم۔ گوجرانوالہ

انمول بات

اگر تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارا رزق اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو پھر رزق کی نہیں اللہ پاک کی تلاش کرو جس کے پاس تمہارا رزق ہے۔

مرسلہ۔ وسیم اختر۔ حیدرآباد

"اور اسی کشش نے آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ اس سے شادی کریں۔"

"نہیں بات کچھ اور بھی تھی۔۔ ہوا یہ تھا کہ اس کے ماموں جہاں وہ رہتی تھی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ممانی کا کوئی سہارا نہیں رہا اور وہ اپنے داماد کے پاس لاہور چلی گئی۔ گویا اس کے رہنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔ ایسے وقت میں میں نے اس کی بھرپور مدد کی اور یہ انسانیت کے ناتے سے تھی۔ میں نے اسے گلشن میں واقع اپنا فلیٹ دے دیا۔ وہ اسی میں رہنے لگی۔ میں اکثر جب تھک جایا کرتا تو اسی فلیٹ میں آرام کرنے جایا کرتا تھا مگر جب سے مس حسن وہاں منتقل ہوئی تھی میں نے جانا چھوڑ دیا تھا لیکن اس دن جب میں اس فلیٹ کے قریب تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کراچی میں بارش ہو اور سڑکیں جل تھل نہ ہوں ناممکن بات ہے۔ ہر سڑک پر موت رقص کرنے لگتی ہے۔ کہیں کرنٹ سے موت تو کہیں گٹر میں گرنے سے موت۔ یوں بھی میں بارش میں کہیں نہ کہیں رک جاتا ہوں۔ فلیٹ نزدیک تھا اس لیے میں مس حسن سے ملنے چلا گیا۔ وہ

فلیٹ میں ہی تھی۔ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"ارباز صاحب آپ اور اس بارش میں؟" وہ بولی۔

"دراصل میں ڈی ایچ اے والے اپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ وہاں سے اٹھا تو بارش شروع ہو گئی..... یقین کرو مجھ سے بارش میں ڈرائیونگ نہیں ہوتی اسی لیے تمہاری طرف آ گیا۔ یہ بتاؤ کوئی پریشانی تو نہیں ہے نا؟"

"جی نہیں....." وہ سر جھکا کر بولی۔ پھر چائے بنانے چلی گئی۔ سرد موسم میں چائے کی طلب بڑھ جاتی ہے اور حرا بھی خوب دیتی ہے۔ اس دن میں وہاں تقریباً دو گھنٹے بیٹھا اور کئی کپ چائے پی۔ ڈھیروں باتیں کیں۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ وہ حقیقتاً بہت معصوم ہے۔ اس کی اس معصومیت نے مجھے اس کا گرویدہ کر لیا۔ اسی دن میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔"

"فیصلہ تھا شادی کر لینے کا؟" انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں..... میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بناؤں گا اور اس سلسلے میں گھر والوں سے بات کرنے کا موقع تلاش کرنے لگا۔"

"آپ نے زندگی ماروی..... کہانی کا ایک باب کھا گئے۔ میں بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے موبائل آن کیا اور اس میں درج تحریر پڑھنے لگا۔ "ارباز صاحب نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری زندگی خوشیوں کے قمقموں سے جگمگا اٹھے گی۔ ارباز صاحب سے پہلے بھی ایک شخص میری زندگی میں آیا تھا مگر وہ زبردستی کا سودا تھا جبکہ ارباز صاحب نے مجھے قانونی طور پر اپنا لیا تھا۔ ہم نے باقاعدہ نکاح پڑھوا کر ایک دوسرے کو اپنا لیا تھا۔ ارباز صاحب کا کہنا تھا کہ ابھی گھر کا ماحول ٹھیک نہیں۔ ممی ڈیڈی کو راضی کر لوں تب تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اگر ابھی لے جاتا ہوں اور وہ لوگ تمہیں وہ عزت نہ دیں تو مجھے دکھ ہو گا، اس لیے وہاں بھی لے جاؤں گا جب گھر والے عزت دینے کی بات مان لیں گے۔ میرے لیے یہ بھی بہت بڑی بات تھی، اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا اور وقت کا انتظار کرنے لگی۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن جب میں گھر میں بیٹھی تھی کہ میری ایک کولیگ شائستہ آئی۔ وہ بولی کہ ارباز نے تمہیں ڈی ایچ اے کے ایک ہوٹل میں بلایا ہے۔ ابھی... اسی وقت۔ میں اس کے ساتھ چلی گئی۔ وہ مجھے ہوٹل میں بٹھا کر چلی گئی مگر اس ہوٹل میں وہ نہیں آیا۔ اس کا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔ انتظار کر کر کے تھک گئی تو میں واپس آ گئی۔ اس دن کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملا۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے دفتر میں بھی جانے نہیں دیا جا رہا تھا۔ چوکیدار کو کہہ دیا گیا تھا کہ مجھے گھسنے نہ دیا جائے۔ پھر ایک دن مجھے فلیٹ بھی خالی کرنا پڑا۔" انسپکٹر نے موبائل بند کر کے کہا۔

"آپ نے اس سے شادی کی پھر اسے اپنی زندگی سے دھکا دے کر نکال دیا؟ حیرت ہے ان حالات میں عورت کے پاس خودکشی کرنے کے علاوہ اور چارہ کیا رہ جاتا ہے؟"

"یہ غلط ہے ..... الزام ہے..... وہ خود میرا فلیٹ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں نے اسے بہت ڈھونڈا..... ہر جگہ تلاش کیا مگر وہ انسانوں کے اس سمندر جیسے شہر میں نہ جانے کہاں چھپ گئی۔ کسی طور نہ ملی۔" ارباز نے سر جھکا کر کہا۔

انسپکٹر جو ٹہلتے ہوئے ادھر سے ادھر جا رہا تھا۔ وہ رک گیا اور بولا۔ "مجھے پتا ہے کہ وہ اتنی دلبرداشتہ کیوں ہو گئی تھی۔ آپ سے اس نے جو امید باندھ رکھی تھی وہ مٹی میں مل گئی تھی۔ اس حالت میں وہ اور کیا کرتی؟ ایک کمزور عورت کو خودکشی ہی نجات کی راہ نظر آتی ہے۔"

"مگر میری آخری ملاقات اس سے چھ ماہ پہلے ہوئی تھی پھر اس سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی جبکہ اس نے خودکشی کل کی ہے تو پھر اس کی خودکشی میں میرا ہاتھ کہاں سے آ گیا؟" ارباز کی آواز کھوکھلی تھی۔

"یہ کس طرح یہ میں ابھی بتاتا ہوں مگر اس سے پہلے ایک آخری ہستی جو اس کمرے میں موجود ہے اس سے تو اب تک پوچھا ہی نہیں کہ اس نے اس لڑکی کو کیسے زخم دیے۔" انسپکٹر نے ان سب کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس وقت اس کمرے میں نادرہ، ملک، ارباز، ثنا اور راحیل تھے۔ تقریباً سب نے اس لڑکی کو پہچاننے کی ہامی بھر لی تھی۔ صرف نادرہ بچ گئی تھیں۔ انسپکٹر ٹہلتا ہوا ان کے قریب گیا اور موبائل آن کر کے بولا۔ "ایک نظر آپ بھی دیکھ لیں کہ کیا آپ اسے پہچانتی ہیں؟"

موبائل میں تصویر پر نظر پڑتے ہی نادرہ کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ ایک عجب سی کیفیت اس کے چہرے پر چھا گئی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "ہاں یہ چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔ یہ میری این جی او میں آئی تھی۔"

"کس لیے آئی تھی..... کچھ یاد آ رہا ہے؟"

"ہم عورتوں کے حقوق کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ کسی مرد نے اس پر ظلم کیا ہو گا اسی سلسلے میں آئی ہو گی؟"

"آپ نے اس کی مدد کی؟"

"یا نہیں... مگر آفس کا رجسٹر دیکھ کر ہی بتا سکوں گی۔"

"میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ کس سبب سے آئی تھی... وہ آئی تھی کہ اس کو دھوکا دیا گیا... شادی کے نام پر کسی نے اسے جی بھر کے لوٹا... اور جب وہ ماں بننے کے مرحلے تک پہنچی تو اس کا محبوب اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ وہ بڑے باپ کا بیٹا تھا اور ایسے کسی بندے سے وہ اکیلے لڑ نہیں سکتی تھی اس لیے وہ آپ کا سہارا لینے آئی تھی اور آپ نے مدد کرنا تو دور کی بات ہے اسے بہت کچھ سنا کر بھگا دیا۔"

"آپ کا اندازہ کسی حد تک صحیح ہے۔ ایسے کسی کیس میں ہم پہلے لڑکی کو سبق سکھانے کے لیے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں پھر اس کا کیس لیتے ہیں۔ اگر ایسا کچھ کہا ہوگا تو اسے سبق سکھانے کے لیے ہی کہا ہوگا اس لیے کہ لڑکیوں کی معصوم ذہنیت کی وجہ سے ایسی بات ہوتی ہے۔"

"جی نہیں آپ نے اسے سبق سکھانے کے لیے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے اس کے ساتھ روکھا برتاؤ کیا تھا۔" انسپکٹر کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے نادرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک بات تو بتائیں کہ ارباز صاحب کو کس وجہ سے باہر جانا پڑ گیا تھا؟"

"اسے ہالی وڈ کے ایک ڈائریکٹر نے بلایا تھا۔ وہ اس کی آفر پر امریکا چلا گیا تھا۔"

"وہ اتنا مشہور ڈائریکٹر نہیں تھا کہ اس کا نام ہالی وڈ پہنچ جائے... یہ اطلاع کب اور کن حالات میں اسے ملی تھی؟"

"اس دن ہم یعنی میں اور ارباز بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ارباز نے ایک لڑکی کو پسند کر لیا تھا۔ اس کی تصویر دکھائی تھی۔ وہ بہت معصوم اور خوبصورت تھی مگر ہمارے اسٹیٹس کی نہ تھی۔ کسی غریب گھرانے کی تھی۔ میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میں کسی بھی طور پر اس لڑکی کو اپنی بہو تسلیم نہیں کر سکتی۔ وہ اس گھر میں نہیں آ سکتی۔ میری اس بات پر ارباز جھاگ سا ہو گیا۔ اس نے بھی سخت لہجے میں کہا کہ اگر میری پسند کو آپ اس گھر کی دلہن نہیں بنا سکتیں تو سن لیں کہ میں بھی اس گھر سے چلا جاؤں گا۔ اسے باغی بنتے دیکھ کر میں اندر سے سہم گئی مگر اوپر کا خول اسی طرح قائم رہا۔ میں نے سخت لہجے میں جواب دیا کہ ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔ یہ تمہاری مرضی ہے کہ اس گھر میں رہو یا نہ رہو لیکن میں اس دو ٹکے کی لڑکی کو اس گھر میں آنے نہیں دوں گی۔ وہ غصے میں کھڑا ہو گیا تھا کہ ملک جی آ گئے۔ انہوں نے ایک لمحے میں فیصلہ سنا دیا۔ وہ ارباز سے بولے۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تم اس لڑکی کو پسند کرتے ہو، اس کو زندگی کا ساتھی بنانا چاہتے ہو تو یہ ایسی کوئی بری بات نہیں ہے۔ میں نے جب تمہاری ماں سے شادی کی تھی اس وقت یہ بھی غریب گھرانے کی تھیں۔ میں بھی ایک معمولی ٹیلرنگ شاپ کا مالک تھا۔ یہ تو میری محنت تھی کہ میں نے ٹیلرنگ شاپ سے ترقی کی اور پہلے کراچی کی مارکیٹ میں بچوں کے کپڑے بنا کر سپلائی کرنے لگا پھر قسمت نے ساتھ دیا اور ہم پاکستان کے بڑے گارمنٹس ایکسپورٹر بن گئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر میرا ایک مشورہ ہے کہ پہلے اپنا کوئی مقام بنا لو۔ آج ہی مجھے شکاگو سے جیمس نے فون کر کے بتایا ہے کہ اس نے ہالی وڈ کے رچرڈ ڈکسن سے بات کی ہے۔ وہ تمہیں اپنی ایک فلم میں ڈائریکشن کے لیے لینا چاہتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ہالی وڈ کا ایک چکر لگا آؤ پھر جو مرضی کرتے رہنا۔" ملک جی کی بات سے ارباز خوش ہو گیا۔ ہالی وڈ میں کام کرنا اس کا دیرینہ سپنا تھا۔ وہ ایک عرصے سے اس کوشش میں تھا مگر اسے چانس نہیں مل رہا تھا۔ اب جب ملک جی نے اسے یہ خبر سنائی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے خوش دیکھ کر ملک جی بولے۔ "بس بیٹے میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ تم خوش رہو۔ اب جا کر آرام کرو صبح باتیں ہوں گی مگر یاد رکھو۔ ابھی یہ خبر کسی کو پتا نہ چلے ورنہ تمہاری لائن کے لوگ ہی جیلسی پر اتر آئیں گے۔ جس میں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ایسا کرو کہ تم اپنا موبائل مجھے دے دو میں آف کر کے تمہاری ماں کے پاس رکھ دیتا ہوں۔ صبح لے لینا۔ اب جا کر سو جاؤ۔"

"گویا ملک جی نے وقت کی بساط بدل دی تھی۔ اپنی مرضی کا کھیل شروع کر دیا تھا؟" انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔

"ارباز جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا۔ ملک جی نے مجھ سے کہا۔ "یہ کیا بچکانا حرکت ہے۔ جوان اولاد سے کبھی نہیں ٹکراتے۔ بزنس کا گر ہے کہ اپنی چال پہلے چل دو تاکہ مقابل کو موقع نہ ملے۔ مجھے یہ خبر کئی روز پہلے مل گئی تھی کہ ارباز نے اپنے فلیٹ میں کسی لڑکی کو ٹھہرایا ہوا ہے۔ بس میں نے اپنی مرضی کی چال چل دی۔ وہ سال چھ مہینے کے لیے کراچی سے باہر رہے گا۔ اس درمیان میں ہم اس لڑکی کا پتا صاف کر دیں گے۔ تم ذرا شائستہ کا نمبر ملاؤ۔ وہ بھی تو ارباز کا خواب دیکھ رہی ہے۔ اس کھیل میں وہ برابر کی حصے دار بن سکتی ہے اس لیے اس کو مہرہ بناؤ۔" میں نے ملک جی کے کہنے پر ان کی چال کو آزمایا اور جیت ہمارا مقدر ٹھہری۔" نادرہ نے اپنی بات ختم کر کے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ نے آدھی

بات کی اور آدھی بات ہضم کر لی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو پوری بات سناتا ہوں۔ اس نے ڈیجیٹل ڈائری میں لکھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ نادرہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا پھر موبائل کو آن کر کے پڑھنے لگا۔ "مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میرے اندر ہمارے پیار کی نشانی سانس لینے لگی ہے۔ اسے بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے باپ کا نام حاصل کرے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر ایسا نہیں ہوا تو لوگ اسے طعنے دیں گے۔ وہ گالی بن جائے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ارباز کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس وجود کو اپنا نام دے مگر وہ تو شہر سے ہی غائب ہو گیا ہے۔ مجھے صرف اتنا علم ہوا ہے کہ وہ پاکستان سے باہر چلا گیا ہے۔ امریکا میں تربیت حاصل کر رہا ہے۔ میرے اندر سانس لیتے وجود کو اس کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے، میں اس پر غور کرنے لگی اور پھر میں معروف این جی او "پر ہینڈ" کے دفتر پہنچ گئی مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ این جی او کی صدر نادرہ صاحبہ اپنی بیٹی کی بات پکی کرنے کے سلسلے میں لڑکے والوں کے گھر گئی ہوئی تھیں، اس لیے آج نہیں آئیں گی۔ میں اگلے روز پہنچی تو ان سے ملاقات ہوئی مگر جب میں نے مدد کی درخواست کی تو وہ آگ بگولا ہو گئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ساری غلطی میری ہے۔ میرے جیسی لڑکیاں بڑے گھروں کے لڑکوں کو پھانس کر اپنے لیے خوشیاں خریدتی ہیں۔ انہوں نے بے عزت کر کے مجھے اپنے دفتر سے نکال دیا۔ اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے، اگر میں نے اپنے بچے کو باپ کا نام نہیں دلوایا تو وہ زندگی بھر گالی بن کر جیے گا اور میں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی۔" انسپکٹر نے موبائل آف کر دیا پھر بولا۔

"اس کے بعد اس نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ پھر بھی ہر کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ ذہنی الجھن کا شکار ہو کر کیا کر سکتی ہے اور اس نے وہی کیا۔"

انسپکٹر کے خاموش ہوتے ہی ارباز اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ غرائی نظروں سے ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم بھی سمجھ گئے ہو گے کہ اس نے یعنی موہا نے جسے تم مس حسن کے نام سے جانتے تھے اس نے خودکشی کیوں کی۔ اس نے صرف اس لیے خودکشی کی کہ تمہارے بچے کو وہ تمہارا نام نہیں دلوا سکی۔ وہ تمہارے بچے کو ناجائز کہلوانا نہیں چاہتی تھی اور اس کی وجہ صرف اور صرف تمہارے ڈیڈی اور ماما ہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے تمہیں مس حسن سے دور کرنے کے لیے اپنے خرچ پر امریکا میں تمہاری تربیت کا انتظام کیا اور یہاں سے دور بھجوا دیا پھر شائستہ نامی لڑکی سے اسے ہوٹل بھجوایا تاکہ جب تم اس سے ملاقات کرنے جاؤ تو وہ فلیٹ پر نہ ملے۔ ایسا ہی ہوا۔ تمہاری فلائٹ تیار تھی۔ تم اس سے ملے بنا چلے گئے۔ تمہارے جاتے ہی تمہارے ڈیڈ نے اسے فلیٹ سے نکال باہر کیا۔ دفتر میں داخلے پر پابندی عائد کرا دی گویا ساری باتیں کلیئر ہو چکی تھیں۔ اب آگے تمہاری مرضی۔ تمہارا وہ بچہ جو اس دنیا میں آنے سے پہلے مر گیا اس کے لیے تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ مجھے جو معلوم کرنا تھا میں نے معلوم کر لیا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

انسپکٹر کمرے سے باہر گیا تھا کہ کمرے میں ایک قیامت آ گئی۔ ارباز غصے میں بھرا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں واپس آتے ہی چیخ کر کہا۔ "ماما آپ اور ڈیڈی نے میرے بچے کو قتل کیا ہے۔ میری نسل کو ختم کیا ہے۔ اب میرے زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں مگر میں آپ لوگوں کو بھی معاف نہیں کروں گا۔" اتنا کہتے ہی اس نے ماں اور باپ پر گولیاں چلا دیں۔

باہر انتظارگاہ میں بیٹھے سب لوگوں کو اندر آتے دیر لگی۔

اگلے دن کے اخبارات میں دو کالمی سرخی کے ساتھ خبر تھی کہ معروف صنعت کار ملک اینڈ ملک کے مالک اور ان کی بیوی کو ان کے بیٹے نے گولی مار کر خودکشی کر لی۔ وہاں موجود ملک جی کے داماد اور بیٹی کا کہنا تھا کہ اس کام کے لیے ارباز کو ایک پولیس انسپکٹر نے اکسایا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ آصف خان نامی کا انسپکٹر پورے کراچی ڈویژن میں کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ شخص کون تھا۔ یہ راز کھل نہیں پایا۔ ارباز، نادرہ ملک اور ملک جی کو مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔

اسی قبرستان میں ملک جی کی قبر سے کچھ فاصلے پر ایک اور قبر بنی ہوئی تھی۔ اس قبر پر جھکا ایک شخص بڑبڑا رہا تھا۔

"تم میری نہ ہو سکیں اس کی مجھے پروا ابھی نہیں ہے۔ میں تم سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے میری خوشی تھی کہ تم خوش رہو۔ تم نے مجھے ٹھکرا کر جب ارباز کو اپنایا تو میں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا کہ ارباز تمہاری زندگی بنا دے گا۔ تمہیں بہت ساری خوشیاں ملیں گی مگر جب تم نے خودکشی کر لی تو میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ اور وہ کر دکھایا جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ارباز کو اکسا کر تمہیں خودکشی پر مجبور کرنے والوں کو ان کے انجام تک پہنچا دیا۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ تمہاری روح کو قرار آ جائے۔"

غلط فہم

ملک صفدر حیات

اللہ کی بے شمار کرم نوازیوں میں سے ایک بہترین تحفہ فہم و فراست بھی ہے، جسے یہ دولت مل جائے اسے مصائب و آلام کا سامنا کرنے اور ان کی گرفت سے نکلنے کا ہنر آتا ہے مگر... ان سے عاری لوگ ایسے ایسے تماشے کرتے ہیں کہ آخر میں اپنی زندگی سے بھی کھیل جاتے ہیں... وہ لوگ بھی ایک ایسے ہی کھیل کا کردار بن گئے تھے جس کا کوئی سرا ان کے ہاتھ نہیں لگ پاتا لیکن... قانون کے ہاتھ اگر چاہیں تو بڑی سے بڑی گتھی سلجھا سکتے ہیں اور... ملک صاحب نے بھی یہ الجھی ریشم بالآخر سلجھا ہی لی۔

جھوٹے مسیحاؤں کے چہرے بے نقاب کرتی

ایک دلخراش تحریر

چاول کی فصل تیار کھڑی تھی۔ بعض علاقوں میں اس کی کٹائی کا کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ وہ ماہ اکتوبر کا وسط تھا۔ گلابی جاڑے کی بھی آمد تھی۔ دن میں دھوپ بڑی خوش گوار محسوس ہوتی تھی اور رات کو ہلکی پھلکی چادریں اوڑھنا پڑتی تھیں۔ لوگوں نے موسم سرما کے "استقبال" کے لیے لحافوں، گدوں اور دیگر گرم کپڑوں کو دھوپ لگانا شروع کر دی تھی۔ دن میں صحنوں اور مکانوں کی چھتوں پر بچھی چارپائیوں پر گرم ملبوسات، اوڑھنے اور بچھونے پھیلے دکھائی دیتے تھے۔

ہر موسم کے استقبال کا اپنا ایک الگ ہی رنگ ہوتا ہے۔

ایسی ہی ایک خنک صبح کو میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے پتا چلا، دو بندے کافی دیر سے میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ سرد موسم میں، میں عموماً نو بجے تک اپنی سیٹ پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ "کافی دیر سے انتظار میں بیٹھنے" نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

"وہ کون لوگ ہیں؟" میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔ "اور وہ کب تھانے آئے تھے؟"

"ملک صاحب! وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔" کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "انہیں یہاں پہنچے آدھا گھنٹا ہو گیا ہے۔"

"اور تمہاری نظر میں آدھا گھنٹا بہت زیادہ دیر ہے۔" میں نے گھور کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ "وہ کہاں سے آئے ہیں؟"

"جی..... ٹپلی والا سے۔" کانسٹیبل خوشی محمد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، انہیں فوراً میرے پاس بھیجو۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

خوشی محمد نے مجھے سیلوٹ کیا اور یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ "او کے ملک صاحب۔"

ان دنوں میں تھانہ صدر میں تعینات تھا۔ "ٹپلی والا" نامی چھوٹا سا گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ ہم

یہ تھانے سے خاصے فاصلے پر نہر کی دوسری جانب واقع تھا۔ اگر وہ لوگ ساڑھے آٹھ بجے تھانے پہنچے تھے تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ ساڑھے سات بجے گھر سے نکلے ہوں گے۔ اتنی صبح گھر سے تھانے آنا یہی ظاہر کرتا تھا کہ ادھر چپلی والا میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد دونوں مذکورہ افراد میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت کی عمر پینتیس کے قریب تھی اور مرد چالیس کے پیٹے میں نظر آتا تھا۔ وہ سیدھا سادہ ایک دیہاتی جوڑا تھا۔

''ہاں بھئی! آپ لوگ چپلی والا سے اتنی صبح صبح '' میں نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے تھانے دار صاحب۔'' مرد نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام منظور ہے اور یہ میری گھر والی حمیدہ ہے۔ ہم چپلی والا سے نہیں بلکہ ''بندو چک'' سے آئے ہیں۔''

''پھر تھانے میں چپلی والا کیوں بتایا؟'' میں نے پوچھا۔

''بات دراصل یہ ہے جناب ...'' حمیدہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم جس مسئلے کے لیے آپ کے پاس آئے ہیں اس کا تعلق چپلی والا سے ہے۔''

''اوہ ...'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''اب جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ ایسا کون سا سنگین مسئلہ ہے جس نے آپ لوگوں کو صبح ہی صبح گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے؟''

''جناب! مسئلہ مشتاق کا ہے۔'' منظور بتانے لگا۔ ''وہ میرا سالا اور حمیدہ کا اکلوتا بھائی ہے۔ وہ دو تین دن سے غائب ہوگیا ہے۔''

''غائب ہوگیا ہے۔'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب.....؟''

''تھانے دار صاحب! وہ دو دن پہلے تک تو چپلی والا میں موجود تھا۔'' حمیدہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''کچھ پتا نہیں چل رہا، وہ کہاں گم ہوگیا ہے۔''

''مشتاق کی عمر کیا ہوگی؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''یہی کوئی ستائیس اٹھائیس سال۔'' اس نے بتایا۔

''ماشاء اللہ! شادی شدہ ہے۔''

''شادی شدہ ہے۔'' میں نے زیرِ لب دہرایا پھر پوچھا۔ ''اس کی بیوی کہاں ہے؟''

''وہ ادھر چپلی والا میں اپنے گھر میں ہے جی۔'' حمیدہ نے بتایا۔

''اس کی بیوی اس بارے میں کیا کہتی ہے؟''

''زرینہ مکمل طور پر اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہی ہے۔'' منظور نے جواب دیا۔ ''ہم نے مشتاق کے بارے میں سب سے پہلے اسی سے پوچھ گچھ کی تھی لیکن اسے تو کچھ پتا ہی نہیں۔ اس کے مطابق دو روز پہلے مشتاق حسبِ معمول اپنی دکان پر گیا مگر شام میں واپس نہیں آیا۔ وہ خود بہت پریشان بیٹھی ہے جناب ....''

چپلی والا اور بندو چک ایک دوسرے سے لگے ہوئے گاؤں تھے۔ دونوں کے بیچ میں چند کھیت تھے اور بس۔ یہ گاؤں کچا ایمن آباد روڈ پر واقع تھے۔ میرے لیے ابھی تک کچھ نہیں پڑا تھا چنانچہ مزید سوالات کا سہارا لینا پڑا۔

''مشتاق کس چیز کی دکان کرتا تھا؟''

''پرچون کی جناب۔'' حمیدہ نے بتایا۔ ''اس کی دکان چپلی والا ہی میں ہے۔ میں کل اپنے بھائی سے ملنے جب اس کے گھر پہنچی تو زرینہ نے مجھے بتایا کہ مشتاق اچانک کہیں غائب ہوگیا ہے۔''

''پھر .....'' میں نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم لوگوں نے اپنے طور پر مشتاق کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟''

''جناب! جہاں تک ہماری پہنچ تھی، ہم نے اسے ہر جگہ تلاش کر لیا ہے۔'' حمیدہ ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن وہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ رات کو منظور نے مجھ سے کہا کہ ہمیں تھانے جا کر مشتاق کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دینا چاہیے اور ہم صبح ہی صبح آپ کے پاس پہنچ گئے ہیں۔''

''مشتاق کی پرچون کی دکان گھر ہی میں تھی یا گھر سے کچھ دور؟'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''دکان گھر سے تھوڑے فاصلے پر ہے تھانے دار صاحب۔'' منظور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ حسبِ معمول گھر سے دکان کی طرف ہی گیا تھا لیکن رات کو گھر نہیں پہنچا۔''

''اس کی دکان کی کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جب رات کو مشتاق گھر نہیں آیا تو کیا اس کی بیوی نے دکان پر جا کر دیکھا تھا؟''

''جی ہاں، دیکھا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''دکان تو بند پڑی تھی۔ جب ادھر ادھر کے لوگوں سے پوچھا گیا تو پتا چلا کہ مشتاق نے صبح سے دکان کھولی ہی نہیں۔''

''ہوں.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوقوعہ کے روز گھر سے نکلا اور دکان کا رخ کیے بغیر ہی وہ کہیں اور نکل گیا یا پھر....'' میں نے سنسنی خیز انداز میں توقف کیا پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یا پھر کسی نے اسے غائب کردیا......''

''غائب کردیا! کیا مطلب جی؟'' منظور نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے.....'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں گیا تو پھر کسی نے اسے غائب کردیا ہوگا۔ اب آپ لوگ مجھے بتاؤ گے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟''

''نہ جی.... بالکل نہیں۔'' حمیدہ جلدی سے بولی۔ ''مشتاق تو بڑا ہی بھلے مانس اور اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہے جناب۔''

''حمیدہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے تھانے دار صاحب۔'' منظور اپنی بیوی کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''مشتاق بہت ہی سیدھا سادہ بندہ ہے جناب۔ آج تک اس کا کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ میں تو اکثر اسے ''اللہ میاں کی گائے'' کہا کرتا تھا۔''

''تو پھر یہ فرض کرلیتے ہیں کہ وہ گھر سے دکان جانے کے لیے نکلا اور راستے میں کسی ہوائی یا ناری مخلوق نے اسے اغوا کرلیا۔'' میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا واقعی تھانے دار صاحب.....؟'' حمیدہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

''تو پھر اور کیا وجہ ہوسکتی ہے مشتاق کی گمشدگی کی۔'' میں نے باری باری ان میاں بیوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں گیا۔ اس کا کوئی ایسا دشمن نہیں جو اسے غائب کردے۔ اسے نہ تو زمین نے نگلا اور نہ ہی آسمان نے کھانے کی کوشش کی۔ اب آ جا کر وہ سبب باقی رہ جاتا ہے جس کا میں نے آپ لوگوں سے ذکر کیا ہے۔''

''جناب.....!'' حمیدہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میرا دھیان ایک خاص طرف جارہا ہے۔''

''کون سی خاص طرف؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہوسکتا ہے کہ مشتاق اپنی مرضی سے کہیں نکل گیا ہو۔''

''تمہارے اس اندازے کا سبب کیا ہے؟''

''وہ کیا ہے نا جی.....'' حمیدہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''مشتاق کی اپنی بیوی زرینہ سے زیادہ نہیں بنتی۔ ان میں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ ان کی شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں مگر ابھی تک ان کے دل اور ذہن آپس میں نہیں ملے۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کہیں میاں بیوی میں کوئی شدید جھڑپ نہ ہوگئی ہو اور مشتاق زرینہ سے ناراض ہوکر کہیں نکل گیا ہو۔''

''ان لوگوں کے بچے کتنے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''کوئی نہیں جی۔'' حمیدہ کی مایوسی میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''پانچ سال شادی کو ہوگئے۔ ابھی تک کوئی اولاد نہیں۔ میاں بیوی میں لڑائی جھگڑا بھی چلتا رہتا ہے۔'' میں نے متفکر سے ہوئے لہجے میں کہا پھر حمیدہ سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اپنی بھابی سے اس بارے میں پوچھا تھا؟''

''کس بارے میں جی؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''یہی کہ جس صبح مشتاق غائب ہوا تھا اس سے پچھلی رات ان دونوں میں کوئی سنگین جھگڑا تو نہیں ہوا تھا؟'' میں نے اپنی بات کی وضاحت کردی۔

''نہیں جی! میں نے زرینہ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا۔''

''ٹھیک ہے تم نے نہیں کیا تو میں کروں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر باری باری دونوں میاں بیوی کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اضافہ کیا۔

''اس کے علاوہ تم لوگوں کو کوئی اور خاص بات پتا ہو تو مجھے بتاؤ.....؟''

ان کی معلومات کے خزانے خالی ہوچکے تھے لہٰذا وہ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر نفی میں گردن ہلا کر رہ گئے۔

حاصل شدہ معلومات کے مطابق مشتاق دس اکتوبر کی صبح گھر سے دکان جانے کے لیے نکلا تھا اور اس کے بعد کسی نے اسے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ آج تیرہ اکتوبر کی تاریخ تھی۔ بادی النظر میں یہ کوئی سنسنی خیز اور ایمرجنسی کیس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ اس کی اپنی بیوی سے زبردست قسم کی منہ ماری ہوگئی ہوگی اور وہ ''اللہ میاں کی گائے'' جدھر منہ اٹھا، ادھر ہی نکل گیا ہوگا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ان میاں بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ واپس چپلی والا جاؤ اور ادھر مشتاق کے گھر ہی میں رکو۔ میں تھوڑی دیر کے بعد وہاں پہنچ رہا ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مشتاق مل جائے گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے تھانے سے رخصت ہو گئے۔

میں نے منظور اور اس کی بیوی کو تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر تھانے سے روانہ کر دیا تھا لیکن یہ تھوڑی دیر سہ پہر میں کہیں جا کر ہوئی۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ ان کے جاتے ہی ایک سنسنی خیز کیس آ گیا تھا۔ دو گروپوں میں زبردست مار دھاڑ ہوئی تھی۔ میرے تھانے کے نزدیک ہی ویگنوں کا ایک اڈا تھا۔ وہاں سے چلنے والی ویگنیں دو گروپوں کی تھیں جو سیاسی طور پر ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ پہلے ویگن بھرنے کی بحث و تکرار میں کچھ زیادہ ہی گرما گرمی ہو گئی جس کے نتیجے میں آٹھ دس زخمی افراد کو تھانے لایا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ان کے سرپرست بھی تھانے پہنچ گئے اور طویل کچہری شروع ہو گئی۔

دونوں پارٹیوں کا موقف یہی تھا کہ وہ حق پر ہیں اور دوسرے نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں نے دونوں پارٹیوں کو فرداً فرداً سنا۔ ان کے بہت زیادہ جوشیلے اور مار دھاڑ کرنے والے بندوں کو حوالات میں بند کیا۔ شدید زخمی افراد کو اسپتال بھجوایا اور باقی کو یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی کہ اب اس مسئلے کو کل دیکھیں گے۔ میں دراصل حوالاتیوں سے تفتیش کرنا چاہتا تھا تاکہ پتا چلتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ ایسے میں ان کے سرپرستوں کو بھی نصیحت ہو جاتی کہ وہ چاہے کتنی بھی اونچی اونچی باتیں کرنے والے کیوں نہ ہوں، میں ان کے بندوں کو قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے تھانے میں بند کر سکتا ہوں۔

میرا تھانہ مین روڈ پر تھا۔ میں نے کانسٹیبل عمران علی کو ساتھ لیا اور ایک تانگے میں بیٹھ کر چپلی والا کی جانب روانہ ہو گیا۔ مین روڈ پر تھانے سے تھوڑا جنوب کی سمت فاصلہ طے کریں تو وہاں سے بائیں جانب ایک کچا راستہ نکلتا تھا جو کچا امین آباد روڈ کہلاتا تھا جو سیدھا امین آباد تک جاتا تھا۔ ویسے مین روڈ سے بھی امین آباد جایا جا سکتا تھا۔ مین روڈ بعد میں بنا تھا جبکہ کچا امین آباد روڈ قیام پاکستان سے بہت پہلے سے موجود تھا۔ اس زمانے میں لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس راستے پر سفر کیا کرتے تھے۔

ہمارا تانگہ مین روڈ سے کچے راستے پر آیا۔ پھر ریلوے لائن کراس کر کے کنھیا لال باغ کے اندر سے گزرتے ہوئے وہ چپلی والا کی جانب بڑھنے لگا۔ راستے کے دونوں طرف کھیتوں میں چاول کی فصل دکھائی دیتی تھی۔ امرودوں کے باغ کے پاس سے گزر کر ہم نہر پر پہنچ گئے۔ یہ نہر ''اپر چناب'' کے نام سے مشہور ہے۔ نہر کی دوسری جانب موضع چپلی والا آباد تھا۔ ہم سہ پہر کے وقت چپلی والا میں تھے۔ مشتاق پرچون فروش کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

گاؤں بڑا ہو یا چھوٹا، پولیس کی آمد سے کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ یہی حال اس وقت چپلی والا کا بھی تھا۔ میری ہدایت کے مطابق حمیدہ اور منظور مشتاق کے گھر کے اندر موجود تھے۔ ان کے علاوہ بھی وہاں بہت سے لوگ بھرے ہوئے تھے جو خیر خبر لینے آئے تھے۔ اب یہ بات چھپی نہیں رہی تھی کہ مشتاق پچھلے تین دن سے غائب تھا اور یہ بھی کہ اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی جا چکی ہے۔

میں نے وہاں پہنچتے ہی تمام غیر متعلقہ افراد کو گھر سے باہر نکال دیا۔ اب صرف تین افراد باقی رہ گئے تھے یعنی منظور، اس کی بیوی حمیدہ اور زرینہ۔ میں نے زرینہ کی طرف رخ کرنے سے پہلے منظور سے پوچھا۔

''کیوں بھئی.... کوئی نئی بات سامنے آئی؟''

''نہیں جی، کچھ بھی نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سب جوں کا توں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مشتاق گیا تو گیا کہاں....''

میں نے بغور زرینہ کا جائزہ لیا۔ وہ ایک نہایت ہی حسین و جمیل اور شاداب عورت تھی۔ اس کی دلکشی اور جاذبیت میں کوئی کلام نہیں تھا۔ ایسی خوب صورت عورتیں بہت کم میری نگاہ سے گزری تھیں۔ زرینہ کی عمر پچیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اسے اپنے شوہر کی گمشدگی کا کچھ زیادہ غم ہو۔ یہ بات ذہن میں چبھنے والی تھی۔ بہرحال کسی کے دل کا حال جاننا تو ممکن نہیں۔ اس کا انٹرویو کرنے کے بعد ہی پتا چل سکتا تھا کہ وہ کس کیفیت میں ہے۔

میں نے منظور اور اس کی بیوی حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں زرینہ سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی.... ضرور۔'' منظور نے جلدی سے کہا۔ ''ہم

ادھر کمرے میں چلے جاتے ہیں۔"

اس وقت ہم گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے اثبات میں گردن ہلانے کے بعد منظور اور اس کی بیوی گھر کے اندرونی کمرے کی سمت بڑھ گئے۔

دو دو کمروں اور وسیع صحن پر مشتمل ایک درمیانے درجے کا گھر تھا۔ صحن میں امرود اور انار کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ میں جن نگاہوں سے گھر۔۔۔۔۔۔ کا جائزہ لے رہا تھا اس دوران میں زرینہ گاہے بہ گاہے چور نظر سے مجھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کی اس اضطراری حرکت نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا اور میں براہ راست اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ہوں.....!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "زرینہ! میری دلی ہمدردی تمہارے ساتھ ہے اور میں یہی کوشش کروں گا کہ جلد از جلد تمہارے شوہر کو ڈھونڈ نکالوں لیکن....."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی پھر اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ "لیکن کیا جی.....؟"

"لیکن یہ کہ..... اس کے لیے تمہیں مجھ سے بھرپور تعاون کرنا پڑے گا۔"

"جی۔ میں تعاون کروں گی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ مشتاق کہاں گیا ہوگا؟" میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"نہیں جی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

"کیا وہ اس سے پہلے بھی یوں چپ چاپ غائب ہوتا رہا ہے؟"

"نہیں جناب۔"

"اس کے یار بیلی یا دوسرے رشتے دار کون کہاں رہتے ہیں؟"

"اس کی صرف ایک ہی بہن ہے حمیدہ۔" اس نے جواب دیا۔ "اور کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے اور جہاں تک یار دوستوں کا تعلق ہے تو یہ کام اس نے کبھی کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔"

"کون سا کام؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"دوست بنانے کا کام جی۔"

"اور دشمن بنانے کے بارے میں تمہارا کیا.....؟"

"یہ کام اس کے بس کا نہیں تھا۔" وہ نیم طنزیہ انداز میں بولی۔ "دشمنیاں پالنے کے لیے بڑے دل گردے اور جگر کی ضرورت ہوتی ہے تھانے دار صاحب۔"

"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو زرینہ۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "تو تمہارے خیال میں مشتاق کے اندر دل گردہ نہیں تھا؟"

"میں نے ہمت اور جرأت کی بات کی تھی۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "مشتاق انتہائی بزدل اور کم ہمت آدمی ہے۔"

میں نے ظاہر ہے مشتاق کو دیکھا نہیں تھا لیکن اس کی بہن حمیدہ کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور قائم کر سکتا تھا کہ وہ کس وضع قطع اور حلیے کا ہوگا۔ حمیدہ گندمی رنگت کی دبلی پتلی... کمزور سی دیہاتن تھی۔ میں نے زرینہ کی متوقع دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"زرینہ..... جب مشتاق کے مقابلے میں تم خاصی بہادر اور جرأت والی ہو۔"

"جی یہ بات تو ہے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

جن عورتوں کے شوہر اچانک گم ہو جاتے ہیں ان کے چہرے کے تاثرات اور دلی کیفیت میں ایک خاص نوعیت کا حزن و ملال پایا جاتا ہے لیکن یہ بات زرینہ کی کسی ادا سے جھلکتی نظر نہیں آئی تھی اور یہی نکتہ مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یا تو وہ شوہر کی گمشدگی کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھی اور یا پھر وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔

"مجھے پتا چلا ہے، تمہاری شادی زبردستی مشتاق سے کر دی گئی تھی؟" میں نے اسے ایک اور پہلو سے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "ابا کو مرنے کی جلدی تھی اور ان کی یہ ضد بھی تھی کہ مرنے سے پہلے مجھے ڈولی میں بیٹھا ہوا بھی دیکھیں گے۔ بس.....!" یہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"اس طرح مشتاق سے میری شادی ہو گئی۔ پانچ سال سے اس شخص کو بھگت رہی ہوں۔"

"میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ آپ دونوں کا کثرت سے لڑائی جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا؟" میں نے زرینہ کو کھنگالنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ اب تو میں اس کی عادی ہو چکی تھی۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"اور وہ کس بات پر جھگڑا ہوا کرتی تھی؟"

"اس کی حماقتوں پر۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ "اگر وہ سارا دن پرچون کی دکان میں بیٹھ کر میرے لیے اور اپنے لیے روزی روٹی کماتا تھا تو اس میں احسان والی کون سی بات تھی۔ یہ تو اس کا فرض تھا۔ میں بھی تو دن بھر گھر کے ہزاروں کام کر رہی ہوتی تھی۔ رات کو گھر آ کر وہ بھی ٹانگیں دبانے کا مطالبہ کرتا اور کبھی پاؤں دبانے یا پھر فرمائش کرتا کہ میں اس کے سر میں تیل کی مالش کروں۔ اس کو تو شکر کرنا چاہیے تھا کہ مجھ جیسی خوب صورت بیوی اس کے حصے میں آ گئی ورنہ کوئی جنگلی بھی اس سے شادی کے لیے تیار نہ ہوتی۔"

"ہوں..." میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اب یہ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ زرینہ کو اپنے شوہر کی گمشدگی کا زیادہ دکھ کیوں نہیں تھا۔ ان میاں بیوی کے بیچ کسی قسم کی کوئی انڈر اسٹینڈنگ بھی نہیں تھی۔ بس وہ گزر بسر کر رہے تھے۔ ایک بات یہ بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ مشتاق شکل وصورت کے لحاظ سے بس ایویں سا ہی رہا ہوگا جبکہ زرینہ میرے سامنے تھی۔ اس کے حسن کی میں تعریف کر چکا ہوں۔

"کیا اس رات بھی تمہارے درمیان کسی قسم کا جھگڑا ہوا تھا جس کی اگلی صبح مشتاق چپ چاپ غائب ہو گیا؟" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔

"جی جھگڑا تو روز ہی ہوتا تھا۔" وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ "کسی ایک رات کا یہ معاملہ نہیں۔"

"میں یہ بات اس حوالے سے پوچھ رہا ہوں کہ کہیں وہ تمہاری کسی سخت بات پر ناراض ہو کر تو نہیں کہیں چلا گیا؟"

"وہ مجھ سے لڑائی جھگڑا ضرور کرتا تھا لیکن وہ مجھ سے ناراض ہونے یا چھوڑ کر چلے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بڑے فخر سے بولی۔ "اس بات کا اسے بھی اچھی طرح احساس ہے کہ مجھ جیسی حسین بیوی اسے مل نہیں سکتی۔"

زرینہ کے فخر کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اسے دیگر مختلف زاویوں سے ٹٹولا مگر کوئی اہم بات معلوم نہ ہو سکی۔ یہ کیس ایک معمے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ مشتاق کا کوئی دشمن نہیں تھا جو یہ سوچا جاتا کہ کسی نے اس کی جان لے لی ہوگی۔ کوئی دوست یا عزیز رشتے دار بھی نہیں تھا جو یہ خیال کر لیا جاتا کہ وہ خاموشی سے ان میں سے کسی کے پاس چلا گیا ہوگا۔ مشتاق کی گمشدگی میں بڑی پراسراریت تھی اور فی الحال تو یہی نظر آ رہا تھا کہ زرینہ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ میں نے جاتے جاتے اس سے پوچھ لیا۔

"ایک ذاتی سا سوال ہے زرینہ... اگر تمہیں برا نہ لگے تو کروں؟"

"ضرور پوچھیں جی۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ تو میرے خیر خواہ ہیں۔ میں بھلا آپ کو کیوں نہیں بتاؤں گی۔"

"آپ لوگوں کی شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔" میں نے اس کی پرکشش آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لیکن ابھی تک آپ لوگوں کا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ کیا یہ قدرت کی طرف سے ہے یا تم لوگ کوئی خاص قسم کی احتیاط کر رہے ہو؟"

"پہلے تو میں یہی سمجھتی تھی کہ قدرت ہی کی طرف سے دیر ہے۔" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن کچھ عرصہ پہلے اس محرومی کی وجہ پتا چل گئی ہے۔"

"کیا مطلب...؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"لگ بھگ ایک ماہ پہلے ہم دونوں شاہ جی کے پاس گئے تھے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بتانے لگی۔ "شاہ جی نے حساب کتاب لگایا اور بڑے وثوق سے کہہ دیا کہ یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔"

"دو طرفہ معاملہ...؟"

"جی تھانے دار صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ایک تو انہوں نے بندش بتائی تھی اور دوسرے یہ کہ مشتاق کے اندر کوئی خاص قسم کی کمزوری ہے۔"

"کیسی بندش؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"اولاد کی بندش۔" اس نے جواب دیا۔

"انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس بندش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

"نام تو نہیں بتایا جی۔" وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "لیکن شاہ جی نے جو اشارے دیے ہیں ان سے حمیدہ والی پر ہی سوئی اٹکتی ہے۔" بات ختم کر کے وہ نفرت بھری نظر سے اس کمرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں منظور اور اس کی بیوی حمیدہ موجود تھے۔ "مجھے تو شک ہے کہ وہ اس وقت بھی اندر کوئی کارروائی کر رہی ہوگی۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی زرینہ۔" میں نے اس کے شک کو نظر انداز کرتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "مشتاق تو حمیدہ کا سگا اور اکلوتا بھائی ہے۔ وہ اس کے لیے اولاد کی بندش کیوں کرائے گی؟"

"یہ ایک الگ کہانی ہے تھانے دار صاحب..." وہ

ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کو میری بات کا یقین بھی آئے گا یا نہیں۔''

''کہانی چاہے کتنی بھی لمبی کیوں نہ ہو، میں سن لوں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور اس بات کا فیصلہ میں تمہاری کہانی سننے کے بعد کروں گا۔ مجھے اس پر یقین کرنا چاہیے یا نہیں لہٰذا تم بلا جھجک شروع ہو جاؤ۔''

اس نے مختلف زاویوں سے اپنے اور حمیدہ کے خاندانی حالات بیان کرنے کے بعد بالکل مختصر کہا۔

''تھانے دار جی! بات دراصل یہ ہے کہ حمیدہ بہت ہی تیکھی اور سازشی عورت ہے۔ یہ اپنے گھر والے کی چھوٹی بہن ثمینہ سے مشتاق کی شادی کرانا چاہتی تھی۔ ثمینہ واجبی سی شکل وصورت کی مالک ہے جبکہ مشتاق مجھ پر ریجھا ہوا تھا۔ اس طرح جب میری اور مشتاق کی شادی ہوئی تو اس سے حمیدہ کو شدید صدمہ ہوا۔ بس اسی دن سے یہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے۔ میرے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''مثلاً... کیسی الٹی سیدھی باتیں؟'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ایسی... ایسی باتیں جن کو سن کر مشتاق مجھے طلاق دے دے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کبھی وہ مجھے کسی موچی کے لڑکے خوشیا کے ساتھ بدنام کرنے کی کوشش کرتی ہے تو کبھی دینو کمہار کے لڑکے منیرو کے ساتھ اور جب کسی بھی طرح اس کی دال نہیں گلی تو اس نے بندش کروا دی ہے۔ مجھے شک ہے...'' تھوڑی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ جو مشتاق دن رات مجھ سے لڑائی جھگڑا کرتا رہتا ہے نا، یہ بھی حمیدہ کی چالوں ہی کا نتیجہ ہے۔''

میں نے بڑی توجہ سے زرینہ کی بات سنی۔ ''بندش'' والے معاملے کو تو میں نے خرافات کے کھاتے میں ڈالا البتہ خوشیا اور منیرو کے ناموں نے اس کیس میں میری دلچسپی کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔ میں چونکہ زرینہ کے موقف سے آگاہ ہو چکا تھا لہٰذا میں نے مختلف زاویے سے سوال کیا۔

''یہ خوشیا اور منیرو بھی پیلی والا ہی میں رہتے ہیں؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''وہ دو تین گلیاں چھوڑ کر ادھر ہی رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے زرینہ!'' میں نے اس کے دل کی بات کہی۔ ''تم فکر نہیں کرو۔ میں اس معاملے کی پوری تحقیق کروں گا۔ اگر تمہاری نند حمیدہ غلط ثابت ہوئی تو میں اسے تھانے میں بند کر دوں گا اور ایسی کڑی سزا دوں گا کہ آئندہ وہ کبھی تمہاری طرف میلی نظر سے نہیں دیکھے گی۔''

''جی۔ بہت بہت شکریہ۔'' اس کے چہرے اور آنکھوں میں ایک اطمینان بھری خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

میں ''شاہ جی'' کو ابھی ایک لمحے کے لیے نہیں بھولا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اسے کھنگالنے کی کوشش کی۔

''زرینہ! یہ تو بتاؤ، شاہ جی کیا شے ہیں؟''

''وہ شے نہیں ہیں جناب...'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''شاہ جی اللہ والے اور بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔''

شاہ جی کے لیے زرینہ کی عقیدت ایک لمحے میں ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔ یہ بہ موقع نہیں تھا کہ میں زرینہ کو اپنے نظریات سے قائل کرنے کے لیے کوئی مناظرہ شروع کر دیتا چنانچہ میں نے نہایت ہی محتاط الفاظ میں کہا۔

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں... مطلب یہ کہ وہ کہاں پائے جاتے ہیں؟''

''آپ نے یہ نہر دیکھی ہے نا...؟''

''ہاں دیکھی ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اسی نہر کے اوپر سے گزر کر تو ہم پیلی والا میں داخل ہوئے ہیں۔''

''بس جی! اسی نہر کے کنارے پیلی والا کی طرف ان کا آستانہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''لوگ دور دور سے اپنے مسئلے لے کر ان کے پاس آتے ہیں اور مرادوں کی جھولیاں بھر کے جاتے ہیں۔''

''آپ لوگ بھی ایک ماہ پہلے شاہ جی کے پاس گئے تھے اپنے من کی مراد لے کر۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور شاہ جی نے تمہیں بندش اور مشتاق کو مخصوص قسم کی کمزوری بتائی تھی؟''

''جی... جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''کیا آپ لوگوں کو شاہ جی نے کوئی علاج بھی بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی... انہوں نے دونوں کے علاج کی بات کی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ کہہ رہے تھے، مشتاق کو کوئی خاص کشتہ بنا کر دیں گے۔ ایک ماہ تک اس کشتے کے استعمال سے مشتاق کی ساری کمزوری جاتی رہے گی اور دو

ایک بھرپور مرد بن جائے گا۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"مجھ پر انہوں نے دم کرنے کو کہا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ میں سات دن تک نہایت ہی پابندی کے ساتھ ان کے آستانے پر آؤں۔ وہ ہر روز مجھ پر کوئی خاص عمل کریں گے جس سے بندش کی کاٹ ہو جائے گی اور سارے معاملات سیدھے ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ جب تک علاج جاری رہے گا، ہمیں پرہیز کرنا ہوگا ... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا!"

میں کوئی ننھا بچہ نہیں تھا جو لفظ "پرہیز" کی معنویت سے نابلد ہوتا۔ زرینہ کے استفسار کے جواب میں، میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔

"تو پھر آپ میاں بیوی نے شاہ جی کا علاج شروع کیا؟"

"کہاں جی۔ مشتاق نے بڑی گڑبڑ کر دی تھی۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہاں شاہ جی کے پاس تو یہ نامعقول "ہاں، ہاں" کرتا رہا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔" وہ چہرے پر ناگواری کے تاثرات سجاتے ہوئے بولی۔ "کہنے لگا.... میرے اندر کوئی کمزوری نہیں۔ میں شاہ جی کا کشتہ نہیں کھاؤں گا اور نہ ہی تمہیں کسی دم وغیرہ کے لیے ان کے آستانے پر جانے دوں گا۔ بس، خاموش ہو کر گھر میں بیٹھی رہو۔ اگر اللہ نے قسمت میں اولاد لکھی ہے تو ضرور ہوگی۔ اس کی اس جاہلانہ سوچ کا میں مقابلہ نہ کر سکی اور اپنے نصیب کو رو دھو کر چپ ہو گئی ...." پھر اس نے امید بھرے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

"تھانے دار جی! مجھے تو لگتا ہے، حمیدہ نے مشتاق پر بھی کوئی کالا پیلا کر رکھا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم دین سے دوری کے باعث جہالت کے تاریک غاروں میں بے مہار دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اگر کوئی شخص کھری اور کھری بات کہہ دے تو اسے الو کا پٹھا سمجھا جاتا ہے۔ لوگ دیوانہ سمجھ کر اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ یہی سب مشتاق کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ بہرحال، زرینہ نے مجھ سے میرا خیال جانا تھا لہٰذا اس کی تشفی بھی ضروری تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"زرینہ! تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں دو تین دن میں تفتیش مکمل کر لوں گا۔ اس کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس ملاقات میں، میں نے زرینہ کو باور کرا دیا تھا کہ میری ساری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا تاکہ وہ مجھ سے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی چھپانے کی کوشش نہ کرے۔

حمیدہ اور منظور بھی میرے ساتھ ہی زرینہ کے گھر سے باہر نکل آئے تھے۔ جب ہم تانگے کے نزدیک پہنچے تو حمیدہ نے پوچھا۔

"کچھ بتایا ہے جی اس نے ....؟" اس کا اشارہ زرینہ کی جانب تھا۔

"بتایا تو بہت کچھ ہے مگر اس میں مشتاق کے بارے میں کچھ نہیں۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "بلکہ اس نے ہر برائی کی جڑ تمہیں قرار دیا ہے۔"

"مجھے .....!" حمیدہ ایسے اچھلی جیسے کسی زہریلے بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ "میں نے اس کی کون سی گائے بھینس (بھینس) چرا لی ہے......؟"

"یہ ایک دلچسپ اور طویل قصہ ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اس پر کل بات کریں گے اور ہاں......" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "کل میں کسی وقت آپ دونوں کو تھانے بلاؤں گا۔ آپ نے بکلی وانا سے گزرتے ہوئے خود کو بہت پریشان ظاہر کرنا ہے جیسے تھانے دار نے آپ کو کسی جرم میں گرفتار کر لیا ہے۔"

"مگر ایسا کیوں؟" منظور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس ڈرامے کی اشد ضرورت ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر ان کے اطمینان کی خاطر کہہ دیا۔ "زرینہ کی باتوں سے مجھے کچھ ایسے اشارے ملے ہیں جن سے اس کے گھر والے کی گمشدگی کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ شام سے پہلے تم دونوں اپنے گھر میں ہو گے۔"

ان کے چہرے تو یہی بتا رہے تھے کہ میری بات ان کے پلے نہیں پڑی تاہم منظور نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔ "ٹھیک ہے تھانے دار صاحب...... جو آپ کا حکم!"

میں کانسٹیبل کے ساتھ تانگے میں بیٹھا اور تھانے کی

جانب روانہ ہو گیا۔ مغرب کی اذان راستے ہی میں ہو گئی تھی۔ جب ہم تھانہ صدر پہنچے تو چاروں جانب اندھیرا چھا چکا تھا۔

☆☆☆

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹا تو مشتاق کی پراسرار گمشدگی والا واقعہ بھی میرے ذہن میں تھا۔ اگر مشتاق اور زرینہ کی آپس میں بنتی نہیں تھی تو اس میں حیرت والی کوئی بات نہیں تھی۔ عموماً ایک سے دو فیصد میاں بیوی ہی کی آپس میں بنتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر لوگ اندرونی حالات کا باہر ذکر نہیں کرتے اور ''سب اچھا ہے'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہے کہ کوئی بھی دوسرے کی برتری ماننے کو تیار نہیں ہوتا کیونکہ ہر دوسرا خود کو ہی برتر سمجھتا ہے جبکہ خوشگوار اور دیرپا تعلقات کے لیے تفہیم ورضا بہت ضروری ہے یا کسی کو اپنا بنا لیں یا پھر کسی کے ہو جائیں۔

میں سمجھتا ہوں، مشتاق، زرینہ سے ہونے والے لڑائی جھگڑے کے باعث نہیں گیا ہوگا۔ سرِدست جو حالات سامنے تھے ان کی روشنی میں یہی نظر آتا تھا کہ مشتاق کو غائب کر دیا گیا تھا۔

اسے کس نے غائب کیا تھا....؟

یہ ایک سنسنی خیز اور اہم سوال تھا جس کا جواب مجھے تلاش کرنا تھا۔ میں نے اس نکتے پر غور کیا تو میری نگاہ کے سامنے ایک راستہ سا کھل گیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ مشتاق کو غائب کرنے والا اس کا دشمن ہوگا۔

اب تک کی حاصل شدہ معلومات کے مطابق دور دور تک مشتاق کا کوئی دشمن دکھائی نہیں دیتا تھا مگر میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے حتی الامکان نگاہ دوڑائی تو اس کے دو دشمنوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا.. مطلب، دو پارٹیوں کو۔

ایک پارٹی دو افراد پر مشتمل تھی یعنی تگی موچی کا بیٹا خوشیا اور دینو کمہار کا بیٹا شیرو۔ زرینہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی نند حمیدہ ان دونوں لڑکوں کے ساتھ منسوب کر کے اس کی عزت خراب کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ عین ممکن تھا کہ حمیدہ اس سلسلے میں مشتاق کے کان بھی بھرتی ہو اور یہ بھی کہ مشتاق کی ان دونوں سے یا ان میں سے کسی ایک سے تلخ کلامی ہو گئی ہو۔ مشتاق ایک حسین وجمیل اور پرکشش بیوی کا شوہر تھا اور خود واجبی سی شکل وصورت کا مالک۔ ایسے کیسوں میں شوہر بہت زیادہ شکی اور زود رنج ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جس کی غلطی سے بھی اس کی خوب صورت بیوی پر نظر پڑ جائے، اس کے بارے میں وہ یہی سوچتا ہے کہ اس کی بیوی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے۔ ایسے شوہر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں اور آئے دن ان کے لوگوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔

اس تناظر میں خوشیا اور شیرو میں سے کوئی بھی مشتاق کا متوقع دشمن ہو سکتا تھا لہٰذا میں نے اگلی ہی صبح انہیں پوچھ گچھ کے لیے تھانے بلانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ پتا تو چلے یہ نوجوان کس مزاج کے لوگ ہیں۔

مشتاق کا دوسرا متوقع دشمن ''شاہ جی'' بھی ہو سکتا تھا۔ زرینہ کے مطابق شاہ جی نے ان کی بے اولادی کے اسباب کا سراغ لگانے کے بعد ان کے لیے الگ الگ علاج بھی تجویز کر دیا تھا لیکن مشتاق نے انتہائی سرکشی اور نافرمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ جی کی صلاح کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ مشتاق کے اس گستاخانہ رویے کی شاہ جی کو خبر نہ ہوئی ہو۔ زرینہ نے بڑی عقیدت اور احترام سے مجھے بتایا تھا کہ شاہ جی بہت پہنچے ہوئے اور کرنی والے بزرگ ہیں۔ عین ممکن تھا شاہ جی نے بدتمیز اور بے ادب مشتاق کو اپنی کرنی کے زور پر کہیں بہت اوپر پہنچا دیا ہو۔ میرا سابق پیشہ ورانہ تجربہ تو یہی بتاتا تھا کہ اس نوعیت کے آستانہ نشین ''جعلی باباؤں'' سے ہر قسم کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔

میں نے سونے سے پہلے ایک اہم فیصلہ یہ بھی کیا کہ آئندہ روز میں تھوڑا وقت نکال کر شاہ جی کی ''قدم بوسی'' کے لیے بھی جاؤں گا تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ وہ کہاں سے کہاں تک پہنچے ہوئے ہیں.. ؟

آدھی رات کے بعد ایک مخصوص آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اکتوبر کا وسط تھا۔ رات میں اچھی خاصی خنکی ہو جاتی تھی۔ سب لوگوں نے صحن اور چھتوں کو خیرباد کہہ کر گھروں کے اندرونی کمروں میں سونا شروع کر دیا تھا اور وہ بھی کمبل یا کھیس اوڑھ کر۔ میں بھی اپنے سرکاری کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ میں نے اوپر جس مخصوص آواز کا ذکر کیا ہے، وہ بارش کی آواز تھی۔ میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا تو صحن میں رم جھم کا سماں تھا۔ جی تو یہی چاہا کہ وہیں کھڑے ہو کر اس برستی ہوئی بارش کا نظارہ کروں لیکن صحن میں پڑے ہوئے سامان کو بچانا بھی ضروری تھا۔

صحن میں چارپائی کے علاوہ بھی چند ایسی چیزیں رکھی

تھیں۔ میں تو بارش میں بھیگنے سے بچا تھا۔ اتنی دیر میں چند پتھر سے بھی بھیگے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اس سامان کو سمیٹا اور برآمدے میں منتقل کر دیا۔ اس کے باوجود بھی بارش نے مجھے اچھی طرح بھگو ڈالا تھا۔ میں نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور دوبارہ گرم بستر میں دبک گیا۔

عموماً ان دنوں بارشیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ قانون قدرت ہے کہ جب کھیتوں میں کوئی فصل تیار کھڑی ہو تو بارش نہیں ہوا کرتی کیونکہ بارش تیار فصل کے لیے نہایت ہی خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوتی ہے میں نے بارش کے تھمنے کی دعا کی۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی جب میں نے صدق دل سے دعا کی تھی۔

صبح میں بیدار ہوا تو بارش کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ آثار سے یہی نظر آتا تھا کہ بارش آدھا پون گھنٹا سے زیادہ نہیں برسی ہوگی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے تھانے پہنچتے ہی سب سے پہلے اپنے عملے کے ایک آدمی کو ہندو چک اور پیپلی والا کی جانب روانہ کر دیا۔ اسے پہلے ہندو چک سے حمیدہ اور اس کے شوہر منظور کو اٹھانا تھا پھر پیپلی والا سے گنی موچی کے بیٹے خوشیا اور دینو کمہار کے بیٹے منیرو کو ساتھ لے کر تھانے واپس آنا تھا۔ میں نے اس اہلکار کو خاص طور پر یہ ہدایت کر دی تھی کہ جب وہ پیپلی والا سے خوشیا اور منیرو کو اٹھائے تو اہل پیپلی والا کو یہ نظر آنا چاہیے کہ تھانے میں منظور حسین اور اس کی بیوی حمیدہ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ سب میں زرینہ کی تسلی کے لیے کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرے۔

دراصل میں زرینہ کی ذات اور اس کے بیان کردہ حالات سے مطمئن نہیں تھا۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس نے کہیں نہ کہیں مجھ سے دروغ گوئی کی ہے۔ ایسی دروغ گوئی جس کا مشتاق کی گمشدگی سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔ میں زرینہ کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے اور حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں گا۔

گزشتہ روز دیگن اسٹینڈ پر جو دنگا فساد ہوا تھا اس کے ملزمان میرے تھانے کی حوالات میں بند تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کے خیرخواہ علاقے کے بااثر افراد بھی آ گئے۔ میں نے آدھے گھنٹے کی کچہری کے بعد دونوں پارٹیوں میں صلح صفائی کرا دی اور انہیں رخصت کر دیا۔ میرے سامنے تو انہوں نے گلے مل کر مصالحت کر لی تھی۔ یہ بات میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کے لیے اپنے دلوں کو بھی صاف کیا تھا یا نہیں۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے ہندو چک اور پیپلی والا کے ”مہمان“ تھانے پہنچ گئے۔ میں نے خوشیا اور منیرو کو فوراً حوالات میں بند کروا دیا اور منظور کو حمیدہ سمیت اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ دونوں میرے سامنے آ کر بیٹھے تو میں نے کچھ دیر بعد ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا زرینہ نے آپ لوگوں کو تانگے میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا؟“

”جی ہاں۔“ وہ بیک زبان ہو کر بولے۔ ”نہ صرف دیکھا تھا بلکہ وہ تو خوش بھی ہو رہی تھی .... “ پھر منظور نے مجھ سے پوچھا۔

”تھانے دار صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”پتا نہیں، یہ کیا ہو رہا ہے یا ہو جائے۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”میں نے تو ایک پرندے کو شکار کرنے کے لیے دانہ ڈالا ہے۔ وہ پرندہ مجھے مشتاق تک پہنچا دے گا۔“

وہ دونوں الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔

میں نے سلیس الفاظ میں وضاحت کی تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ حمیدہ کی سرسراتی ہوئی آواز .... خارج ہوئی۔

”تت .... تو .... اس کا مطلب ہے مشتاق کو زرینہ نے غائب کیا ہے؟“

عورتوں کے سوچنے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے اور وہ کسی چیز کے بارے میں رائے قائم کرنے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کرتیں جیسے کسی پیر استاد نے انہیں بتا رکھا ہو کہ .... بچہ! ایسے کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ مطلب نکلتا ہو۔“ میں نے حمیدہ کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ”مجھے کچھ اشارے ملے ہیں جن کی وضاحت کے لیے میں نے تمہیں تھانے بلایا ہے۔ اگر میرا شک درست ثابت ہوتا ہے تو پھر مشتاق کا سراغ لگانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

”سرکار! آپ نے بلایا اور ہم آپ کے حکم پر چلے آئے۔“ منظور نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ ہم سے جو بھی سوال کریں گے، ہم اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیں گے۔“

”مجھے زیادہ سوالات تو تمہاری بیوی ہی سے کرنا ہیں منظور۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ زرینہ سب سے زیادہ محبت حمیدہ ہی سے کرتی ہے۔“

"یہ آپ عجیب بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" حمیدہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس کو تو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ وہ میری برائی کے علاوہ بھی کچھ کرسکتی ہو...." لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"سچ بتائیں تھانے دار صاحب!" میں نے اس کے سوال میں خاصی سنسنی محسوس کی۔ "آپ نے یہ بات طنزیہ انداز میں کی ہے نا؟"

"تمہارا انداز درست ہے حمیدہ۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، اس کمینی نے میرے خلاف بہت زہر اگلا ہے؟" اس نے تلخی سے پوچھا۔ "آپ کو میرے بارے میں الٹا سیدھا بتایا ہے...... ہیں نا؟"

حمیدہ کے استفسار کے جواب میں، میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ "میں نے تمہیں اسی وضاحت کے لیے تو تھانے بلایا ہے۔"

"آپ پوچھیں جی، کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔" وہ جوش میں آتے ہوئے بولی۔ "میں بھی تو سنوں اس بدبخت نے کون سی آگ اگلی ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ منظوری کی ایک چھوٹی بہن ثمینہ ہے؟"

"جی ہاں...... اس میں بھلا کیا شک ہے۔"

"تمہاری یہ خواہش تھی کہ ثمینہ اور مشتاق کی شادی ہو جائے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل! میں ایسا ہی چاہتی تھی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں ثمینہ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ میری نند ہے اور ہم کئی سالوں سے ایک ساتھ، ایک ہی گھر میں رہ رہے تھے۔ میں سمجھتی ہوں، مشتاق کے لیے ثمینہ سے زیادہ موزوں اور کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی تھی اسی لیے میری یہ تمنا تھی کہ ان کی شادی ہو جائے مگر......" اس کے چہرے پر دکھ اور نفرت کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے۔

"مگر کیا؟" میں نے اس کے ادھورے جملے پر استفسار کیا۔

"مگر مشتاق کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ "وہ گوری چٹی اور چھیل چھبیلی زرینہ پر مرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی اور اس نے اسی سے شادی کر لی۔"

"گوری چٹی" اور "چھیل چھبیلی" جیسے الفاظ استعمال کرکے حمیدہ نے دراصل زرینہ کے حسن اور جوانی کی تعریف کی تھی لیکن چونکہ وہ اپنے دل میں اس کے لیے اچھے جذبات نہیں رکھتی تھی لہٰذا اس کی ناپسندیدگی ان الفاظ سے بھی عیاں تھی۔ میں نے اپنے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں تو پھر تم نے اپنے بھائی کا گھر اجاڑنے کی کوششیں شروع کر دیں؟"

"میں مشتاق کا گھر اجاڑوں گی۔" وہ استعجابیہ انداز میں مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "تھانے دار صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ میں نہیں کہہ رہا، تمہاری بھابی زرینہ نے فرمایا ہے۔"

"اس نے سراسر بکواس کی ہے۔" وہ جلال میں آگئی۔ "آپ اس پچھل پائی کو تھانے بلائیں۔ میں ابھی آپ کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے دکھاتی ہوں...."

"مجھے نہیں امید کہ کبھی تم دونوں کو آمنے سامنے بٹھا کر کوئی مناظرہ کرانے کی نوبت آئے لیکن ایسی ضرورت پیش آ گئی تو پھر میں اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال، میں تم سے جو سوال کروں اس کا سیدھا اور مختصر جواب دینا۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ "جب تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو تم نے مشتاق کے کان بھرنا شروع کر دیے جس کے نتیجے میں میاں بیوی میں اکثر لڑائی جھگڑا رہنے لگا؟"

"بالکل جھوٹ۔" حمیدہ نے میری ہدایت کے مطابق دوٹوک اور مختصر جواب دیا۔

"تمہاری یہ سازش بڑی حد تک کامیاب رہی۔ میاں بیوی میں صبح وشام دنگا فساد ہونے لگا۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ "لڑائی جھگڑے کا سلسلہ تو چل نکلا تھا مگر مشتاق، زرینہ کو اپنی زندگی سے باہر نہیں نکال پا رہا تھا۔ اس کام کو تیز کرنے کے لیے تم نے زرینہ کے کردار پر ایک خطرناک حملہ کر دیا۔"

میں نے ڈرامائی توقف کرکے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کون سا خطرناک حملہ تھانے دار صاحب؟"

"تم نے یہ مشہور کر دیا کہ زرینہ کے خوشیا اور منیر د کے ساتھ تعلقات ہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں

کہا۔ ''یہ ایک ایسا حربہ تھا کہ مشتاق سنتے ہی اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا۔ کوئی بھی شوہر ان معاملات کو بڑی سنجیدگی سے لیتا ہے مگر مشتاق کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور تم ایک بار پھر شکست کھا گئیں......؟''

ہمن کی برداشت جواب دے گئی۔ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ نے اس بدذات کی تو بہت ساری سن ڈالیں۔ اب ذرا میری بھی سنیں......''

میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''یہ جو منیرو اور خوشیا ہیں نا! ان کے بارے میں پورے پیلی والا سے جاکر پوچھ لیں۔'' وہ جلالی انداز میں بتانے لگی۔ ''ایک نمبر کے آوارہ اور لفنگے ہیں دونوں......''

''میں نے انہیں اسی لیے تھانے بلا کر حوالات میں بند کیا ہے۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ان سے کڑی پوچھ گچھ کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔ میں آپ دونوں میاں بیوی کو قصوروار نہیں سمجھتا اس لیے اپنے کمرے میں بٹھا رکھا ہے۔ تمہارے جوابات سے مجھے زرینہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور اگر زرینہ میری سمجھ میں آگئی تو میں گمشدہ مشتاق کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

''میں آپ کو زرینہ کی ہوشیاری اور مکاری کے بارے میں ہی تو بتارہی تھی۔'' وہ سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''خوشیا اور منیرو مشتاق کے گھر سے دو تین گلیاں ادھر ادھر رہتے ہیں لیکن ادھر مشتاق دکان کی طرف روانہ ہوا، ادھر یہ دونوں زرینہ کے گھر کے سامنے حاضر ہوگئے۔ گلی ڈنڈا کھیلتا ہو یا پتنگ اڑانا ہو یا پھر کنچے اور اخروٹ سے دل بہلانا ہو، ان بدمعاشوں کا پورا دن زرینہ کے دروازے کے سامنے گزرتا ہے اور وہ بھی آدھا دروازہ کھولے کھڑی ان کے کھیل تماشوں کو دیکھتی رہتی ہے۔ انسان کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ توبہ توبہ...... استغفراللہ!'' اس نے لمحاتی توقف کرکے کانوں کو ہاتھ لگائے پھر اسی جوشیلے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''کیا ضرورت ہے، ایسے آوارہ گردوں کے کھیل دیکھنے کی۔ نہ صرف زرینہ ان کا تماشا دیکھتی ہے بلکہ انہیں لسی پانی کا بھی پوچھتی ہے۔ جب پہلی مرتبہ کسی کی زبانی مجھ تک ان واقعات کی خبر پہنچی تو مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ بتانے والے نے ایسے وثوق سے بات کی تھی کہ میں ادھر ادھر کے لوگوں سے تصدیق کرنے پر مجبور ہوگئی۔ میں نے پیلی والا آکر آس پڑوس سے سن گن لی تو یہ اطلاع سو فیصد سچی نکلی۔

مشتاق میرا بھائی ہے تھانے دار صاحب...... اگر اس کی عزت پر حرف آئے گا تو کیا مجھے دکھ نہیں ہوگا؟ جب زرینہ کی ان گھٹیا حرکتوں کی خبر پیلی والا سے ہندو چک میرے پاس پہنچ سکتی ہے تو کیا پیلی والا میں لوگ زرینہ پر اور مشتاق پر تھو تھو نہیں کررہے ہوں گے۔ اس بے غیرت نسل نے تو شرم و حیا کو اتار کر ایک طرف پھینک دیا ہے۔ میرے بھائی کی عزت کو نیلام کرتی پھر رہی ہے۔ ہاں......'' وہ ایک بار پھر پھولی ہوئی سانس کے ساتھ متوقف ہوئی پھر بڑے طمطراق سے اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے مشتاق کو زرینہ کے کرتوتوں کے بارے میں بتایا تھا اور میں سمجھتی ہوں، میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا۔ یہ مشتاق کی بزدلی اور نالائقی ہے کہ وہ اس سرکش گھوڑی کو سیدھے راستے پر نہیں لا سکا۔''

میں گزشتہ روز پیلی والا گیا تھا اور زرینہ کے گھر میں، میں نے اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں گاؤں کے بچے مختلف کھیل کھیلتے نظر آئے تھے۔ حمیدہ نے خوشیا اور منیرو کے کھیل کے حوالے سے جو بات کی تھی اس کی زیادہ اہمیت نہیں تھی البتہ زرینہ کا بڑے انہماک سے انہیں کھیلتے ہوئے دیکھنا اور لسی پانی سے ان کی تواضع کرنا تشویش ناک تھا تاہم یہ چونکہ حمیدہ کا بیان تھا اور یقیناً زرینہ اس کی تردید ہی کرتی۔ ان نند بھابی کے بیچ جو کڑوے پانی کی خلیج حائل تھی، میں اس کو پاٹنے میں اپنی توانائی ضائع نہیں کرسکتا تھا لہٰذا فوراً ہی اصل موضوع کی طرف آگیا۔

''مشتاق واقعی ایک احمق، بزدل اور نالائق انسان ہے۔'' میں نے حمیدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب وہ زرینہ جیسی سرکش اور اڑیل گھوڑی کو راہ راست پر نہیں لاسکا تو تم نے ایک اور چال چلی، زرینہ کے بیان کے مطابق۔''

''کیسی چال؟'' وہ چونک کر مجھے تکنے لگی۔

''بہت ہی خطرناک چال......'' میں نے ذرا اونچی لہجے میں کہا۔ ''تم نے زرینہ کے خلاف بندش کروادی۔''

''تھانے دار صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' منظور پہلی مرتبہ ہماری گفتگو کے بیچ بولا تھا۔ ''حمیدہ بھی تعویذوں اور بندشوں کے چکر میں نہیں رہی۔ زرینہ سراسر بکواس کررہی ہے۔''

''اب جو بھی ہے۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''زرینہ کا تو یہی دعویٰ ہے۔''

''اس منحوس کو یہ کیسے پتا چلا کہ میں نے اس کے

خلاف کوئی بندش کرائی ہے۔" حمیدہ چونک کر بولی۔" کیا اس نے خواب میں دیکھا ہے.....؟"

"اسے قبلہ شاہ جی نے بتایا ہے۔"

"وہ شاہ جی جو نہر کے کنارے والے آستانے میں ہوتے ہیں؟" وہ چونکے ہوئے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوئی۔

"ہاں... میں انہی شاہ جی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

حمیدہ نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔" وہ شاہ جی کے پاس کیا لینے گئی تھی؟"

"مشتاق اور زرینہ دونوں لگ بھگ ایک ماہ پہلے شاہ جی کے پاس گئے تھے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔" انہوں نے شاہ جی کو بتایا کہ شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں اور ابھی تک اولاد نہیں ہوئی۔ شاہ جی نے حساب لگا کر یہ فتویٰ صادر کردیا کہ کسی نے زرینہ کی اولاد کے سلسلے میں بڑی خطرناک بندش کروائی ہوئی ہے تاکہ مشتاق اسے بانجھ سمجھ کر طلاق دے دے۔"

"کیا شاہ جی نے میرا نام لے کر انہیں بتایا تھا کہ میں نے بندش کروائی ہے؟" حمیدہ نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں....." میں نے قطعی انداز میں جواب دیا۔ "انہوں نے بندش کروانے والے کے حوالے سے چند اشارے دیے تھے جس سے زرینہ نے اندازہ لگالیا کہ وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔"

"کتنے افسوس اور دکھ بلکہ ... شرم کی بات ہے۔" حمیدہ نے افسوس ناک انداز میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔" میرے وہم و گمان میں بھی نہیں اور یہ کم ذات مجھ پر ویسے ایسے گھناؤنے الزام لگا رہی ہے۔ اللہ اس منحوس ماری کو غارت کرے۔"

"میں تو کہتا ہوں، انسان کو پیروں فقیروں کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔" منظور نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔" اللہ اور رسول ﷺ نے دین کو اور دنیا کو بڑے آسان اور واضح انداز میں سمجھا دیا ہے۔"

"منظور! میں تمہارے خیالات سے متفق ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔" لیکن جو لوگ ان چکروں میں پڑے ہوئے ہیں انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں....." میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اسی سے پوچھ لیا۔

"منظور! تمہاری نظر میں یہ شاہ جی کیسا بندہ ہے؟"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے جی۔ میرا تو کبھی اس سے واسطہ نہیں پڑا۔" وہ سادگی سے بولا۔" میں اور میرا خاندان ایسے جھمیلوں سے دور ہی رہتے ہیں۔"

"بہت اچھا کرتے ہیں آپ لوگ۔" میں نے کہا۔ "میں اصلی مرشد کے خلاف نہیں ہوں۔ ایسا شخص اللہ کا دوست ہوتا ہے اور وہ اللہ کے بندوں کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے۔ وہ صرف "دیتا" ہے "لیتا" کسی سے کچھ نہیں۔ جو اللہ کا سچا دوست ہو وہ بھلا کسی سے کیا لے گا مگر ایسے مرشد اور ولی کامل اب خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ اکثریت ایسے پیروں، بابوں اور شاہ صاحبان کی نظر آتی ہے جو معصوم اور سادہ لوح افراد کو الٹی سیدھی کہانیوں میں الجھا کر ان سے زیادہ سے زیادہ مال بٹورنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔"

حمیدہ نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔" تھانے دار صاحب! زرینہ نے شاہ جی سے اس بندش کی کاٹ وغیرہ بھی کرائی تھی یا نہیں؟"

میں نے شاہ جی کی تشخیص میں شامل مشتاق کی مخصوص کمزوری کا ذکر گول کرتے ہوئے نہایت ہی اطمینان سے جواب دیا۔" شاہ جی نے بندش کی کاٹ کے لیے زرینہ کو سات دن کا کوئی روحانی عمل بتایا تھا لیکن مگر ... مشتاق بیچ ہی میں اکھڑ گیا۔ اس نے دو ٹوک الفاظ میں زرینہ سے کہہ دیا کہ کسی علاج معالجے کی ضرورت نہیں۔ اگر قسمت میں اولاد ہوئی تو ہو جائے گی ورنہ ہم بے اولاد ہی اچھے ہیں۔"

"یہ کی تھی نا مشتاق نے مردوں والی بات۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔" مشتاق کے اس عمل نے میرے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے تھانے دار صاحب کہ..."

وہ پراسرار انداز میں اچانک رکی تو مجھے تشویش ہوئی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نہایت ہی اہم نکتے نے اس کی زبان کو بریک لگا دیے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں بھی گہرا تذبذب نظر آرہا تھا۔ میں نے کہنیاں میز پر ٹیک کر آگے کی جانب جھکتے ہوئے استفسار کیا۔

"پر..... کیا حمیدہ؟"

"تھانے دار صاحب!" وہ اپنے ذہن کو میرے سامنے کھولتے ہوئے بولی۔" مشتاق کو غائب ہوئے آج پانچواں دن..."

"پانچواں نہیں۔" منظور نے لقمہ دیا۔" چوتھا دن۔"

"ہاں چوتھا دن..." حمیدہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔" جب تک وہ گھر میں تھا تو شاہ جی سے علاج کی مخالفت کر رہا تھا۔ مجھے شک ہے کہ مشتاق کے غائب ہوتے

ہی کہیں زرینہ نے شاہ جی کا علاج شروع نہ کرا یا ہو۔"

"زرینہ نے مجھ سے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اور اگر وہ شاہ جی سے علاج کرا بھی رہی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بہت فرق پڑتا ہے تھانے دار صاحب!" وہ سنسنی خیز لہجے میں بولی۔ "میں بھی خود تو جا کر شاہ جی سے نہیں ملی اور نہ ہی ابھی انہیں دیکھنے کا موقع ملا ہے مگر ہندو چک کی ایک عورت نے مجھے ان کے بارے میں بڑی خطرناک بات بتائی ہے۔"

میرا چونک جانا لازمی تھا۔ "کون سی خطرناک بات؟" میں نے پوچھا۔

"خوب صورت عورتوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ "جیسے اپنے شکار کو دیکھ کر کسی جنگلی درندے کی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے۔ مجھے تو فکر ہو رہی ہے ایسا لوگ بھی زرینہ کو اپنا چاند نہ بنا لے۔"

حمیدہ کا انکشاف واقعی تشویش ناک تھا۔ میں نے کئی دنیا پیروں کا محاسبہ کیا تھا جن میں بیماری مشترک بھی "ہوس" تھی۔ زرینہ کے معاملے میں کیا تھا یا نہیں، فی الحال اس وقت اس کے بارے میں، میں کوئی فتویٰ صادر کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا لہٰذا حمیدہ کی پریشانی کے جواب میں، میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ لوگوں کو قطعاً پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک دو دن میں اپنی تفتیش مکمل کر لوں گا۔ آپ لوگ یہاں سے سیدھے اپنے گھر جاؤ اور فی الحال زرینہ سے ملنے کی کوشش نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔"

"تو کیا آپ نے ہمیں صرف اس لیے تھانے بلایا تھا؟" منظور نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہ باتیں ہندو چک والا میں زرینہ کی موجودگی میں ہو سکتی تھیں اور نہ ہی میں خوامخواہ ہندو چک میں آپ لوگوں کے گھر جا کر کھچڑی پکانا چاہتا تھا۔"

"تھانے دار جی!" حمیدہ نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ "میرا بھائی تو ٹل جائے گا نا......؟"

"انشاء اللہ!" میں نے تہِ دل سے کہا۔ "میں بہت جلد مشتاق کو ڈھونڈ نکالوں گا۔" وہ دونوں میاں بیوی مجھے دعائیں دیتے اور میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے تھانے سے رخصت ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی میں نے خوشیا اور منیرو کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حوالدار خدا بخش بھی ان کے ساتھ ہی میرے پاس آ گیا تھا۔ وہ دونوں خاصے ڈرے سہمے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ حوالدار نے انہیں ”چائے پانی“ ضرور پوچھا ہوگا۔ یہ کوئی فارمولا یا قانون قاعدہ تو نہیں لیکن عموماً ہوتا یہی ہے کہ جب کسی بھی ملزم یا مجرم کو گرفتار کر کے تھانے لایا جاتا ہے تو ”استقبالیہ“ کے طور پر اس کی کچھ ”خاطر مدارات“ لازمی خیال کی جاتی ہے۔ وہ دونوں میرے سامنے آ کر کھڑے ہوئے تو میں نے کڑک دار آواز میں ان سے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے مشتاق کو کہاں غائب کیا ہے؟“

”ہم نے مشتاق کو کچھ نہیں کیا جی۔“ خوشیا منت ریز لہجے میں بولا۔

منیرو لجاجت بھرے انداز میں گویا ہوا۔ ”آپ ہم سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں جی۔ ہمیں مشتاق کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔ ہم تو خود حیران ہیں کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا۔“

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ ”مجھے پتا چلا ہے کہ چند دن پہلے آپ لوگوں کا مشتاق کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا اور آپ دونوں نے اسے دھمکیاں وغیرہ بھی دی تھیں؟“

دونوں نے پہلے الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر خوشیا نے مجھ سے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! ہماری تو کبھی مشتاق سے لڑائی نہیں ہوئی بلکہ مشتاق اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہے جی۔ اس کا کسی کے ساتھ کوئی تنازع ہوتا، ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا۔“

”یہ جھوٹی خبر آپ کو کس نے دی ہے؟“ منیرو نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ان کے ذہنوں کا حال جاننے کے لیے اندھیرے میں ایک اور تیر چھوڑا۔ ”تم دونوں مشتاق کے گھر کے سامنے کھیل میں مصروف رہتے ہو اور اس کی بیوی زرینہ کو چھیڑتے ہو۔ بتاؤ، ایسا ہے یا نہیں؟“

”اچھا تو زرینہ نے آپ سے ہماری شکایت کی ہے؟“ خوشیا نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم لوگوں سے جو پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دو۔“

”جناب! سچی بات یہ ہے کہ زرینہ ہم دونوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔“ منیرو صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہم نے کبھی اسے نہیں چھیڑا۔ ہم اس سے بات چیت کے بہانے ادھر کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ آپ ہمیں غلط نہ سمجھیں۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔“

میں نے آئندہ ایک دو گھنٹے میں انہیں مختلف زاویوں سے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے مشتاق کی گمشدگی میں کہیں ملوث دکھائی نہ دیے۔ میں نے ان کی زبان کھلوانے کے لیے خطرناک دھمکیاں بھی دیں اور ان کے عقب میں کھڑے حوالدار خدا بخش نے زبانی دھکوں کے ساتھ ساتھ ٹھڈے اور چانٹے بھی مارے مگر نتائج وہی رہے جو ابتدا میں تھے۔ مشتاق کے غیاب میں کسی بھی حوالے سے ان کا ہاتھ شامل نہیں تھا۔ میں نے اس ”ڈیوٹی“ کے ساتھ انہیں تھانے سے جانے کی اجازت دے دی۔

”تم دونوں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو گے اور جہاں جہاں تک بھی تم لوگ آوارہ گردی کے لیے جاتے ہو، نہایت ہی رازداری کے ساتھ مشتاق کو تلاش کرنے کی کوشش کرو گے۔ جیسے ہی تمہیں مشتاق کے بارے میں کوئی بات پتا چلے، تم لوگ فوراً آ کر مجھے بتاؤ گے.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور کسی کو یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے تم لوگوں کو کتنا اہم مشن سونپا ہے۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں جی۔“ خوشیا بڑے فخر سے بولا۔ ”ہم آپ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔“

”اور بہت جلد آپ کو کوئی خوش خبری بھی سنائیں گے۔“ منیرو نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

وہ دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے کہ میں نے ان پر بھروسا کرتے ہوئے ان کے ذمے ایک اہم کام لگا دیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں منیرو کے معصومیت بھرے جواب پر غور کرنے لگا۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا۔

”جناب! سچی بات یہ ہے کہ زرینہ ہم دونوں کو بہت اچھی لگتی ہے.....“

کوئی بھی معقول آدمی جس نے زرینہ کی ایک جھلک دیکھ رکھی ہو وہ منیرو کے ”فتوے“ کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح یعنی پندرہ اکتوبر کو میں کانسٹیبل یعقوب کے ساتھ پیلی والا روانہ ہو گیا تاکہ وہاں کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا جا سکے۔ خوشیا اور منیرو کو اگرچہ میں نے مشتاق کی

تلاش کا کام سونپ دیا تھا اور مجھے امید تھی کہ وہ دونوں آوارہ گرد نوجوان سر دھڑ کی بازی لگا کر مشتاق کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کریں گے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام تھے۔ سب سے اہم تو زرینہ سے ملاقات تھی۔ گزشتہ روز حمیدہ کی گفتگو کے ایک حصے نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور میں اسی سلسلے میں زرینہ سے پوچھ تاچھ کرنا چاہتا تھا۔

اس دن اچھی خاصی تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی اور آسمان بالکل صاف شفاف دکھائی دیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، ہمارا تانگا ایک لامحدود نیلی چھتری کے نیچے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ یہ تنی عجیب بات ہے کہ ہم جہاں جہاں جاتے ہیں آسمان بھی ہمارے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے بلکہ اس نیلی چھتری کے اندر سبھی مظاہر قدرت مثلاً سورج، چاند اور ستارے بھی ہمارے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ اس ”عجیب بات“ کو اگر ہم سائنسی بنیادوں پر پرکھنے بیٹھ جائیں تو روح پرور کیفیت کا خانہ خراب ہو کر رہ جائے گا۔ میں اس مزے کو کرکرا نہیں کرنا چاہوں گا لہٰذا ہم خاموشی سے آگے بڑھتے ہیں۔

سائنس نے جہاں انسان کی زندگی میں بے انتہا آسانیاں پیدا کر دی ہیں وہیں اسے قدرتی نظاروں اور ان کے اصل ذائقوں سے بہت دور کر دیا ہے۔ جب سائنس نے تیز اور تیز لائٹس ایجاد نہیں کی تھیں اور زندگی چراغوں یا لالٹینوں کی رہین منت ہوا کرتی تھی تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے پچاس پچپن سال کی عورت کو سوئی میں بغیر نظر کے چشمے کے دھاگا ڈالتے اور اسی سالہ بوڑھے کو کسی بھی عینک کے بغیر قرآن پاک پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور آج کل عالم یہ ہے کہ میرے محتاط اندازے کے مطابق پانچ سے دس سال کی عمر میں سو میں سے تو سے بچوں کو نظر کا چشمہ لگ جاتا ہے اور اگر ضعفِ نظری کا یہی تناسب جاری رہا اور ہم تیز روشنیوں اور چمکدار اسکرینوں سے دور نہ ہوئے تو آنے والے بیس پچیس سال میں بچہ پیدائش کے موقع پر چشمہ ساتھ ہی لے کر پیدا ہوا کرے گا۔

ہمارا تانگا جب نہر کے قریب پہنچا تو میرے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ نہر کی دوسری جانب پچلی والا تھا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ زرینہ کے گھر کا رخ کرنے سے پہلے ایک ملاقات شاہ جی سے بھی کر لی جائے۔ شاہ جی کا آستانہ نہر کنارے واقع تھا۔ میں نے نہر کا پل عبور کرنے کے بعد تانگے کا رخ آستانے کی طرف موڑنے کا حکم دے دیا۔ جلد ہی ہم آستانے کے سامنے موجود تھے۔

آستانے پر ایک مجاور ٹائپ آدمی نے ہمارا استقبال کیا۔ میں اور کانسٹیبل یعقوب اس وقت سرکاری وردی میں تھے۔ اتنی صبح پولیس کی آمد کسی بھی آدمی کو چونکا دیتی ہے لہٰذا مجاور کی آنکھیں بھی حیرت اور الجھن کی غماز تھیں۔ وہ چپ چاپ سوالیہ نظر سے ہمیں دیکھے جا رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ شاہ جی کہاں ہیں؟“

”شاہ جی تو آرام کر رہے ہیں۔“ اس نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

میں نے آستانے کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کون سا وقت ہے آرام کرنے کا بھئی؟!“

”شاہ جی رات بھر ایک وظیفے میں مصروف تھے۔“ مجاور نے آستانے کے صحن میں سایہ دار جگہ پر ہمارے لیے چارپائیاں بچھاتے ہوئے بتایا۔ ”فجر کی نماز کے بعد ہی سوئے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں شاہ جی کو آپ کی آمد کے بارے میں اطلاع دیتا ہوں۔“

مجاور نے آخر میں خاصی معقول بات کی تھی ورنہ میں اسے اگلا حکم یہ دینے والا تھا کہ جا کر شاہ جی کو فوراً بیدار کرو۔ میں ان سے ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔

میں اور کانسٹیبل آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھ گئے اور مجاور آستانے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ لگ بھگ دو پانچ منٹ کے بعد واپس آیا اور نہایت ہی ادب سے بتایا۔

”تھانے دار صاحب! شاہ جی نے آپ کو اندر کمرے میں بلایا ہے۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو کانسٹیبل نے بھی میری تقلید کی۔ مجاور نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار جی! شاہ جی نے صرف آپ کو اپنے پاس بلایا ہے۔“

میں نے کانسٹیبل یعقوب کو وہیں رکنے کو کہا اور خود مجاور کی راہنمائی میں آستانے کے اس حصے کی سمت بڑھ گیا جدھر قبلہ شاہ جی تشریف فرما تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں شاہ جی کے کمرے میں موجود تھا۔

وہ ایک فرشی نشست والا نہایت ہی آرام دہ اور ہوادار کمرا تھا جس کی دو کھڑکیاں باہر، نہر کی جانب کھلتی تھیں۔ بعد ازاں شاہ جی کا اصل نام عرفان شاہ معلوم ہوا۔

اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت کا مالک اور دبلا پتلا اور صحت مند تازہ انسان تھا۔ اس نے سر کے بالوں کو زلفوں کی صورت بڑھا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر مناسب سے سائز کی داڑھی بھی نظر آرہی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد شاہ جی نے اپنے مجاور کو ہمارے لیے ناشتے پانی کا بندوبست کرنے بھیج دیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آج صبح آپ کس مشن پر ہیں ......؟''

''شاہ جی! آپ صاحب بصیرت انسان ہیں۔'' میں نے سخن کاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''ایک مسئلے نے پچھلے دو تین دن سے مجھے بری طرح الجھا رکھا ہے۔ اس مسئلے کا تعلق چونکہ پپلی والا سے ہے اس لیے سوچا کہ آپ سے بھی مدد لینا چاہیے۔''

''آپ کی مہربانی ہے جو آپ میرے پاس تشریف لائے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ''مسئلہ کیا ہے ......؟''

جب ہم آستانے پر پہنچے تھے تو مجاور نے بتایا تھا کہ شاہ جی رات بھر کسی چلے میں مصروف رہے تھے اور اس وقت وہ آرام فرما رہے ہیں بلکہ یہاں تک کہا تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد ہی سوئے ہیں لیکن شاہ جی انتہائی ہشاش بشاش اور فریش دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ان کے سوال کے جواب میں بتایا۔

''پپلی والا کا ایک وسنیک مشتاق چار پانچ دن سے لاپتا ہے۔ میں اس کی تلاش کے سلسلے میں آپ سے راہنمائی چاہتا ہوں۔''

''آپ زرینہ کے شوہر کی بات کر رہے ہیں نا؟'' شاہ جی کی آنکھوں میں مخصوص چمک پیدا ہوئی۔

''جی ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مجھے اسی مشتاق کی تلاش ہے۔''

''میرا ایک مشورہ ہے ملک صاحب!'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''اگر مان لیں گے تو آپ کا کام آسان ہو جائے گا۔''

''جس مشورے سے کام آسان ہوتا ہو، میں بھلا اسے کیوں نہیں مانوں گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ حکم کریں، کرنا کیا ہے؟''

''آپ بس، مشتاق کے لیے پریشان ہونا چھوڑ دیں۔'' وہ بدستور دھیمی آواز میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں شاہ جی۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ایک بندہ چار پانچ دن سے لاپتا ہے۔ میرے پاس اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے اور آپ فرما رہے ہیں، میں اس کے لیے پریشان ہونا چھوڑ دوں......''

''میں سمجھاتا ہوں۔ آپ غور سے میری بات سنیں......''

اسی دوران میں شاہ جی کا مجاور ناشتے کے سامان سے سجی ٹرے لے کر کمرے میں آگیا۔ ہمارے درمیان چند لمحات کے لیے خاموشی آن ٹھہری ہوئی۔ مجاور واپس جانے لگا تو میں نے اسے کہا۔

''وہ... باہر میرا ایک آدمی بھی بیٹھا ہوا ہے۔''

مجاور خاصا کائیاں شخص تھا۔ فوراً ہی میری بات کی تہ میں اتر گیا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''جی... سنتری بادشاہ کو بھی ناشتا دے دیا ہے۔''

مجاور کے جانے کے بعد شاہ جی دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! مشتاق کا دماغی توازن درست نہیں... خدانخواستہ آپ میری بات کا یہ مطلب نہ لیں کہ وہ کوئی پاگل ہے... دراصل وہ کیا کہتے ہیں کہ اگر تھوڑے میں زیادہ ڈال جائے تو پھر معاملہ ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ زرینہ سے شادی اس کو راس نہیں آئی۔ وہ زرینہ کے قابل نہیں تھا، اسی وجہ سے دن رات ان میں لڑائی جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔ اسی صورت حال نے مشتاق کو نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا ہے۔ آپ اس کے بارے میں بالکل فکرمند نہ ہوں۔ وہ جیسے چپ چاپ گم ہوا ہے، ایسے ہی ایک دن خاموشی سے واپس بھی آجائے گا۔''

شاہ جی کا مشورہ اگرچہ مجھے بچکانا سا لگا لیکن میں نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بجائے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''شاہ جی! میں نے سنا ہے، مشتاق اور زرینہ پچھلے دنوں اپنی بے اولادی کا رونا رونے آپ کے آستانے پر بھی آئے تھے اور آپ نے اپنے کشف و کرامات سے ان کی بے اولادی کا سبب بھی معلوم کر لیا تھا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اپنی توند اور چھ بل گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''ہم تو یہاں پر پریشان حال لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے ہی بیٹھے ہیں۔ جو ہماری بات پر عمل کرتا ہے، وہ فائدہ اٹھاتا ہے اور جو مشتاق کی طرح ہماری باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا، وہ ساری زندگی نامرادی بھگتتا ہے۔''

میں نے ساری معلومات حاصل ہونے کے باوجود

بھی شاہ جی سے پوچھ لیا۔ "شاہ جی! آپ کے علم کے مطابق ان کی بے اولادی کا سبب کیا ہے؟"

"دوطرفہ سبب ہے ملک صاحب۔" وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "آپ ساتھ ساتھ ناشتا بھی جاری رکھیں، میں بتاتا ہوں۔"

میں نے رکے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ متحرک کر دیا اور سوالیہ نظر سے شاہ جی کو دیکھنے لگا۔ وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

"ایک تو کسی ظالم شخص نے زرینہ پر اولاد کے سلسلے میں بڑی سخت بندش کرائی ہوئی ہے اور دوسرے مشتاق کے اندر ایک خاص نوعیت کی کمزوری پائی جاتی ہے۔"

"آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ مشتاق کے اندر کوئی مخصوص کمزوری موجود ہے؟" میں نے شاہ جی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

"ملک صاحب! آپ ایک جہاں دیدہ، تجربہ کار اور سیانے بیانے آدمی ہیں، اسی لیے میں آپ سے کھل کر بات کر سکتا ہوں۔" وہ بڑے تحمل سے بولا۔ "دراصل، جب یہ دونوں میرے پاس اپنی بے اولادی کا کیس لے کر آئے تھے تو میں نے ان سے الگ الگ ملاقات کی تھی۔ مشتاق نے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا رونا روتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ زرینہ اسے اپنے قریب نہیں جانے دیتی۔ جب میں نے زرینہ کا انٹرویو کیا اور مشتاق کی فریاد کے حوالے سے سوال پوچھا تو اس کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا پھر وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ شاہ جی! وہ اس قابل نہیں کہ میں اسے اپنی تنہائی کا ساتھی بنا سکوں......" شاہ جی نے یہاں تک بتانے کے بعد لمحاتی توقف کیا پھر سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

"زرینہ نے جب مشتاق کی مخصوص "نالائقی" کا انکشاف کیا تو سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا اور ملک صاحب...... یہ کوئی ایسا گمبھیر معاملہ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ لوگ میرے بتائے ہوئے علاج کے لیے راضی ہو جاتے تو ان کا مسئلہ ایک دو ماہ میں حل ہو سکتا تھا لیکن وہی بات ہے نا، میں لٹھ لے کر کسی کے پیچھے تو نہیں جا سکتا نا......"

"انھوں نے آپ کے علاج سے انکار کیوں کیا تھا؟" میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

"زرینہ تو پوری طرح تیار تھی مگر مشتاق اچانک بھڑک اٹھا تھا۔" شاہ جی نے بتایا۔ "میری تشخیص نے اس کی عزتِ نفس پر کاری چوٹ لگائی تھی۔ وہ کسی بھی طور اپنی "خرابی" کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا حالانکہ یہ میری تشخیص نہیں تھی، یہ تو اس کی بیوی کا فتویٰ تھا۔ ملک صاحب! آپ جانتے ہیں، ازدواجی معاملات میں عورت کا "فتویٰ" عدالت کی نظر میں بھی بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔"

"جی ہاں... آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تو اس طرح ان کے علاج معالجے کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔"

"ملک صاحب! جس دن مشتاق غائب ہوا ہے نا... اس سے اگلے دن زرینہ میرے پاس آئی تھی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس نے مجھ سے کہا کہ میں مشتاق کی واپسی کے لیے کوئی عمل کروں۔ میں نے جواب دیا۔ جو شخص مجھے بھی نہیں مانتا، اس پر میرا عمل کیا اثر کرے گا۔ وہ منت کرنے لگی کہ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں۔ میں نے اسے اس تسلی کے ساتھ آستانے سے رخصت کر دیا کہ ٹھیک ہے، میں اس کے شوہر کے حق میں دعا کروں گا۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر وہ ادھر نہیں آئی۔"

شاہ جی کی بات نے میرے ذہن میں ایک انوکھے تجسس کو بیدار کر دیا۔ میں نے زرینہ سے ملاقات کے دوران میں اس سے ہر زاویے کا سوال کیا تھا اور اس نے میرے ہر سوال کا جواب بھی دیا تھا لیکن اس بات کا اس نے کہیں ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ مشتاق کی گمشدگی کے دوسرے روز شاہ جی کے آستانے پر گئی تھی۔ اگر اس نے یہ بات دانستہ مجھ سے چھپائی تھی تو پھر یقیناً دال میں کچھ کالا تھا۔ مجھے زرینہ کے دل کا احوال جاننے کے لیے کچھ نفسیاتی ہتھکنڈے استعمال کرنے کی ضرورت تھی اور میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ایسا ضرور کروں گا۔

"شاہ جی! مجھے اجازت دیں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے قانون کے ساتھ جو تعاون کیا ہے، اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے امید ہے، آپ کو جیسے ہی مشتاق کے حوالے سے کوئی بات پتا چلے گی، آپ مجھے ضرور بتائیں گے۔"

"ملک صاحب! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔" وہ بڑے عجز و انکسار کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "میں آئندہ بھی آپ سے تعاون کا عمل جاری رکھوں گا۔ آپ پھلی والا کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور آستانے سے باہر نکل آیا۔

جب ہم آستانے کے باہر کھڑے تانگے میں بیٹھ چکے تو

میں نے کوچوان سے کہا۔ "واپس تھانے کی طرف چلنا ہے۔"

کوچوان نے کوئی سوال کیے بغیر تانگے کو واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔ جب ہم نے نہر پر چناب کا پل عبور کر لیا تو کانسٹیبل یعقوب نے مجھ سے پوچھ لیا۔

"ملک صاحب! آپ نے بتایا تھا کہ زرینہ کے گھر جانا ہے مگر آپ خلافِ پروگرام آستانے پر آگئے اور اب واپس تھانے جا رہے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے؟"

"میں نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا یعقوب۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم زرینہ سے ملے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔" پھر میں نے کوچوان سے مخاطب ہوتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تانگے کو واپس پپلی والا کی سمت موڑ لو اور نہر کے پل سے گزرنے کے بعد دائیں بائیں دیکھے بغیر تیز رفتاری سے پپلی والا کے اندر داخل ہو جانا ہے۔"

کانسٹیبل ہونقوں کی طرح منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی حیرت کو دور کرنا ضروری نہ سمجھا اور اردگرد کے قدرتی نظاروں میں کھو گیا۔

میں نے یہ احتیاطی تدبیر صرف شاہ جی کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اختیار کی تھی۔ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ اپنے مجاور کو میرے تعاقب میں روانہ کر سکتا ہے تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ میں آستانے سے نکل کر واپس تھانے کی طرف جاتا ہوں یا زرینہ سے ملنے پپلی والا کی جانب۔ مجھے یقین تھا کہ اگر مجاور نے مجھے واچ کرنے کی کوشش کی ہوگی تو میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

☆☆☆

میں زرینہ کے گھر کے اندر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ کانسٹیبل یعقوب کو میں نے باہر تانگے ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں چند سنسنی خیز پوائنٹس آپس میں دنگل کر رہے تھے اور مجھے کسی نتیجے تک رسائی حاصل کیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جانا تھا۔

پوائنٹ نمبر ایک۔ شاہ جی کے مطابق مشتاق کی مخصوص کمزوری کے بارے میں خود زرینہ نے انہیں بتایا تھا مگر زرینہ نے مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

پوائنٹ نمبر دو۔ شاہ جی کے مطابق مشتاق کی گمشدگی کے دوسرے دن یعنی گیارہ اکتوبر کو زرینہ آستانے پر پہنچی تھی اور مشتاق کی واپسی کے لیے ان سے کسی روحانی عمل کی درخواست کی تھی لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ طویل گفتگو کے باوجود بھی زرینہ نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

پوائنٹ نمبر تین۔ حمیدہ کی معلومات کے مطابق شاہ جی ایک ہوس پرست انسان تھا اور حمیدہ کو گہری تشویش تھی کہ یہ بھولی پنچھی زرینہ کوئی نیا چاند نہ چڑھا لے۔

میں ابھی تھوڑی دیر پہلے شاہ جی سے ملاقات کر کے آرہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں، میں خصوصی طور پر اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں واقعی ایک مخصوص کشش پائی جاتی تھی اور اسے اپنے تاثرات پر بھی کمانڈ تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں جو کھچڑی پک رہی تھی اس کی "تیاری" زرینہ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد زرینہ نے بڑی تشویش سے پوچھا۔ "تھانے دار جی۔ مشتاق کا کچھ پتا چلا؟"

"میں نے اپنی تلاش کے گھوڑے چاروں طرف دوڑا رکھے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ جہاں کہیں بھی ہوگا، میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ بس مجھے اس سلسلے میں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"تو جی میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "آپ نے جو پوچھا، میں نے صاف صاف بتا دیا اور بھی جو پوچھیں گے، بتاؤں گی۔"

"دیکھو زرینہ! بات دراصل یہ ہے کہ ہم پولیس والے ہر شے پر پہلی نظر شک ہی کی ڈالتے ہیں۔" میں نے اس کے اوپر نفسیاتی جال پھینکتے ہوئے کہا۔ "اور جب تک ہماری تسلی نہیں ہو جاتی، ہم آگے نہیں بڑھتے اس لیے اگر تمہیں میرا کوئی سوال عجیب یا الٹا لگے، تم اس کا برا نہیں ماننا۔ میں تمہارا سچا ہمدرد ہوں اور ہر حال میں تمہارا فائدہ چاہتا ہوں۔ میں نے تمہاری خاطر ہی حمیدہ کو تھانے بلا کر اس کی وہ بے عزتی کی ہے تاکہ وہ اب کبھی پپلی والا کا رخ نہیں کرے گی۔"

میرے آخری الفاظ نے زرینہ کو گہرے سکون اور طمانیت سے سرفراز کیا۔ وہ یک دم خوش ہو گئی اور مسرت سے سرشار آواز میں بولی۔

"تھانے دار جی! میں آپ پر اندھا اعتماد کرتی ہوں۔ آپ جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیں۔ میں ضرور بتاؤں گی۔"

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں ابھی ابھی شاہ جی سے ملاقات کر کے آرہا ہوں۔ وہ منتظر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مشتاق کی مخصوص کمزوری کے بارے میں تم نے

شاہ جی سے کوئی شکایت کی تھی یا انہوں نے حساب کتاب لگا کر خود ہی پتا چلا لیا تھا؟''

''جی، میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''شاہ جی بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ انہوں نے ہم دونوں کی خرابیوں کا اندازہ خود ہی لگا لیا تھا۔''

زرینہ کے اس جواب نے شاہ جی کا جھوٹ واضح کر دیا تھا۔ یہ بات میں اپنے تجربے کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ زرینہ اس وقت مجھ سے دروغ گوئی نہیں کر رہی تھی۔

میں نے سنسنی خیز تحقیق کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم لوگوں نے ایک ساتھ شاہ جی سے ملاقات کی تھی یا الگ الگ؟''

''ہم ایک ساتھ ہی ان کے حجرے میں گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور انہوں نے وہیں ہمارے سامنے حساب لگا کر ہمارے مسائل کے بارے میں بتایا تھا۔''

شاہ جی کا ایک اور جھوٹ کھل گیا تھا۔ اس معاملے میں میری دلچسپی فزوں تر ہو گئی۔ جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد کارفرما ہوتا ہے یا تو وہ اپنے کسی جرم کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے یا پھر وہ اپنے کسی جرم کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے دوسروں کو گمراہ کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب تھا، شاہ جی زرینہ کے حوالے سے کسی سنگین چکر میں پڑا ہوا تھا۔ میرے اگلے سوال نے شاہ جی کے شیطانی منصوبے کی بلی کو تھیلے میں سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔

''مجھے پتا چلا ہے.....'' میں نے سرسری انداز میں زرینہ سے پوچھا۔ ''مشتاق کی گمشدگی کے اگلے روز تم شاہ جی سے ملنے ان کے آستانے پر گئی تھیں؟''

''جی ہاں۔'' وہ بڑی معصومیت سے بولی۔ ''میں نے ان سے مشتاق کی واپسی کے لیے کوئی عمل کرنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ وہ بڑا زبردست عمل کریں گے جس سے چند ہی روز میں مشتاق واپس آجائے گا ....'' وہ لمحاتی توقف کرکے تھوڑی جزبز ہوئی پھر بتایا۔

''اس کے ساتھ ہی شاہ جی نے مجھے ایک مشورہ بھی دیا تھا۔''

''کیا مشورہ؟'' میں نے اپنے تاثرات کو قابو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مشتاق تو اتفاق سے کہیں غائب ہو گیا ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بتانے لگی۔ ''یہ اچھا موقع ہے۔ اگر میں شاہ جی سے اپنا سات دن کا علاج شروع کرا دوں تو وہ میری بندش کی کاٹ کر دیں گے۔ مشتاق جب واپس آئے گا تو اس کے بارے میں بھی سوچ لیا جائے گا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے مشتاق کے لیے چند تعویذ بنا کر دیں گے۔ میں وہ تعویذ کھانے میں ملا کر اگر مشتاق کو کھلا دوں گی تو اس کی مخصوص کمزوری جاتی رہے گی۔''

میں نے زرینہ کے دل میں اترتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''شاہ جی نے مشورہ تو بالکل ٹھیک دیا تھا۔ کیا تم نے ان کی بات مان لی؟''

میں اس شیطان صفت اور ہوس پرست شاہ جی کی چال کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا تھا لیکن زرینہ اس کھیل کا ایک اہم مہرہ تھی لہٰذا اسے بڑی احتیاط کے ساتھ ہینڈل کرنے کی ضرورت تھی۔ اسے کسی بھی قیمت پر میرے عزائم کی خبر نہیں ہونا چاہیے تھی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ مشتاق کی گمشدگی میں بھی اسی شاہ جی کا ہاتھ ہوگا۔ شاہ جی کو چھاپنے کے لیے بڑی محتاط اور شفاف منصوبہ بندی کی ضرورت تھی اور یہ اسی صورت ممکن تھا جب تک زرینہ مجھ پر اعتماد کرتی رہے۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

''تھانے دار جی! آپ کی طرح مجھے بھی شاہ جی کی بات بہت اچھی لگی تھی اس لیے میں نے اگلے روز ہی سے اپنا علاج شروع کرا دیا تھا۔''

''تیرا خانہ خراب۔ تو واقعی الو کی پٹھی ہے۔'' میں نے دل میں کہا پھر اپنے لہجے میں سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے زرینہ سے پوچھا۔ ''تمہیں شاہ جی سے علاج کراتے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟''

''تین دن ہو گئے ہیں جی۔'' اس نے بتایا۔ ''آج چوتھی مرتبہ جاؤں گی۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم نے کیا ہے عقل مندی کا کام۔ سمجھو، آدھا علاج ہو گیا اور آدھا باقی ہے۔''

''جی۔ یہ پورے سات دن کا علاج ہے۔''

''وہ تمہارے اوپر کس قسم کا عمل کرتے ہیں؟'' میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جب میں ان کے حجرے میں جاتی ہوں تو سب سے پہلے وہ مجھے ایک شربت پلاتے ہیں۔'' وہ وضاحت

کرتے ہوئے بولی۔ "پھر وہ مجھے چیت لیٹنے کا حکم دیتے ہیں اور وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر پڑھائی شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اس پڑھائی کے اثر سے میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں بادلوں کے اوپر اڑ رہی ہوں۔ اسی کیفیت میں مجھے نیند آجاتی ہے اور میں سو جاتی ہوں۔"

احمق عورت نشہ آور شربت کے اثرات کو شاہ جی کی پڑھائی کا اثر سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنی ذہنی کیفیت کو اس پر عیاں نہیں ہونے دیا اور بہ دستور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟"

"پتا نہیں، میں کتنی دیر نیند کی حالت میں رہتی ہوں۔ پھر جب شاہ جی مجھے جھنجوڑ کر جگاتے ہیں تو آنکھ کھلتی ہے۔" وہ بتانے لگی۔ "اس کے بعد شاہ جی مجھ پر دم کرتے ہیں اور کہتے ہیں، میں گھر جا کر آرام سے سو جاؤں اور جب تک یہ عمل مکمل نہیں ہو جاتا، اس کے بارے میں کسی سے ذکر نہ کروں ورنہ عمل کا اثر زائل ہو جائے گا..." پھر وہ فکرمندی سے مجھے دیکھنے لگی اور بولی۔ "تھانے دار جی! میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟"

"ہرگز نہیں!" میں نے اس کی تشویش دور کرنے کے لیے قطعی انداز میں کہا۔ "شاہ جی نے ان لوگوں کو بتانے سے منع کیا ہے جو تمہارے دشمن ہیں جیسے کہ حمیدہ۔ میں تو تمہارا سچا خیر خواہ ہوں اور اس بات کا شاہ جی سے بھی ذکر نہیں کرنا کہ میں تم سے ملا تھا اور تم نے مجھے ان کے عمل کے بارے میں بتایا ہے۔ جو بات پردے میں رہے اس میں سبھی کا بھلا ہوتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

ویسے تو حمیدہ کے نام پر ہی اس کی آنکھوں اور چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ میرے مشورے نے اسے اور بھی مطمئن کر دیا۔ بڑی فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"جی..... اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔"

"تم اس مخصوص عمل کے لیے کتنے بجے شاہ جی کے آستانے پر جاتی ہو؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو کھینچتے ہوئے پوچھا۔

میرا مقصد تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ بس، مجھے چند اہم پوائنٹس درکار تھے۔ میں نے آنے والی رات شاہ جی کے آستانے پر دھاوا بولنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ میں اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کرنا چاہتا تھا۔

زرینہ نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

"مغرب اور عشا کا درمیانی وقت مجھے ان کے حجرے میں گزارنا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، آج سے زیادہ وقت لگ جائے..."

"کیوں..... آج کیا خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاہ جی نے کہا ہے کہ آخری چار دن کا عمل کچھ طویل ہوگا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ان کے مطابق انہوں نے میری بندش کی کاٹ تو کر دی ہے۔ اب وہ مجھ پر ایک ایسا عمل کریں گے جس کی وجہ سے زندگی میں کوئی مجھ پر کوئی بندش یا کسی بھی قسم کا کالا عمل نہیں کر سکے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ زرینہ ابھی تک شاہ جی کے شر سے محفوظ تھی لیکن آج کے بعد وہ خبیث شخص کسی خاص عمل کی آڑ میں چاروں راتیں زرینہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے گا۔ میں زرینہ کی بے وقوفی اور احمقانہ سادگی سے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ اس مکار کے سامنے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کر سکے گی۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ بروقت حالات کی باگ میرے ہاتھ میں آگئی تھی۔ میں کسی بھی قیمت پر شاہ جی کو اس کے شیطانی عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ آج کی رات اس کی زندگی کی سیاہ ترین رات ثابت ہونے والی تھی۔ اب اس امر میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ مشتاق کو راستے کا کانٹا سمجھتے ہوئے اسی نے ہٹایا ہوگا۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

"جب تم آستانے پر جاتی ہو تو وہاں اور کتنے افراد موجود ہوتے ہیں؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"صرف شاہ جی کا خدمت گار۔" اس نے جواب دیا۔

زرینہ کا اشارہ مجاور کی طرف تھا۔

میں نے سوالات کے سلسلے کو موقوف کرتے ہوئے زرینہ سے پوچھا۔ "کیا آج بھی تم مغرب کے وقت ہی آستانے پر جاؤ گی؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "جانے کا ٹائم تو وہی ہے مگر واپسی میں تھوڑی دیر ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، تم اطمینان سے اپنا علاج مکمل کرو۔" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں مشتاق کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ فکرمندی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تھانے دار جی! آپ میری ایک بات مانیں گے؟"

سوگوار اور فکرمند حسن دو آتشہ ہوتا ہے۔ میں نے زرینہ سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں..... ضرور

باتوں گا۔"

"اگر میرا علاج ختم ہونے سے پہلے مشتاق واپس آجائے تو آپ اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔" وہ بڑی امید سے بولی۔ "اور علاج کے بعد بھی نہیں۔"

"میرے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ میں مشتاق کو اپنا سیدھا کروں گا کہ بعد میں وہ خوشی خوشی اپنا علاج کرانے پر بھی تیار ہوجائے گا۔"

اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

"لیکن تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"میں سو وعدے کروں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ حکم تو کریں۔"

"کسی کو ہماری اس ملاقات اور ان باتوں کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

"شاہ جی کو بھی نہیں...!"

"میں ان کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"شاباش!"

☆☆☆

زرینہ سے حاصل شدہ معلومات اتنی جامع اور سنسنی خیز تھیں کہ میں نے تھانے پہنچ کر ہنگامی بنیادوں پر ایک مشن کی تیاری کی جس میں خوشی محمد اور یعقوب کے علاوہ دو اور مستعد کانسٹیبل بھی شامل تھے۔ میرا سرِشام شاہ جی کے آستانے پر شب خون مارنے کا ارادہ تھا۔ ادھر اندھیرا ہوتا، ادھر ہم کارروائی شروع کر دیتے۔ میں نے اپنی ٹیم کو اس معاملے کی اونچ نیچ سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم پانچوں ایک تانگے پر سوار ہوکر ہکلی والا پہنچ گئے۔ تانگے کو ہم نے آستانے سے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے پیچھے اس زاویے پر کھڑا کر دیا جہاں سے میں آستانے کے گیٹ کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا مگر اتنے فاصلے سے کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چاروں چاق و چوبند نوجوان میرے اشارے کے منتظر تھے۔

میں اس مقام پر ایک خاص مقصد کے تحت رکا تھا۔ جلد ہی میرا وہ مقصد پورا ہوگیا۔ میں نے ایک عورت کو آستانے کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ بھاری چادر میں لپٹی ہوئی اس عورت کو اتنے فاصلے سے پہچاننا تو ممکن نہیں تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ زرینہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوگی۔

"یعقوب...... خوشی محمد!" میں نے کانسٹیبلز کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "تم دونوں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ آستانے کی پہلوؤں والی دیواروں کی طرف چلے جاؤ۔ میں گیٹ پر مجاور کو باتوں میں لگاؤں گا۔ اس دوران میں تم دیوار پھاند کر اندر پہنچ جاؤ گے اور تم دونوں ..." میں نے دیگر دو کانسٹیبلز کی سمت مڑتے ہوئے کہا۔ "تم ادھر ہی رک کر آستانے کے گیٹ پر نگاہ رکھو گے اور جیسے ہی کوئی غیر معمولی صورتِ حال نظر آئے تم فوراً حرکت میں آجاؤ گے۔"

سب نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔ اس گفتگو کے دوران میں میری نظر مسلسل آستانے کے گیٹ پر ٹکی ہوئی تھی۔ جیسے ہی زرینہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی، مجاور نے نگاہ گھما کر گرد و پیش کا جائزہ لیا اور گیٹ بند کر دیا۔

"موو......!" میں نے یعقوب اور خوشی محمد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں تفصیل سے سمجھا چکا ہوں کہ اندر پہنچنے کے بعد تم نے کہاں کہاں پوزیشن لینا ہے۔"

انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور تاریکی کا حصہ بن گئے۔ میں نپے تلے قدموں کے ساتھ گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ میں دانستہ تھوڑا تاخیر دینا چاہتا تھا تا کہ شاہ جی اپنے عمل... شیطانی عمل کا آغاز کر سکے اور میں اسے رنگے ہاتھوں اپنے دام میں لا سکوں۔

اس وقت میں اور میرے چاروں ساتھی سادہ لباس میں تھے۔ میں سست روی سے چلتے ہوئے گیٹ تک پہنچا اور دستک دینے کے بعد ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گیٹ نیم وا ہوا اور وہاں مجاور کا چہرہ دکھائی دیا۔

"کون ہے...؟" اس نے تاریکی میں میری سمت دیکھتے ہوئے اکھڑ پن سے استفسار کیا۔

"میں ہوں، صفدر حیات۔" میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے بہ آوازِ بلند جواب دیا تا کہ یعقوب اور خوشی محمد تک میری آواز پہنچ جائے۔

"کون صفدر حیات۔" مجاور میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "اس وقت کیوں آئے ہو، کیا کام ہے......؟"

"کام بہت ضروری ہے۔" میں نے بدستور اونچی آواز میں کہا۔ "ورنہ رات میں کبھی نہ آتا۔"

اس بات چیت کے دوران میں مجاور میرے قریب پہنچ گیا تھا۔ اگرچہ میں سول ڈریس میں تھا تاہم اس نے مجھے

پہچاننے میں ذرا غلطی نہیں کی اور سراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! آپ......؟"

"ہاں۔ مجھے شاہ جی سے ایک بہت ہی ضروری کام ہے۔" میں نے گیٹ کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے بتایا۔ "ابھی اور اسی وقت ان سے ملنا ہے۔"

"ابھی تو شاہ جی سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔" وہ میری راہ میں حائل ہوتے ہوئے بولا۔

"کیوں...ابھی کیا ہے؟"

"شاہ جی کہیں باہر گئے ہیں۔" اس نے فوری طور پر ایک بہانہ تراشا "وہ رات کو دیر... یا پھر صبح واپس آئیں گے۔"

"کوئی بات نہیں، میں ان کے حجرے میں بیٹھ کر انتظار کر لوں گا۔" میں اپنی ہی دھن میں آستانے کے اندر پہنچ کر آگے بڑھنے لگا۔

مجاور میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا پھر بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ "آپ شاہ جی کے کمرے میں نہیں جا سکتے۔"

میں مجاور کے تیور کو بھانپ چکا تھا لہٰذا میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کمرے میں کیوں نہیں جا سکتا... کیا وہاں تمہاری بہن آرام کر رہی ہے؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔

اسی لمحے تاریکی میں سے چاق و چوبند یعقوب برآمد ہوا اور اس نے مجاور کو جن جپھا ڈال کر پہلے ہوا میں بلند کیا اور پھر کسی دھوبی کے مانند زمین پر پٹخ دیا۔ میں مجاور کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد شاہ جی کے حجرے کی سمت بڑھ گیا۔ زرینہ کو وہاں پہنچے پندرہ سے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ شاہ جی کو چھاپنے کا انتہائی مناسب موقع تھا۔ اگر میں دیر کر دیتا تو وہ شیطان صفت، ننگ انسانیت زرینہ کو "چھاپ" ڈالتا۔

خوشی محمد میری ہدایت کے مطابق حجرے کے دروازے کے سامنے موجود تھا۔ خوشی محمد اور یعقوب دونوں تنومند، دراز قامت اور لڑائی بھڑائی کے ماہر تھے۔ یعقوب نے بڑی کامیابی سے مجاور کو سنبھال لیا تھا۔ اب خوشی محمد کے کارکردگی دکھانے کی باری تھی۔

"ملک صاحب! دروازہ توڑنا ہے یا...؟" وہ دھیمے مگر خطرناک لہجے میں بولا۔

"دروازہ میں کھلوا لوں گا۔" میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "توڑ پھوڑ کا شوق تم شاہ جی کے ساتھ پورا کر لینا۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے حجرے کے دروازے پر دستک دی اور مجاور کی آواز نکالتے ہوئے پکارا۔ "شاہ جی... شاہ جی!"

جیسے ہی میری آواز اندر پہنچی، حجرے کے دروازے کی سمت چلتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری پھر اگلے ہی لمحے دروازے کی کنڈی گرنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں ریڈ الرٹ ہو گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا اور وہاں شاہ جی کا منحوس چہرہ نمودار ہوا۔

"کک... کیا ہوا...!"

شاہ جی کے استفسار کو بریک لگ گئے۔ ادھر اس نے "کک" کہا، ادھر میں نے ایک دھواں دھار لات دروازے کے اس مقام پر ماری جہاں شاہ کی خبیث صورت دکھائی دی تھی۔ میری ٹائمنگ اتنی پرفیکٹ تھی کہ وہ "کک...کیا ہوا..." کے آگے ایک لفظ بھی نہیں بول سکا تھا۔

میرے "ایکشن" کے جواب میں ایک زوردار دھما کا ہوا جس کی آواز پورے آستانے میں سنائی دی تھی۔ میری لات کھا کر شاہ جی کسی اسپرنگ کی طرح پیچھے کی جانب اچھلا پھر کسی ٹوٹے ہوئے ستارے کے مانند وہ حجرے کے آرام دہ فرش پر پشت کے بل گرا۔ فرشی نشست چاہے کتنی بھی آرام دہ سہی لیکن لات میں جو طمطراق تھا اس نے شاہ جی کو ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند کراہنے پر مجبور کر دیا۔ قبل اس کے کہ شاہ جی کی اذیت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرتی، میں اور خوشی محمد جست مار کر حجرے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

اندر کا منظر بڑا عبرت ناک بلکہ شرمناک تھا۔ چراغ کی مدھم روشنی میں، میں نے شاہ جی کو برہنہ دیکھا۔ حجرے کے ایک کونے میں، زرینہ بھی لب بستری میں نیم بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے شاہ جی کو اس کے شیطانی مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی چھاپ لیا تھا۔

"خوشی محمد!" میں نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اس بی بی پر کوئی کپڑا وغیرہ ڈال دو۔"

خوشی محمد تیزی سے زرینہ کی سمت بڑھ گیا۔

اس دوران میں شاہ جی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "چلو... جلدی سے کپڑے پہنو۔ تم سے باقی باتیں ادھر تھانے میں ہوں گی۔"

جب شاہ جی نے دیکھا کہ بازی پلٹ چکی ہے اور میں نے اسے اس کے کالے کرتوتوں کے ثبوت کے ساتھ

چھاپ نیا ہے تو اس کی رگ بدمعاشی پھڑک اٹھی۔

"معذرت! " وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں مجھ سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔"

"اچھے برے کا فیصلہ دھرتھانے کے لاک اپ روم میں ہوگا۔" میں نے بھی دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ "اگر تم نے پانچ منٹ کے اندر لباس نہیں پہنا تو میں تمہیں اسی حالت میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"میں اگر چاہوں تو ابھی ایک پھونک مار کر تمہیں جلا کر بھسم کر دوں.....۔"

"ادبے..... کسی ناپاک جانور کی اولاد!" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ "تیری اور تیری پھونک کی تو ایسی کم تیسی۔" پھر میں نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کو ایسے ہی لے چلو۔ جب یہ خود ہی اپنا مذاق بنانا چاہتا ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

میرے اٹل انداز نے شاہ جی کو جلدی جلدی کپڑے پہننے پر مجبور کر دیا۔ اس اثنا میں زرینہ بیدار ہو گئی تھی۔ جب صورت حال اس کی سمجھ میں آئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"زرینہ! میں اس شیطان شاہ جی کو لے کر باہر جا رہا ہوں۔ تم جلدی سے لباس پہن کر باہر آجاؤ۔ میں آستانے کے گیٹ پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

شاہ جی نے ادھر لباس پہنا، ادھر اسے اپنی ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ پھر ہم اسے کھینچتے ہوئے آستانے کے وسیع و عریض صحن میں لے آئے۔ وہاں موجود کانسٹیبل نے شاہ جی کے مجاور کو زدوکوب کرنے کے بعد ہتھکڑی لگا دی تھی۔ میں نے گیٹ کی سمت نگاہ اٹھائی تو وہاں مجھے وہ دونوں کانسٹیبل نظر آئے جنہیں ہم تانگے میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ ہماری خیر خبر لینے ادھر آ گئے تھے۔

جب زرینہ لباس پہن کر باہر آئی تو میں اسے ایک طرف لے گیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "زرینہ! تم میری بیٹی کی طرح ہو، میری بات توجہ سے سنو۔ یہ شاہ جی ایک ڈبا پیر اور ڈھونگی شخص ہے۔ میں کافی دنوں سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ تم نے میرا کام آسان کر دیا....." آخری جملے میں نے موقع محل کی ضرورت کے تحت شامل کر دیے تھے۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے کہا۔

"یہ ہوس پرست خبیث شاہ جی تمہاری عزت سے کھیلنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔ مخصوص عمل کے نام پر یہ نشے والا شربت پلا پلا کر تمہارے دماغ کو کمزور بنا رہا تھا۔ آج یہ تمہاری عزت خراب کرنے والا تھا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میری بروقت مداخلت نے شاہ جی کے شیطانی منصوبے کا ستیاناس کر دیا۔ اگر تم ایک بار اس کی ہوس کا نشانہ بن جاتیں تو پھر یہ ساری زندگی تمہاری جان نہ چھوڑتا۔"

"تھانے دار صاحب! آپ کی باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں۔" وہ بے حد لرزیدہ، خوف زدہ آواز میں بولی۔ "بتائیں، اب میں کیا کروں؟"

"تم یہاں سے سیدھی اپنے گھر جاؤ اور ہر بات کو بھلا کر سکون سے سونے کی کوشش کرو۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں کل کسی وقت آ کر تم سے بھرپور ملاقات کروں گا۔ مجھے شک ہے کہ مشتاق کی گمشدگی میں بھی اسی مردود شاہ جی کا ہاتھ ہے۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور خاموشی سے اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ ہم نے آستانے کے گیٹ پر تالا ڈالا اور شاہ جی مع مجاور کو لے کر تھانے آ گئے۔ جب تھانے پہنچے رات کے دو بج رہے تھے۔

کسی بھی تھانے کا ٹارچر روم بڑی عجیب و غریب جگہ ہوتی ہے جہاں پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب میں نے شاہ جی اور اس کے مجاور کو الٹا لٹکا کر تفتیش کا آغاز کیا تو آدھے گھنٹے سے پہلے ہی ان کی زبان کھل گئی۔

شاہ جی کو تو میں نے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ وہ اپنے کسی جرم سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ ساری تفتیش میں گمشدہ مشتاق کی بازیابی کے لیے کر رہا تھا۔ میرا شک درست نکلا۔ شاہ جی نے مشتاق کے قتل کا اقبال کر لیا۔ یہ کام اس نے اپنے خدمت گار مجاور سے کرایا تھا۔ مشتاق کی لاش کو نہر کے کنارے زیر زمین دبا دیا گیا تھا۔

شاہ جی زرینہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا اور مشتاق اس سلسلے میں اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ شاہ جی نے اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہونے کے لیے راستے کی رکاوٹ کو ہٹا ڈالا تھا۔

انسان بعض اوقات بہت غلط فہم ہو جاتا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کا سب کچھ ریکارڈ بھی ہو رہا ہے۔ پھر ایک روز یہی غلط فہمی اسے لے ڈوبتی ہے۔ شاہ جی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

لرزتے سائے میں پناہ لینے والی ایک بچی کی بہادری

کبھی کبھی معصوم گواہی اور بچگانہ ذہن کی باتوں سے بھی کسی بڑے مجرم تک رسائی کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔ وہ بھی کھیل ہی کھیل میں ایک ایسے عجیب منظر کی چشم دید گواہ بن گئی تھی جس کا ہر پہلو ایک نئی داستان ترتیب دے رہا تھا مگر... اس کا ذہن بھانو کی ترکیبوں میں الجھ کر رہ گیا اور... بالآخر اس کی معصوم ذہانت رنگ لائی اور انجانے میں اصل مجرم کے چہرے کو بے نقاب کر ڈالا۔

نعم البدل

تنویر ریاض

پڑوسی نے ادھ کھلی کھڑکی سے میریل کو تیزی سے باہر نکل کر آتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے بڑے سے سر پر گندمی بالوں کی چوٹیاں دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔ وہ دیکھنے میں بڑی بے ڈھب سی لگتی تھی۔ دبلے پتلے جسم پر چوڑے چہرے نے اس کی شخصیت کی ساری جاذبیت ختم کر دی تھی۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر نوعمر لڑکیوں جیسی معصومیت اور بھولپن نظر آتا تھا۔ میریل نے بغیر کسی وجہ کے دالان کے فینس پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور اس کے مکان کے سامنے رک گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میریل کی نظر اس پر پڑے لہٰذا وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔

اس کا مکان ان تین میں سے ایک تھا جو کہ سیکر تین کے سرے پر واقع تھے اور یہاں آ کر یہ گلی بند ہو جاتی تھی۔ عام طور پر میریل بھی یہاں پہنچ کر اپنا چکر مکمل کرتی اور گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر واپس ہو جاتی لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ میریل واپس جانے کے بجائے وہیں رک کر اس کے لان کی طرف دیکھنے لگی پھر اس نے شمال میں واقع مکان کی جانب نظر دوڑائی اور دونوں مکانوں کے درمیان خالی جگہ کا جائزہ لینے لگی۔ پڑوسی کے ماتھے پر تفکرات کی لکیریں نمایاں ہونے لگیں اور اس نے ٹھنڈی کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے اس بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اچانک ہی میریل نے دوبارہ سائیکل کی گھنٹی بجانا شروع کر دی اور یہ عمل کئی بار دہرایا۔ گھنٹی کی آواز اتنی تیز تھی کہ اسے لگا جیسے میریل اپنی سائیکل سمیت اس کے لیونگ روم میں چلی آئی ہو۔ اس نے غصے سے میریل کی طرف دیکھا اور دانت پیس کر بڑبڑانے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ میریل کے والدین کی شان میں گستاخی کر رہا ہو کہ انہوں نے ایسی بدتمیز لڑکی کیوں پیدا کی اور اگر وہ دنیا میں آ ہی گئی تھی تو اس کی ڈھنگ سے تربیت کیوں نہیں کی۔ آخر یہ لڑکی یہاں کیا تلاش کر رہی ہے۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اس سے پہلے بھی وہ ایک سے زائد مرتبہ اسے اپنے شیڈ کے گرد چکر لگاتے اور کھڑکیوں میں جھانکتا دیکھ کر بھگا چکا تھا۔ اس کی ماں سے بھی شکایت کی لیکن وہ اپنی بچی کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ ان ماؤں میں سے تھی جنہیں اپنی اولاد میں کوئی عیب نظر نہیں آتا بلکہ اس نے پڑوسی پر ہی الزام لگا دیا کہ وہ میریل کی معصومانہ حرکتوں پر غیر ضروری ردعمل ظاہر کر رہا ہے۔

اسے یاد آیا کہ میریل کی ماں نے اس کی شکایت سننے کے بعد تمسخرانہ انداز میں پوچھا تھا کہ اسے بیوی سے علیحدہ ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے اور کیا اسے نئے ساتھی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ شاید وہ اسی بہانے اس سے ملنے چلا آیا ہے۔ اس عورت کی سانسوں میں سستی شراب کی بو رچی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کثرت سے شراب نوشی کرتی ہے لیکن اس وقت میریل کی آمد اس لحاظ سے حیران کن تھی کہ وہ عموماً چوری چھپے تاک جھانک کیا کرتی تھی جبکہ اس وقت اس کا انداز کسی فوجی جرنیل جیسا تھا جو سڑک پر کھڑا حکم چلا رہا ہو۔ بظاہر وہ خاموش کھڑی ہوئی تھی لیکن بار بار سائیکل کی گھنٹی بجا کر اپنی موجودگی کا اعلان بھی کر رہی تھی البتہ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کس لیے کر رہی ہے۔

وہ قالین کی صفائی کرنا بھول گیا۔ اس نے کافی کا مگ اٹھایا اور کھڑکی کے پاس بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا لیکن اس نے ایسی پوزیشن لے رکھی تھی کہ میریل اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میریل کی ماں نے اس عجیب و غریب مخلوق کا اتنا خوب صورت نام کیسے رکھ دیا۔ اس لڑکی میں ذرا سا بھی نسوانی پن نہیں تھا اور اپنی انہی بیہودگی حرکتوں کی وجہ سے پاس پڑوس کا کوئی بھی شخص اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے میریل کی سائیکل اپنے لان میں پڑی ہوئی نظر آئی جبکہ میریل اسے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ماتھے کی شکن اور گہری ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیاری سے کچن کی طرف گیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے کچن کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور اس پگڈنڈی کی جانب دیکھنے لگا جو اس کے گھر سے جنگل کی جانب جا رہی تھی۔ کافی فاصلہ ہونے کے باوجود اسے میریل کا بڑا سا سر نظر آ گیا جو دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ اس نے لڑکی کے خیال سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں اس کتے کی تصویر ابھرنے لگی جو اس کے لان میں اچھل کود کر رہا تھا پھر اسے اس بیلچے کا خیال آیا جس کا درست استعمال کر کے اسے وقتی طور پر اطمینان محسوس ہوا تھا لیکن اب میریل کی بے چینی دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ کتا اسی کا تھا۔ اس نے سختی سے اپنے دونوں ہاتھ بھینچ لیے جیسے ایک بار پھر بیلچے کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی ہو۔

میریل جلدی میں کھودے گئے گڑھے کے پاس کھڑی اس بچے کو غور سے دیکھ رہی تھی جو تھوڑا سا باہر لٹکا ہوا تھا۔ اس کی کھال پر گہری سیاہ پٹیاں تھیں جس کی وجہ سے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اسی کا کتا تھا جسے وہ پیار سے زیبرا کہہ کر بلاتی تھی۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جا رہا تھا، اس کی تخریبی سرگرمیاں بھی بڑھتی جا رہی تھیں جو میریل اور اس کی ماں کو بالکل بھی پسند نہیں تھیں۔ اس لیے اسے پچھلے صحن میں باندھ کر رکھا جاتا تھا اور میریل اس کے لیے ایک جیلر کی طرح کام کرتی تھی۔ گویا اسے اس کتے سے کوئی محبت نہیں تھی اور نہ ہی وہ کتا اس سے بہت زیادہ مانوس تھا۔ بہرحال

اس نفرت کے باوجود وہ اس کا خیال رکھنے پر مجبور تھی۔ میریل ہی اس کتے کو کھانا دیتی اور وہی اسے ڈھونڈ کر بھی لاتی جب وہ زنجیر کھلی رہ جانے کی وجہ سے گیٹ سے باہر چلا جاتا تھا۔ میریل اسی بہانے پڑوس کے گھروں میں جھانک لیتی اور اس طرح اسے کچھ خبریں مل جاتیں اور واپسی میں اسے بہلا پھسلا کر ساتھ لے آتی۔ یہی وہ مشن تھا جس کی تکمیل کے لیے وہ ہفتے کی صبح کو گھر سے باہر نکل پڑی تھی لیکن اب وہ دیکھ رہی تھی کہ اسے اس مشن میں جزوی کامیابی ہوئی ہے۔ ریبرل تو گیا تھا لیکن وہ اپنے بنگلے میں واپس جانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ شاید اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس کی مدد سے وہ نرم مٹی ہٹا کر اپنے کتے کی باقیات نکال سکے۔ اسے درخت کی شاخ کا ایک مضبوط ٹکڑا مل گیا اور اس نے اس کے ذریعے گیلی زمین کو کھودنا شروع کر دیا۔ وہ اس کوشش میں پسینے پسینے ہو گئی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور چند منٹوں بعد ہی اسے کتے کی لاش نظر آ گئی۔ اسے دفن کرنے والا کوئی اناڑی تھا جس نے گہرا گڑھا کھودنے کے بجائے ذرا سی مٹی ہٹا کر کتے کو وہاں دبا دیا تھا اور اس کی لاش سے اٹھنے والا تعفن ہی اس گڑھے تک پہنچنے کے لیے کافی تھا۔

اسے کتے کی لاش کچھ بدلی بدلی نظر آئی۔ وہ اس کا بغور معائنہ کرنے کے لیے اپنا بڑا سا منہ اس کے قریب لائی تو لاش سے اٹھنے والی بدبو مزید تیز محسوس ہونے لگی لیکن میریل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اس کا بغور جائزہ لیتی رہی اور اس نتیجے پر پہنچی کہ کتے کی لاش میں تبدیلی آ چکی ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوبارہ کھڑی ہوئی اور جنگل میں دور دور تک نظریں دوڑاتی رہی لیکن دشمن اسے کہیں نہیں دکھائی دیا۔ گو کہ اسے کتے کی بے وقت موت کا کوئی غم نہیں تھا لیکن اسے اپنی ملکیت کی چوری اور اس کے ضائع ہونے پر غصہ آ رہا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ کسی نے اس کا کتا چرایا تھا۔

اس نے آخری بار کتے کی لاش پر ہلکے سے ٹھوکر ماری اور نزالی کی تلاش میں واپس آنے کے لیے مڑی تاکہ اسے یہاں سے اٹھا کر لے جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کتے کی لاش جنگلی جانوروں کی خوراک بن جائے۔ اسے معلوم تھا کہ کئی پڑوسیوں کے پاس ایسی ٹرالی ہے اور سال کے اس حصے میں وہ بہ آسانی دستیاب ہو سکتی ہے۔ عین اسی وقت گڑھے کے پاس پڑی ہوئی چیز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی جو کہ درختوں سے چھن کر آنے والی سورج کی روشنی میں کسی بلی کی آنکھ کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر ایک ہاتھ سے وہ جگہ ٹٹولنے لگی جہاں وہ چیز پڑی ہوئی تھی اور جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اسے ایک ایسا قیمتی انعام مل گیا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ وہ ایک سونے کا نیکلس تھا جس کے وسط میں ایک ہیرا جڑا ہوا تھا۔ میریل کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ کیا چیز لگی ہے لیکن اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ کوئی بہت ہی قیمتی انعام ہے۔

اس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نیکلس کو گڑھے سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن اسے یوں لگا جیسے وہ کہیں اٹکا ہوا ہے۔ اس نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنی جانب کھینچا تو یوں لگا جیسے مٹی کے نیچے کسی چیز نے حرکت کی ہے۔ اس نے لکڑی کی مدد سے وہ نیکلس اٹھا کر اپنے قبضے میں لے لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے مٹی میں دبا ہوا جبڑا نظر آیا اور وہ سمجھ گئی کہ یہاں کسی انسان کی لاش دبی ہوئی ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے ہاتھوں میں کپکپاہٹ طاری ہوئی لیکن اس نے نیکلس کو مضبوطی سے تھامے رکھا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دونوں ہاتھ اوپر کر کے اس نیکلس کو اپنے گلے میں ڈال لیا۔ وہ خوش تھی کہ دن بھر کی بھاگ دوڑ کا اتنا اچھا نتیجہ برآمد ہوا۔ اسے کتے کی موت یاد نہیں رہی تھی۔

اس حیرت ناک واقعے کے بعد اس کا منصوبہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے کتے کی لاش کو گھسیٹ کر دوبارہ گڑھے میں ڈال دیا اور دوبارہ سے اس پر مٹی ڈال دی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اس جگہ کا جائزہ لیا اور زمین پر گری ہوئی درختوں کی شاخیں جمع کر کے اس گڑھے پر ڈال دیں۔ اچھی طرح مطمئن ہو جانے کے بعد وہ گھر جانے کے لیے مڑی لیکن اس سے پہلے اس نے وہ نیکلس ..... اپنی قمیص کے نیچے چھپا لیا۔ وہ اس خزانے سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ماں کی نظر اس نیکلس پر گئی تو وہ اسے چھین لے گی اور اپنے بناؤ سنگار کے لیے ضبط کر لے گی۔ اس کے علاوہ پہلے وہ یہ تسلی بھی کرنا چاہ رہی تھی کہ اس ہار کا تعلق ان تین لوگوں سے تو نہیں جو گلی کے اختتام پر واقع تین مکانوں میں رہتے تھے کیونکہ یہ بات میریل کے ذہن میں بھی تھی کہ صرف وہی تین لوگ جنگل میں جانے والی پگڈنڈی تک رسائی حاصل کر سکتے تھے اور اس خفیہ گڑھے سے چند گز کے فاصلے سے گزر سکتے تھے۔

سالٹر نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ ''تمہیں یہ کہاں سے ملا؟''

وہ میریل کی جانب چند قدم بڑھا تو وہ بھی سائیکل سمیت ذرا سی پیچھے ہٹ گئی۔ یہ دیکھ کر سالٹر اپنی جگہ پر رک گیا اور اس نیکلس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہاری ماں نے اسے پہننے کی اجازت دے دی؟''

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''کیا وہ جانتی ہے کہ تمہارے پاس یہ نیکلس ہے کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس طرح کی چیزیں افورڈ کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ اصلی ہو جو کہ نظر آ رہا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے چند قدم آگے بڑھائے لیکن میریل پہلے ہی واپس جانے کے لیے اپنی سائیکل موڑ چکی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم میرے مکان پر آتی رہتی ہو۔'' اس نے پیچھے سے آواز لگائی لیکن میریل نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ تیزی سے سائیکل چلا رہی تھی۔ بوڑھا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چکر لگانا چھوڑ دو۔ اسے مداخلت بے جا کہتے ہیں اور میں پولیس کو رپورٹ کر سکتا ہوں۔'' اس کی آواز بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ''اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو شاید میں پولیس کو بلا لوں۔ کیا تم نے یہ نیکلس چرایا ہے؟''

میریل دور جا چکی تھی لیکن اس نے آخری جملہ سن لیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے مسٹر سالٹر کا نام مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا۔

☆☆☆

اس کے بعد مسز فورسٹر کا نمبر تھا۔ وہ بالکل خاموشی سے لان پار کر کے ان کے عقبی صحن میں پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فورسٹر کی پشت ان کی جانب تھی اور وہ اپنی مرغیوں کو دانہ ڈالنے اور ان سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ انہیں اس کے آنے کا پتا ہی نہ چلا۔ میریل ان مرغیوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی اور ماضی میں کئی بار ان سے شناسائی کی کوشش کر چکی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر مسٹر فورسٹر نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا جب وہ ڈربے میں گھس کر ایک مرغی کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس طرح مسٹر فورسٹر بھی ان پڑوسیوں میں شامل ہو گئے جو آئے دن میریل کی ماں سے اس کی شکایتیں کرتے رہتے تھے۔ اس واقعے کے بعد میریل بہت محتاط ہو گئی تھی۔ گو کہ وہ پھر کبھی نہیں پکڑی گئی لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی بھی نہیں ہوئی۔

ان مرغیوں کو ادھر ادھر دوڑتے ہوئے دیکھ کر میریل خاموش نہ رہ سکی اور آہستہ سے بولی۔ ''بہت شریر ہیں۔''

فورسٹر اچانک گھوما اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''اوہ!'' پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ تم اتنی خاموشی سے اندر آ گئیں جبکہ عام طور پر سائیکل کی گھنٹی بجا کر اپنے آنے کی اطلاع دیتی ہو۔''

میریل نے سر جھکا کر اسے تعظیم دی۔ جواب میں فورسٹر نے بھی اسے مسکرا کر دیکھا۔ دونوں کافی فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ فورسٹر نے دانے کا پیالہ زمین پر رکھا اور باہر آنے کے لیے ڈربے کا دروازہ کھول دیا۔ میریل نے بے ڈھنگے پن سے اپنی سائیکل نصف دائرے میں گھمائی اور منہ اس جانب کر لیا جہاں سے وہ آئی تھی۔ بوڑھے نے اس کی احتیاط کو نوٹ کیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے سے باہر آ گیا پھر اس نے بڑی احتیاط سے ڈربے کا دروازہ بند کیا۔ جب وہ میریل کی طرف مڑا تو اس نے دیکھا کہ اس کے گلے میں سونے کا نیکلس پڑا ہوا ہے۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''اوہ میرے خدا..... میریل! تمہارے پاس یہ نیکلس کہاں سے آیا ہے؟ یہ تو بہت خوب صورت ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے پاس یہ قیمتی نیکلس ہے۔''

میریل کی نظریں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے نیکلس میں جڑے ہوئے ہیرے کو دیکھا۔ پھر اس کے لبوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ فورسٹر نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''کیا یہاں ایسی کوئی چیز ہے جو تمہیں چاہیے؟''

یہ کہہ کر وہ دو قدم اور آگے بڑھا۔ وہ قد میں اس سے تھوڑا سا لمبا تھا اور اس کا وزن بھی پندرہ پونڈ زیادہ تھا۔ لہٰذا وہ اس سے اتنی زیادہ خوفزدہ نہیں تھی جتنی کہ محلے کے دوسرے لوگوں سے ہوتی تھی۔

''تم ان مرغیوں کو دیکھنے آئی ہو۔ میری طرح تمہیں بھی یہ اچھی لگتی ہیں۔ پچھلی بار جب تم یہاں آئی تھیں تو میں نے تھوڑی زیادہ ہی تیزی دکھا دی لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ تم بھی میری طرح ان کی گرویدہ ہو اور محض انہیں دیکھنے کے لیے یہاں چلی آئی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور میریل کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم کسی مرغی کو ہاتھ میں لینا چاہو گی؟''

اس پیشکش پر میریل کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک

ابھری۔ ان نرم پروں والی مرغیوں کو چھونے یا انہیں ہاتھ میں لینے کا تصور ہی اس کے لیے بڑا خوش کن تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔ فورسٹر اس کی دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے دڑبے کی جانب بڑھا اور وہاں سے ایک مرغی نکال لایا۔ میریل مسکرائی اور اس نے مرغی کو پکڑنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے لیکن فورسٹر اس سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا اور مرغی کے نرم پروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''مجھے وہ نیکلس دوبارہ دکھاؤ۔ پہلے میں فاصلے پر ہونے کی وجہ سے اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا اور اس کے بعد تم اس مرغی کو ہاتھ میں لے سکو گی۔''

میریل نے جلدی سے اپنی قمیص میں رکھا ہوا نیکلس نکالا اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر فورسٹر کے سامنے کر دیا۔ اس دوران بھی اس کی حریص نظریں مرغی پر جمی رہیں۔ فورسٹر پنجوں کے بل آگے کی طرف جھکا اور کئی لمحوں تک خاموشی سے نیکلس میں جڑے ہوئے قیمتی پتھر کو تکتا رہا پھر میریل نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں اس کی بہت حفاظت کرنا ہوگی کیونکہ اس طرح کی چیزوں سے دوسرے لوگوں کی نیت خراب ہو سکتی ہے۔'' وہ ذرا سا آگے کی طرف ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہاری ماں کو اس نیکلس کے بارے میں علم ہے؟''

میریل نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں اس نیکلس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اسے کبھی نہیں بتاتا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اسے تم سے چھین کر خود پہننے لگی اور یہ نیکلس اسی کے پاس رہے گا۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ عورتیں ایسا کرتی ہیں۔''

میریل نے وہ نیکلس دوبارہ اپنی قمیص کے اندر رکھ لیا اور مرغی لینے کے لیے دوبارہ اپنے بازو پھیلا دیے۔ فورسٹر نے احتیاط سے مرغی اس کے ہاتھ پر رکھی اور میریل کی طرف دیکھ کر مسکرایا جس کے چہرے پر مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میریل نے جوش میں آ کر مرغی کی پشت پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ نازک اندام مرغی اس کے بازوؤں میں مچلنے لگی۔ شاید وہ اس کے ہاتھ کا دباؤ برداشت نہ کر سکی۔ فورسٹر دیکھ رہا تھا کہ میریل اس معاملے میں اناڑی ہے۔ وہ مرغی واپس لینے کے لیے آگے بڑھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مرغی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ مرغی اجنبی ہاتھوں کا دباؤ برداشت نہ کر سکی اور اس نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے تیزی سے پروں کو پھڑپھڑانا شروع کر دیا۔ میریل گھبرا گئی اور اس نے مرغی کو زمین پر چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اپنے دڑبے میں چلی گئی۔ میریل اپنی جگہ پر مایوسی سے کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر اس نے غصے میں آ کر اپنی سائیکل اٹھائی اور گھر جانے کے لیے مڑی۔ فورسٹر اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا آیا اور بولا۔ ''ابھی یہ مرغیاں تم سے مانوس نہیں ہیں۔ اس میں کچھ وقت لگے گا۔ تم جب چاہو دوبارہ آ سکتی ہو۔ میں تمہیں سکھاؤں گا کہ انہیں کس طرح سنبھالا جاتا ہے۔''

میریل کی فہرست میں اگلا نام وانڈری کا تھا۔ میریل کو اس سے ملنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ بچے کی نینی کے گھر گئی تو وہ باہر ہی مل گیا۔ وہ سامنے والے پورچ میں ٹی لکڑی کی ریلنگ پر رنگ کر رہا تھا۔ میریل نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے کئی بار سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ ''ہیلو میریل! کیسی ہو؟ چند ہفتوں بعد سردی بڑھ جائے گی پھر میرے لیے یہ کام کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ اسے جلدی جلدی نمٹا لوں۔''

میریل اس کی بات کا کیا جواب دیتی چنانچہ اس نے ایک بار پھر گھنٹی بجا دی۔ وانڈری نے اپنا کام روک کر احتیاط کے ساتھ برش ڈبے کے کنارے پر رکھا اور اپنی پرانی پتلون سے ہاتھ صاف کرتا ہوا بولا۔ ''تمہاری سائیکل تو بالکل نئی لگتی ہے؟''

میریل نے اپنا بڑا سا سر ہلا دیا اور بولی۔ ''یہ میں نے کہیں سے چرائی نہیں بلکہ نانی نے خرید کر دی ہے۔''

وانڈری مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

میریل نے اپنے گلے میں ہاتھ ڈال کر قمیص سے وہ نیکلس نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔ وانڈری کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے پاس یہ نیکلس کہاں سے آیا؟''

میریل نے یہاں بھی وہی حرکت کی جو اس سے پہلے سالٹر اور فورسٹر کے ساتھ کر چکی تھی۔ اس نے اپنی سائیکل سیدھی کی اور اس کے پیڈل پر پاؤں رکھ کر خاموش کھڑی ہو گئی تاکہ کسی خطرے کی صورت میں اسے بھاگنے میں آسانی رہے۔

وانڈری نے جیب سے رومال نکالا اور چہرے کا پسینہ

پوچھتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح کی چیزوں سے ناچ پیدا ہوتا ہے لیکن تم ابھی بہت چھوٹی ہو، اس لیے میری بات نہیں سمجھ سکو گی۔''

اس نے ایک بار سڑک کی جانب دیکھا اور دوبارہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔ ''میں جس جگہ کام کرتا ہوں وہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس طرح کی چیزوں کی خاطر کسی کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔'' اس کے چہرے پر ہلکی سی سختی آ گئی لیکن وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میں کہاں کام کرتا ہوں؟''

میریل جانتی تھی۔ ایک بار باتوں باتوں میں اس کے چچا نے اس بارے میں بتایا تھا لہٰذا اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ وانڈری نے اس کی جانب دلچسپی سے دیکھا اور بولا۔ ''تب تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ بہت برے لوگوں کے درمیان گزارا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک نمودار ہوئی جس نے میریل کو بے چین کر دیا۔ وانڈری نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور میریل آنے والے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے بھاگنے کی تیاری کرنے لگی۔

''کیا تم عیسائی ہو؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''تمہاری ماں تمہیں کبھی اپنے ساتھ چرچ لے کر گئی ہے۔''

''ہم کبھی کبھی وہاں جاتے ہیں۔'' میریل نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ ''ہم کیتھولک ہیں۔''

وانڈری کے چہرے پر مایوسی نظر آنے لگی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''اب میں سمجھا کہ تم لوگوں کو سونے اور قیمتی اشیا سے اتنی محبت کیوں ہے؟''

میریل نے پیڈل پر پاؤں مارا اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ جس مقصد سے آئی تھی وہ پورا ہو چکا تھا۔ وانڈری نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''تم اور تمہاری ماں جب چاہیں، میرے گھر ہونے والی دعائیہ تقریب میں آ سکتی ہیں۔ خدا ہر اس شخص کی بات سنتا ہے جو کھلے دل سے اس کے سامنے اعتراف کر لیتا ہے۔''

☆☆☆

اس رات میریل اپنے بستر میں لیٹی دن بھر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتی رہی۔ اس نے اپنے کتے کے قاتل کو بے نقاب کرنے کے لیے جو کوششیں کی تھیں، وہ بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اب اس کے پاس سوچنے کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عقبی صحن میں پورے چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گیٹ کے قریب ایک ہک سے کتے کی زنجیر لٹک رہی تھی۔ میریل کی آنکھیں بھیگنے لگیں اور وہ یہ سوچ کر ہی اداس ہو گئی کہ اس کا پیارا کتا اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک سائے پر گئی جو درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ وہ خود بھی رات کو گھر سے نکلنے کی عادی تھی۔ اس لیے اس نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس سائے نے ایک انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا لگ رہا تھا لیکن ناکافی روشنی کی وجہ سے اس کے نقوش واضح نہیں تھے۔ وہ عقبی صحن کا لان عبور کر کے سیدھا اس کے بیڈروم کی کھڑکی کی طرف آیا تو میریل کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس نے نیند کے غلبے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ آدمی مکان کی دیوار کے پاس پہنچ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میریل نے کسی دھاتی شے کے گرنے کی آواز سنی اور اسے یاد آ گیا کہ یہ وہی سیڑھی ہے جو اس کے کمرے کی کھڑکی کے باہر رکھی ہوئی تھی۔ میریل اس سیڑھی کو اس وقت استعمال کیا کرتی جب ماں باہر جاتے وقت اس کے کمرے کا دروازہ بند کر جاتی لیکن کافی عرصے سے ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میریل کو بھی وہ سیڑھی یاد نہیں تھی لیکن اس وقت اس کی آواز سن کر وہ حرکت میں آ گئی۔

اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر بستر سے اتری اور اس نے کمبل کے نیچے تکیے رکھ دیے۔ اس کے بعد وہ گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی کمرے کے بند دروازے تک گئی۔ اسے امید تھی کہ ماں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند نہیں کیا ہوگا۔ یکایک اس کے عقب میں کھڑکی سے ایک سر نمودار ہوا۔ میریل نے سامنے والی دیوار پر اس کا سایہ دیکھا تو خوف سے منجمد ہو گئی پھر وہ نیچے کی طرف جھکی اور اس نے میلے کپڑوں کے ڈھیر میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔

وہ چند لمحوں تک یونہی بے سدھ بیٹھی رہی۔ اس نے ایک پرانا تولیا اپنے سر پر لے لیا تھا اور وہ اس میں سے جھانک رہی تھی۔ اس کی نظریں اپنے بستر پر جمی ہوئی تھیں جو کھڑکی سے آنے والی چاند کی روشنی میں واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ کئی لمحوں تک یہ منظر یونہی ساکت رہا پھر کھڑکی میں ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی تو میریل چوکنا ہو گئی۔ وہ چاہتی تو ماں کو آواز دے سکتی تھی لیکن یہ اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھا جو فوری طور پر اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اس

کے بجائے اس نے اپنا ایک بازو باہر نکالا تاکہ دروازے کی ناب تک اس کی رسائی ہوسکے۔ جیسے ہی وہ شخص اندر کمرے میں داخل ہوتا، وہ باہر نکل جاتی اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دیتی پھر وہ گھوم کر کھڑکی تک جاتی اور وہاں سے سیڑھی ہٹا دیتی۔ اس طرح اندر آنے والا کسی چوہے کی طرح پھنس جاتا اور اس طرح اسے قاتل کا سراغ مل جاتا۔

بالآخر اس کا ہاتھ دروازے کی ناب تک پہنچ گیا اور اس نے اسے گھمانا شروع کردیا۔ اسے عقب میں کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ان کے منصوبے کے حساب سے واقعات بہت تیزی سے ظہور پذیر ہورہے تھے۔ لہٰذا اسے بھی جلدی کرنا پڑی۔ عین اسی وقت سیلر نے غرانا شروع کردیا۔ غالباً اسے اس کمرے میں اجنبی کی آمد پسند نہیں آئی تھی۔ میریل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ سیلر کو بالکل بھول چکی تھی۔ وہ اس کی بلی کا نام تھا جو اس کی ماں کو سابق دوست نے تحفے میں دی تھی۔ وہ خود پانی کے جہاز پر کام کرتا تھا اور اسی مناسبت سے اس بلی کا نام بھی سیلر پڑ گیا۔ وہ بلی غراتی ہوئی اجنبی پر جھپٹی۔ اس کی نیلی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور وہ غضب ناک انداز میں اپنے پنجے زمین پر مار رہی تھی۔ جونہی اجنبی نے اسے دیکھا، اس نے حلق سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی جسے سن کر اس کی ماں بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

میریل نے بلی کو ان کے حال پر چھوڑا اور فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس نے دروازے کی بیرونی کنڈی لگائی اور عقبی دروازے کی طرف بھاگی۔ جب وہ کھڑکی کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی سیڑھی کے ذریعے اتر چکا تھا اور بھاگنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ وہ اس کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہ کرسکی۔ وہ اس کے تعاقب میں جانا چاہ رہی تھی لیکن پیچھے سے اس کی ماں نے پکڑ لیا اور اپنی جانب کھینچ لیا تاہم اس ساری کشمکش کے باوجود وہ یہ دیکھنے میں کامیاب ہوگئی کہ اس کے دشمن کا رخ بند گلی کے سرے پر واقع مکانوں کی طرف تھا۔

شیرف کے آدمیوں اور سراغ رساں کتوں نے نقب زن کا پیچھا کیا اور وہ اس کی بو سونگھتے ہوئے سالٹر کے مکان کے عقبی حصے میں پہنچ گئے جہاں ان کا سامنا سالٹر کے کتے بروزا سے ہوا جو دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد سستانے کی غرض سے لیٹا ہوا تھا۔ اسے یہ مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے حسب عادت غرانا اور بھونکنا شروع کردیا۔ بڑی مشکل سے سالٹر نے اسے قابو کیا۔ اس سے پہلے پولیس والے میریل سے یہ پوچھ چکے تھے کہ کیا اس نے نقب زن کا چہرہ اچھی طرح دیکھا تھا۔ میریل کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ مسٹر سالٹر تھے۔“

پولیس والوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور مسٹر سالٹر کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے تاکہ انہیں مزید پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جاسکیں۔ ان کے جانے کے بعد میریل بستر پر لیٹی کافی دیر تک سونے کی کوشش کرتی رہی لیکن نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہ اس واقعے کے بعد بری طرح خوفزدہ ہوگئی تھی پھر آہستہ آہستہ وہ پرسکون ہوتی گئی اور اس پر یہ احساس غالب آنے لگا کہ اس کی بھاگ دوڑ رائیگاں نہیں گئی اور وہ کم از کم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ وہ بیکس اس کے تینوں پڑوسیوں میں سے کسی کی حرکت نہیں تھا۔

اگلا دن اتوار کا تھا اور اس روز میریل کی صبح دیر سے ہوئی تھی۔ ویسے بھی رات والے واقعے کے بعد اس کی ماں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور وہ دوپہر تک سوتی رہی۔ جب آنکھ کھلی تو اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ تجسس بھی تھا کہ رات پولیس نے جو کارروائی کی، اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور سائیکل اٹھا کر گشت پر نکل گئی۔ وہ ایک روشن اور چمکیلا دن تھا۔ موسم خزاں شروع ہوچکا تھا اور فضا میں ہلکی ہلکی خنکی محسوس ہورہی تھی۔ سالٹر کے مکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہوکر صورت حال کا جائزہ لینے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے کیونکہ پورچ میں کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ میریل نے سوچا کہ شاید سالٹر کی بیوی اور بیٹیاں پولیس اسٹیشن میں رو رو کر اس کی آزادی کے لیے فریاد کررہی ہوں گی۔ اسے یقین تھا کہ پولیس والے ان کی آہ و بکا پر کان نہیں دھریں گے اور ممکن ہے کہ اعانت جرم میں انہیں بھی گرفتار کرلیا جائے۔ یہ اس کی بچکانا سوچ تھی یا اس نفرت کا شاخسانہ جو اسے سالٹر اور اس کے گھر والوں سے تھی۔

میریل نے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنی اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سائیکل پر پیڈل مارنے لگی۔

”میریل!“ کسی نے نرم لہجے میں اسے پکارا۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے گھوم کر دیکھا۔

اسے آواز دینے والا فورسٹر تھا۔

وہ اپنے میل باکس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک کمزور مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”گزشتہ شب کیا ہوا

تھا کہ پولیس بھی آ گئی۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ یہاں کیا ہوتا رہا ہے؟''

میریل نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا جیسے رات کو ٹھیک طرح سو نہ سکا ہو۔ فورسٹر ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم ہی مجھے کچھ بتا سکتی ہو کیونکہ تمہیں اس علاقے کی خبر رہتی ہے۔''

میریل کا سینہ فخر سے پھول گیا اور وہ یکایک اپنے آپ کو بہت اہم محسوس کرنے لگی۔ فورسٹر بولا۔ ''اندر آجاؤ۔ مجھے مرغیوں کو دانہ ڈالنا ہے۔ ساتھ ساتھ ہم باتیں بھی کرتے رہیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اندر جانے کے لیے مڑا۔ میریل بھی اس کے پیچھے چل دی۔ وہ مکان کے عقبی صحن میں گیا اور اس نے ایک تھال اٹھا کر میریل کو پکڑا دیا۔ اس نے مٹھیاں بھر بھر کر مرغیوں کی خوراک زمین پر پھیلانا شروع کر دی اور چند ہی لمحوں میں ساری مرغیاں اس کے گرد جمع ہو کر دانے چگنے لگیں۔

''اب بتاؤ کہ رات کیا ہوا تھا؟'' فورسٹر نے اپنا سوال دہرایا۔

میریل کو اس کی بے تابی پر ہنسی آنے لگی لیکن وہ اسے ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر سالز میرے کمرے میں آئے تھے۔''

''کیا واقعی؟'' فورسٹر چونکتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟''

میریل اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی۔''

''ممکن ہے کہ وہ کچھ چرانے آیا ہو۔'' فورسٹر بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

میریل نے کندھے اچکائے لیکن کچھ بولی نہیں۔ سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا اور اس کی زرد روشنی میں سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

فورسٹر اس کی جانب جھکا اور راز دارانہ انداز میں بولا۔ ''تم نے کسی کو اس نیکلس کے بارے میں تو نہیں بتایا؟''

میریل نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''بہت اچھا کیا۔ شاید ابھی تک تمہاری ماں کو بھی معلوم نہیں!؟''

میریل نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔

''میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں۔ سردی بڑھ رہی ہے اور ویسے بھی مرغیاں کچھ دیر تک کھانے میں مصروف رہیں گی۔'' یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑے بغیر وہاں سے چل دیا۔ سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر وہ رکا اور دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ میریل جب وہاں سے گزری تو اس نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور میریل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی انگلیوں نے پلو اور کے نیچے چھپے ہوئے نیکلس کو چھوا ہو۔

وہ چولہے کے قریب گیا جس پر پہلے سے ہی ایک کیتلی میں پانی گرم ہو رہا تھا اور اس سے نکلنے والی بھاپ کی وجہ سے کمرے میں اچھی خاصی گرمی ہو گئی تھی۔ میریل کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' فورسٹر نے کھڑکی کے قریب رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کھڑکی سے عقبی صحن، مرغیوں کا دڑبا اور اس کے پیچھے تاریک جنگل صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میریل کے ذہن میں اپنے مرے ہوئے کتے کی یاد تازہ ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے فورسٹر کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔

''مجھے ان پرندوں کی وجہ سے اس جگہ کو گرم رکھنا پڑتا ہے۔'' اس نے ایک مگ میں گرم پانی لے کر اس میں کافی ملاتے ہوئے کہا۔ ''یہ پرندے ٹھنڈ برداشت نہیں کر سکتے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق جنوبی امریکا سے ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ میریل نے دیکھا کہ وہاں درجنوں پنجرے لٹکے ہوئے تھے۔

''انہیں کوئی بھی کر یہ خاموش ہو جاتے ہیں لیکن جب ان سے مانوس ہو جائیں تو چہچہانے لگتے ہیں۔''

اچانک ہی ان میں سے ایک پرندے نے آواز نکالی پھر سب اپنی اپنی آواز میں گانے لگے اور کمرے کی فضا ان کی آواز سے گونج اٹھی۔ میریل نے ساری زندگی اتنی خوب صورت آواز نہیں سنی تھی۔ وہ بے اختیار ہو کر اٹھی اور ایک قریبی پنجرے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی جس میں ایک چھوٹا سا پرندہ اپنی مخصوص آواز میں چوں چوں کر رہا تھا۔ اس کے پر نیلے اور سرخ دھاریں نظر آ رہی تھیں۔ فورسٹر ابھی تک کافی بنانے میں مصروف تھا۔ میریل نے ہاتھ بڑھا کر پنجرے کی چٹخنی گرا دی اور اس سے پہلے کہ وہ پرندے کو پکڑتی، فورسٹر چلایا۔

''نہیں، اسے ہاتھ مت لگانا۔'' اس کے ساتھ ہی سارے پرندے خاموش ہو گئے۔

میریل نے چونک کر اسے دیکھا اور اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا لیکن پنجرے سے باہر نہیں نکالا۔ یہ اس کی فطرت

میں شامل نہیں تھا کہ وہ کسی وجہ کے بغیر اپنے مقصد سے پیچھے ہٹ جاتی۔

"یہ بہت نازک اور حساس ہوتے ہیں۔" فورسٹر نے کافی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔"

واقعی میریل اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی لیکن اسے اس کے بازو پر پڑی خراشوں کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ گزشتہ شب اس کی بلی نے جو کارروائی کی تھی، اس کا نتیجہ سامنے تھا۔

فورسٹر نے اس کی نظروں کا مفہوم بھانپ لیا اور اپنے بازو پر پڑی خراشوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں بلیوں کو ناپسند کرتا ہوں۔" اس کی آواز میں ہلکی سی سرسراہٹ تھی۔ "مجھے صرف وہ نیکلس چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں اور اس کی بھی کوئی وجہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئی ہوگی۔"

میریل نے کچھ نہیں کہا اور کمرے میں ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی۔

فورسٹر نے سر ہلایا اور بولا۔ "اگر تم یہ نیکلس مجھے دے دو تو ہم اب بھی دوست بن سکتے ہیں۔ تمہارے لیے یہ نیکلس بے کار ہے کیونکہ تم اسے پہن کر باہر نہیں جاسکتیں۔ تم لوگوں کو کیا جواب دوگی کہ یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا۔ ویسے یہ بھی کوئی اتنا قیمتی نہیں ہے۔ اس میں نقلی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے زیورات بازاری عورتیں پہنتی ہیں۔"

اس نے احتیاط سے اپنا مگ میز پر رکھا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔

"تم نے میرے کتے کو مارا ہے؟" میریل نے پرندے کو اپنی مٹھی میں لیتے ہوئے کہا۔

فورسٹر اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "ایسا مت کرو۔ پلیز اسے چھوڑ دو۔"

میریل نے اپنی مٹھی ڈھیلی کردی اور دروازے کی طرف کھسکنے لگی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی اور وہ ایک ہاتھ پیچھے کر کے اس کا ہینڈل ٹٹول رہی تھی۔ فورسٹر کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اس کی نقل و حرکت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ میریل کو دروازہ کھولنے میں کامیابی نہیں ہوئی تو وہ ذرا سا اس جانب مڑی تاکہ مزید قوت لگا کر دروازہ کھول سکے۔ فورسٹر اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھا اور اس نے اپنی انگلی میریل کی گردن میں ڈال دی۔ میریل نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ ردعمل کے طور پر اس نے اپنی مٹھی بھینچ لی اور اس کی قید میں گرفتار پرندہ بے بسی کے عالم میں تڑپنے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھوں میں خوف کے سائے لرز رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔" فورسٹر نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے اپنی ہتھیلی فضا میں بلند کی۔ "میریل پلیز! تم اسے تکلیف مت دو۔"

بالآخر میریل دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگئی اور ہوا کا تازہ جھونکا اندر داخل ہوگیا۔ میریل دروازے کی طرف بڑھنے لگی لیکن اس نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی نظریں فورسٹر پر سے نہیں ہٹائیں۔ اس نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا اور باہر نکل گئی۔ فورسٹر لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط تک آیا پھر اس نے اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر میز کا کنارہ پکڑ لیا تاکہ اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکے۔ اسے یوں لگا جیسے ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ وہ نزدیکی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ چند لمحوں بعد اس کے کانوں میں سائیکل کی گھنٹی کی آواز آئی تو وہ افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "اوہ میرے خدا! یہ میں کیا کرنے جارہا تھا۔"

خدا خدا کر کے اس کی طبیعت بحال ہوئی تو اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر یوں دیکھا جیسے ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا ہو۔ اس نے وہ مگ اٹھایا جو میریل کے لیے بنایا تھا اور ایک ہی گھونٹ میں باقی بچی ہوئی کافی پی گیا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تمام کمروں کی لائٹیں جلادیں۔ اسے یوں لگا جیسے چاروں طرف نغمے بکھر گئے ہوں اور ایک نیا دن طلوع ہو رہا ہو۔ کچن میں واپس آنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آگے کی جانب جھکا اور اپنا سر میز پر رکھ دیا۔ وہ بار بار پلکیں جھپک رہا تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں بتدریج تیز ہوتی جارہی تھیں۔ پھر اس نے ایک کتے کے مانند ہانپنا شروع کردیا پھر آہستہ آہستہ اس میں کمی آنے لگی۔ اس نے پرندے کے خالی پنجرے کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"تم سے رہائی مبارک ہو۔"

گو کہ میریل ابھی تک نیکلس والی بات ماں سے چھپانے میں کامیاب رہی تھی لیکن پرندے کو گھر میں چھپانا ممکن نہیں تھا۔ رات بھر وہ پرندہ اپنی آزادی کی خوشی میں چہچہاتا رہا اور میریل کی بلی دروازے پر پنجے مار مار کر اپنی ناراضی کا اظہار کرتی رہی۔ دوسری صبح میریل کی ماں نے

اس خوب صورت رنگین پرندے کو میریل کے کمرے میں اِدھر سے اُدھر پھدکتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ میریل سے اس بارے میں پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ اس پوچھ گچھ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس نے دوسری عورتوں سے سن رکھا تھا کہ فورسٹر کو رنگ برنگے پرندے پالنے کا شوق ہے لہٰذا اسے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ میریل کے پاس وہ پرندہ کہاں سے آیا ہوگا۔

وہ خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر نکلی تو میریل نے بھی کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ تھوڑی سی ناراض اور خوفزدہ تھی لیکن ساتھ ہی اسے یہ تجسس بھی تھا کہ ماں کس سلسلے میں باہر گئی ہے۔ جب کئی بار دستک دینے کے باوجود فورسٹر نے دروازہ نہیں کھولا تو میریل کی ماں اپنے بھاری بھر کم وجود کو گھسیٹتی ہوئی مکان کے پچھواڑے گئی جہاں اس نے فورسٹر کی مرغیوں کو صحن سے باہر پھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں لیکن وہ انہیں نظر انداز کرتی ہوئی عقبی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ اس نے دروازے کے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ فورسٹر کا سر میز پر ڈھلکا ہوا تھا۔ وہ مسلسل دروازہ پیٹتی رہی لیکن اس کے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ میز پر ایک خالی مگ رکھا ہوا تھا۔ میریل کی طرح اس کی نظر بھی فورسٹر کے پھیلے ہوئے بازو پر گئی جن پر خراشوں کے نشان نظر آرہے تھے۔ وہ تیزی سے پلٹی اور سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے سڑک پر آگئی جہاں میریل سائیکل کا ہینڈل تھامے کچھ سن گن لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے میریل کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی گھر واپس لے کر آگئی۔ پولیس نے اس کا فون سننے کے بعد جائے وقوعہ پر پہنچنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی۔

مسز فورسٹر کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی اور پولیس نے میریل کا بیان سننے کے بعد سائلر کو رہا کر دیا۔ پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ میریل سے اندھیرے کی وجہ سے حملہ آور کو شناخت کرنے میں غلطی ہوئی۔ وہ چونکہ پہلے سے سائلر کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی تھی، اس لیے وہ یہی سمجھی کہ سائلر اس کا نیکلس چرانے کے لیے آیا ہے۔ یہ ایسی غلطی تھی جو کوئی بڑا شخص بھی کر سکتا تھا۔ تاہم سائلر نے اسے اپنی بے عزتی جانا۔ وہ بار بار میریل کے خلاف مقدمہ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میریل کی ماں اسے منانے میں کامیاب ہو گئی۔ ویسے بھی وہ اس کی بات نہیں ٹال سکتا تھا کیونکہ وہ اسے پسند کرتا تھا اور موقع ملنے پر اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے جواب میں ہمیشہ کھری کھری سننے کو ملی تھیں بلکہ ایک دو مرتبہ میریل کی ماں نے اس کا مزاج درست کرنے کے لیے اپنا سینڈل بھی اتار لیا تھا لیکن اس بار معاملہ مختلف تھا۔ جس لگاوٹ اور محبت سے وہ اپنی بیٹی کی غلطی معاف کرنے کی درخواست کر رہی تھی، وہ سائلر کو موم کر دینے کے لیے کافی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس عورت کا اپنا ممنون و احسان مند رکھنے کا اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا چنانچہ اس نے میریل کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی عقل میں یہ بات آگئی تھی کہ میریل ابھی نابالغ ہے اور اس سے کوئی جرم بھی سرزد نہیں ہوا لہٰذا ایک چھوٹی سی غلطی کی بنیاد پر اس کے خلاف کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ اس رات میریل کے کمرے میں کھڑکی کے راستے داخل ہونے والا فورسٹر ہی تھا۔ میریل اپنے بیان میں بتا چکی تھی کہ فورسٹر نے پہلے اس سے وہ نیکلس مانگا اور بعد میں چھیننے کی کوشش کی۔ اگر وہ اس معصوم پرندے کو اپنے دفاع میں استعمال نہ کرتی تو فورسٹر اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکتا تھا پھر اس کے بازوؤں پر نظر آنے والی خراشوں نے سارا معاملہ ہی صاف کر دیا جس کا سہرا میریل کی بلی بیلر کے سر تھا لیکن اب فورسٹر اس دنیا میں نہیں تھا لہٰذا اس کے خلاف مداخلت بے جا اور نقب زنی کا مقدمہ خارج کر دیا گیا۔

میریل نے جس بہادری سے اپنا دفاع کیا، اس کو سراہتے ہوئے اسے وہ پرندہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی گئی گو کہ وہ کتے کی جگہ نہیں لے سکتا تھا لیکن میریل اس فیصلے پر بہت مطمئن تھی۔ اس سارے ہنگامے کے باوجود اس نے نیکلس والی بات اپنی ماں سے چھپانے کی کوشش کی لیکن پولیس کارروائی کے دوران اس کی ماں نیکلس کے بارے میں جان گئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے میریل پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ اس نیکلس کا کوئی دعوے دار نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی لہٰذا پولیس نے بھی اسے زیادہ اہمیت نہیں دی اور معصوم میریل یہی سمجھتی رہی کہ کسی کو اس نیکلس کے بارے میں علم نہیں ہے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نیکلس کا مالک یعنی اس کا پڑوسی مصلحتاً اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور ہے ورنہ اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا اور پولیس اسے میریل کے کتے کے قتل کے الزام میں گرفتار کر سکتی تھی۔

محفلِ شعر و سخن

❋ رضوان تنولی کریڑوی ۔۔۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی
بات چلی تو نیل گگن سے تارے توڑے لوگوں نے
وقت پڑا تو جان چھڑالی جان سے پیارے لوگوں نے

❋ محمد حنیف گبول ۔۔۔ نیو سینٹرل جیل، ملتان
شرابِ عشق کہیں بھی ہو، پر جام بدلتے رہتے ہیں
حق کا علم لہراتا ہے، پر ہاتھ بدلتے رہتے ہیں
حالات سے ٹکرا کر جینا یہ حق والوں کی عادت ہے
حالات کی تو تقلید نہ کر حالات بدلتے رہتے ہیں

❋ شمائلہ زبیر ریحان ۔۔۔ کورنگی، کراچی
اس رنگ برنگی دنیا میں کچھ رنگ مجھے بھی لینے دو
میرے ارمانوں کے خوں سے تم خود ہی گلنار ہے جاتے ہو
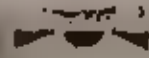
❋ رضیہ عمیر ۔۔۔ کراچی
وقت کے دھارے سے ٹکرانا مشکل لگتا ہے
ریگِ رواں پر پاؤں جمانا مشکل لگتا ہے
اپنی کہانی اپنی زبانی خود سے کہتے رہتے ہیں
دکھ اپنے غیروں کو سنانا مشکل لگتا ہے

❋ ایم عمران قاسم ۔۔۔ سمبل تحصیل کلر سیداں
اک ذرا گردشِ حالات نے آگھیرا ہے
ہم بہرحال تمہارے ہیں، تمہیں یاد رہے

❋ مشال ۔۔۔ جہلم
وجہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں رہی
وہ لہجے بدلتے گئے اور ہم اجنبی ہو گئے

❋ نوال ۔۔۔ جہلم
مسلسل ہوں ملاقاتیں تو دلچسپی نہیں رہتی
یہ بے ترتیب یارانے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں

❋ رانا سجاد اختر ۔۔۔ نیو سینٹرل جیل، ملتان
ہری ہے شاخِ تمنا ابھی جلی تو نہیں
دبی ہے آگ جگر کی مگر بجھی تو نہیں
جفا کی تیغ سے گردن وفا شعاروں کی
کٹی ہے برسرِ میدان مگر جھکی تو نہیں

❋ خلیق الرحمٰن، سید ضیب بخاری ۔۔۔ فیصل آباد
موسم کو موسم کی بہاروں نے لوٹا
ساحل کو سمندر کے کناروں نے لوٹا
ارے تم تو ایک ہی غم سے ڈر گئے
ہم کو تو تیری قسم دے کر ہزاروں نے لوٹا

❋ ایم یوسف ۔۔۔ سانول
جڑ گئے تا سر سے پاؤں تک
او گمرہ سب پروا لوگوں سے بے پناہ محبت

❋ ڈاکٹر ساجد محبوب شیخ ۔۔۔ سینٹرل جیل سیالکوٹ لکھپت
ہزاروں اسبابِ راحت ہوں اسیری پھر بھی اسیری ہے
قفس میں آہی جاتا ہے خیالِ آشیاں اکثر

❋ رمضان پاشا ۔۔۔ گلشنِ اقبال، کراچی
جلتے ہوئے سورج کو سمندر سے نکالو
ساحل کو جلانے سے اجالا نہیں ہوتا

❁ محمد رشید سیال......مدوہڑی

خیر ہو دلِ نادان، اب یہ غم بھی سہنا ہے
ان سے ملنا بھی نہیں اور شہر میں بھی رہنا ہے

❁ توصیف احمد......پٹھان کالونی، کراچی

عشق قاتل سے بھی، مقتول سے ہمدردی بھی
یہ بتا کس سے محبت کی جزا مانگے گا؟
سجدہ خالق کو بھی، ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کس سے عقیدت کا صلہ مانگے گا؟

❁ اعجاز احمد راحیل، ماہی......ساہیوال

ملا جو بھی مجھے اس نے محبت میں دیے دھوکے
مگر اچھا نہیں لگتا ہے یاروں سے گلہ کرنا
فقط چہرے سے دکھوں کی تپش محسوس کی جائے
بھلا موزوں کہاں ہے سوگواروں سے گلہ کرنا

❁ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال

ہم نہ ہوں گے تو کون منائے گا تمہیں
بری بات ہے یہ ہر بات پہ روٹھا نہ کرو

❁ زاہد چودھری......چھور کینٹ

میری آنکھوں میں تیرا سپنا سجا رہتا ہے
ہاں میرے دل میں تیرا عکس بسا رہتا ہے
اس طرح میرے دل کے بہت پاس ہو تم
جس طرح پاس ہی شہ رگ کے خدا رہتا ہے

❁ وزیر محمد خان......بٹل، ہزارہ

کچھ تجھ کو محبت پہ یقین تھا نہ وفا پہ
کچھ دکھ میری تقدیر میں لکھا بھی بہت تھا
دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت تھا

❁ مہرین ناز......حیدرآباد

اسے کہنا نہ رفاقتیں بدلیں، نہ تجھ سے انداز الفت
تجھے آج بھی ہم یاد کرتے ہیں دن چڑھے، شام ڈھلے

❁ حاجراں ہاشمی......لاہور

میں اپنی روح کی پوشاک بھی اسے پہنا دوں
وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

❁ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی

نہ ابن آدم غیور ٹھہرے نہ بنت حوا میں اب حیا ہے
جو میرے اندر کا اک شاعر تھا مجھ میں گھٹ گھٹ کے مر گیا ہے

❁ محمد حنیف آصف......ضلع بھکر

نیند ہے بھی سکوں نہیں ہوتا
آنکھ سوتی ہے دل نہیں سوتا
عمر گزری اسی کشمکش میں
یوں نہ ہوتا تو عدم یوں ہوتا

❁ جاوید اختر رانا......حیدرآباد

غم کے غبار میں ہیں ستارے اٹے ہوئے
خواہش کی کرچیوں میں ہیں چہرے سجے ہوئے
اب کیا تلاشِ امن میں نکلیں کہ ہر طرف
مدت سے فاختاؤں کے ہیں پر کٹے ہوئے

❁ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص

سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

❁ اسد عباس......سرگودھا

غیر کے دل میں گر اترنا تھا
میرے دل سے اتر گئے ہوتے

❁ شازیہ کمال......کراچی

سانجھ ڈھلی تو اڑتے پنچھی لائے یہ پیغام
تو بھی گھر جا پاگل لڑکی ہو گئی اب تو شام

❁ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی

ڈھانپے جو نفرتوں کے برہنہ وجود کو
ایسی کبھی کوئی پیار کی چادر تلاش کر

❁ مونا رضوان......کورنگی، کراچی

عنوان میری زیست کا مبہم ہے یہ کیسا
احوال شب و روز کا برہم ہے یہ کیسا
کیا پھر کوئی مظلوم یہاں مارا گیا ہے
زندان میں ہنگامۂ ماتم ہے یہ کیسا

❁ راجکماری سارہ احسان......نامعلوم مقام

آؤ سو جائیں خزاں آنے سے پہلے ایک رات
کون دیکھے گا بہاروں کا پریشاں ہونا

❁ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی

ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے

٭ محمد قدرت اللہ نیازی...... حکیم ٹاؤن، خانیوال
اب تک وہی بچپن، وہی تخریب کاری ہے
قفس توڑ دیتا ہوں، پرندے چھوڑ دیتا ہوں

٭ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
رابطوں سے گریز، تکلم میں تکلف
پھر سے اجنبی ہوئے جاتے ہیں وہ

٭ این اے یمن......چوہڑ جمالی
اک دکھ بیچ ہزار آنسو!
اف آنکھوں کی شاہ خرچیاں

٭ جبیں ستر......بہاولنگر
تو بھول گیا مجھے تو گلہ کیا؟
میں بھی تو دنیا کو بھولا ہوں تیرے واسطے

٭ محمد اطہر......اسلام آباد
وہ مجھے دیکھ کر رکے، رک کے چلے
تسلی ہوئی میں یاد ہوں ان کو ذرا ذرا

٭ فہد بخاری، سعد بخاری...... ضلع اٹک
میں استعاروں کی سرزمین پر اتر کر دیکھوں تو بھید پاؤں
بشر مسافر، حیات صحرا، یقین ساحل، گمان سمندر

٭ اظہر حسین بچار......ہزاری، جتوئی
کچھ لوگ سفر کے لیے موزوں نہیں ہوتے
کچھ راستے کٹتے نہیں تنہا سے کہنا

٭ عبدالغفور خان، ساغری خٹک......ضلع اٹک
وفات عشق کا اعلان ہے کچھ مشورہ ہی دو
یہ ہندو تھا نہ مسلم تھا جلا دیں یا دفنا دیں

٭ محمد نعمان......صدر، کراچی
مجھ کو ڈھونڈ لیتا ہے نت نئے بہانے سے
درد ہوگیا ہے واقف میرے ہر ٹھکانے سے

٭ احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف بائی پاس
ہر ایک پاؤں مجھے روند کے گزرا دوست
جانے کون سی منزل کا مسافر ہوں میں

٭ رعنا رضوی......یو کے
کہتے ہیں لوگ تجھ کو مسیحا مگر یہاں
اک شخص مرگیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

٭ محسن علی طالب، ارم طالب......ساہیوال
اس کے رخسار پہ ٹھہرے ہوئے آنسو توبہ
ہم نے شعلوں پہ مچلتی شبنم دیکھی

٭ محمد زریان سلطان......اردو بازار، کراچی
آنا پڑا ہے اس کو ہمارے حضور میں
ہم سے الجھ رہے تھے مقابل کے فیصلے

٭ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
اشکوں سے کیا آگ بجھے گی، عشق تو نام ہے جلنے کا
ہم تو چلتے ہیں انگاروں پہ آبلے تو پڑ جانے تھے

٭ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
ابھی ہجر کا موسم جاری ہے اور پل پل مجھ پہ بھاری ہے
کچھ دل بھی اپنا نازک ہے کچھ وار ترا بھی کاری ہے

٭ ریاض بٹ......حسن ابدال
بچے کی طرح چیختا رہتا ہے مسلسل
کیا خوف میرے شہر کو سونے نہیں دیتا

٭ عبدالرحمٰن......میرب
رندان بے ریا کی محبت کے نصیب
زاہد بھی ہم میں بیٹھ کر انسان ہوگئے

٭ حنا عروج......جیکب لائن، کراچی
رنگ اتر جاتا ہے تحریر تو رہ جاتی ہے
خواب کے بعد کی تعبیر تو رہ جاتی ہے

٭ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
یادِ ماضی، عہدِ حاضر اور مستقبل کا خوف
تین ساتھی جن لیے ہیں زندگی نے کس لیے

٭ مدحت......کراچی
دل کی وادی میں ابھی جشنِ چراغاں نہ کرو
موم کا شہر ہے گرمی سے پگھل جائے گا

کوپن
برائے ماہ
جولائی 2015

مَحفلِ شِعر و سُخن

نام: --

پتا: --

شارٹ کٹ

ایم اے افضل انجم

زندگی طویل ہو یا مختصر... اپنے حصے کی کہانی مکمل ضرور کرتی ہے... اس کے پاس بھی وقت کم تھا لہٰذا طویل سفر طے کرنے کے لیے اسے کسی شارٹ کٹ کی تلاش تھی... انسان پوری لگن سے کچھ تلاش کرے اور نہ ملے یہ تو... قدرت کا قانون نہیں ہے۔ اسے بھی مطلوبہ ہدف حاصل کرنے کے لیے مطلوبہ سمت کا اشارہ مل گیا تھا۔

ذہانت کی جنگ میں جیتنے والے ایک کم فہم کی مقدر یاوری

طارق کا شمار بھی ملک کے ان لاکھوں جوانوں میں ہوتا تھا جو واجبی سی تعلیم، محدود آمدنی اور مستقبل کے بھیانک اندیشوں میں گھرے اور آنکھوں میں آنے والے کل کے لیے سہانے سپنے سجائے مختلف قسم کے ''شارٹ کٹ'' کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ اس قسم کے لاتعداد نوجوان بلکہ ادھیڑ عمر بھی کبھی پرچی جوا کبھی ''ڑی نمبر'' کبھی پرائز بانڈ نمبر یا کسی نہ کسی اشیائے صرف بنانے والی کمپنی کی انعامی اسکیموں میں حصہ لینے میں پیش پیش تھے۔ جائز اور

ناجائز طریقے سے عاری یہ لوگ کسی نہ کسی صورت ایک ہی جست میں بلندیوں کے آسمان کو چھو لینے کے خواہش مند تھے۔ بے جا حرص اور خواہشات کے بے پناہ ہجوم میں یہ لوگ اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے تھے۔

یہ بھول کر کہ سب کچھ انسانوں کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتا۔ فطرت کے اپنے اٹل اصول اور ضابطے ہوتے ہیں اور فطرت کے ساتھ ٹکرانے کا نتیجہ مختلف... نقصانات کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ خوشیوں اور آسودگیوں کا منبع صرف اور صرف دولت اور مالی وسائل ہی نہیں ہوتے بلکہ حقیقی آسودگی اور خوشی زندگیوں کے ہر دریچے میں موجود ہوتی ہیں۔ مسئلہ صرف انہیں تلاش کرنے کا ہے۔ کبھی کبھی زندگی اچانک کوئی چانس بھی دیتی ہے اور انسان کو فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیتی ہے لیکن ایسا کیا سب کے ساتھ ہوتا ہے؟

طارق زاہد متوسط درجے سے بھی کم درجے کی زندگی گزارنے والا واجبی سی قابلیت کا حامل ایک موبائل سیلزمین تھا اور کسی مقامی کمپنی کی اشیا معمولی کمیشن پر مختلف دکانوں پر سپلائی کرتا تھا۔ محدود آمدنی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ خرچہ آمدنی سے کم ہی رکھنا پڑتا ہے بلکہ آمدنی خرچ سے کم ہوتی ہے لیکن طارق زاہد اس قدر محدود وسائل میں سے اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ رقم اپنی بدبختی کو خوش بختی میں تبدیل کرنے کے لیے لگا ہی دیتا تھا۔ ابھی تک قسمت نے یاوری نہیں کی تھی۔

تبھی کبھی اس کا خریدا ہوا انعامی ٹکٹ یا پرچی نمبر "انعام یافتہ" نمبر کو چھو جاتا تھا مگر مکمل طور پر نہیں اور اس قسم کی صورت حال اس کے جذبے کو مہمیز کر دیا کرتی تھی اور وہ مایوس ہونے کے بجائے نئے عزم کے ساتھ میدان میں کود پڑتا تھا۔ کنوارہ ہونے کے سبب شادی کی خواہش بھی رکھتا تھا لیکن شادی کے معاملے میں بھی کسی قسم کے شارٹ کٹ کا امیدوار تھا۔ جیسے کوئی مالدار بیوہ، کوئی دولت مند طلاق یافتہ یا کسی یورپی ملک کی نیشنلٹی ہولڈر اور اس قسم کا خناس تو ہمارے یہاں اکثر شادی شدہ افراد کے سر میں بھی سمایا ہوا تھا۔ وہ تو خیر تھا ہی کنوارہ۔ معمول کے مطابق صبح نو بجے کے بعد ہی وہ اپنی ڈین میں کمپنی کا سامان لے کر بازاروں میں نکلتا تھا اور دوپہر دو بجے تک مختلف تجارتی مرکزوں میں اپنی چرب زبانی اور چاپلوسی کے سہارے کمپنی کا مال فروخت کرتا تھا پھر وین کا ڈرائیور اور وہ نسبتاً سستا سا کھانا کھاتے اور کسی گھٹیا سے چائے خانے میں چائے پیتے اور کچھ دیر سستانے کے بعد کمپنی کے ڈپو پر واپس آ جاتے۔

تقریباً ساڑھے تین بجے بقیہ مال، وین اور رقم کا حساب کتاب کمپنی کے حوالے کرنے کے بعد چھٹی کر لیتے۔ ڈیوٹی کے دورانیے میں طارق زاہد کو نسبتاً کم محنت کرنی پڑتی۔ وہ آرام سے وین کی پسنجر سیٹ پر براجمان رہتا اور ڈرائیور بے چارہ اکیلا بے ہنگم قسم کے ٹریفک سے نبرد آزما ہوتا۔

مطلوبہ دکانوں پر مال اتارنا اور لین دین کی ذمے داری طارق کی تھی۔ کبھی کبھی کسی دکاندار کی بے پروائی کے سبب نو کے تیرہ وصول کر لیتا تھا اور اس قسم کے موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ گفتگو کے ہنر سے خوب آگاہ تھا بلکہ چرب زبانی میں ملکہ حاصل تھا۔ ایسے افراد اکثر کام چور اور نکمے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایک دوپہر کھانے کے بعد وہ چائے پینے کے لیے ایک چائے خانے میں بیٹھے تھے۔ طارق نے وقت گزارنے کے لیے اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا تھا۔ وہ اخبار میں خبریں وغیرہ کم ہی دیکھتا تھا۔ اس کا اصل ہدف "ضرورت رشتہ" کے وہ اشتہار ہوا کرتے تھے جن میں کسی کم عمر بیوہ کا ذاتی کاروبار بلا امتیاز ہر قسم کے اور ہر عمر کے مردوں کے لیے شادی کی آفر موجود ہوتی تھی یا اسی قسم کی دعوت کسی امریکن نیشنلٹی یا انگلینڈ نیشنلٹی ہولڈر کی طرف سے دی جاتی تھی۔

اس وقت بھی اس کی نظر ضرورت رشتہ کے کالم پر دوڑ رہی تھی۔ کالم میں اکثریت ایسے اشتہارات کی تھی جنہیں پڑھ کر کوئی ذی عقل شادی کرنا تو دور کی بات، حامل اشتہار سے رابطے کی کوشش بھی شاید ہی کرتا اور اس سے زیادہ عقل مندی کا تقاضا یہ ہوتا کہ اس قسم کے اشتہار نظرانداز ہی کر دیے جاتے۔

دفعتاً اس کی نظر ایک اشتہار پر مرکوز ہو گئی۔ امریکن نیشنلٹی ہولڈر جوان اور خوب صورت دوشیزہ کے لیے رشتہ درکار ہے۔ ایسے نوجوان رابطہ کریں جو امریکا میں لڑکی کے چلتے ہوئے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں۔ رہائش و قیام کے اخراجات لڑکی خود برداشت کرے گی۔ لڑکے کے لواحقین کو مالی مدد بھی دی جائے گی۔ خواہش مند حضرات مندرجہ ذیل پتے پر فوراً رابطہ کریں۔ اس کے بعد پتا درج کیا گیا تھا۔

طارق نے بہ غور اشتہار کو پڑھا اور پھر مذکورہ پتا اپنی نوٹ بک پر نوٹ کر لیا۔

☆☆☆

بنگلا شہر کے پوش علاقے میں واقع تھا۔ جدید طرز پر بنا ہوا تھا۔۔۔ نہ ۔۔۔ شان دکھائی دیتا تھا۔

طارق نے اپنے پاس موجود پتے کا بنگلے کے پھاٹک پر درج پتے سے موازنہ کیا اور چند لمحوں کے تامل کے بعد ایک طویل سانس لیتے ہوئے پھاٹک پر موجود ڈور بیل کا بٹن دبا دیا۔ یقیناً وہ صحیح پتے پر پہنچ گیا تھا۔ دور کہیں گھنٹی بجنے کی مدھم سی آواز اس نے بھی سنی۔ چند منٹ کے بعد پھاٹک میں موجود چھوٹی سی کھڑکی وا ہوئی۔ اس کی آمد کے متعلق استفسار کیا گیا۔ اس نے آمد کا سبب بتایا اور اسے ایک آراستہ اور خوب صورت نشست گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ نشست گاہ میں اسے اسی ملازم نے پہنچایا تھا جس نے پھاٹک پر اس سے اس کی آمد کی بابت دریافت کیا تھا۔

اسے چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران اس نے نشست گاہ کا جائزہ لیا۔ قیمتی فرنیچر، ریشمی پردے اور خوب صورت قالین اور دیگر دلکش اسباب سے آراستہ نشست گاہ میں اس نے خود کو کچھ اجنبی سا محسوس کیا۔ اس کے وجود پر موجود وہ لباس جسے وہ قیمتی اور بارعب سمجھتا تھا، کچھ بے وقعت سا محسوس ہوا۔ دفعتاً پردوں کے عقب سے ایک ادھیڑ عمر اور صحت مند بیگم صاحبہ نما عورت نشست گاہ میں داخل ہوئی۔ طارق نے بے ساختہ نشست چھوڑ دی تھی۔ وہ بہ غور اس کی طرف دیکھتی ہوئی ایک صوفے پر براجمان ہوگئی۔

''اچھا تو آپ تشریف لائے ہیں اشتہار کے نتیجے میں۔'' عورت نے طارق کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی..... جی ہاں میں نے گزشتہ دنوں ہی وہ اشتہار دیکھا تھا۔'' طارق نے واپس نشست سنبھالتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اعتماد سے زیادہ عاجزی تھی۔ عورت چبھتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''تو پھر تم ہماری بھتیجی سے شادی کے خواہش مند ہو؟''

''جی ہاں، میں اسی ارادے سے حاضر ہوا تھا۔''

''ایک بات کا خیال رکھنا جو کچھ پوچھا جائے اس کا جواب بالکل صداقت پر مبنی ہو۔'' عورت کے لہجے میں رعونت کے ساتھ تحکم بھی شامل تھا۔

''آپ میرے بیان کی تصدیق کر سکتی ہیں۔''

''ضرورت محسوس ہوئی تو تصدیق بھی کی جائے گی۔''

''تمہاری تعلیم کتنی ہے؟''

طارق نے اپنی تعلیم کے متعلق بتایا۔

''گھر کے حالات مختصر بتاؤ۔ کتنے بہن بھائی ہو؟ ماں باپ کون ہیں؟ تم خود کیا کرتے ہو؟ آمدنی کتنی ہے؟''

طارق نے اختصار کے ساتھ تمام سوالوں کے جوابات دیے۔ کچھ بات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس دوران عورت خاموشی سے سنتی رہی۔

طارق کے خاموش ہونے کے بعد چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔ پھر عورت یوں گویا ہوئی۔ ''تم اپنا پتا اور رابطہ نمبر نوٹ کرا دو، میں تم سے خود رابطہ کرلوں گی۔ اگر تم اس رشتے کے لیے موزوں ہوئے۔'' اسی دوران ملازم چائے اور لوازمات کی ٹرالی نشست گاہ میں پہنچ گیا تھا۔

''ہاں ایک بات اور جو بڑی خاص ہے غور سے سنو۔''

عورت نے ملازم کے جانے کے بعد کہا۔

طارق زاہد نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''اگر یہ شادی تم سے طے پا جاتی ہے تو تمہیں ہماری شرطوں پر شادی کرنا ہوگی۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟'' عورت نے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جی ... یہ تو بالکل ظاہر ہے، میری کیا شرط ہو سکتی ہے؟'' طارق نے ایسے انداز میں کہا جیسے کہہ رہا ہو کہ ''میری کیا اوقات ہو سکتی ہے۔''

☆☆☆

ایاز قریشی اس کمپنی کے سیلز منیجر تھے جس میں طارق سیلز مین کا کام کرتا تھا۔ خاصے معقول اور مہربان طبیعت کے شخص تھے۔ طارق کے ساتھ ان کی اکثر ملاقات ہوتی تھی اور وہ اسے اکثر معاملات میں مدد، مشورہ دے دیا کرتے تھے اور طارق سے مذاق بھی کرتے رہتے تھے۔

ان کے کھاتے اور حساب کتاب کو باریک بینی سے جانچتے تھے۔ مردم شناس شخص تھے اور طارق جیسے آدمی کی تمام کمزوریوں پر گہری نظر رکھتے تھے لیکن اس سے متنفر نہیں تھے بلکہ اس کی اصلاح کی توقع رکھتے تھے۔

طارق گزشتہ دو دن سے غیر حاضر دماغ اور کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے اسے کسی بات کا انتظار ہو۔ کام سے بھی اس کا دل اچاٹ سا تھا۔

ایاز قریشی صاحب نے بھی یہ بات نوٹ کرلی تھی۔

''کیا بات ہے میاں... تم ان دنوں کچھ زیادہ ہی لاپروا ہو رہے ہو... کیا کوئی لاٹری نکل پڑی؟''

''جی نہیں... قریشی صاحب! اپنے مقدر میں کہاں کہ لاٹری نکل آئے۔''

''نہیں برخوردار! کوئی خاص بات ہے جو تمہارے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے۔''

طارق نے ابھی تک شادی والے معاملے کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس نے چاہا کہ وہ سب کچھ ایاز قریشی کے گوش گزار کر دے۔ اسے لڑکی والوں کی طرف سے جواب کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ممکن تھا کہ کسی کو بتا دینے سے اس کی بے چینی میں کچھ کمی واقع ہوجاتی۔ یہی سب کچھ سوچ کر اس نے تمام قصہ ایاز قریشی کو بتا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ایاز قریشی بہ غور مجسم سوچ میں ڈوبے ہوئے طارق کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''قریشی صاحب! ممکن ہے میری شادی ہوجائے اور میرے لیے ایک بہترین اور آسودہ زندگی کا آغاز ہوجائے۔ قدرت نے مجھے ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے۔'' ایاز قریشی خاموشی سے سنتے رہے۔

طارق نے تمام تفصیل ان کے سامنے بیان کردی تھی۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے تھے۔

''دیکھو طارق! حتی الامکان پیچیدگی سے بچنا چاہیے۔ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ اگر تمہارا شادی کا سلسلہ بن جائے یا کوئی آسودگی اور آسانی کا ذریعہ پیدا ہوجائے تو تم اس سے انکار کردو۔ لیکن جو کچھ بھی کرنا سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر کرنا کیونکہ اس قسم کے اشتہاری رشتے ''عموماً'' کسی نہ کسی ناخوشگوار صورتِ حال کا سبب ضرور بنتے ہیں۔''

''قریشی صاحب شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن میں اپنی موجودہ طرزِ زندگی سے قطعی خوش نہیں ہوں اور میں کسی بھی صورت زندگی میں کوئی بڑی اور خوشگوار تبدیلی چاہتا ہوں اور ایسا کرنے کے لیے میں کسی قدر رسک تو لے ہی سکتا ہوں۔''

''دیکھو طارق...... خوشیوں اور آسانیوں پر سب کا حق یکساں ہے۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ میں بھی تمہیں کامیاب اور خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس معاملے میں مجھے کہیں نہ کہیں کوئی سقم دکھائی دیتا ہے۔'' ایاز قریشی نے آخری جملہ پُرتشویش انداز میں ادا کیا تھا۔

''اگر شادی کے اس سلسلے میں کسی قسم کے خدشے کے پیشِ نظر پیش رفت نہ کی جائے تو بھی مستقبل میں بے شمار خدشات موجود ہیں۔'' طارق کی دلیل خاصی معقول تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے، کچھ نہ کچھ کرنا کچھ نہ کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔'' ایاز قریشی نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور ایاز قریشی نے اٹھایا تھا۔ دوسری طرف کوئی عورت تھی جس نے طارق سے گفتگو کی فرمائش کی تھی۔ ایاز قریشی نے ریسیور طارق کی طرف بڑھا دیا۔ ''تمہارے لیے کال ہے۔''

''جی، میں طارق زاہد عرض کررہا ہوں۔''

طارق نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''میری تم سے رشتے کے سلسلے میں ملاقات ہوچکی ہے۔ تمہارے لیے خوشخبری ہے کہ ہم نے رشتے کے لیے تمہارا انتخاب کرلیا ہے۔'' دوسری طرف اسی عورت کی آواز سنائی دی جس نے ملاقات کے دوران اپنا نام بیگم درانی بتایا تھا۔

''جی ... جی بہت بہتر۔ یہ تو واقعی خوشی کی خبر ہے۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟'' طارق نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دوسرا جملہ سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

''تم جلد از جلد مجھ سے ملاقات کرو تاکہ باقی معاملات نمٹائے جاسکیں۔''

''جی...... جی بہت بہتر۔ میں جلد ہی حاضر ہوجاتا ہوں۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گی ....'' اس کے ساتھ ہی سلسلۂ گفتگو منقطع ہوگیا۔

طارق نے ریسیور کریڈل کردیا تھا۔

ایاز قریشی سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''جناب! یہ فون اسی خاتون کا تھا جن کے ساتھ شادی کے سلسلے میں بات چیت چل رہی ہے اور اب انہوں نے مجھے پھر بلایا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے میرا انتخاب کرچکی ہیں۔''

طارق کے لہجے سے شادمانی جھلک رہی تھی۔

ایاز قریشی متفکرانہ انداز میں سر ہلا کر رہ گئے۔

☆☆☆
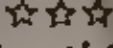
منظر بیگم درانی کی نشست گاہ کا تھا۔ طارق کے سامنے بیگم درانی موجود تھیں۔

''تو برخوردار! تم اپنے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات وغیرہ مجھے پہنچاؤ تاکہ تمہاری روانگی کا بندوبست کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ تمہارے والدین کے اخراجات کی مد میں کی جانے والی ادائیگی کے لیے ان کا اکاؤنٹ نمبر بھی درکار ہوگا۔ کوئی اور بات جو تم طے کرنا چاہتے ہو؟'' بیگم درانی نے سوال کیا۔

''جی بیگم صاحبہ اگر......'' طارق نے قدرے جھجکتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں ہاں، بے تکلف کہو۔ کیا بات ہے؟ شرمانے یا

گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"میں اپنی ہونے والی بیوی کی تصویر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تصویر..... بالکل ٹھیک ہے، تصویر تم ابھی دیکھ سکتے ہو۔" بیگم درانی نے سائڈ ٹیبل پر سے ایک چھوٹا سا البم اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اس البم میں سے ایک تصویر نکال کر طارق کی طرف بڑھا دی۔

طارق نے بے تابی سے تصویر لے لی۔ وہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی کا کلوزاپ فوٹو تھا۔ "اس کا نام شاداب درانی ہے۔ یہ میرے شوہر فرحت درانی کے چھوٹے بھائی کی بیٹی ہے جو ایک حادثے میں انتقال کر چکے ہیں۔ ان دنوں میرے شوہر فرحت درانی امریکا میں اسی کے پاس قیام پذیر ہیں۔ کاروباری ذمے داریوں کی وجہ سے انہیں فوری طور پر شاداب کی شادی کرنی پڑ رہی ہے۔"

بیگم درانی نے تفصیل بتائی۔ "اور شاداب کی والدہ .... ؟" طارق زاہد نے سوال کیا۔

بیگم درانی نے چند لمحوں کے لیے غور کیا اور پھر پر سوچ انداز میں گویا ہوئیں۔ "شاداب کی حقیقی ماں میں خود ہوں۔ برسوں پہلے فرحت درانی کے بھائی کے انتقال کے بعد میں نے اپنے جیٹھ یعنی فرحت درانی سے شادی کر لی تھی۔ چنانچہ ایک رشتے سے شاداب میری بھتیجی بھی لگتی ہے۔" بیگم درانی یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

"ہوں.... تو پھر نکاح وغیرہ کا معاملہ میرے امریکا پہنچنے پر ہی ہو سکے گا۔" طارق کا انداز سوالیہ تھا۔

"ٹیلی فون کے ذریعے نکاح پہلے ہوگا اور بعد میں تم امریکا کے لیے روانہ ہو جاؤ گے جہاں شاداب اور شاداب کے تایا تمہیں ریسیو کر لیں گے۔" طارق نے مزید سوالات نہیں کیے تھے۔ شاداب اسے پسند آئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شاداب درانی کی تصویر اسے پسند آئی تھی اور وہ اسے جلد از جلد پا لینے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں اپنی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ خوش بختی بھی لانے والی تھی اور پھر دیگر مراحل بھی بہ تدریج طے ہوتے چلے گئے۔ پہلے اس کے والدین کے ماہانہ اخراجات کے لیے ایک معقول رقم ان کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروائی گئی اور اتنی ہی رقم ہر ماہ باقاعدگی سے ان کو پہنچانے کی ذمے داری لی گئی پھر ٹیلی فون پر اس کا نکاح شاداب درانی سے پڑھا دیا گیا۔

تیسرے مرحلے میں اس کی امریکا روانگی کے سلسلے میں معاملات نمٹائے گئے اور اس کی روانگی کی تاریخ طے ہو گئی اور پھر مقررہ تاریخ کو طارق امریکا کی طرف پرواز کر گیا۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ اسے سب کچھ ایک خوش کن خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ کیا یہ سب کچھ سچ ہو گیا تھا۔ اس کی قسمت یاوری کر گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لاکھوں میں سے کسی ایک خوش بخت کے یوں دن بدلتے ہیں اور قدرت یوں ہی مہربان ہوتی ہے۔ شروع شروع میں جو اندیشے اور خدشے اس کے ذہن میں امڈتے تھے وہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتے چلے گئے تھے اور جب اس طیارے نے امریکا کی سرزمین کو چھوا تو تمام وسوسے خود بخود دم توڑ گئے تھے۔

ائرپورٹ پر اس کے استقبال کے لیے فرحت درانی پہلے سے موجود تھا جس کی فوٹو وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس لیے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔

رات کافی سے زیادہ گہری ہو چکی تھی اور خنکی بھی خاصی تھی۔ اسے لینے کے لیے فرحت درانی اکیلا ہی آیا تھا۔ طارق کے استفسار پر اس نے بتایا کہ شاداب درانی حجلۂ عروسی میں دلہن بنی اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ تب اس کے من میں انبساط اور مسرت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ مختصر سے سفر کے بعد وہ ایک کثیر المنزلہ عمارت کے سامنے پہنچے تھے جہاں پارکنگ شیڈ میں فرحت درانی نے اپنی لمبی سی شاندار کار پارک کر دی تھی۔ پھر وہ برقی زینوں کے ذریعے بالائی منزل کے ایک خوب صورت اور آراستہ فلیٹ میں داخل ہوئے۔ فلیٹ کی آراستگی اور آرائش انتہائی موزوں ترین تھی۔ طارق نے مدہوش نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور بے خود سا ہو گیا۔ زندگی اس قدر دلکش اور رنگین بھی ہو سکتی ہے، اس نے شاید تصور بھی نہیں کیا تھا۔ فرحت درانی کے اشارے پر وہ ایک اور دروازے میں سے گزر کر کمرے میں داخل ہو گیا تھا جو حجلۂ عروسی کے طور پر بڑے اہتمام کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ گلاب کے تازہ پھولوں سے آراستہ خواب ناک دھیمی روشنی میں سیج پر دلہن سر جھکائے گھونگھٹ کیے بیٹھی تھی۔ سیج کے سرہانے کی دیوار پر شاداب درانی کی جہازی سائز تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا سیج کے قریب پہنچ چکا تھا کہ اچانک وہ چونک پڑا۔ اس نے گھبرا کر بہ غور دلہن کی طرف دیکھا جس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے قدرے اوپر تک غائب تھیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں وہیل چیئر کا ہیولا بھی نظر آ رہا تھا۔

انیسویں قسط

ماروی

محی الدین نواب

اگر یہ ہی کائنات کی رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... قدرت زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کی سمت پرواز... ٹھنڈی ہواؤں کی جھرجھری ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم تو کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی سرخی، کہیں کانٹوں کی چمک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے سمادیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا فسوں ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کی اسی جنگ میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹنے نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

اور ان کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام سراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تا کہ ایمان دشمنوں کی ٹارگٹ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور وہاں کی وزارت کو نے کر لندن آ گیا۔ محبوب نے اسے ہونے سے نہیں روکا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مراد کے جیتے جی مادرونی اس تک نہیں ہو سکتی۔ ادھر لندن میں بلا نے میکی براؤن کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا۔ بشریٰ نے میکی کے بیٹے کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ بیٹے کو بشریٰ کی فکر تھی اور وہ کسی بھی وقت دشمنوں کی گرفت میں آ سکتی تھی۔ ادھر مراد کے لیے مرینہ تنہا رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ رہنا اس کی مجبوری تھی۔ مرینہ نے سرجری کے ذریعے اپنا چہرہ بدل لیا تھا۔ ایمان علی اپنے باپ کے ہمراہ لندن آ گیا تھا۔ میکی براؤن نے اس سے رابطہ کیا اور وہاں ایمان علی کو موجود پا کر حیران رہ گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میڈونا اسے بڑی حیرانی سے دیکھ کر بولی۔ ”تم بالکل وہی میرے ایمان علی ہو لیکن تم تو سن سٹی میں تھے۔ تمہارے ساتھ کوئی حسین چڑیل تھی۔“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر میں سن سٹی میں تھا تو پھر یہاں کیسے نظر آ رہا ہوں؟ مجھے ایسا شرمناک الزام کیوں دے رہی ہو کہ میں کسی حسینہ کے ساتھ تھا۔ میں نے تو آج تک کسی لڑکی کو دور سے بھی ہاتھ نہیں لگایا۔“

”میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تھا۔“

”میں نہیں جانتا کہ تم نے کس کے ساتھ مجھے دیکھا تھا۔ یا تو تمہاری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے یا پھر کسی ہمشکل کو یا کسی بہروپیے کو تم نے دیکھا ہوگا۔“

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں تو اپنی پیدائش کے پہلے دن سے اب تک کنوارا ہوں۔ کبھی کسی حسینہ پر دل نہیں آیا۔ سچ کہتا ہوں، کل ابیب سے لندن جاتے ہوئے جب پہلی بار تمہیں جہاز میں دیکھا تو دل نے کہا، تم میرے لیے ہی پیدا ہوئی ہو۔ تم بھی مجھ سے شادی کرنے کے لیے راضی ہو گئی تھیں۔ اب کیوں شبہ کر رہی ہو؟“

میکی براؤن کی آواز سنائی دی۔ ”بیٹی! اس پر شبہ نہ کرو۔ بات سمجھ میں آ گئی ہے۔ تم نے جسے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے اور جو ابھی سن سٹی میں ہے وہ کوئی بہروپیا ہے۔ وہ سرجری کے ذریعے ایمان علی کا ہمشکل بن گیا ہے۔“

وہ باپ کے یقین دلانے پر خوش ہو کر بولی۔ ”او گاڈ! وہ تم نہیں تھے اور میں سمجھ رہی تھی کہ تم بے وفا ہرجائی ہو گئے ہو۔ تھینکس گاڈ!“

وہ کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ ”ہائے... میں کیسے بتاؤں اس وقت مجھے ایسی مسرتیں حاصل ہو رہی ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ ابھی بیٹھے بیٹھے اڑ کر آ جانا چاہتی ہوں۔“

”میں بھی بیان نہیں کر سکتا کہ تمہیں دوسری بار دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ہاتھ بڑھا کر چھو لوں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”چھونا مشکل نہیں ہے۔ ہم راضی ہیں۔ ہمارے ماں باپ راضی ہیں۔ یہاں ابھی آ جاؤ۔ ابھی تمہاری دلہن بن جاؤں گی۔“

وہ بولا۔ ”ایک بات کہہ دوں کہ ہم جلدی شادی نہیں کریں گے۔ پہلے تم یہاں آ جاؤ۔ ہم ایک ماہ تک شملہ کے خوب صورت مقامات میں رومانس اور تفریح کریں گے۔ تم شملہ کے قدرتی مناظر دیکھو گی۔ میرے ساتھ رہو گی تو یہاں سے جانا بھول جاؤ گی پھر دوسرے ماہ سوئٹزرلینڈ، پیرس، لندن وغیرہ کی سیر کریں گے۔ شادی کے بعد تو بچے زنجیر بن جاتے ہیں۔“

میکی براؤن کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ تم کل ہی کی فلائٹ سے سسلی آؤ گے۔ یہاں باقاعدہ شادی ہوگی۔ فضول رومانس کی باتیں نہ کرو۔“

وہ میڈونا سے بولا۔ ”اپنے پاپا کو سمجھاؤ، جوانوں کے معاملے میں بوڑھوں کو نہیں بولنا چاہیے۔ کیا تم شادی سے پہلے رومینٹک لائف گزارنا نہیں چاہو گی۔“

وہ جذباتی ہو کر بولی۔ ”ہائے کتنا مزہ آئے گا۔ میاں بیوی بننے سے پہلے رومانس ہونا چاہیے۔ ہم بہت ہی رومانٹک لمحات گزاریں گے۔ مائی گاڈ... کیسے انجوائے کریں گے۔“

باپ نے کہا۔ ”میڈونا... میری جان! صرف اپنی خواہشوں کو اور خوشیوں کو نہ دیکھو۔ ہماری دنیا، ہماری زندگی دوسروں سے الگ ہے۔ تم سخت سیکیورٹی کے بغیر ایمان کے ساتھ کسی بھی ملک میں آزادی سے تفریح نہیں کر سکو گی۔“

وہ بولی۔ ”پاپا! یہی تو عمر ہے لائف انجوائے کرنے کی۔ شادی کے بعد ایک روٹین والی زندگی گزاری جاتی ہے۔ رہ گئی بات آزادی سے گھومنے پھرنے کی تو آپ کے لیے کون سی بڑی بات ہے؟ میں کہیں بھی جاؤں گی تو زیادہ سے زیادہ سیکیورٹی کے انتظامات کرنا آپ کے لیے کبھی کوئی

سکتہ نہیں رہا ہے؟"

وہ باپ کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "او مائی ڈیئر پاپا! آپ نے دیکھا ہے، ایمان علی سے ملنے تک میرا دل ڈرتا ہوا تھا۔ آپ کتنے پریشان تھے۔ اب بات بن رہی ہے تو کیا آپ بیٹی کو مسرتیں حاصل کرنے نہیں دیں گے؟"

پھر وہ ایمان علی سے بولی۔ "تم فکر نہ کرو۔ پاپا جان کو بھی داؤ پر لگا کر میری بات مان لیتے ہیں۔ میں تمہارے پاس کسی بھی پہلی فلائٹ سے آؤں گی۔"

باپ نے کہا۔ "ابھی یہ رابطہ ختم کرو۔ پہلے ہم آپس میں فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ پھر دو چار گھنٹے بعد تم ایمان علی سے بات کر لو گی۔"

وہ بولی۔ "ویل ایمان علی! میں جا رہی ہوں۔ ایک گھنٹے بعد ہمیں ملاقات ہوگی، آئی لو یو۔"

وہ بولا۔ "آئی لو یو ٹو۔"

اسکائپ کے ذریعے رابطہ ختم ہوگیا۔ ڈاکٹر مینگ سن بہت دیر سے بیٹے کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ مجبور تھا۔ میگی اور ان کی موجودگی میں ان کے خلاف بول نہیں سکتا تھا۔

اس نے رابطہ ختم ہوتے ہی کہا۔ "ایمان! یہ تم کیا بکواس کر رہے تھے۔ کیا میڈونا کے ساتھ کئی ہفتوں میں وقت گزارو گے پھر اس سے شادی کرو گے؟"

وہ بولا۔ "جانتا ہوں ڈیڈ وہ مراد کا جانی دشمن ہے لیکن... مراد کو صرف آپ ہی نہیں چاہتے میں بھی دل سے چاہتا ہوں اور کچھ سوچ کر ہی آئندہ اس کے لیے سہولتیں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم اس کے لیے کیسی سہولتیں پیدا کرو گے؟"

"میں مراد اور میگی کو ایک دوسرے کے مقابل پر لے آؤں گا۔ میڈونا میرے ساتھ رومانس کرتی رہے گی۔ میگی اپنی بیٹی کی فکر میں اس کے پاس آتا جاتا رہے گا۔ یوں مراد کی نظروں میں آتا رہے گا۔ اس نے میگی کے بھولی اور جانی کو نہیں چھوڑا۔ اسے بھی نہیں چھوڑے گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "آپ دیکھتے رہیں۔ اسے جہنم میں پہنچانے کی سہولتیں مراد کو مجھ سے حاصل ہوں گی۔"

وہ بیٹے کو پریشان ہو کر دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔ "بیٹے! تم نے کبھی گن نہیں پکڑی۔ کبھی کسی مجرم سے مقابلہ نہیں کیا۔ پلیز ان معاملات میں نہ پڑو۔" وہ بیٹے کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے مراد کو دل سے بیٹا بنایا ہے۔ ہم اس کے ہر اچھے برے وقت میں کام آتے رہیں گے۔ فار گاڈ سیک تم میگی اور میڈونا سے دور رہو۔"

وہ بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔ "میں نے سنا ہے کہ کوئی مسلمان یہودی عورت سے شادی نہیں کرتا۔"

"کون کمبخت اس سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ میں تو صرف ایک ایجنڈا پورا کر رہا ہوں۔"

باپ نے بیزاری اور پریشانی سے کہا۔ "تم اس یہودی لڑکی سے پرواہ نہیں کرتے رہو گے پھر شادی نہیں کرو گے تو اس کا باپ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "اس سے پہلے مراد اسے جہنم میں پہنچا دے گا۔ میں نے کئی ایپ میں اس کی خاطر ڈالی ہوئی ہے۔ وہ میری خاطر یہاں لندن ضرور چلا آئے گا۔"

وہ فون پر نمبر پنچ کرنے لگا۔ پھر اسے کان سے لگایا تو آواز آئی کہ مطلوبہ نمبر بند ہے۔ اس نے دوسرا نمبر پنچ کر کہا۔ "میرے پاس دوسرا نمبر ہے۔ اس سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ وہ اپنا کوئی نمبر استعمال نہیں کر رہا ہے۔"

ایمان علی نے فوراً ہی کمپیوٹر کو آن کیا۔ تھوڑی دیر پہلے میگی نے ان سے کہا تھا کہ وہ بیمار! پیلس سٹی کے ایک ہوٹل ان کاسل آف نوسٹ سٹی میں ہے۔ اس نے انٹرنیٹ کے ذریعے اس ہوٹل کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ جلد ہی وہاں کے چار فون نمبرز معلوم ہو گئے۔ پھر اس نے ایک نمبر کے ذریعے رابطہ ہونے کے بعد کہا۔ "میں ڈاکٹر مینگ سن بول رہا ہوں۔ پلیز ایمان علی سے بات کرائیں۔ وہ آپ کے ہوٹل میں مقیم ہے۔"

جلد ہی مراد کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو ڈیڈ! آپ خیریت سے تو ہیں؟ مجھے کیسے یاد کیا؟"

وہ بولا۔ "برخوردار... ڈیڈ کی خیریت سے ہیں۔ میں لندن سے بول رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "ہائے ایمان! تم کیسے ہو؟ آج کل کہاں مستیاں کر رہے ہو؟"

"میں ابھی میں ڈیڈ کے ساتھ ہوں۔"

"اچھا تو تم نے ڈیڈی سے کلمہ پڑھوا لیا ہے؟"

"نہیں مراد! مجھے دین و حرم کے معاملات میں کسی سے زبردستی نہیں کرنی چاہیے۔ خدا کو دل سے مانا جاتا ہے۔ صرف زبان سے کلمہ پڑھایا جائے تو دل ایمان سے خالی رہتا ہے۔ اس لیے میں نے ضد چھوڑ کر ڈیڈی سے صلح کر لی ہے۔"

"شاباش... ایہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب ڈیڈی کو بڑھاپے میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔"

"انشاء اللہ اب میں یہیں رہوں گا لیکن ایک مسئلے میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔"

''تو رانیولو کیا چاہتے ہو؟''

''تم نے ایمان علی کے روپ میں میڈونا سے ملاقات کی تھی۔ وہ مجھے وہی ایمان علی سمجھ کر میری طرف مائل ہوگئی ہے۔''

''یعنی وہ گئی کام سے...؟''

''یار! بہت خوبصورت ہے۔ ابھی اسکاپ کے ذریعے دیکھا تو سیدھی گولی کی طرح لگی۔ تم میری اس عادت سے واقف ہو۔ میں بہتی گنگا میں ہاتھ دھویا کرتا ہوں۔''

مراد نے جلتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے گناہ نہیں سمجھتے اور میں تمہیں گنہگار کر کے پارسا نہیں بنا سکوں گا۔ آگے بولو۔''

''آگے کی بات یہ ہے کہ وہ باپ بیٹی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ باپ تو اتنا خطرناک ہے کہ مجھے یہیں سے بھی اٹھوا کر سسلی پہنچا کر قیدی بنا دے گا۔''

''ہاں وہ ایسا کرے گا اور میں کرنے نہیں دوں گا۔ تم ایک بار میری خاطر گولی کھا چکے ہو۔ دوسری بار تمہیں میکی کے چنگل میں پھنسنے نہیں دوں گا۔ اسے اور اس کے شوٹرز کو تمہارے سائے کے قریب بھی پہنچنے نہیں دوں گا۔''

''میں گیم شروع کروں گا۔ میڈونا میرے پاس آئے گی تو اس کا باپ ضرور بھی آیا کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ تمہارے نشانے پر رہا کرے گا۔''

''ہاں، میں یہی چاہتا ہوں۔ اسے ختم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا پورا خاندان فنا ہو جائے گا لیکن وہ بیٹی کو تمہارے پاس جانے نہیں دے گا۔''

''میں نے میڈونا کو راضی کر لیا ہے۔ وہ باپ کو راضی کرنے والی ہے۔ ابھی دو چار گھنٹے میں معلوم ہوگا کہ باپ بیٹی کے سامنے جھک رہا ہے یا نہیں؟''

''ٹھیک ہے، میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ اپنا نمبر Send کر رہا ہوں۔''

مراد نے رابطہ ختم کر کے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور ماروی اس کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا یہ وہی ڈاکٹر نگی سن کا بیٹا ہے جو تمہارا ہم شکل ہے؟''

''وہ میرا نہیں، میں اس کا ہم شکل بن گیا ہوں۔ میں نے ماسٹر سے کہا ہے کہ آئندہ ایمان علی داور کی حیثیت میں ڈاٹن نہیں چاہتا۔ لہٰذا کسی سرجری کے ذریعے چہرہ بدلنے والا ہوں۔''

''واہ رے نصیب... ایسے مرد سے پالا پڑا ہے۔ صورت بدلتا رہتا ہے۔ اجنبی بنتا رہتا ہے۔ کل میرے سامنے آؤ گے تو پھر اجنبی لگو گے۔ ایمان علی کا چہرہ لے کر آئے تھے۔ تب بھی ایک غیر مرد لگتے رہے۔ میں دل کو سمجھاتی رہتی ہوں۔ دل جلدی مان لیتا ہے کہ صرف صورت گم ہوتی ہے۔ کل تبدیل ہو کر آؤ گے تو پھر ایک اجنبی کے ساتھ رہنا ہوگا۔ بڑا وقت گزرنے کے بعد دل کو تسلی ہوگی کہ تم ہی ہو۔''

''یہ بتاؤ میرے ساتھ زندگی کیسی لگ رہی ہے؟''

''بہت ہی پراسرار، عجیب سی زندگی ہے۔ یہاں دولت ہے عیش و عشرت ہے لیکن آزادی نہیں ہے۔''

''تم نے میرے ساتھ آزادی سے گھوم پھر کر اس خوب صورت شہر کو دیکھا ہے۔''

''کیا یہ آزادی اپنے وطن میں ملے گی؟ کسی اور ملک میں تم مجھے سیکیورٹی گارڈز کے بغیر کہیں تفریح کے لیے لے جاؤ گے؟''

''ایمان علی کی صورت میکی براؤن کی نظروں میں چڑھ گئی تھی۔ اب یہ اطمینان رہے گا کہ کل نئے چہرے کے بعد کوئی مجھے اپنا بھی نہیں پہچانے گا۔ پھر میں تمہارے ساتھ آزادی سے کہیں بھی آ جا سکوں گا۔''

''تم نے کہا تھا کہ میری تصویریں بھی دشمنوں کے پاس ہیں۔ لندن ایئرپورٹ پر میڈونا نے مجھے پہچانا۔ اگر اس کا باپ میکی دیکھ لیتا تو پہچان لیتا کہ میں ماروی ہوں اور میرے ساتھ کوئی ایمان علی ہو ہی نہیں سکتا۔ اسے یقین ہو جاتا کہ تم ہی مراد ہو۔''

یہ تمام باتیں اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتی تھیں اور وہ اسے سمجھاتی رہتی تھیں۔ وہ اس وقت بھی ماروی کی باتیں سن رہا تھا اور سر جھکا کر سوچ رہا تھا۔

ماروی کے دماغ میں جو باتیں آ رہی تھیں اس کے مطابق وہ کہہ رہی تھی۔ ''کل نئے چہرے کے پیچھے چھپنے کے بعد جو میرے ساتھ دیکھے جاؤ گے تو دشمن آنکھیں بند کر کے تمہیں مراد نہیں کہیں گے۔ یہ سیدھی سی مگر زبردست سی بات سمجھ رہے ہو نا؟ میری یہ صورت تمہاری دشمن ہے اور تمہارا وجود میری موت ہے۔ ہم مجرموں کی طرح ہی چھپ کر محفوظ رہ سکتے ہیں اور اپنی محبت زندہ رکھ سکتے ہیں۔''

''درست کہتی ہو۔ ہم کہیں ہنی مون منانے کے لیے نہیں جا سکیں گے۔ یہی مجبوری ہے ہمیں اپنی ملاقات کے لیے ہی ہنی مون کے شوق کو مارنا ہوگا۔''

''بات صرف ہنی مون کی نہیں ہے۔ اگر تم اپنی مصروفیت کے باعث دو چار روز نہیں آؤ گے۔ میں تمہارا ہوں

کی، کسی دکھ بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے باہر نکلوں گی تو دل پر ہاتھ رکھ کر بولو کیا واپس آسکوں گی؟"

وہ سن رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ "کوئی دشمن مجھے اٹھا کر لے جائے گا اور تمہیں میرے پاس آنے پر مجبور کرے گا۔ تب کیا ہوگا؟ تم جان کی بازی لگا کر آؤ گے تو نتیجہ کیا ہوگا یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بولا۔ "یہ مصیبت ہے؟ کوئی دوسری بات کرو۔ باڈی گارڈ میرا سروس ٹینٹ ہے۔ ویسے میں بھی تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تمہیں باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تمہاری ہر ضرورت چار دیواری میں پوری ہو جایا کرے گی۔"

"یعنی ابھی مجھے کھلے آسمان کے نیچے کھلی فضا میں تازہ ہوا نصیب نہیں ہوگی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم ضرورت کے مطابق جب چاہو گے، چہرہ بدل کر آزادی سے گھومتے رہو گے۔ میں اپنے گھر سے اپنے وطن سے دور دیارِ غیر میں چار دیواری کے اندر قیدی بن کر رہا کروں گی۔"

"میں تمہیں کھلی ہوادار کوٹھی میں رکھوں گا۔ ماسٹر کے بیوی بچے بھی چار دیواری میں رہتے ہیں باہر نہیں جاتے۔ تمہیں بھی میرے حالات سے سمجھوتا کرنا چاہیے۔"

وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "صاف اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم جب بھی کسی اہم کام سے ایک آدھ دن کے لیے باہر جاؤ گے تو بے اعتباری کہے گی کہ مرینہ یا شاشہ یا کسی اور کے پاس گئے ہو۔"

اسی وقت فون کا بزر بولنے لگا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "کیبن کے فون پر آپ کی کال ہے۔"

اس نے کہا۔ "ابھی آرہا ہوں۔"

ماروی اس کے زانو سے سر اٹھا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "سیکرٹ کال ہے، کیبن سے ہو کر ابھی آتا ہوں۔"

اس نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ کیسی سیکرٹ کال ہے؟ مسٹر جیمز باس کی کال یہاں کمرے میں آتی ہے اور تم سنتے ہو اور کسی سے ایسی کیا رازداری ہے کہ اسے سننے کے لیے باہر کیبن میں جاتے ہو؟"

"میں تمہیں ایک بار سمجھا چکا ہوں۔ بعض اوقات حالات ایسے ہوتے ہیں جن پر باتیں کرنے کے لیے صرف ایک ہی فون کو مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ فار گاڈ سیک! تم ایک ہی بات پر بار بار بحث نہ کیا کرو۔"

وہ بولتا ہوا باہر چلا گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ماروی نے کہا تھا۔ "مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم جب بھی کسی اہم کام سے ایک آدھ دن کے لیے باہر جاؤ گے تو بے اعتباری کہے گی کہ مرینہ یا شاشہ یا کسی اور کے پاس گئے ہو۔"

اس کی بے اعتباری درست تھی۔ مراد نے کیبن میں آکر ریسیور کو کان سے لگایا۔ وہ جانتا تھا کہ مرینہ کی کال ہے۔ اس نے کہا۔ "ہاں مرینہ بولو کیسی ہو؟ کیا کر رہی ہو؟"

"اور کیا کروں گی؟ انتظار کر رہی ہوں کب تم سے آزادی سے مل کر باتیں کر سکوں گی۔"

"جب جولیا جینی کے ساتھ سسلی سے باہر آئے گی تب ہی میں ماروی کو یہاں چھوڑ کر جولیا کو اغوا کرنے اور جینی کو ٹھکانے لگانے جس ملک میں جاؤں گا وہاں تم سے ملاقات ہوگی۔"

وہ بولی۔ "جولیا کا باپ ابھی تک اسپتال میں ہے۔ فون پر اس سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ جولیا نے جینی کو سسلی سے باہر کہیں جانے کے لیے راضی کر لیا ہے۔ اب جینی اپنے باپ کو راضی کر رہا ہے۔ امید ہے مسٹر براؤن انہیں سیر و تفریح کے لیے باہر جانے کی اجازت دے دے گا۔"

"تب ہی ہماری بات بنے گی۔"

پھر وہ بڑے رومانٹک انداز میں بولی۔ "مراد! میرے ساتھ گزارے ہوئے دن رات تمہیں یاد آتے ہیں؟"

"بہت یاد آتے ہیں۔"

"ماروی کو اپنے بچپن کی محبت کو پا لینے کے بعد بھی میں یاد آتی ہوں؟...؟"

"ہاں تم دونوں میں جو فرق ہے، وہ مجھے یاد آتا ہے۔"

"مجھے وہ فرق بتاؤ۔"

"ماروی آرام ہے سکون ہے میری راتوں کی نیند ہے۔ تم اس نیند میں ایک خواب ہو، میں سوتا اس کے ساتھ ہوں اور تعبیر کے لیے تم پکارتی ہو۔ وہ میری محبت ہے میرے دل کی دھڑکن ہے۔ وہ میری جذباتی دنیا کی ملکہ ہے اور تم حالات کی چٹان ہو۔ زندگی میں جتنی جنگیں لڑی جاتی ہیں وہ جذبات سے نہیں حوصلے اور ہتھیار سے لڑی جاتی ہیں۔ میں اس حقیقت سے کیسے انکار کروں کہ تم میرا ہتھیار ہو۔ میرے دشمنوں کو شکست دینے والی قوت ہو۔"

پھر اس نے دل میں کہا۔ ''سوری ماروی! دشمنوں نے مرینہ کو میرے لیے ضروری بنا دیا ہے۔''

وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ مراد جب بھی وہ سیکرٹ کال سننے جاتا تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ دل اندر سے چیختا تھا کہ اس کے بچپن کا ساتھی، جوانی کا ہم سفر ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ اسے پکڑ لے۔

مراد کے پچھلے گناہوں کے حوالے سے جو بے اعتمادی تھی، وہ دماغ میں چھپنے لگتی تھی۔ کئی بار سوچا کہ اپنے مرد کو اس کے معاملات میں آزاد چھوڑ دے مگر دل نہیں مانتا تھا۔

دل کہتا تھا۔ ''کیا میں نے بچپن سے محبت کرتی آئی ہوں کہ اس کے نام سے قید ہو جاؤں اور اسے دوسری عورتوں کے پاس جانے کے لیے چھوڑ دوں؟ میری زندگی میں بھی ایک دوسرا مرد موجود ہے۔ وہ آج بھی میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں اس کے سامنے میں بھی جاؤں گی تو مراد کی غیرت پھڑپھڑانے لگے گی...... کیوں؟ کسی عورت کے پاس جانے کی جو آزادی اسے ہے وہی آزادی مجھے محبوب کے پاس جانے کے لیے کیوں نہ ہے؟ توبہ ہے میں اتفاقاً ایسا سوچ رہی ہوں۔ ایک عورت کی حیا اور شرافت کسی دوسرے مرد کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن مجھے انصاف ملنا چاہیے۔ میں نے اس کے لیے اپنے عاشق کو چھوڑ دیا۔ ایک پرامن شریفانہ زندگی چھوڑ کر مجرموں کی دنیا میں آ گئی۔ اپنے میکے کو، اپنے پیارے پاکستان کو چھوڑ کر آ گئی۔ یا خدا مجھے انصاف چاہیے۔''

☆☆☆

ریڈ الرٹ کے سربراہ منگی براؤن کے مقدر میں جیسے ناکامیاں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ مراد علی منگی کو ہینڈل کرنے کے سلسلے میں ناکام ہوتا آ رہا تھا۔ اب اپنے گھریلو معاملات میں بھی بری طرح الجھ رہا تھا۔ ایک طرف اس کا بیٹا جیمی اپنی محبوبہ جولیہ کے ساتھ کسی سے باہر جانے کی ضد کر رہا تھا۔ دوسری طرف میڈونا ایمان علی کے پاس ہندوستان جانے کے لیے مچل رہی تھی۔

ویسے بیٹی کی ضد سے وہ فائدہ اٹھانے والا تھا۔ اپنی پلاننگ کے مطابق مراد کو شکنجے میں گھیرنے والا تھا۔ دوسری طرف بیٹا مچل رہا تھا کہ وہ جولیہ کے ساتھ سوئٹزر لینڈ جائے گا اور وہ بیٹے کو سمجھا رہا تھا کہ ایک باشتے کو زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہیے۔

اور اس نے جواباً کہا تھا۔ ''پاپا! میں نے آپ کی بات مان لی۔ ایک مدزمانی بیٹی سے شادی نہیں کر رہا ہوں۔ جب آپ نہیں رہیں گے اور آپ کی جگہ میں ریڈ الرٹ کا سربراہ بن جاؤں گا۔ تب اسے اپنی شریک حیات ضرور بناؤں گا۔''

بیٹے کی یہ بات سن کر باپ سوچ میں پڑ گیا۔ اس دنیا میں جو کچھ ہے، اپنی زندگی میں ہے۔ ہم نہیں ہیں تو پھر یہ دنیا نہیں ہے۔ وہ جسے منصوبہ بناتا تھا، وہ اس کی تکمیل کرتا تھا۔ وہ نہیں رہے گا تو تخت اس کے بیٹے کا ہے گا۔

''آہ..... یہ ایک ہی بیٹا رہ گیا ہے۔''

وہ سوچتا تھا۔ پتا نہیں بیٹے کی اور اس کی کتنی زندگی رہ گئی تھی۔ وہ شکست خوردہ سا ہو کر مان لیتا تھا کہ اسے اپنی ضد اور انا سے باز آ کر بیٹے کو اجازت اسے دینی چاہیے۔

اس نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک ہفتہ انتظار کرو۔ ابھی تمہیں اہم معاملات میں میرے ساتھ رہنا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اس بہروپیے مراد تک پہنچ رہا ہوں۔ میں ایک بہت بڑے حملے کی تیاری کر رہا ہوں۔ تم آٹھ یا دس دنوں بعد جولیہ کے ساتھ جا سکتے ہو۔''

اس کی بیٹی ایمان علی سے مایوس ہونے کے بعد ہنسنا بولنا بھول گئی تھی۔ وہ بظاہر باپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھی لیکن وہ باپ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس بار بیٹی کا چارہ ڈال کر مراد کو فریب کر سکے گا۔

اس نے کھیل میں وہ بیٹی کو ہار بھی سکتا تھا اور اس کے کاندھے پر بندوق رکھ کر ناقابل شکست دشمن کو موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا تھا۔

اس نے دیکھا تھا کہ انڈیا میں ایمان علی کو دیکھ کر بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ بیٹی کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔ یہ اچھی طرح معلوم ہوا تھا کہ ایمان علی بے وفا اور ہرجائی نہیں ہے۔ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ منسوب کی جانے والا ایمان علی بہروپیا ہے۔

وہ جسے چاہتی ہے، وہ انڈیا میں ہے۔ اب میڈونا اس کے پاس جانے کے لیے مچل رہی تھی اور باپ اپنے طور پر پلاننگ کر رہا تھا۔

بیٹی کے مایوس چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ وہ اس کے چہرے کی رونق کو اپنی پلاننگ کے مطابق برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میڈونا! میں سمجھ گیا ہوں کہ انڈیا میں جو بہروپیا ہے، وہ دراصل مراد ہے۔ ڈاکٹر لکی سن سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ تم انڈیا جاؤ گی تو وہ تمہیں فریب کرنے اور تمہیں میری کمزوری بنانے ضرور وہاں پہنچے گا۔''

وہ بولی۔ ''وہاں آپ کی سیکیورٹی مضبوط ہو گی تو آپ اس کا آلۂ کار نہیں بنیں گے۔ مجھے جانے دیں۔ یہ عمر آزادی

سے اڑتے پھرتے اور دنیا دیکھتے رہتے ہیں۔"

وہ تصور میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایمان علی ٹھیک کہتا ہے۔ ہمیں پہلے شادی نہیں رومانس کرنا چاہیے۔ لائف انجوائے کرنے کی یہی عمر ہوتی ہے۔ میں انڈیا جاؤں گی پاپا!"

وہ جانے کے لیے مچل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "وہاں دن نہیں گے گا تو سوئٹزرلینڈ جاؤں گی اور دن نہیں کٹیں گے گا۔ ایمان کسی کھنڈر میں بھی رہے گا تو میرا دل لگ جائے گا۔"

وہ باپ کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "اور میں جہاں جاؤں گی وہاں وہ جانی دشمن آئے گا۔ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے آپ کو بڑے مواقع ملیں گے۔"

"کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ وہ تمہیں ہلاک کر سکتا ہے؟"

"نو پاپا! وہ دشمن لاکھ برا سہی، یہ تو اس کے سب ہی دشمن کہتے ہیں کہ وہ عورتوں کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ انہیں نقصان نہیں پہنچاتا۔ پھر اس سے ڈرنا کیسا؟"

وہ ایمان علی کے پاس جانے کے لیے پاگل ہو رہی تھی اور وہ بیٹی کا مسرت سے کھلا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں بہت ہی سخت اور منظم سیکیورٹی کے ساتھ جانے دوں گا۔ اپنی مام کو بھی ساتھ لے جاؤ، مجھے اطمینان رہے گا۔"

اس کی بیوی مارتھا نے کہا۔ "مجھے ایشیائی ملک اور وہاں کے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ پھر میں وہاں جوانوں کے ساتھ کیا کروں گی؟ خواہ مخواہ کباب میں ہڈی بن جاؤں گی۔ مجھے وہاں جانے کو نہ کہو میں نہیں جاؤں گی۔"

میڈونا نے کہا۔ "پاپا! آپ میری فکر نہ کریں۔ صرف سیکیورٹی گارڈز اور جیمز پر بھروسا کریں۔ مراد ادھر آئے گا تو حرام موت مارا جائے گا۔ آپ ابھی معلوم کریں انڈیا جانے کے لیے کسی فلائٹ میں جگہ ہے یا نہیں؟"

اس نے معلوم کیا پھر انڈیا میں شملہ کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں۔ وہاں بیٹی کے لیے ایک کاٹیج ریزرو کرایا پھر اس سے کہا۔ "تم ایمان علی سے رابطہ کرو۔ اس سے باتیں کرو۔ میں سیکیورٹی کے انتظامات کر رہا ہوں۔"

میڈونا نے ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر رابطہ کیا۔ جلد ہی دل سے دل مل گیا۔ ایمان علی اسکرین پر نظر آنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ "ہائے میڈونا... میری جان! میں انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ خوشی سے تالی بجانے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔ "میں خوشی سے پاگل ہو رہی ہوں۔ پاسوں کی فلائٹ میں سیٹ ہو گئی ہے۔ پرسوں رات یہاں سے اڑ کر جاؤں گی وہاں سے دوسری صبح کنیکٹڈ فلائٹ میں دہلی پہنچوں گی۔ یعنی آج سے تین دن بعد چوتھے دن تمہارے پاس آ جاؤں گی۔"

"اوہ مائی سویٹ ڈارلنگ! بہت بڑی خوش خبری سنا رہی ہو۔ میں آج ہی شملہ میں ایک اچھے ہوٹل میں کمرا بک کراؤں گا۔"

"تم کچھ نہ کرو، میرے پاپا وہاں ایک کاٹیج کرائے پر حاصل کر رہے ہیں۔ ابھی وہ میری سیکیورٹی کے سلسلے میں سخت انتظامات کر رہے ہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "او گاڈ! کیا تمہارے گارڈز ہمیں تنہا رہنے نہیں دیں گے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "فکر نہ کرو۔ ہماری تنہائی میں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مارے گا۔ کوئی گارڈ مداخلت نہیں کرے گا۔"

وہ خوش ہو رہے تھے۔ بولتے رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک آئندہ کے پروگرام بناتے رہے۔ پھر ایمان علی نے اس سے رابطہ ختم ہونے کے بعد مراد کو کال کی۔ یہ وہی وقت تھا، جب وہ کیبن میں بیٹھا مریم سے باتیں کر رہا تھا۔

اس سے رابطہ ختم ہوتے ہی موبائل فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ایمان علی کے نمبر پڑھے پھر بٹن دبا کر کہا۔ "ہاں بولو میرے یار.... تمہارے نئے عشق کی رفتار کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "یہ میڈونا تو دوڑتی آ رہی ہے، بلکہ پھلانگتی ہوئی آ رہی ہے۔ آج سے چوتھے دن یہاں پہنچنے والی ہے۔ اس کا باپ شملہ میں کاٹیج بھی بک کرا رہا ہے۔"

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم فلرٹ کرتے رہنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہو۔ اسے لڑکیوں کے ماں باپ تمہارے لیے ہی پیدا کرتے رہتے ہیں۔"

"مراد! ذرا سنجیدہ ہو جاؤ۔ باپ کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ بیٹی پرائی ہے، اسے بہت زبردست سیکیورٹی انتظامات کے ساتھ بھیج رہا ہے۔ گویا میں ایک عاشق کی فوج میں گھرا ہوا تنہا نہتا اور بے یار و مددگار رہوں گا۔"

"تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ بھونرے کی طرح پھول کا رس چوس کر اڑنا چاہو گے تو اس کا باپ تمہیں وہیں گولی مار دے گا۔"

"اتنی جلدی نہیں اڑوں گا۔ اس سے پہلے دیکھوں گا کہ میڈونا کا مزاج کیسا ہے۔ شاید وہ باپ کی طرح مغرور ہو۔"

مراد نے کہا۔ "یقیناً غرور اس کی گھٹی میں پڑا ہوگا۔"

اس نے کہا۔ "وہ میرے مزاج کے خلاف مجھے مجبور بنا کر رکھنا چاہے گی تو وہاں سے نکل نہیں پاؤں گا۔ ایسے وقت تم ہی مجھے وہاں سے نکال سکو گے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں آؤں گا۔ میڈونا جب تک وہاں رہے گی تب تک اس کے باپ کو ایسے عذاب میں مبتلا رکھوں گا کہ وہ توبہ توبہ کرتا پھرے گا۔"

"تو پھر آجاؤنا۔"

"میں نے کہا نا فکر نہ کرو۔ میں اپنے حالات کے مطابق وہاں کسی دن بھی پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے ایمن علی سے کہہ تو دیا تھا کہ فکر نہ کرے لیکن فون بند کر کے خود فکر میں مبتلا ہوگیا کہ کیا کرے؟ بڑے مسائل تھے۔ ان میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ مارای کو وہاں تنہا چھوڑ کے جانا تھا۔ جبکہ وہ بھی اپنے گھر میں تنہا نہیں رہ سکتی اور وہ تو دیارِ غیر تھا۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ وہاں سب ہی انگریزی یا مقامی زبان بولتے تھے۔ چچی چچا ہوتے تو وہ رہ جاتی۔ ان کے بغیر اسے پرائے ملک میں چھوڑ دینا دانش مندی نہیں تھی۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا پھر عقل نے سمجھایا ایک ہی راستہ ہے کہ اسے کچھ دنوں کے لیے چاچی چاچا کے پاس پہنچا دیا جائے اور کوئی دوسری تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔

وہ سوچتا ہوا کمرے میں آیا۔ مارای ایک صوفے پر بیٹھی فون پر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مراد کو دیکھ کر فون پر کہا۔ "اچھا یہ آگئے ہیں۔ میں پھر کسی وقت بات کروں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "چاچی سے باتیں کر رہی تھیں؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں..."

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "اچھا تو اور کون ہے؟ کس سے بات کر رہی تھیں؟"

"یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟ میں تو تم سے نہیں پوچھتی کہ کیبن میں کس سے باتیں کرنے جاتے رہتے ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم خوامخواہ شبہ کرتی ہو۔ میں تو بتا چکا ہوں کہ اس فون پر سیکرٹ معاملات پر گفتگو ہوتی ہے۔"

پھر اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "میرے باہر جانے سے یوں شبہ کرتی رہو گی تو زندگی کیسے گزرے گی؟"

"میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ تم میرے دل میں چھپا ہوا ڈاکو نہیں ہو گے تو زندگی کیسے گزرے گی؟" وہ اس کی طرف گھور کر بولی۔ "تم یہی سمجھتے رہو گے کہ ملالہ جیسی عورتوں کے بغیر دشمنوں سے لڑ نہیں سکتے ہو تو میں بھی نہیں مانوں گی۔ وہ مرد، مرد نہیں ہوتے جو عورتوں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتے ہیں۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ یہ بتاؤ کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

وہ ذرا تن کر بولی۔ "محبوب ہے..."

مراد کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "جھوٹ بول رہی ہو۔"

اس نے اپنا فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو دیکھ لو۔"

اس نے فون لے کر بٹن دبا کر اطہر نمبرز دیکھے۔ واقعی وہ محبوب سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ فون کو صوفے پر پھینکتے ہوئے بولا۔ "اس سے کیوں باتیں کر رہی تھیں؟"

"تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

"نہیں۔ تم صرف میری ہو۔ تمہارے دن رات صرف میرے لیے ہیں۔ محبوب تو اب ہمارے بیچ نہیں آ چکا ہے۔ ہم نے ماضی کی وہ کتاب بند کر دی ہے۔"

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ مجھے بھی یقین دلاؤ کہ تم نے مریضہ کی کتاب بند کر دی ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "تم جب بھی کیبن میں باتیں کرنے جاتے ہو میرے اندر سے آواز آتی ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے چھین رہی ہے۔"

"یہ تمہارا شبہ ہے اور کچھ نہیں..." پھر وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "میں کچھ اور کہنے آیا تھا تم نے دل اور بات چھیڑ دی۔ تمہیں کچھ دنوں کے لیے چچی کے پاس جانا پڑ رہا ہوگا۔"

وہ چونک کر بولی۔ "مجھے دور کیوں کر رہے ہو؟"

"مجھے حالات مجبور کر رہے ہیں۔ اچانک ہی حالات بدل جاتے ہیں۔ میں ایک اہم مشن پر انڈیا جا رہا ہوں۔ ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کتنے دن کتنے ہفتے لگ جائیں گے۔"

"میں تم سے دور نہیں رہوں گی۔"

"تم پاکستان میں رہو گی تو میں تمہیں اپنے قریب محسوس کرتا رہوں گا۔ میری مجبوریوں کو سمجھو۔ کام ختم ہوتے ہی واپس آتے ہی تمہیں یہاں بلا لوں گا۔"

''کوئی چکر تو نہیں ہے؟''

''میری جان! مجھ پر شبہ نہ کرو۔ ابھی تمہارے سامنے ماسٹر سے باتیں کرتا ہوں۔''

اس نے ماسٹر سے رابطہ کر کے فوراً اسپیکر آن کر دیا۔ ماسٹر کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو مراد! میں ابھی کال کرنے والا تھا۔ ایک اچھی خبر ہے وہ یہ کہ...''

مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ''یہ بتا دوں کہ ماروی میرے قریب ہے اور ہماری باتیں سن رہی ہے۔''

ماروی نے اسے گھور کر دیکھا۔ ماسٹر نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں کہہ رہا تھا اخلاشہ نے خبر سنائی ہے۔ آج سے دس دنوں کے بعد جولیا دشمن کے بیٹے کے ساتھ مستقل سے باہر کسی ملک میں جائے گی۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''جب شلاشہ نے خبر سنائی ہے تو ہم یقین کر سکتے ہیں۔ ہمیں آگے کی پلاننگ کرنی ہوگی۔''

ماسٹر نے کہا۔ ''میرے پاس ایسی خفیہ پناہ گاہیں ہیں جہاں جولیا کو اغوا کرنے کے بعد حفاظت سے رکھا جائے گا۔ تم ہو، شلاشہ ہے اور بلا ہے۔ تین زبردست شوٹرز کے نشانوں سے دشمن کے بیٹے کو بچ کر نہیں جانا چاہیے۔''

''آپ اطمینان رکھیں۔ میری گن سے جو گولی نکلے گی وہ جیکی براؤن کو ہی لگے گی۔''

''میں جانتا ہوں۔ وہ تم سے بچ کر نہیں جائے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''ایک اور خبر ہے۔ جیکی براؤن کی بیٹی میڈونا آج سے چار دن بعد دہلی جا رہی ہے۔ وہاں سے شملہ جائے گی۔''

ماسٹر نے پوچھا۔ ''کیا واقعی...؟''

''مجھے ایمان علی نے بتایا ہے اور یہ پکی بات ہے۔ کل میرے چہرے کی سرجری ہے۔ آپ میرے نئے چہرے کے مطابق پاسپورٹ اور ضروری کاغذات تیار کرائیں اور دہلی کے لیے کسی فلائٹ میں سیٹ حاصل کریں۔ اپنے چھ شوٹرز شملہ بھیج دیں۔ میں کل ان شوٹرز سے ملاقات کروں گا اور ضروری ہدایتیں دوں گا۔''

''تم نے بہت بڑی خبر سنائی ہے۔ اطمینان رکھو۔ تمام انتظامات ہو جائیں گے۔''

مراد نے ماروی سے کہا۔ ''سنا تم نے...؟ مجھے ایک نئیں دو مشن پر جانا ہے۔ پتا نہیں کتنے دن لگ جائیں گے۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں تم دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کسی کو گولی مار دینا تمہارے لیے ایسا ہی ہے جیسے ایک چیونٹی کو مسل دیا جائے۔ تمہاری نظروں میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔''

وہ ذرا ہچکچایا پھر بولا۔ ''میں کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہوں۔ مجھے بدترین حالات نے اس راستے پر ڈال دیا ہے۔ اس کے باوجود میں لوگوں کو خوامخواہ ہلاک نہیں کرتا۔ صرف دشمنوں کو ختم کرتا ہوں۔ ایسا نہ کروں تو وہ مجھے ختم کر دیں گے۔''

''کسی کی بیٹی کو اغوا کرنا کہاں کی شرافت ہے؟''

''وہ میرے ایسے ظالم دشمن کی بیٹی ہے جس نے میرے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز رکھی ہے۔''

''دشمن کی بیٹی تم سے دشمنی نہیں کر رہی ہے۔ تمہیں عورتوں کی عزت کرنی چاہیے۔''

''یہی کروں گا۔ اغوا کرنے کے بعد اسے عزت سے رکھا جائے گا اور اس کے باپ کو بلیک میل کیا جائے گا۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ''ماروی! میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ یقین کرو، میں کسی بے قصور کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔'' پھر وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں ماسٹر کو یہ کہنا بھول گیا کہ تمہارے لیے بھی جہاز میں سیٹ کرائی جائے۔ ہم ایسی فلائٹ میں جائیں گے جو کراچی ہوتے ہوئے دہلی جاتی ہے۔''

وہ فون پر پھر ماسٹر کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ اس نے رابطہ ہونے پر کہا۔ ''میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ ماروی کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ وہ تنہا نہیں رہنا چاہتی۔ ہم دونوں کی سیٹیں ایسے جہاز میں حاصل کریں جو کراچی سے ہو کر دہلی جاتا ہو۔''

''اگر ایسے کسی جہاز میں سیٹیں نہ ملیں یا یہاں سے کوئی جہاز کراچی ہو کر دہلی نہ جاتا ہو تو کیا کیا جائے؟''

مراد نے پریشان ہو کر ماروی کو دیکھا پھر فون پر کہا۔ ''یہ یہاں سے تنہا پاکستان نہیں جائے گی۔ گھبرا جائے گی۔''

ماروی نے کہا۔ ''میں کیوں گھبراؤں گی؟ کوئی بچی تو نہیں ہوں۔ یہاں جہاز سے وہاں اترنا ہے۔ چاچی چاچا مجھے لینے آئیں گے۔ میں وہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ وہ میرا وطن ہے۔''

وہ اس کے وطن کی بات کہہ رہی تھی۔ اس نے ماسٹر سے کہا۔ ''اوکے، مجبوری ہو تو ماروی تنہا یہاں سے چلی جائے گی۔ آپ اپنی سہولت کے مطابق انتظامات کریں۔''

اس نے فون بند کر کے اسے آغوش میں بھر لیا۔ اسے

یوں پیار کر رہے تھے، جیسے ابھی اس سے بچھڑنے والا ہو۔ اس نے پوچھا۔ "یا چانک اتنا پیار کیوں آرہا ہے؟"

"کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ میں روز ہی پیار کرتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ہائے! تم کتنا چاہتے ہو۔ تمہی جیسی دنیا میں لا کر پیار کر رہے ہو۔ میں نے وطن سے باہر آ کر صرف لندن جیسے خوب صورت شہر کو دیکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگے کی دنیا اور بھی خوب صورت ہوگی۔ ہمیں دنیا کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھنا چاہیے۔"

وہ اس کا بازو تھام کر بولی۔ "لیکن مراد... اپنے دل جلالی گوٹھ میمن گوٹھ اور کراچی کی گلیوں میں اٹکا رہے گا۔ اگر بیچ میں سمندر نہ ہوتا تو میں اکیلی دوڑتی ہوئی سوہنی دھرتی تک پہنچ جاتی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "سوہنی دھرتی کی چھپکلی اور چاچا کے نیچے کھنچنے سے ڈر جاؤ گی۔ چلو تمہیں شاپنگ کرا دوں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اور اپنے بیٹے کو بھول گئے۔ میں اس کے لیے ایسے کھلونے خرید کر لے جاؤں گی جو وہاں کسی اور بچے کے پاس نہیں ہوں گے۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "تم میرے دماغ میں سوئی رہتی ہو۔ بچے کو تم ہی یاد رکھا کرو۔"

وہ کمرے سے نکل کر ہوٹل کے باہر آئے پھر اپنی کار میں بیٹھ کر جانے لگے۔ ایسے وقت مسلح گارڈز کی دو گاڑیاں ان کے آگے پیچھے چلنے لگیں۔ ماروی نے کہا۔ "یہ ہماری سلامتی کے لیے چل رہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ کیا موت اپنے مقررہ وقت پر آئے گی تو یہ بچا سکیں گے؟"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے ہنستے ہوئے بولا۔ "موت سے کون بھاگ سکتا ہے۔ اس کا ایک دن مقرر ہے۔ اتنا یقین ہے کہ آج کا دن ہماری موت کے لیے مقرر نہیں ہے۔ انشاءاللہ ہم بخیریت ہوٹل واپس جائیں گے۔"

اس نے ایک سات منزلہ شاپنگ پلازا کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ مختلف ممالک کے باشندے نظر آرہے تھے۔ وہ کار سے اتر کر عمارت کے اندر آئے پھر خودکار زینوں کے ذریعے مختلف فلور کی دکانوں میں جا کر من پسند چیزیں خریدنے لگے۔

ماروی ایک دکان میں آ کر کھلونے پسند کرنے لگی۔ مراد شوکیس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک گولی اس کے کان کے قریب سے گزرتے ہوئے شوکیس میں لگی۔ اس کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر فرش میں آنے لگا۔

وہ پھرتی سے چھلانگ لگا کر ماروی کے پاس پہنچ گیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا ایک دیوار کی آڑ میں کھینچ کر لے گیا۔ وہ بڑی گڑبڑی بھی محفوظ نہیں تھی۔

کسی نے سائلنسر لگے ہوئے ہتھیار سے فائر کیا تھا۔ وہ اپنے لباس سے ریوالور نکال کر دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا، اس کے گارڈز بھی ادھر ادھر دوڑتے ہوئے کسی فائر کرنے والے کو تلاش کر رہے تھے۔

ماروی کو بولو نے کہا تھا کہ اس کے علاقے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ ماروی کے ساتھ آزادی سے کھلی فضا میں گھومتا رہے گا لیکن موت وہاں بھی پہنچ گئی تھی۔

مراد نے ماروی کو تھپک کر کہا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہاں بے خوف و خطر آرام سے چھپ کر کھڑی رہو۔ میرے پیچھے نہ آنا۔"

اس بار کہیں قریب سے فائر کی آواز گونجی۔ تب خریداروں کو پتا چلا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ لوگ چیختے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ایسی بھگدڑ شروع ہوئی کہ دکانوں سے باہر رکھے ہوئے قیمتی سامان لوگوں سے ٹکرا کر گرنے اور دور تک بکھرنے لگے۔

مراد وہاں سے نکل کر دوڑتا ہوا سامنے والی دکان کے ستون کے پاس جا کر رک گیا۔ اس نے ایک شخص کو دوسرے کوریڈور میں بھاگتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ مراد نے گولی چلائی لیکن وہ دوسری طرف نکل گیا۔

خریدار وہاں سے بھاگتے ہوئے دوسرے فلور میں چلے گئے تھے۔ ابھی کچھ سہمے ہوئے لوگ وہاں تھے، موقع دیکھ کر لفٹ کی طرف یا خودکار زینے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ایسے ہی وقت ایک جوان عورت بھاگ رہی تھی۔ گولی چلی تو وہ چیختی ہوئی لڑکھڑاتی ہوئی مراد کے پاس آگئی۔ مراد نے اسے گرنے سے پہلے دونوں بازوؤں میں سنبھال کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسے ستون کی آڑ میں لے لیا۔

ماروی کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ وہ دکان میں چھپی ہوئی سامنے مراد کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے حسینہ کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے لگے کھڑے تھے۔ کچھ بول رہے تھے اور ماروی کے دل پر قیامت گزر رہی تھی۔

یہ ان کی مجبوری تھی۔ یہ ضروری تھا کہ ستون کی آڑ میں فائرنگ سے بچنے کے لیے ایک دوسرے سے لگ کر رہیں ورنہ کوئی گولی دائیں بائیں سے آ کر لگ سکتی تھی۔

وہ مراد سے لگ کر اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ وہ

اسے چیک کرنے سنبھالا تو اوندھے منہ گر پڑتی اور کوئی گولی اسے لگ سکتی تھی۔ ادھر ماروی سوچ رہی تھی۔ ”یہ کون ہے؟ مراد اسے ضرور جانتا ہے۔ تب ہی اس سے لگ کر باتیں کر رہا ہے۔“

مراد الجھ رہا تھا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ ماروی دیکھ رہی ہوگی اور غصہ ہو رہی ہوگی۔ ایسے وقت اس عورت کے موبائل سے رنگ ٹون ابھری۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر بےزاری سے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ ادھر گولیاں چل رہی ہیں۔ کیا مجھے یہاں سے نکال کر لے جا سکتے ہو؟“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”فون اس آدمی کو دو۔“

اس نے پوچھا۔ ”کس آدمی کو؟“

”اس کو دو جس سے لگ کر کھڑی ہوئی ہو۔“

اس نے مراد کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کون ہے؟ میرے فون پر تمہیں کال کر رہا ہے؟“

مراد نے غور کر فون کو دیکھا پھر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ”ہیلو کون ہو تم؟“

سخت لہجے میں کہا گیا۔ ”تمہاری موت۔ اس وقت تم میرے نشانے پر ہو۔ میں اس عورت کے ساتھ تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ ابھی گولی نہیں چلاؤں گا۔ اگر سچ بتا دو کہ تم کون ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ پرامن شہری ہوں۔ تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو؟“

”تم عام سے آدمی نہیں ہو۔ ماسٹر کوبوبو سے ایسا کیا گہرا تعلق ہے کہ وہ تمہیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہا ہے۔ وہ ہوٹل دنیا کے سب سے مہنگے ہوٹلوں میں سے ایک ہے وہ ایسی مہنگی جگہ میزبانی کر رہا ہے۔ کم آن ہری اپ۔ جلدی بولو کون ہو؟“

”میں سچ بولوں گا۔ پہلے تم سچ بولو۔ تمہیں اس عورت کا فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟“

وہ غصے سے بولا۔ ”وقت ضائع نہ کرو۔ میرے سوال کا جواب دو۔ میں تین تک گن رہا ہوں۔ اس کے بعد گولی ماردوں گا۔ حرام موت نہ مرو۔“

مراد تیزی سے دور تک اوپر نیچے نظریں دوڑا رہا تھا۔ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ٹارگٹ کلر کہاں چھپا ہوا ہے؟

پھر اس نے دیکھ لیا۔ ایک دکان کی چھت پر مچان بنی ہوئی تھی وہ وہاں چھپا ہوا تھا۔ اس کا جھانکتا ہوا سر تھوڑا سا نظر آ رہا تھا۔ مراد نے اس عورت کے بازو کو سختی سے پکڑ کر پوچھا۔ ”تم بولو اسے تمہارا فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟“

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں جانتی وہ کون ہے اور میرا فون نمبر کیسے جانتا ہے۔“

فون سے اس شخص کی آواز ابھری۔ ”اسے چھوڑ دو وہ تمہیں نہیں جانتی۔ کیا تم حرام موت مرنا چاہتے ہو؟“

مراد نے اس عورت کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اپنے آگے ڈھال بناتے ہوئے کہا۔ ”اب چلاؤ مجھ پر گولی۔ پہلے یہ مرے گی۔ تم اسے نہیں جانتے۔ یہ تمہیں نہیں جانتی۔ کم آن چلاؤ گولی...“

وہ تڑپتی ہوئی مچلتی ہوئی چیخ رہی تھی۔ ”چھوڑ دو مجھے۔ مجھے چھوڑ دو جانے دو۔“

مراد نے فون پر کہا۔ ”گولی کیوں نہیں چلاتے؟ تمہاری کوئی نہیں ہے۔ یہ مرے گی تو دوسری گولی مجھے لگے گی۔“

”نہیں۔ میں گولی نہیں چلاؤں گا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے بارے میں صحیح معلومات حاصل کروں۔ اسے چھوڑ دو۔ میرے نشانے سے ہٹ جاؤ۔ چلے جاؤ تم دیکھو گے میں گولی نہیں چلاؤں گا۔“

”میں تمہارے نشانے پر رہوں گا۔ یہ میرے نشانے پر رہے گی۔ اسے زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو بولو۔ کس کے حکم سے مجھے گھیرنے آئے ہو؟ کون معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میں کون ہوں؟“

وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ چپ ہو گیا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”اور میں تمہاری یہ خوش فہمی ختم کر دوں کہ یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گے۔ میں تمہیں اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں اس مچان سے اترنے نہیں دوں گا۔“

دوسری دکانوں کے پاس دو گارڈز مورچہ بنائے ہوئے تھے۔ مراد نے چیخ کر ان سے کہا۔ ”میرے سامنے والی دکان کے مچان پر نظر رکھو۔ دشمن وہاں چھپا ہوا ہے اور اس کی ایک گن یہاں میری گرفت میں ہے۔“

ایک گارڈ نے اسے للکارا۔ ”ہتھیار پھینک کر نیچے آؤ۔ ہم گولی نہیں چلائیں گے۔“

دوسرے گارڈ نے کہا۔ ”تمہارا ایک ساتھی گولی کھا کر زخمی ہو گیا ہے۔ تیسرا فرار ہو رہا تھا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اپنے ساتھی کی طرح زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہتھیار پھینکو اور نیچے آ جاؤ۔“

اس کے سامنے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے ہتھیار پھینک کر مچان سے اتر کر گرفتاری پیش کر دی۔ وہ عورت اس کی محبوبہ تھی۔ انہیں مقامی پولیس نے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔

انہوں نے بیان دیا کہ وہ مینگی براؤن کے تابعدار ہیں۔ مینگی یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ماسٹر کوبوبو کا وہ خاص مہمان کون

ہے؟ اسے شبہ ہے کہ وہ کوئی اور نہیں، مراد ہی ہے۔

میکی کے تابعدار اس وی آئی پی بننے والے مہمان کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے اسے چھیڑنے اور گن پوائنٹ پر کھینس نے جاکر اصلیت اگلوانے آئے تھے اور ناکام رہے تھے اور ناکامی کا مطلب یہ تھا کہ وہ حرام موت مارے جانے والے تھے۔

ماسٹر کو بوبو ہوش آگیا تھا۔ ان کے لیے سزائے موت کا حکم سنا کر ماروی اور مراد کو اپنی کار میں لے آیا۔ ان کے ساتھ ہوٹل میں آکر بولا۔ ''میکی براؤن کے کتے یہاں میرے وفادار بن کر مجھے دھوکا دینے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ میرے جاسوس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتارتے رہتے ہیں۔ اگر اب بھی اس کے کتے یہاں رہ گئے ہیں تو وہ بھی حرام موت مریں گے۔''

وہ مطمئن ہوکر بولا۔ ''مراد! آج سے چار دن بعد تم شملہ جاؤ گے۔ پھر دس دنوں بعد جیکی کو کسی ملک میں ٹریپ کرو گے جس دن اس کی بیٹی اور بیٹے کو جہنم میں پہنچاؤ گے، اس دن سے براؤن میکی کی کمر ٹوٹ جائے گی اور وہ دن جلد ہی آرہا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''دس دنوں کے بعد آپ کے بدترین دشمن کی قوت آدھی سے بھی آدھی رہ جائے گی۔''

ماسٹر تھوڑی دیر تک باتیں کرتا رہا پھر چلا گیا۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں آگئے۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مراد نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ ''میں ابھی آرہا ہوں۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ ماروی نے ناگواری سے پوچھا۔ ''پھر وہی سیکرٹ کال آئی ہے؟''

''ہاں تم آرام کرو۔ میں ابھی آجاؤں گا۔''

وہ اس کے ساتھ دروازے تک آئی۔ اس نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''دروازہ اندر سے بند کرلو۔''

ماروی نے دروازہ لگا دیا لیکن اسے اندر سے بند نہیں کیا۔ دروازے سے لگی کھڑی رہی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اندر رہے یا باہر نکل جائے؟

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا۔ جب بھی وہ سیکرٹ کال آتی تھی، اس کی بے اطمینانی اور بے چینی بڑھ جاتی تھی۔ دل میں ہلچل سی ہوتی رہتی تھی۔ آخر وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

وہ کیبن کے اندر آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ریسیور کان سے لگائے بول رہا تھا۔ باتیں کرنے کے دوران بیچ

سر گھما کر دیکھنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ مرینہ سے کہہ رہا تھا۔ ''میں تمہیں شام کو کال کرنے والا تھا، ایک اچھی خبر ہے۔ تمہاری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔''

وہ مزہ آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''میری تو ایک ہی خواہش ہے... ہم ہمیں آزادی سے ملتے رہیں۔''

''اور یہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔ میں آج سے چوتھے دن انڈیا جا رہا ہوں۔ تم بھی وہاں پہنچو۔''

وہ اسے ایمان علی اور میڈونا کے رومانس کے متعلق بتاتے ہوئے بولا۔ ''میکی نے بیٹی کے لیے شملہ میں ایک کاٹیج لیا ہے اور زبردست سیکیورٹی کے انتظامات کر رہا ہے۔ وہاں ہمیں اپنا گیم کھیلنا ہے۔ تم مجھ سے پہلے وہاں پہنچو اور ان کا ترم سیٹ اپ معلوم کرو کہ میڈونا کی سیکیورٹی کے لیے کیا کیا جا رہا ہے۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''مزہ آئے گا۔ ادھر ایمان علی اور میڈونا کا رومانس ہوگا۔ ادھر ہمارا...''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اور دونوں طرف رومانس کے دوران گولیاں چلیں گی۔ ہم میکی براؤن کو ہلا دیں گے۔''

وہ خوش ہورہی تھی لیکن مراد فکر میں مبتلا ہوگیا۔ سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ مرینہ نے ایک ذرا انتظار کے بعد پوچھا۔ ''چپ کیوں ہوگئے؟ کچھ سوچ رہے ہو؟''

''مرینہ! میں نے اپنے رب سے وعدہ کیا ہے۔ کبھی گناہ کا ارادہ بھی نہیں کروں گا۔ وہاں تم دن رات میرے ساتھ رہوگی۔'' وہ پریشان ہوکر بولا۔ ''یا خدا... میں کیا کروں؟ میں آزمائش میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

اس نے سمجھایا۔ ''ہماری قربت کو مسئلہ نہ بناؤ۔ یہ سمجھو کہ ہمیں آئندہ نہ جانے کتنے معاملات میں ساتھ رہنا ہے۔ ہم لازم و ملزوم ہوگئے ہیں۔ ایسے وقت نہ میں تمہارے بغیر رہ سکوں گی اور نہ تم مجھ سے دور رہ سکو گے۔''

''یہی تو مسئلہ ہے، میں بھی تم سے دور نہیں رہ سکوں گا۔''

اس نے اپنے دل کی بات کہی۔ ''مراد..... یہ اچھا ہے، خدا سے ڈرو۔ گناہوں سے باز رہنے کے لیے مجھ سے نکاح پڑھوالو۔''

دل میں یہی بات تھی۔ وہ قائل ہوکر بولا۔ ''میں بھی سوچ رہا ہوں۔ یہ ایک دو دن کا معاملہ نہیں ہے۔ پتا نہیں، ہمیں کتنی لمبی زندگی گزارنی ہے۔ تم مجھ سے پہلے دہلی پہنچو۔ ڈاکٹر یحییٰ من اور ایمان علی سے مل کر نکاح پڑھوانے کے انتظامات کرو۔ میں وہاں آکر تمہیں اپنی منکوحہ بنالوں گا۔''

یکبارگی اس کے پیچھے جیسے دھماکا ہوا۔ ماروی نے حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے کہا۔ ''نہیں.....''

اس نے ایک دم سے اچھل کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے کیبن کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ شدید کرب میں مبتلا ہوگئی تھی۔ غم و غصے سے دونوں مٹھیاں بھینچ کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ''نہیں! اتنا بڑا دھوکا.....؟''

''آہ.....آہ.....!'' اس کے حلق سے آہیں سی نکل رہی تھیں جیسے دم نکل رہا ہو۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے تھے۔ وہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اس سے دور ہو رہی تھی اور چیختی جا رہی تھی۔ ''نہیں.....نہیں، میں مر جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی.....''

وہ پریشان ہوگیا۔ یہ اچانک توقع کے خلاف ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھید اس طرح کھل جائے گا۔ وہاں کھڑی ہوئی دو کنیزیں اور حبشی غلام بھی پریشان ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔

اس نے ندامت سے جھجکتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''چپ ہو جاؤ ماروی.....! اس طرح نہ چیخو۔ دیکھو یہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کمرے میں چلو.....''

وہ اسے منانے کے لیے قریب آنا چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ کر ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ ''دور ہو جاؤ۔ مجھے ہاتھ لگاؤ گے تو میں جل جاؤں گی۔ اتنا بڑا دھوکا... یا اللہ...! میں آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے کانوں سے سنا ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے...''

وہ اور پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''تم مکار ہو۔ مجھ پر جان دینے والا مراد مر گیا ہے۔ تم مراد نہیں ہو۔ بازاری مرد ہو۔ بازاری مرینہ کے ساتھ مرتے رہو گے۔''

وہ دونوں بازو پھیلا کر اسے پیار سے پچکارنے لگا۔ ''خدا کی قسم تم میری جان ہو۔ یہاں میری عزت کا خیال کرو۔ خدا کے لیے اس طرح نہ چیخو۔ میرے پاس آؤ۔''

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ پلٹ کر بھاگتی ہوئی قریبی لفٹ میں جا کر بند ہوگئی۔ وہ لفٹ نیچے جانے لگی۔

اس نے پریشان ہو کر سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگائی۔ پھر وہاں پہنچ کر کئی پائدانوں پر چھلانگیں لگاتے ہوئے تمام سیڑھیوں سے اترتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر پہنچا۔

وہ دوڑتی جا رہی تھی اور چیخ چیخ کر بولتی جا رہی تھی۔ ''چاچی! میں دھوکا کھا گئی چاچی.....! مجھے آکر لے جاؤ۔ میں اکیلی ہوگئی ہوں چاچی...! میری ماں! مجھے تمہاری ممتا بھری گود یاد آرہی ہے۔ میں کیسے تمہارے پاس آؤں.....؟ میرے چاروں طرف بدمعاشوں کی دنیا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ چاچی.....! میں کیسے آؤں.....؟''

ہوٹل کی عورتیں اور مرد آتے جاتے رک گئے تھے۔ اس کی زبان نہیں سمجھ رہے تھے۔ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے تماشا بن گئی تھی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی کہ دنیا کیا دیکھ رہی ہے اور کیا سمجھ رہی ہے؟ وہ چیختی ہوئی بھاگتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔ ''میرے چاروں طرف بدمعاشوں کی دنیا ہے چاچی...! میں یہاں نہیں رہوں گی۔ ہائے چاچی...! تمہارے پاس کیسے آؤں؟''

مراد چھلانگیں مارتا ہوا قریب آگیا۔ پھر اس کے سامنے ہو کر راستہ روکتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ تم مجھ سے نفرت کرو۔ مگر رک جاؤ۔ یہ تماشا نہ کرو۔''

وہ کترا کر دوسری طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''ایک زمانے سے جھوٹ بولتے آرہے ہو کہ مرینہ کو چھوڑ دیا ہے۔ نمازیں پڑھتے ہو اور جھوٹ بولتے ہو۔''

وہ دونوں ہاتھ پھیلائے راستہ روکے ہوئے تھا۔ وہ روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''جس نے تمہارے لیے ساری دنیا چھوڑ دی اسے ہمیشہ سے دھوکا دیتے آرہے ہو۔ کہاں لاکر جان نکال رہے ہو؟ اب انڈیا جا کر اس سے نکاح پڑھانے والے ہو..... میں نفرت کرتی ہوں تم سے... تھوکتی ہوں تم پر.....''

تھوکنے والی بات ایسی تھی کہ وہ غصے سے اچھل کر سامنے آگیا۔ پھر اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔

اور کیا کرتا؟ کبھی اسے پھول سے بھی نہ مارتا لیکن وہ قابو میں نہیں آرہی تھی۔ ایک ہاتھ پڑتے ہی اس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑائی اس کی ناک سے لہو بہنے لگا تھا۔

وہ پوری طرح حواس کھو چکی تھی۔ خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟ بس ایک ہی ضد تھی کہ اس بے وفا سے دور بہت دور ہو جانا ہے۔

جب مراد کا ایک ہاتھ پڑا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے ایک طرف گری اور فوارے کے چبوترے سے ٹکرا گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مراد نے دیکھا اس کا جسم یکلخت ساکت ہوگیا تھا۔ وہ فرش پر گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کی پیشانی اور چہرہ لہو سے بھیگ

رہا تھا۔

مراد نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مریتہ سے تعلقات کا بھید کھلے گا تو ماروی غصے سے پاگل ہو جانے کی اور اسی لیے میں اسے چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں۔ اس کی حالت آتش دیدہ تھی۔ اس کی ناک سے اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

اس مہنگے ہوٹل میں طبی سہولتیں موجود تھیں۔ اسے فوراً ہی اسٹریچر پر ڈال کر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے اٹینڈ کیا۔ وہ جلد ہی ہوش میں آ گئی۔

اس نے آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھا۔ چند لمحوں تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے اور اس پر کیا گزر چکی ہے؟

وہ خوابیدہ سی تھی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مراد دور کھڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھ چکا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر طیش میں آ جاتی تھی اور اس سے دور بھاگ رہی تھی۔ اس لیے قریب نہیں جا رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''کیا یہ سو گئی ہے؟''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس پر نیم بے ہوشی طاری ہے۔ رفتہ رفتہ پوری طرح ہوش میں آ جائے گی۔''

ایک کارندے نے ماسٹر کو بو یو کو اطلاع دی تھی کہ مسز ایمان علی ایبنارمل ہو گئی ہیں اور اس وقت ہوٹل میں بے ہوش پڑی ہیں۔

ماسٹر بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس نے ماروی کو دیکھا پھر مراد سے پوچھا۔ ''یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟ ابھی ایک گھنٹہ پہلے میں یہاں سے گیا تو یہ نارمل تھی۔''

مراد نے کہا۔ ''بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے میری اور مریتہ کی فون کال سن لی ہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''او گاڈ... یہ تو بڑی گڑبڑ ہوئی۔ اسے کسی طرح سمجھاؤ۔ کسی طرح نارمل رکھو۔''

''بہت مشکل ہے۔ میں نے اسے کبھی اس طرح جنون میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے میں کیا کروں؟ اسے کیسے نارمل رکھوں؟ یہ محبت کرنے والی اچانک ہی مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔''

''یہ پرابلم بن کر رہے گی تو کیا کرو گے؟ تمہیں ایک نئی دو مشن پر جانا ہے اور دونوں ہی اہم ہیں۔ تم ایزی رہو گے تب ہی میگی برادران کو ان کی تمام فیملی سمیت ختم کر سکو گے۔''

اسی وقت ماروی کی کراہ سنائی دی۔ وہ دونوں بیڈ کے قریب آئے۔ وہ کراہتے ہوئے زیرِ لب کچھ کہہ رہی تھی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی یاد نہیں آیا کہ کیا ہوا تھا اور ابھی وہ کہاں ہے؟

وہ دونوں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر یکلخت اسے یاد آ گیا۔ وہ اندر سے لرز گئی۔ اچھل کر بیٹھ گئی۔

یوں بیٹھتے ہی مراد نظر آیا تو اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئی اچھل کر بیڈ کے دوسری طرف چلی گئی۔ ''دور ہو جاؤ۔ تمہارا سایہ بھی مجھ پر پڑے گا تو میں ناپاک ہو جاؤں گی۔ عورتوں کے بازار میں غلاظت بھری دنیا میں رہنے والے... تم مجھے دھوکے سے یہاں لے آئے ہو۔ خدا کی قسم! مر جاؤں گی مگر یہاں نہیں رہوں گی۔''

ماسٹر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''پلیز چپ ہو جاؤ۔ میری بات سنو۔ تم میری بیٹی ہو...''

''بیٹی؟ تمہاری اپنی بیٹی کا شوہر اس کے اعتماد کو دھوکا دے گا، کسی دوسری عورت کے پاس جانے گا تو تم کیا کرو گے؟ بولو کیا کرو گے؟ اس کے شوہر کے ساتھ جو سلوک کرو گے، پلیز وہی اس کے ساتھ کرو۔''

''پلیز! میں تمہاری تمام شکایتیں دور کروں گا۔ اس طرح نہ چلاؤ۔ پہلے ایزی ہو جاؤ۔''

وہ ذرا نارمل ہو کر بولی۔ ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایزی ہو جاؤں تو دروازے سے ہٹ جائیں۔ مجھے جانے سے روکا جائے گا تو ابھی اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔''

مراد نے پوچھا۔ ''اس اجنبی شہر میں اکیلی کہاں جاؤ گی؟''

وہ ماسٹر سے بولی۔ ''اس آدمی سے بولو، یہ مجھ سے نہ بولے۔ میری نظروں سے دور ہو جائے۔ میں یہاں سے ابھی ایئرپورٹ جاؤں گی۔ جب تک پاکستان جانے کے لیے سیٹ نہیں ملے گی میں یہاں کا ایک دانہ منہ میں نہیں رکھوں گی۔ یہاں کا ایک گھونٹ پانی نہیں پیوں گی۔''

وہ دروازے کی طرف جانے لگی۔ مراد نے دونوں ہاتھ پھیلا کر راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ''میں راستہ نہیں روکوں گا۔ تم ابھی جاؤ گی۔ جب میں کہہ رہا ہوں تم جاؤ گی تو پھر ضرور جاؤ گی۔ لیکن میری بات سن لو۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ تو کہنے دو۔''

''تم کیا صفائی پیش کرو گے؟ میں پوچھتی ہوں بولو کیا خرد بُرد کیا اس دنیا کو ابھی چھوڑ کر یہاں سے چلو گے؟ نہیں چلو گے۔ کیونکہ اب شرافت سے رہو گے تو دشمن تمہیں کہیں جینے نہیں دیں گے اور ایسی زندگی گزارنے کے لیے مریتہ جیسی عورتیں تمہاری زندگی میں آتی رہیں گی۔ تم اس سے نکاح ضرور پڑھواؤ گے۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”اسے مفقود نہیں بناؤں گا۔ کبھی اس کو تم نہیں دیکھوں گا۔“

”شادی سے پہلے تم یہی جھوٹ بولتے رہے تھے کہ مرینہ کو چھوڑ چکے ہو۔ تم نے محبوب جیسے فرشتے سے مجھے دور کر دیا۔ تم نے بوسے مراد کا فریب دیا۔ میں نے تمہارا ساتھ دیا۔ اس فرشتے کو دھوکا دیا۔ اس کی توہین کی۔ مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔ میں اپنے وطن سے دور، اپنی ماں جیسی چاچی سے دور ہو کر یہاں اکیلی ہو گئی ہوں۔“

”تم اکیلی نہیں ہو۔ میں مرتے دم تک تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ صرف ایک بار مجھ پر بھروسا کرو۔ چاہے جیسی بھی قسم لے لو۔ اب مرینہ کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔“

”اگر سچے ہو تو قسم نہ کھاؤ۔ اگر ایمان والے ہو، خدا سے ڈرتے ہو تو بولو۔ مجھے دھوکا دے کر یہاں کیوں لائے ہو؟ تم نے کیوں مجھ سے دشمنی کی ہے؟ تمہارے پاس میرے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ آئندہ شریفانہ زندگی گزارنے کی کوئی ضمانت نہیں دے سکو گے اور میں تم سے کیوں پوچھ رہی ہوں؟ بہت ہو چکا۔ مجھے راستہ دو۔ آخری بار کہتی ہوں مجھے جانے دو۔ نہیں تو میں سر پٹخ پٹخ کر مر جاؤں گی۔“

یہ کہتے ہی اس نے دوڑتے ہوئے جا کر سامنے کی دیوار پر اپنا سر دے مارا۔ ایک زوردار آواز کے ساتھ سر ٹکرایا، وہ پیچھے کی طرف الٹ کر فرش پر گر پڑی..... وہ بے شک جنون میں مبتلا ہو چکی تھی۔ کسی کی سننے والی نہیں تھی۔

مراد اور ماسٹر اس کے پاس دوڑتے ہوئے آئے۔ پہلے ہی اس کی پیشانی زخمی تھی۔ دوسری بار چوٹ لگی تو سر چکرانے لگا۔ مراد نے اسے تھام کر وہاں سے اٹھانا چاہا تو وہ نقاہت کے باوجود چیخ پڑی۔ اپنی پیشانی کو فرش پر مارنے لگی۔

نتیجہ ظاہر تھا، وہ دوسری بار بے ہوش ہو گئی۔ ڈاکٹر پھر آ گیا۔ پھر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

ماسٹر نے کہا۔ ”مراد! اب یقین کر لو کہ یہ تم سے نفرت کر رہی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کو ایسی نفرت کرتے نہیں دیکھا۔ تم اسے ہاتھ لگاتے ہو تو یہ جنون میں مبتلا ہو جاتی ہے۔“

ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگایا۔ خاصی دیر تک وہاں بیٹھا اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ اسے چیک کرتا رہا پھر بولا۔ ”اسے ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اگر اسے نارمل نہ رکھا گیا تو یہ ذہنی مریضہ بن جائے گی۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”یہ نہیں نہیں چاہتی۔ تم تو اسے جانتے

ہو۔ لہٰذا اس کی سلامتی چاہتے ہو تو اس کے سامنے نہ آؤ۔ یہ پاکستان جانا چاہتی ہے۔ اسے جانے دو۔ یہ تم سے دور رہ کر نارمل ہو جائے گی۔ تب تم اسے پھر سے دوست بنانے کی کوشش کرو۔"

وہ سر جھکا کر کمرے سے باہر آ گیا۔ ایک جگہ بیٹھ کر سوچنے لگا' وہ اپنے حالات سے مجبور ہو کر مرینہ کو اپنی منکوحہ بنانا چاہتا تھا۔ مجرموں سے نمٹنے کے دوران وہ ہمیشہ ساتھ رہنے والی تھی اور نکاح کے بغیر ساتھ رہ کر وہ گناہ کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ جب ماروی کو معلوم ہوگا تو وہ غصہ دکھائے گی۔ عام بیویوں کی طرح جھگڑا کرے گی۔ پھر ہار کر سوکن کو برداشت کرلے گی۔

اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ ماروی جیسی شریف زادیاں جب ٹوٹ کر کسی کو چاہتی ہیں تو اس کا جھوٹ اور فریب برداشت نہیں کرتیں۔

اس نے مراد کی خاطر اب اپنی عاشق کو چھوڑ دیا۔ ماں کا پیار دینے والی چاچی سے دور ہو گئی۔ اس نامراد کی خاطر پاک وطن کی دھرتی سے دور چلی آئی۔ اتنی محبت کا اور اندھے اعتماد کا صلہ پیار کی سچائی سے ملنا چاہیے تھا۔ وہ ایک اجنبی ملک میں بالکل تنہا ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس کا جنون میں مبتلا ہونا ایک فطری امر تھا اور جنون بتا رہا تھا کہ اسے اس کے حال پر نہ چھوڑا گیا تو وہ آئندہ ذہنی مریضہ بن جائے گی۔

ماسٹر نے کمرے سے باہر آ کر کہا۔ "وہ ہوش میں آ گئی ہے اچھا ہوا تم یہاں آ گئے۔ ورنہ پھر خود کو نقصان پہنچاتی۔ ویسے مشکلات پیدا کر رہی ہے۔ دوا نہیں کھا رہی ہے۔ کمزوری کے باوجود ائرپورٹ جانے کی ضد کر رہی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے اس کی ہر بات مانتے رہو۔ ورنہ وہ پھر مسائل پیدا کرے گی۔ پھر بے ہوش ہو جائے گی۔"

وہ بولا۔ "ماسٹر! میں بہت مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ اسے ائرپورٹ لے جائیں۔ کسی بھی پہلی فلائٹ میں سیٹ حاصل کریں۔ یہاں آپ اسے جہاز میں بٹھائیں گے وہاں چاچی اسے لینے ائرپورٹ آ جائیں گی۔"

ماسٹر نے کہا۔ "وہ میرے ساتھ ابھی یہاں سے جائے گی۔ تم چھپ جاؤ۔ اس کے سامنے نہ آؤ۔"

مراد کے دل سے ایک آہ نکلی۔ "آہ! مجھ سے کتنی نفرت کرنے لگی ہے؟ کیا میں پھر سے اس کے دل میں جگہ بنا سکوں گا؟"

وہ وہاں سے اٹھ کر ہوٹل کے باہر آ گیا۔ اپنی کار میں بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ ماروی ماسٹر کے ساتھ باہر آ کر اس کی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کار کے پیچھے جانے لگا۔

اب اس بچھڑنے والی کی قدر و قیمت معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہ آسانی سے ہاتھ آنے والی بیوی نہیں رہی تھی پھر ایک بار دور سے للچانے والی محبوبہ بن گئی تھی۔ دل بھی کیا تماشے کرتا ہے۔ اس وقت بے اختیار اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

ائرپورٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ دوسری صبح آٹھ بجے کی فلائٹ میں سیٹ مل گئی ہے۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ ماسٹر نے ڈنر کے لیے کہا۔ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ دھوکا دے کر مجھے یہاں لایا ہے۔ میں یہاں کا پانی بھی نہیں پیوں گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو' کیا کل صبح تک بھوکی پیاسی رہو گی؟"

"آپ فکر نہ کریں' ہم مسلمان تیس دنوں تک روزہ رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے بھوک پیاس کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں کل جہاز میں کھانے پینے تک زندہ رہوں گی۔"

"پلیز! تم مراد کو غصہ دکھاؤ۔ میرے ملک کے دانے پانی سے انکار نہ کرو۔"

"میرا فیصلہ اٹل ہے۔ میں پاکستان کے سوا ہر اس ملک سے نفرت کرتی رہوں گی' جہاں وہ جاتا رہے گا۔ وہ جس ملک کی زمین پر رہے گا میں وہاں کی ہوا میں سانس بھی لینا نہیں چاہوں گی۔ ماسٹر! مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ پلیز! آپ اب جائیں۔ میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

وہ اسے ٹکٹ، پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات دے کر عمارت سے باہر مراد کے پاس آ گیا۔ اس نے کہا۔ "ماسٹر! آپ جائیں آرام کریں۔ جب تک یہ جہاز میں بیٹھ کر نہیں جائے گی، میں یہیں رہوں گا۔"

وہ ویٹنگ ہال کی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چاچی سے رابطہ کیا۔ پھر جیسے بہت دنوں کے بعد ایک ماں کی آواز سن کر رو پڑی۔ چاچی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟ مراد خیریت سے ہے نا؟"

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں کل آ رہی ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا سچ کہہ رہی ہو؟ اچانک آ رہی ہو؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟ کہیں ماں بننے والی تو نہیں ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ مجھے لینے آئیں گی نا؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ابھی تمہارے چچا کے ساتھ گھر سے نکلوں گی تو صبح کراچی پہنچوں گی۔

تمہارا جہاز کس وقت آئے گا؟"

"میں صحیح وقت معلوم کرنے کے بعد فون کروں گی۔"

"کیا تمہارے لاڈلے شہزاد کو بھی لے کر آؤں؟"

شہزاد!... مراد کا بیٹا... جسے وہ دن رات کلیجے سے لگائے رکھتی تھی۔ ابھی باپ سے نفرت کرتے وقت بیٹے کو بھول گئی تھی۔ اب دل نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیا اس بے وفا فریبی کی اولاد سے بھی نفرت کر سکے گی؟"

نہیں بچہ تو معصوم تھا۔ اس سے بھی منہ نہیں پھیر سکے گی۔ لیکن ایک مشکل نظر آ رہی تھی۔ بیٹے کو پیار کرے گی تو باپ چپکے سے یاد آتا رہے گا۔

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ چاچی نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو گئیں؟ کیا شہزاد یاد نہیں آتا ہے؟"

وہ سرد لہجے میں بولی۔ "بہت یاد آتا ہے۔ لیکن اسے کراچی نہ لانا۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ شہزاد نگاہوں کے سامنے دکھائی دینے لگا۔ وہ سوچنے لگی فی الحال بچے سے دور رہے گی۔ مراد کو کسی بھی بہانے اپنی زندگی میں آنے نہیں دے گی۔

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ننھی سی اسکرین پر محبوب کا نام روشن تھا۔ اس نے محبوب سے کہا تھا کہ وہ سمیرا سے شادی کر لے اور اس نے کہا تھا وعدہ کرو کبھی مراد کے ساتھ نہ رہ سکو، اس سے علیحدگی ہو جائے تو تم میرے پاس آؤ گی۔

ماروی نے سوچا تھا مرتے دم تک مراد سے جدائی نہیں ہوگی۔ وعدہ کرنے میں کیا حرج ہے؟ اور اس نے زبان دی تھی کہ کبھی مراد سے چھوٹ گئی تو سیدھی اس کے پاس آئے گی اور اب وہ وقت آ گیا تھا۔ وہ مراد سے دور ہو رہی تھی۔ یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ مرینہ کے ساتھ رہنے والے کا منہ بھی نہیں دیکھے گی۔ کبھی اس کا نام بھی زبان پر نہیں لائے گی۔

کیا طلاق لے لے گی؟

اندر سے دل رونے لگا۔ پوچھنے لگا۔ "اور کیا کرو گی؟ کیا اس دھوکے باز کے نام سے ساری عمر بندھی رہو گی؟"

اس نے سر کو جھٹک دیا۔ طلاق کے معاملے کو ابھی ملتوی کر دیا۔ دل کہہ رہا تھا، ہوسکتا ہے وہ مرینہ کو چھوڑ کر مجرمانہ زندگی سے توبہ کر کے اس کے پاس چلا آئے۔ اس سے سخت نفرت کرنے کے باوجود دل میں کہیں ایک نرم گوشہ موجود تھا۔

فون چیختے چیختے بند ہو گیا تھا۔ دس منٹ کے بعد پھر پکارنے لگا۔ اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا پھر کہا۔ "السلام علیکم۔"

اس کی آواز سنائی دی۔ "وعلیکم السلام۔ ابھی میں نے تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا ہے۔"

وہ کچھ سمجھ گئی۔ کچھ اور سمجھنے کے لیے پوچھا۔ "کون سا وعدہ؟"

"میں نے سمیرا کو اپنی شریک حیات بنا لیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارا نکاح ہوا ہے۔"

"آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ سمیرا آپ کے پاس ہوگی۔ ان سے بات کرائیں۔"

"وہ ابھی عورتوں میں گھری ہوئی ہے۔ جب رخصتی ہوگی، میرے گھر آئے گی تو بات کراؤں گا۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟"

"کیسا وعدہ؟"

"تم انجان بن رہی ہو۔ میں نے کہا تھا کہ خدانخواستہ کبھی مراد سے بچھڑ جاؤ، کسی وجہ سے علیحدگی ہو جائے تو تم سیدھی میرے پاس آؤ گی۔"

"ہاں۔ آپ نے کہا تھا۔"

"اور تم نے کہا تھا کہ میں سمیرا کو دلہن بنا کر ازدواجی زندگی گزارتا رہوں گا پھر بھی تمہارے ساتھ کوئی ایسا ہوگا تو تم میرے پاس آؤ گی۔"

"آپ نے ابھی ابھی سمیرا کو دلہن بنایا ہے اور ابھی میری تمنا کر رہے ہیں۔ آپ مرد حضرات کیا ہوتے ہیں؟ ایک محبت کرنے والی شریک حیات کی قدر کیوں نہیں کرتے؟ اپنی بیوی کے مقابلے میں پرائی عورت کیوں اچھی لگتی ہے؟"

"تم پرائی تو نہیں ہو۔ میری زندگی میں اول تم ہو آخر تم ہو۔ پرائی تو سمیرا تھی۔ تمہارے ہی اصرار کرنے سے میں نے اسے دلہن بنایا ہے۔ میں نے کبھی تم سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ تم خود گواہ ہو۔ میں زبان کا سچا ہوں۔ میں نے تمہیں زبان دی اور سمیرا کو دلہن بنا لیا۔ آئندہ اس کی قدر کرتا رہوں گا۔ کسی بھی معاملے میں اس کی حق تلفی نہیں کروں گا۔ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتا رہوں گا۔ لیکن دل اور دماغ میں تو تم ہی رہو گی۔"

وہ چپ رہی۔ کیا بولتی؟ وہ مراد کے مقابلے میں سچا اور کھرا انسان تھا۔ ابھی ٹھوکر کھانے کے بعد کھرے اور کھوٹے کا فرق صاف نظر آ رہا تھا۔

اس نے التجا کی۔ "پلیز چپ نہ رہو۔ میری بات کو نہ ٹالو۔ جواب دو۔ وعدہ یاد ہے نا؟ تم نے جھوٹا وعدہ تو نہیں کیا ہے؟"

"میں جھوٹ بولنے سے پہلے خدا سے ڈرتی ہوں۔ اس لیے بے اختیار سچ بول رہی ہوں۔"

"تو پھر سچ بتاؤ۔ اس کے ساتھ خوش ہو نا؟"

وہ ذرا گڑبڑائی۔ ابھی اس نے سچ بولنے کا دعویٰ کیا تھا۔ سچ بولنا تھا۔ اس نے بات دوسری طرف گھمادی۔ اس سے پوچھا۔ "آپ کو یہ شبہ کیوں ہے کہ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہوں گی؟ کیا ابھی روتی ہوئی لگ رہی ہوں؟"

"وہ جیسی زندگی گزار رہا ہے، اس کے پیش نظر میں انتظار کرتا رہتا ہوں کہ جلد ہی تم دونوں کے درمیان رنجش پیدا ہوگی۔"

وہ اس کے حالات سے بے خبر ہونے کے باوجود درست کہہ رہا تھا۔ "روبی... ! مجرم اپنے حالات سے مجبور ہو کر جھوٹ ضرور بولتے ہیں۔ اپنوں کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔"

محبوب نے بڑے یقین سے کہا۔ "میں یہ لکھ کر دیتا ہوں کہ وہ جرائم کی دنیا میں عورتوں سے دور نہیں رہ سکے گا اور تم کسی سوکن کو برداشت نہیں کروگی۔ میں درست کہہ رہا ہوں نا؟"

وہ اس سچائی سے ذرا گڑبڑائی پھر اس نے جلدی سے بات بنائی۔ "یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ کوئی عورت سوکن کو برداشت نہیں کرتی۔ آپ اپنی بات کریں۔ سمیرا کے ساتھ کب ہنی مون کے لیے جا رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟"

"جب تم جاؤ گی اور جہاں جاؤ گی، وہاں ہنی مون کے بہانے تمہیں دیکھنے آجاؤں گا۔"

کیسا دیوانہ تھا۔ پیار کے پہلے دن سے اس کی دیوانگی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس نے ہیرے کی قدر نہیں کی۔ پتھر چن لیا۔

اس نے کہا۔ "میں ہنی مون کے لیے کہیں جا نہیں سکوں گی۔ مراد بڑے ہی سنگین معاملات میں مصروف ہو گیا ہے۔ ہم یہاں سے نکل نہیں پائیں گے۔"

"کیوں جا کر پھنس گئی ہو، روبی! اپنی مرضی سے کہیں جا بھی نہیں سکتی ہو۔ میں تمہارے مزاج کو سمجھتے ہوئے یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے جو پریشانیاں ہوں گی، تم انہیں چھپاؤ گی۔ مجھے نہیں بتاؤ گی۔"

وہ بڑے جذبات سے بولا۔ "میں دل سے چاہتا ہوں کہ مجھے دکھ درد میں اپنا شریک سمجھو۔ کبھی ایک بار کہہ کر تو دیکھو، تمہارے پاؤں میں کانٹا چبھا ہے، میں اسی لمحے میں کانٹا نکالنے دوڑا چلا آؤں گا۔ پاؤں کا کانٹا آنکھوں سے نہیں، اپنے ہونٹوں سے نکالوں گا۔"

روبی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کانا باری طرح بچھ رہا تھا۔ ابھی وہ آواز دیتی تو وہ جاتے دوڑا چلا آتا۔ اسے معلوم ہوتا کہ وہ مراد کو چھوڑ کر آرہی ہے تو وہ خوشی سے ناچنے لگتا۔

وہ سوچنے لگی۔ "مراد بھی یہ نہیں چاہے گا کہ رقیب میرے قریب آئے۔ پہلے میں زندگی بھر مراد سے دور رہوں، وہ محبوب کو میرے قریب برداشت نہیں کرے گا۔ رقابت کی آگ بھڑکے گی اور پیار کے گلزار میں دشمنی کا نیا باب شروع ہو جائے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "روبی! کیا سوچ رہی ہو؟"

اس نے بات بنائی۔ "اپنا وطن یاد آرہا ہے۔"

"تو پھر آجاؤ۔ میں ہنی مون کے لیے کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہاں تمہیں دیکھوں گا۔ ایک دن کے لیے ہی آؤ... مگر آجاؤ۔"

وہ بول نہیں سکتی تھی کہ آرہی ہے۔ اگر کراچی شہر میں اس کی ہلکی... سی خوشبو بھی ملتی تو وہ نئی دلہن کو چھوڑ کر اس کے پیچھے کتوں کی طرح گھومنے لگتا اور یہ مناسب نہ ہوتا۔ سمیرا اس کا حق چھین رہی تھی۔ وہ سمیرا کا حق چھین کر کم ظرفی کا ثبوت دینا نہیں چاہتی تھی۔ یہ مسئلہ پریشان کررہا تھا کہ وہاں محبوب سے کس طرح چھپ کر رہ سکے گی؟

اس نے کہا۔ "میں ابھی نہیں آؤں گی۔ آپ ایمانداری سے اور محبت سے سمیرا پر توجہ دیں۔ مجھ سے فون پر بھی اتنی لمبی باتیں نہ کیا کریں۔ یہ نئی دلہن کے ساتھ سراسر ناانصافی ہوگی۔ میں فون بند کررہی ہوں۔ آئندہ کسی وقت سمیرا سے بات کرائیں۔"

اس نے جواب سنے بغیر رابطہ ختم کردیا۔ مراد وہاں سے دور چھپا بیٹھا تھا۔ اسے بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اب سے چند گھنٹے پہلے وہ گھر کی مرغی دال برابر تھی۔ کیونکہ بیوی ہو گئی تھی۔ اب ایک بار پھر محبوبہ بن کر نا حاصل ہو گئی تھی۔

عورتیں سچ کہتی ہیں کہ مردوں کے منہ میں تر نوالہ نہیں جچتا ہے۔ حلق میں اٹک اٹک کر جانے سے اہمیت قائم رہتی ہے۔

وہ بہت اہم ہوگئی تھی۔ اس کے غصے، جنون اور نفرت نے صاف طور سے سمجھا دیا تھا کہ وہ آئندہ ہاتھ نہ آنے کے لیے جارہی ہے۔ اس وقت ائرپورٹ پر اس لیے بھاگی چلی گئی ہے کہ مراد کے خلاف احتجاج کررہی ہے۔ وہ اس حد تک پانی بھی نہیں پی رہی تھی جس حد تک جھوٹے [illegible] اسے ختم کردیا تھا کہ اب وہ کسی بھی

قیمت پر اس کی زندگی میں نہیں آئے گی۔

یہ سوال خنجر کی طرح سینے میں اتر رہا تھا کیا وہ محبوب کی طرف مائل ہوگی؟ وہ شخص اس کے مقابلے میں عزت دار تھا۔ اسے جرائم سے پاک، امن و امان والی زندگی دے سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کی نیکی اور شرافت سے متاثر تھی۔ اب محبوب کو قبول کرے گی تو اس کے منہ پر جوتا پڑے گا۔

وہ دور بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ ماروی فون کو کان سے لگائے بڑی لمبی باتیں کررہی تھی۔ اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ محبوب سے باتیں کررہی ہے۔ وہ اسے ریسیو کرنے ائرپورٹ پر آئے گا۔ وہ دونوں ایک نئے مستقبل کی پلاننگ کررہے تھے۔

وہ تلملا کر وہاں سے اٹھ گیا۔ ایک ہی بات دماغ میں آرہی تھی کہ ماروی کو وہاں نہ جانے دے، جہاں محبوب ہے۔ لیکن اسے کیسے روکے؟ اسے روکنے جائے گا تو وہ اس کی صورت دیکھتے ہی بھڑک اٹھے گی اور جنون میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس کی ایک بات نہیں سنے گی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا ادھر سے ادھر گیا پھر اس نے ماروی کو دیکھا۔ فون ابھی تک اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ دماغ پھر چیخنے لگا کہ وہ محبوب کے ساتھ کوئی لمبی پلاننگ کررہی ہے۔ اس نے فوراً ہی ماسٹر کو فون پر مخاطب کیا۔ ''ماسٹر! میں بہت اپ سیٹ ہوں۔ ماروی یہاں سے جائے گی تو میں کچھ سوچنے سمجھنے کے اور کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہوں گا۔''

اس نے کہا۔ ''مراد! خود کو سنبھالو۔ تم مرد ہو۔ فولادی ارادوں کے مالک ہو۔ ایک عورت کے لیے کمزور نہ پڑو۔''

''آپ کو سمجھنا چاہیے کہ وہ عورت میری قوت ہے۔ وہ نہ رہی تو میں کمزور پڑ جاؤں گا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟ بولو میں کیا کروں؟''

ایک مجرم کے دماغ میں مجرمانہ تدبیر ہی آسکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اسے ائرپورٹ سے اغوا کرائیں۔ اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی یا بے جا حرکت نہ ہو۔ میں اس کے پیچھے رہوں گا۔ اسے جہاں لے جائیں گے جس چار دیواری میں قید رکھیں گے وہیں باہر موجود رہوں گا۔''

''مراد..... سوچ لو۔ اسے اس طرح ٹریپ کرنے سے کیا وہ تم سے راضی ہو جائے گی؟''

''فی الحال میں نہیں چاہتا کہ وہ پاکستان جائے اور میرے رقیب سے راضی ہو جائے۔''

''کیا تم اس کی لاعلمی میں اسے اپنے پاس قیدی بنا کر رکھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں لیکن ماروی پر یہ ظاہر کیا جائے کہ کسی برادری کے آدمیوں نے اسے اپنی قید میں رکھا ہے اور مراد کو وارننگ دے رہے ہیں کہ اس نے گرفتاری پیش نہ کی تو ماروی کو ہلاک کر دیں گے۔ اس طرح مراد کو وہاں آنے پر مجبور کریں گے۔''

ماسٹر نے قائل ہو کر کہا۔ ''اچھا آئیڈیا ہے۔ وہ غصہ بھول کر تمہارے لیے ہمدردی سے سوچے گی۔ یہ نہیں چاہے گی کہ تم اس کی خاطر دشمنوں کے سامنے جھکنے اور مرنے کے لیے جاؤ۔''

''میں اس کے دماغ میں یہی ہمدردی اور محبت ٹھونسنا چاہتا ہوں۔ کسی بھی طرح اسے روکنا چاہتا ہوں۔''

''مراد! تم جو چاہو گے، وہ ہو جائے گا۔ لیکن یہ تو بتاؤ، بیوی کے معاملے میں الجھے رہو گے تو دشمن کی بیٹی کو ٹریپ کرنے انڈیا کیسے جاسکو گے؟''

''آج سے چوتھے دن کا ٹکٹ ہے۔ میں تین دنوں کے اندر اپنی وائف کو منا لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میرا پلان میکر تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کے ساتھ پلاننگ میں شریک رہو۔ ابھی اسے اغوا کیا جائے گا۔''

وہ فون بند کر کے ماسٹر کے پلان میکر کا انتظار کرنے لگا۔ اپنے طور پر یہ سوچنے لگا کہ اسے اغوا کرنے کے بعد کس طرح اپنے قابو میں کیا جائے گا۔

ایسے وقت میں ماسٹر نے کال کی پھر کہا۔ ''ابھی ماسٹر نے بتایا ہے کہ ماروی تمہیں چھوڑ کر پاکستان جارہی ہے۔''

وہ بولا۔ ''تمہاری دوستی مجھے مہنگی پڑ رہی ہے۔ اس نے تمہاری فون کال سن لی تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ میں انڈیا جا کر تمہیں منکوحہ بنانے والا ہوں، وہ غصے سے پاگل ہو گئی ہے۔''

وہ گنواری سے بولی۔ ''خواہ مخواہ ہنگامہ کر رہی ہے۔''

''تم اس کی محبتوں کو اور جذبوں کو نہیں سمجھو گی۔ وہ دو بار بے ہوش ہو چکی ہے۔ دوا نہیں لے رہی ہے۔ نہ کچھ کھا رہی ہے نہ ایک گھونٹ پانی پی رہی ہے۔ اگر اسے پاکستان جانے سے روکوں گا تو وہ جنون میں مبتلا ہو کر بھوکی پیاسی مر جائے گی یا دماغی مریضہ بن جائے گی۔ اس نے تو میرا دماغ الٹ کر رکھ دیا ہے۔''

''او مراد..... اب کیا کرو گے؟''

''میں اسے روک نہیں سکوں گا۔ اسے تو جانا ہی جانا ہے۔ ماسٹر نے بتایا ہے کہ جہاز نکل جائے گا اور وہ ابھی سے

ائرپورٹ پر بیٹھی ہوئی ہے۔"

وہ اپنا سر تھام کر بولا۔ "وہ مجھے چھوڑ کر جائے گی تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کسی کام کے قابل نہیں رہوں گا۔ اسے روکنے کی آخری کوشش کر رہا ہوں۔ تم سے پھر کسی وقت بات کروں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کیا۔ پلان میکر اپنے کئی ماتحتوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ وہ مراد کے ساتھ پلاننگ کرنے لگا کہ اسے اغوا کرنے کے بعد کہاں لے جا کر ایک مکان میں قید کیا جائے گا۔ پھر اس سے کیا کچھ کہا جائے گا۔

انہوں نے منصوبے پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد تین ماتحتوں کو وہاں سے ماروی کے پاس بھیجا۔ وہ سر جھکائے آئندہ زندگی گزارنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ یہ سوال اہم تھا کہ کراچی شہر میں رہنے کے دوران کس طرح محبوب سے چھپ کر رہے گی۔

وہ تینوں اس کے پاس آ کر دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ایک اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے اپنے لباس کے اندر سے ریوالور کی جھلک دکھاتے ہوئے بڑی سفاکی سے کہا۔ "منہ سے ایک ذرا آواز نہ نکالنا۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔"

دوسرے نے بھی ریوالور کی جھلک دکھاتے ہوئے کہا۔ "ہم جانتے ہیں تم ہمارے دشمن مراد کی وائف ہو۔ ہم تمہیں لے جائیں گے تو وہ تمہارے پیچھے ضرور آئے گا۔ چلو اٹھو۔"

ماروی نے دائیں بائیں سر گھما کر انہیں ناگواری سے دیکھا۔ ان کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ ایک نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم کہتے ہیں اٹھو یہاں سے......"

وہ ایسے بیٹھی رہی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وہ موجودہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر زندگی سے بیزار ہو گئی تھی۔ موت کی دھمکیاں اب پر اثر نہیں کر رہی تھیں۔

پھر مراد نے سختی سے یہ ہدایت کی تھی کہ اس کی ماروی کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ ریوالور دکھانا کافی ہوگا۔ اس سے فاصلہ رکھ کر دھمکی دی جائے گی تو وہ ساتھ چل پڑے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا تھا۔

بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم بہری ہو؟ ہمارا حکم نہیں سن رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں کچھ بولنا چاہتی ہوں۔ لیکن تم لوگوں نے آتے ہی حکم دیا ہے کہ منہ سے آواز نہ نکالوں۔"

"تم کچھ نہ بولو۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔"

وہ بیٹھی رہی۔ ایک نے کہا۔ "یہ کھلونا نہیں ہے۔ بھرا ہوا ریوالور ہے۔ بس ایک گولی چلے گی اور یہیں پھڑ پھڑا کر مر جاؤ گی۔"

وہ بیٹھی رہی۔ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اب اسے گھیرنے والے پریشان ہو گئے تھے۔ نہ گولی مار سکتے تھے، نہ اسے ہاتھ لگا سکتے تھے۔ صرف دھمکیوں سے کام نہیں نکل رہا تھا۔

مراد دور سے دیکھ رہا تھا۔ حیرانی سے سوچ رہا تھا۔ دیر کیوں ہو رہی ہے؟ وہ لوگ اسے وہاں سے کیوں نہیں لے جا رہے ہیں؟

پلان میکر نے کہا۔ "منصوبہ خاک ہونے والا ہے۔ مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ وہ آپ جیسے مرد میدان کی بیوی ہے ہتھیاروں سے ڈرتی نہیں ہے۔"

ادھر وہ تینوں ماروی کی ڈھٹائی سے پریشان ہو گئے تھے۔ ایک نے مجبور ہو کر کہا۔ "اچھا بولو۔ کیا بولنا چاہتی ہو؟"

ماروی نے کہا۔ "میں مراد کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ آگے میری دنیا تاریک ہے۔ میرا جینا مرنا برابر ہے۔"

وہ اپنے حالات کے مطابق بول رہی تھی۔ "میں ابھی نہیں مروں گی تو اس ہرجائی کے دشمنوں کے ہاتھوں بھی ضرور مروں گی۔ سن لو کہ یہاں سے نہیں اٹھوں گی۔"

وہ حیران اور پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ بولی۔ "مجھے ہاتھ لگاؤ گے تو چیخنا شروع کر دوں گی۔ کیا مجھے یہاں سے اغوا کر کے جا سکو گے؟"

اسے خوف زدہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ آنے والوں کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ "یہاں ہر طرف پولیس والے ہیں۔ تم لوگ کتنے جیالے ہو؟ کیا مجھے گولی مار کر فائرنگ کی آواز سنا کر یہاں سے بھاگ سکو گے؟"

ماروی نے تینوں کو باری باری دیکھا۔ تینوں اسے بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ فوراً ہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ اس نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔ "چلاؤ گولی۔"

وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے بڑے سے مشورہ کریں۔ وہاں جو شخص سامنے کھڑا ہوا تھا، اس نے فون کو کان سے لگا کر ماروی سے دور جا کر پلان میکر سے کہا۔ "سر! یہ دھونس میں نہیں آ رہی ہے، ہم نے اسے اسلحہ دکھایا ہے۔ گولی مارنے کی دھمکی دی ہے اور یہ مرنے کو تیار ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بول رہے ہو؟"

"......" "یہ نادان نہیں ہے۔ جانتی ہے کہ ہم

اسے گولی مارنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ یہاں پکڑے جائیں گے۔"

پلان میکر نے مراد سے کہا۔ "تمہاری وائف کو موت کا ڈر ہی نہیں ہے۔ اسے یقین ہے کہ گولی نہیں چلائی جائے گی۔ چلائیں گے تو اغوا کرنے والے پکڑے جائیں گے۔"

مراد نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی بے باک ہوجائے گی۔ اس نے پریشان ہوکر کہا۔ "تم کروا سے کسی طرح روکو۔ میں اسے اپنے رقیب کے پاس جانے نہیں دوں گا۔"

پھر فوراً ہی اس کے ذہن میں تدبیر آئی۔ یہ خیال آیا کہ ماروی ہزار نفرتوں کے باوجود اسے اپنے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہے گی۔ تڑپ جائے گی۔ اس کے ساتھ دشمنوں کے شکنجے میں رہنے کے لیے آجائے گی۔

اس نے پلان میکر سے کہا۔ "تم اور تمہارے دو آدمی مجھے یہاں گن پوائنٹ پر رکھیں اور اس سے بولیں کہ وہ تمہارے ساتھ چلے ورنہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

اس نے فون پر کہا۔ "ماروی کو فون دو۔ میں بات کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ماروی کی آواز سنائی دی۔ "کون ہو تم لوگ؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟"

پلان میکر نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تمہیں خوشخبری سنا رہے ہیں۔ مراد ہمارے شکنجے میں آگیا ہے۔ اپنے دائیں طرف گھوم کر دیکھو۔ یہ ہمارے نشانے پر ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ دائیں طرف گھوم کر دیکھا تو پریشان ہوگئی۔ مراد کے آس پاس جو کھڑے ہوئے تھے انہوں نے اپنے لباسوں میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ مراد کو نشانے پر رکھا گیا ہے۔

مراد کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ ماروی کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ یہ چشم زدن میں بھول گئی کہ وہ ہرجائی ہے اور وہ اس ہرجائی سے نفرت کررہی ہے۔

اب کیسے نفرت کرسکتی تھی؟ اس کے بچپن کا پیار، اس کی جان، اس کا ایمان موت کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ وہ ساری نفرتیں بھول کر تڑپ گئی۔ فون کو پھینکتے ہوئے دوڑ تک دوڑتے ہوئے اس کے سامنے آگئی۔

اس کی تدبیر کامیاب رہی تھی۔ اب وہ اسے چھوڑ کر رقیب کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ مراد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ایک دن تو یہ ہونا تھا۔ میں دشمنوں پر غالب آتا رہا۔ آج یہ مجھ پر غالب آگئے ہیں۔ میرا آخری وقت آچکا ہے۔"

وہ بڑی ندامت سے سر جھکا کر بولا۔ "ماروی! میں نے تمہیں بہت صدمہ پہنچایا ہے۔ مجھے معاف کردو۔"

وہ ایک دم سے تڑپ کر آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی۔ بلک بلک کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔ "یہ اچھا ہے۔ تمہارے ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی۔ مجھے رونا نہیں چاہیے خوش ہونا چاہیے۔ تمہیں یاد ہے۔ ہم نے ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسم کھائی تھی۔"

"ہاں! مجھے یاد ہے۔ لیکن ہم ساتھ جئیں گے۔"

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ مراد نے اس کے کان میں کہا۔ "ابھی چپ چاپ ان کے ساتھ چلو۔ میں نے تدبیر سوچ لی ہے۔ ہم کہیں جاکر ان سے نجات پائیں گے۔"

وہ فوراً ہی الگ ہوکر بولی۔ "نہیں مراد! ہم ان سے نجات حاصل نہیں کریں گے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "ہماری خوش نصیبی سے یہ گھڑی نصیب ہو رہی ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ میں زندہ رہ کر یہاں سے محبوب کے پاس جاؤں؟"

"ہرگز نہیں۔ اس کا نام نہ لو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم پر محبوب کا سایہ بھی پڑتا رہے۔"

"اور تم دیکھ رہے ہو کہ میں بھی سوکن کو برداشت نہیں کررہی ہوں۔ میں بھی نہیں چاہوں گی کہ تم زندہ رہ کر مرینہ کے پاس جاؤ۔ مراد......! ہم زندگی میں ساتھ نہیں رہ سکیں گے لیکن ایک ساتھ مرنے کی قسم تو پوری کرسکیں گے۔"

مراد چکرا گیا۔ بازی پھر پلٹ رہی تھی۔ اس نے جو سوچا تھا اور ماروی کی سوچ کسی اور سمت جا رہی تھی۔ وہ بری طرح الجھ کر بولا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ ہم زندہ رہیں گے اور ساتھ رہیں گے۔"

"اگر زندہ رہ گئے تو ساتھ نہیں رہوں گی۔ تمہی مرینہ کو برداشت نہیں کروں گی۔"

"میں مرینہ کو چھوڑ دوں گا۔ قسم سے کہتا ہوں، تمہارے لیے ساری دنیا چھوڑ دوں گا۔"

"تو پھر دنیا چھوڑ کر چلو۔ میں اس زندگی میں کبھی تم پر بھروسا نہیں کروں گی۔"

"ایک بار بھروسا کرو۔"

"کبھی نہیں۔ تم نے جھوٹ فریب سے ثابت کردیا ہے کہ ہم ساتھ جی نہیں سکیں گے۔ ہمیں ساتھ مرنے کا اپنی

قسم پوری کرنے کا یہ اچھا موقع مل رہا ہے۔"
پھر اس نے پان میکر سے کہا…" چلاؤ گولی۔"
مراد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔" چپ رہو۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"
وہ مکمل یقین سے بولی۔" میں جو کہہ رہی ہوں وہ دشمن نہیں کریں گے۔ انہیں اتنی تو عقل ہے کہ گولی چلاتے ہی سب کے سب پکڑے جائیں گے۔"
ان کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ ہوا کا رخ یوں بدل جائے گا۔ پان میکر نے کہا۔" ہم فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونا جانتے ہیں، یہ نہ سمجھو کہ تم دونوں کو زندہ چھوڑ دیں گے۔"
وہ مراد سے نپٹ کر بولی۔" تو پھر چلاؤ گولی…"
ایک سیدھی سادی زندگی گزارنے والی ان تمام مجرموں کی مکاریوں کو خاک میں ملا رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگے کیا کہا جائے اور کیا کیا جائے؟
پان میکر نے کہا۔" ہم یہاں نہیں، تم دونوں کو اپنے باس کے سامنے لے جاکر گولیوں سے چھلنی کردیں گے۔"
وہ بولی۔" تمہارا باپ بھی ہمیں یہاں سے نہیں لے جائے گا۔ میں ابھی چیخنا شروع کروں گی تو تم ہمیں گولیاں مارتے ہوئے یہاں سے بھاگو گے۔"
مراد نے اس کے بازو کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔" پاگل ہوگئی ہو؟ کیوں انہیں دشمنی پر مجبور کررہی ہو؟"
وہ بڑے جذبے سے بولی۔" ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہیں چھوڑ کر جارہی تھی لیکن اپنے اندر مررہی تھی۔ اب تمہارے ساتھ مروں گی۔ یہ دشمن نہیں ہیں، رحمت کے فرشتے ہیں۔"
وہ اس کی گردن میں باہیں ڈال کر بولی۔" ہم لپٹے ہوئے ہیں ابھی ایک ساتھ دنیا سے رخصت ہوجائیں گے۔"
پھر وہ چیخ کر بولی۔" اے کتے! گولی چلا…"
پان میکر نے پریشان ہوکر مراد کو دیکھا۔ وہ بولی۔
" منہ کیا دیکھتا ہے؟ گولی کیوں نہیں چلاتا؟"
مراد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔" چلاؤ مت، لوگ ادھر دیکھ رہے ہیں۔"
وہ منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔" اچھا ہے دنیا دیکھے۔ پولیس والے ادھر آئیں گے تو یہ مجبور ہوکر گولیاں چلاتے ہوئے بھاگیں گے۔"
پھر وہ حیران ہوکر اس سے الگ ہوکر بولی۔" یہ گولیاں کیوں نہیں چلا رہے ہیں؟ میں چیخ چیخ کر انہیں چیلنج کررہی ہوں اور یہ تمہارا منہ تک رہے ہیں؟ کیا تم پر پیار آرہا ہے؟"
لوگ جمع ہورہے تھے۔ پان میکر اپنے ماتحتوں کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مراد نے آگے بڑھ کر اسے خاموش کرنے کے لیے پکڑنا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔" یہ کیسے دشمن تھے۔ منہ پھیر کر جارہے تھے؟ یہ… یہ کیا ہورہا ہے؟ ہاں۔ ہاں میری سمجھ میں آرہا ہے، یہ دشمن نہیں تھے۔ تم بدمعاشی کررہے ہو۔ مجھے جانے سے روک رہے ہو۔ میں سمجھ گئی جارہی ہوں کہ تم کتنے مکار اور چالباز ہو۔ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ مجھے اغوا کرا رہے تھے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر۔ یہ ثابت ہورہا ہے کہ مجرمانہ زندگی گزارنے والوں کا کوئی ضمیر نہیں ہوتا۔ کوئی ایمان نہیں ہوتا۔"
وہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ مراد اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھتا جارہا تھا۔ وہ بولتی ہوئی اس سے کتراتی جارہی تھی۔ ایسے ہی وقت ایک پولیس افسر نے سپاہیوں کے ساتھ آکر مراد کو پکڑ لیا۔" یہ کیا ہورہا ہے؟ اس عورت کو کیوں پریشان کررہے ہو؟"
اس نے کہا۔" یہ میری وائف ہے۔ مجھ سے ناراض ہے، میں اسے منا رہا ہوں۔"
ماروی نے اپنے بیگ میں سے ٹکٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔" یہ میرا کوئی نہیں ہے۔ یہ ٹکٹ دیکھو۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان جارہی ہوں۔ یہ مجھے پریشان کررہا ہے۔ میرے گھر جانے سے مجھے روکنے آیا ہے۔"
پولیس افسر نے سپاہیوں سے کہا۔" اسے لے چلو۔"
وہ مراد کو پکڑ کر لے جانے لگے۔ وہ کہنے لگا۔" آفیسر! میں ماسٹر گوبو کا خاص مہمان ہوں۔ ابھی فون پر رابطہ کرتا ہوں اور آپ سے بات کراتا ہوں… سر میرے حق میں بیان دے گا۔ گواہی دے گا کہ یہ میری وائف ہے۔"
" وائف تھی۔ اب نہیں ہوں۔ اسے بازاری عورتوں کے پاس چھوڑ کر جارہی ہوں۔"
" پلیز ماروی… ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے چھوڑ کر جاؤ گی تو میں پاگل ہوجاؤں گا۔"
وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔" میں جاؤں گی۔ تمہاری مکاری اچھی طرح معلوم ہوگئی ہے۔ پلیز آفیسر! مجھے یہاں سے نجات دلا دو۔"
افسر نے کہا۔" مسٹر! یہ تمہاری وائف ہے تو پاکستان جاؤ اور قانون کے مطابق اسے راضی کرو۔ ہم اپنے ملک میں ایک عورت سے زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔"
مراد ان کی حراست میں مجبور ہوگیا۔ یہ یقین تھا کہ

ماسٹر کے ایک فون پر اسے رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن ماروی کی طرف سے اور زیادہ مایوسی ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی طرح بھی اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اس سے جدائی ایک نامعلوم مدت کے لیے اٹل ہو گئی تھی۔

ماسٹر ایک گھنٹے کے اندر وہاں آگیا۔ مراد نے کوئی بڑا جرم نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی وائف کو جانے سے جبراً روک رہا تھا۔ ماسٹر نے اسے رہائی دلا کر کہا۔ "یہاں سے چلو۔ ورنہ ماروی کو روکتے رہو گے تو پھر اسے راہ کیے کی غلطی کرو گے۔"

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ "ماسٹر! میرا رقیب اسے اپنی طرف مائل کرے گا۔ میں کیا کروں؟"

"تم ابھی کچھ نہیں کر سکو گے۔ اسے جانے دو۔ وہ وہاں جاتے ہی رقیب کی جھولی میں نہیں گرے گی۔ شرم و حیا والی عورتیں فوراً ہی مرد نہیں بدلتیں۔ خوب سوچ سمجھ کر اچھا خاصا وقت گزار کر کسی دوسرے مرد کو قبول کرتی ہیں۔"

مراد دل ہی دل میں قائل ہو کر سوچنے لگا۔ "میں اسے روک نہیں سکوں گا لیکن اس کے پیچھے جاتا ہوگا۔ میں ہاسان کر محبوب کو جیتنے نہیں دوں گا۔ یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ ماروی محبوب کو قبول کرنے کا ایک بہت بڑا قدم اٹھانے میں جلدی نہیں کرے گی۔"

اس نے سوچا۔ "وہ میری منکوحہ ہے۔ جب تک اسے طلاق نہیں دوں گا۔ تب تک وہ محبوب کی منکوحہ نہ بن سکے گی اور نہ اپنے بدن کو ہاتھ لگانے دے گی۔"

اسے یک گونہ اطمینان ہوا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ماسٹر نے کہا۔ "کل تمہارا چہرہ سرجری کے ذریعے تبدیل ہوگا۔ تم ماروی کے پیچھے پاکستان جاؤ گے تو پولیس اور انٹیلی جنس والے تمہیں پہچان نہیں سکیں گے۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "ہاں وہاں میں آزادی سے رہ کر اسے اپنی طرف مائل کر سکوں گا۔"

"لیکن پہلے میرا اہم کام نمٹا دو گے۔ پہلے شملہ میں میڈونا کو قریب کرو گے پھر جیسی جہاں بھی جوئیا کے ساتھ نسلی سے نکل کر جائے گا، وہاں اسے ختم کرو گے۔"

مراد نے کہا۔ "اس مشن میں کم از کم بارہ دنوں تک مصروف رہوں گا۔ آپ کا یہ کام ہر حال میں ہوگا۔ آپ میری ایک بات مانیں۔ کل چہرہ تبدیل ہوگا۔ میں پرسوں ایک دن کے لیے پاکستان جاؤں گا۔ اسے دیکھوں گا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے پھر وہاں سے دوسرے دن شملہ چلا جاؤں گا۔"

اب تو وہ اسے پاگل کر دینے والی تھی۔ جتنا وہ قریب جاتا اتنی ہی دور ہونے والی تھی۔ موجودہ حالات میں یہ کہنا چاہیے کہ صرف پیار کی دیوانی نہیں تھی۔ صرف اسے دوبارہ پالینے کی ہوس نہیں تھی بلکہ اپنی انا کا بھی مسئلہ اہم تھا۔ وہ محبوب کے پاس جاتی تو اسے یہی لگتا کہ ناک کٹ گئی ہے۔

اور محبوب کو اپنا سر دے سکتا تھا۔ اپنی ناک بھی نہ دیتا۔

☆☆☆

وہ اپنے ملک اپنے شہر میں واپس آگئی۔ اس نے جہاز سے اتر کر فون پر چاچی سے پوچھا۔ "کیا مجھے لینے آئی ہو؟"

"ہاں بیٹی! تمہارے چاچا بھی آئے ہیں۔ یہ بتاؤ اکیلی کیوں آگئی ہو؟ مراد کیوں نہیں آیا؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ لائن کاٹ دی۔ چاچی کے اس سوال سے دل میں گھونسا سا لگا تھا کہ وہ ساتھ کیوں نہیں آیا؟ وہ فون پر نہیں کہہ سکتی تھی کہ ساتھ چھوڑ کر آئی ہے۔ کبھی واپس نہ جانے کے لیے..... وہ بڑے ارمانوں سے بڑے فخر سے مراد کے ساتھ اسی جگہ سے ہواؤں میں اڑتی گئی تھی اور دوبارہ آ کر نیچے گر رہی تھی۔ اسے اڑانے اور گرانے والے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ اپنا تن من اور اپنی آبرو کا سرمایہ لٹا کر کھوکھلی ہو کر آئی تھی۔

جب اس نے وزیٹرز لابی میں چاچی کو دیکھا تو روتی ہوئی روتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ بڑی دیر بعد بلک بلک کر رونے کے لیے کوئی اپنا خاص تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

چاچی پریشان ہو گئی۔ اس کے رونے کا انداز کہہ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔ وہ خوش نصیب بن کر گئی تھی۔ اب کوئی بدنصیبی ہے جو اسے رلاتے ہوئے لائی ہے۔

چاچی اسے تھپکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "تم آگئی ہو۔ ماں کی گود میں پہنچ گئی ہو۔ چپ ہو جاؤ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کیا دکھ ہے بولو۔ میں پہلی بار تمہیں بکھرتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔"

چاچا اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے شانے کو تھپک کر بولا تھا۔ "کیا ہوا ہے بیٹی! تم سمندر پار سے اکیلی آئی ہو۔ مراد نے تمہیں تنہا کیوں آنے دیا ہے؟"

چاچی نے کہا۔ "اس نے ضرور میری بچی کو ستایا ہے۔ تبھی یہ بلک بلک کر رو رہی ہے۔"

وہ دونوں ماروی کو دائیں بائیں سے تھام کر کرسیوں کے پاس آئے۔ اسے وہاں بٹھایا پھر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ چاچی نے پوچھا۔ "بولو بیٹی! کیا ہوا ہے؟"

وہ اپنے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی روداد سنانے لگی۔ آخر میں یہ کہتے ہوئے پھر رو پڑی کہ وہ مرید

سے شادی کرنے لندن لایا جا رہا ہے۔ چاچی سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ مراد کو گالیاں دینے لگی۔

ماروی نے کہا۔ ”گالیاں دے کر اپنی زبان گندی نہ کریں۔ آپ کے کوسنے سے اور بددعائیں دینے سے نہ تو وہ انسان بن جائے گا اور نہ ہی اس کا کچھ بگڑے گا۔“

چاچا نے پوچھا۔ ”وہ تجھے بچپن سے چاہتا آرہا تھا۔ اب اتنی جلدی تجھ سے کیوں پھر گیا ہے؟“

”میں اس کے قابل نہیں ہوں چاچا! وہ اور سمیرا ایک جیسی بدمعاشوں والی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ مراد کے لیے مجھ سے زیادہ ضروری ہے۔ اس نے ایک بدمعاش عورت کے مقابلے میں مجھے گرایا ہے۔ میں بھی اس کا منہ نہیں دیکھوں گی۔“

وہ آنسو پونچھ رہی تھی۔ پھر روتی بھی جا رہی تھی۔ چاچی نے کہا۔ ”ابھی وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اسے جوتے مارتی اور تیرے سامنے جھکاتی۔ ابھی اس سے فون پر کہتی ہوں کہ یہاں آئے اور.....“

ماروی نے بات کاٹ کر کہا۔ ”نہیں چاچی! اس سے بات نہ کرو۔ وہ آئے گا تو میں یہاں سے بھی چلی جاؤں گی۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھوں گی۔“

چاچا نے کہا۔ ”بیٹی! اپنا مرد بے مروت ہو جائے، ہرجائی بن جائے تب بھی اسے دنیا سے نکال کر نہیں پھینکتے۔ ابھی تم غصے میں ہو بعد میں سمجھو گی کہ مرد کے بغیر پہاڑ جیسی زندگی نہیں گزار سکو گی۔“

چاچی نے گھور کر کہا۔ ”یہ پہاڑ جیسی زندگی اکیلی نہیں گزارے گی۔ جب وہ دوسری عورت کر رہا ہے تو یہ بھی دوسرا مرد کرے گی اور وہ دوسرا تو اس کا سچا عاشق ہے۔“

ماروی نے چونک کر چاچی کو دیکھا۔ یہ تو کہے بغیر سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ مراد سے چھوٹنے والی محبوب کی ہی پناہ میں جائے گی۔

چاچی کہہ رہی تھی۔ ”ابھی اسے معلوم ہوگا تو وہ اس کے قدموں میں لوٹنے کے لیے دیوانہ وار دوڑتا چلا آئے گا۔ توبہ ہے ہم بہت ہی جاہل اور ناقدرے ہیں۔ ہم نے ہیرے کو پھینک کر پتھر چن لیا تھا۔“

”نہیں چاچی! ابھی محبوب کی باتیں نہ کرو۔ میں ایک کے بعد دوسرے مرد کو قبول نہیں کروں گی۔ محبوب کو معلوم نہ ہو کہ میں مراد کو چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔ اسے سمیرا کے ساتھ زندگی گزارنے دو۔ میں اس سے چھپ کر رہنا چاہتی ہوں۔“

”یہاں رہو گی؟ تو کیا نہیں جاؤ گی؟“

”وہاں جا کر رہوں گی تو تھوڑا ہی دور رہ کر بھی وہ مجھے اپنے قریب محسوس ہوتا رہے گا۔ اس کے سامنے بیٹھنے سے لگاؤں گی تو وہ میری دھڑکنوں میں شور مچائے گا۔“

چاچی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میری بچی کیسی مشکلوں میں پھنس گئی ہے۔ اس نامراد کو دل سے دماغ سے دور پھینکنے کے لیے ایک معصوم کی محبت سے بھی محروم ہو رہی ہے۔ یہاں ایک دل و جان سے چاہنے والا ہے۔ وہ اپنی تمام دولت ابھی قدموں میں لا کر رکھ دے گا لیکن اس سے بھی چھپ کر رہنے والی ہو۔ ایک بات سمجھاتی ہوں بیٹی! زیادہ الجھن میں نہ پڑو۔ جتنی جلدی ہو سکے محبوب کی قدر کرو۔ مراد کے منہ پر جوتا تو مارو۔“

وہ بولی۔ ”ہاں، وہ مجھے یہاں آنے سے روک رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میرا اب بھی دیوانہ ہے اس لیے چاچی! کہ محبوب کے پاس جاؤں گی تو وہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ مجھے اپنی جاگیر اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ میں کوئی گری پڑی عورت نہیں ہوں کہ کسی قدر و قیمت کے بغیر اس کے استعمال میں رہتی۔ وہ سمجھتا نہیں چاہتا کہ وہ بھی تو میری ملکیت تھا۔

”میں اسے ٹھکرا کر آرہی ہوں۔ اس نے مجھے روکنے اور اپنے قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا ہوگا کہ میں ملکیت بن کر رہنے والی نہیں ہوں۔ کسی دن بھی اس کے رقیب کے پاس چلی جاؤں گی۔“

وہ خلا میں تکتے ہوئے بولی۔ ”اچھا ہے وہ رقابت سے سوچتا رہے۔ جلتا رہے، کڑھتا رہے اور اس کی نیندیں حرام ہوتی رہیں۔ مجھے تو دونوں سے دور رہنا ہے۔ ایک کو آزما چکی ہوں۔ دوسرے کو آزمانے کی غلطی نہیں کروں گی۔ چاچی! مجھے محبوب سے چھپ کر رہنا ہے۔“

چاچا نے کہا۔ ”یہ تو بتاؤ کہاں رہنا ہے؟ گوٹھ نہیں جاؤ گی۔ کیا یہاں کرائے کے مکان میں رہو گی؟“

اب تو روپوش رہنا تھا۔ ایک سے نہیں دونوں سے چھپ کر رہنا تھا اور وہ دونوں ایسے تھے کہ اس کی تلاش میں کہیں بھی پہنچ سکتے تھے۔ وہ بولی۔ ”ہم نے بہت پہلے ہی سے آگے رہتی جا کے رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم آج کا دن کسی ہوٹل میں گزاریں گے۔ کل اپنے اکاؤنٹ سے میں پچیس لاکھ نکال کر رہتی جائیں گے۔“

چاچی نے کہا۔ ”ہمارے کپڑے لتے اور کچھ ضروری سامان گوٹھ میں ہے۔ وہاں سے لیتے ہوئے جائیں گے۔“

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی۔ پھر انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں، ہم رہتی نہیں جائیں گے۔ وہ مجھے

محبوب سے دور رکھنے کے لیے میرے پیچھے ضرور آئے گا۔ مجھے یہاں نہ پاکر ریتی جائے گا۔ پہلے بھی ہمیں تلاش کرتا ہوا وہاں تک گیا تھا۔"

چاچی نے پوچھا۔"ابھی تمہارے بینک کے کھاتے میں ایک کروڑ اسی لاکھ روپے ہیں۔ ہم یہاں سے دور کسی بھی علاقے میں جا کر رہ سکیں گے۔ ابھی یہاں سے اٹھو کسی ہوٹل میں چل کر آرام سے بیٹھ کر سوچیں گے کہ ہمیں کہاں جا کر رہنا چاہیے۔

وہ تینوں وہاں سے ایک ہوٹل میں آگئے۔ کہیں جا کر برسوں تک چھپ کر آرام سے رہنے کے لیے ان کے پاس بہت بڑی رقم تھی۔ وہ تمام رقم نکالنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کہیں بھی لٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ دوسرے دن صرف پچاس لاکھ روپے بینک سے نکال کر لے آئے۔

آئندہ یہ فکر تھی کہ پھر بھی رقم نکالنے کے لیے کراچی آئیں گے تو مراد یا محبوب کی نظروں میں آجائیں گے۔ چاچی نے کہا۔"ہم کفایت شعاری سے گزارہ کریں گے تو کئی برسوں تک اور رقم نکالنے کے لیے یہاں نہیں آئیں گے۔"

انہوں نے طے کیا کہ پہلے نواب شاہ میں جا کر رہیں گے۔ اگر وہ جگہ راس نہیں آئے گی تو پھر کسی دوسرے شہر میں جا کر رہیں گے۔ ماروی نے چاچی کے ساتھ ایک شاپنگ پلازا میں آکر پہلے عبا خریدی۔ اسی دکان میں اسے پہنا اور نقاب میں چہرے کو چھپا کر مطمئن ہوگئی کہ اب کوئی اسے نہیں پہچانے گا۔

تدبیر کچھ ہوتی ہے، تقدیر کچھ ہوتی ہے۔ ٹھیک ایسے وقت جب وہ عبا پہننے کے بعد چہرے کو نقاب میں چھپا رہی تھی، حماد صدیقی نے اسے دیکھ لیا۔

وہ اپنے چار ماتحتوں کے ساتھ ایک مجرم کو گھیرنے کے لیے ادھر آیا تھا۔ اس کے ایک ماتحت نے چوتھے فلور سے فون پر کہا تھا کہ مجرم وہاں سے بھاگتا ہوا تیسرے فلور کی طرف گیا ہے۔ حماد دوسرے فلور پر تھا۔ اسے پکڑنے کے لیے تیسری منزل کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک دکان سے گزرتے ہوئے اس نے ماروی اور چاچی کو دیکھا تھا۔ ایسے ہی وقت اسے بھاگنے والا مجرم نظر آیا۔ حماد نے اس کی طرف دوڑ لگائی پھر چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ شاپنگ کرنے والی عورتیں اور بچے سہم کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ مجرم اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کررہا تھا۔ ایسے وقت اس کے ماتحتوں نے آکر اسے ہتھکڑی پہنادی۔

اس نے ایک بڑی کامیابی حاصل کرکے ماتحتوں کو حکم دیا۔"اسے لے چلو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

پھر وہ دوڑتا ہوا اس دکان میں آیا تو وہاں ماروی اور چاچی نہیں تھیں۔ اس نے دکاندار سے پوچھا۔"ابھی ایک جوان عورت عبا اور نقاب میں یہاں تھی، وہ کدھر گئی ہے؟"

دکاندار نے کہا۔"ادھر بائیں کوریڈور کی طرف گئی ہے۔"

وہ ادھر جا کر انہیں ڈھونڈنے لگا۔ چاچی بھتیجی گم ہوگئی تھیں۔ سامنے ایک زینہ گراؤنڈ فلور کی طرف گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لفٹ کا دروازہ بند تھا۔ بدلتے ہوئے نمبروں سے پتا چلا کہ لفٹ اوپر جارہی ہے۔

اس نے سوچا شاید اوپر گئی ہیں، وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک ایک وو دو پائدانوں کو پھلانگتا ہوا تیسرے فلور پر آیا۔ وہاں دور تک جا کر دیکھا پھر چوتھے فلور پر گیا۔ وہاں بھی وہ نظر نہیں آئیں۔ تب اس نے نیچے گراؤنڈ فلور پر آکر دیکھا۔ بہت دیر ہوچکی تھی۔ وہ دونوں گراؤنڈ فلور سے باہر آکر ٹیکسی میں بیٹھ کر جا چکی تھیں۔

اس نے فون پر محبوب کو مخاطب کیا۔"سر! کیا آپ جانتے ہیں کہ ماروی اسی شہر میں ہے؟"

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔"کیا کہہ رہے ہو؟ وہ تو کن سٹی میں ہے۔ کل اس نے فون پر مجھ سے باتیں کی تھیں۔"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔"جسٹ اے منٹ۔ کل رات میں نے سمیرا سے اس کی بات کرانا چاہی تو فون پر رابطہ نہ ہوسکا۔ اس نے فون بند کررکھا ہے۔ آج صبح بھی اس سے رابطہ نہ ہوسکا۔"

"سر! آپ کن سٹی کے کوڈ کے ساتھ نمبر پنچ کررہے ہیں۔ پلیز اسے ڈائریکٹ کال کریں۔"

"میں ابھی کال کرتا ہوں۔ تم انتظار کرو۔"

محبوب نے بڑی بے چینی سے اس کے نمبر پنچ کیے۔ دل میں کھلبلی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ پاکستان آگئی ہے اور اسی شہر میں دیکھی گئی ہے۔ اس نے نمبر پنچ کیے تو دوسری طرف سے جواب سنائی دیا۔"آپ کا مطلوبہ نمبر ریسپانس نہیں ہورہا ہے۔"

بات سمجھ میں آگئی کہ ماروی نے سم بدل دی ہے۔ محبوب نے حماد سے فون پر پوچھا۔"تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ تم نے اس سے ملاقات کیوں نہیں کی؟ ابھی وہ کہاں ہوگی؟"

"سر! میں ملینیم کے شاپنگ سینٹر میں ہوں۔ یہاں ڈیوٹی پر تھا۔ ایک مجرم کو پکڑنے کے بعد اس دکان میں گیا تو وہ چاچی کے ساتھ وہاں سے جا چکی تھی۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔"چاچی کا فون نمبر میرے پاس

ہے۔ میں ابھی بات کرتا ہوں۔"

وہ حماد سے رابطہ ختم کرکے چاچی کے فون نمبر پنچ کرنے لگا۔ وہ دونوں ہوٹل میں آگئی تھیں۔ چاچا کمنٹ سے آیا تھا۔ ٹرین چار گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہونے والی تھی۔ ایسے وقت فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔

چاچی واش روم میں تھی۔ فون ماروی کے قریب رکھا ہوا تھا۔ وہ اسکرین پر محبوب کے نمبر پڑھتے ہی اچھل پڑی۔ تیزی سے چلتی ہوئی واش روم کے دروازے کے پاس آکر بولی۔ "چاچی! یہ محبوب کی کال ہے۔ تمہیں سم نکال کر پھینک دینی تھی۔ اب لائن کاٹنے سے اسے شبہ ہوگا۔ ہم کیا کریں؟"

وہ بولی۔ "محبوب نے کبھی مجھے فون نہیں کیا۔ تعجب ہے ابھی کیوں یاد کررہا ہے؟"

وہ دروازے کو ذرا سا کھول کر ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "لاؤ۔ میں بات کرتی ہوں۔"

"وہ میرے بارے میں پوچھے گا۔ اس سے کیا بولوگی؟"

"تم خواہ مخواہ پریشان ہورہی ہو۔ اس کے فرشتے بھی نہیں جانتے ہیں کہ تم یہاں ہو۔"

ماروی نے لاؤڈ اسپیکر آن کرکے فون اسے دیا۔ اس وقت تک رنگ ٹون بند ہوگئی تھی۔ وہ دونوں ایسے گھبرا رہی تھیں جیسے محبوب ان کے دروازے پر آگیا ہو۔ ماروی نے کہا۔ "وہ پھر کال کرے گا۔"

چاچی نے کہا۔ "اس نے تمہارے جانے کے بعد آج تک کال نہیں کی تھی۔ اب تمہارے آتے ہی مجھے یاد کر رہا ہے۔"

ماروی نے کہا۔ "میں نے سم بدل دی ہے۔ مجھ سے بات نہیں ہورہی ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔"

رنگ ٹون پھر ابھرنے لگی۔ چاچی نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ محبوب نے کہا۔ "چاچی! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بیٹے! خوش رہو۔ سلامت رہو۔ آج میری یاد کیسے آگئی؟"

"میں ماروی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ فون اسے دیں۔"

وہ حیرانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ "کیا کہہ رہے ہو؟ فون اسے کیسے دوں؟ وہ تو سن سٹی میں ہے۔"

"پلیز! مجھ سے جھوٹ نہ بولیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ دونوں میٹیم کے شاپنگ سینٹر میں تھیں۔"

یہ ایسی بات تھی کہ دونوں پریشان ہوگئیں۔ چاچی نے دروازے کے پیچھے سے جھانک کر ماروی کو دیکھا۔ ماروی نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بھی انکار میں سر ہلا کر فون پر

بولی۔ "پتا نہیں تم نے کسے دیکھا ہے۔ میں تو گوٹھ میں ہوں۔ یہاں کوئی شاپنگ سینٹر کہاں سے آجائے گا؟"

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ ماروی سے بولیں، یہاں آکر مجھ سے چھپ کر نہ رہے۔ میں اس وقت اسے آپ کے پاس دیکھ رہا ہوں۔"

"بیٹے! تم دیوانے ہو۔ جاگتی آنکھوں سے بھی اس کے خواب دیکھتے رہتے ہو۔ نہ میں کراچی میں ہوں، نہ وہ میرے پاس ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟ یہاں گوٹھ میں آکر دیکھ لو۔"

چاچی نے اسے الجھا دیا۔ اس نے حماد سے رابطہ کرکے کہا۔ "چاچی کہہ رہی ہے کہ وہ یہاں نہیں گوٹھ میں ہے۔ تمہاری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا ہے؟"

"نہیں سر! ہم کرائم برانچ کے لوگ ہیں۔ شکار ڈھونڈتے ہیں اور شکاری کی نظر رکھتے ہیں۔ میں ماروی اور چاچی کو لاکھوں کی بھیڑ میں پہچان سکتا ہوں۔"

"تم وہیں رکو۔ میں آرہا ہوں۔"

اب وہ سکون سے رہنے والا نہیں تھا۔ اس نے ماروی کی ایک تصویر جیب میں رکھی۔ پھر اپنی کار میں تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا اس شاپنگ سینٹر میں آیا۔ وہاں حماد صدیقی اس کا منتظر تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس دکان میں آیا جہاں وہ حماد کو نظر آئی تھی۔ اس بار اس نے دکاندار کو اپنا آئی ڈی کارڈ دکھا کر کہا۔ "ہمیں اس لڑکی کی تلاش ہے جس کے بارے میں پہلے بھی آپ سے پوچھ گچھ کرکے گیا ہوں۔"

محبوب نے جیب سے تصویر نکال کر دکاندار کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ یہی لڑکی تھی۔"

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی جناب! یہی لڑکی تھی۔"

یہ سنتے ہی ماروی کی وہاں موجودگی کی تصدیق ہوتے ہی محبوب تن کر رہ گیا۔ اس کا پورا وجود دل بن کر دھڑکنے لگا۔ اس نے حماد کے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "وہ آگئی ہے۔ واپس آگئی ہے۔ اسے ڈھونڈو حماد... وہ مجھ سے چھپ رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں سے کہیں اور چلی جائے۔"

وہ اس کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا عمارت سے باہر آ رہا تھا۔ "جتنی جلدی ہو سکے، اسے پالینا ہے۔ وہ چاچی کے ساتھ یہاں کیوں آئی ہے۔ میرا دل کہتا ہے اس کے ساتھ کچھ ایسا ہوا ہے کہ وہ جاتے ہی واپس آگئی ہے؟"

وہ اس عمارت سے باہر آتے ہوئے جوش اور جنون

میں بڑبڑا رہا تھا۔ ''اس کے ساتھ کیا بات ہوگئی ہے؟ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ میں کیسے معلوم کروں؟''

حماد فون پر اپنے ماتحتوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ ابھی شاپنگ پلازا میں آئیں اور ماروی کی تصویر دیکھیں پھر اسے پورے شہر میں تلاش کریں۔ وہ کرائے کے مکانوں میں اور ہوٹلوں میں یا کسی گوشے میں کہیں ضرور ہوگی۔

محبوب فون پر ٹنڈے جانی سے کہہ رہا تھا۔ ''تم ماروی کو پہچانتے ہو۔ کئی بار اسے دیکھ چکے ہو۔ وہ شہر میں ابھی کہیں ہے اور یہاں سے کہیں جا بھی سکتی ہے۔ اسے ریلوے اسٹیشن اور لانگ روٹ کے بس اڈوں میں تلاش کرو۔''

پھر اس نے حماد سے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کرائے پر حاصل کرو۔ انہیں ماروی کی تصویر دکھاؤ۔ ڈھونڈنے والے اتنی تعداد میں ہوں کہ وہ کہیں چھپ کر نہ رہ سکے۔ نظروں میں آجائے۔''

ماروی اس کی دیوانگی کو خوب سمجھتی تھی۔ اس نے چاچا سے کہا۔ ''محبوب مجھے ڈھونڈ نکالنے کے لیے پورا شہر کھنگال ڈالے گا۔ اس کے آدمی یہاں سے جانے والی ہر ٹرین میں جھانکتے پھریں گے۔ تم فوراً ٹیکسی لے آؤ۔ ہم یہاں سے ٹیکسی میں دوسری جگہ جائیں گے۔ وہاں سے ٹرین میں سوار ہوں گے۔''

یہ بھی خاصی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی تھی۔ محبوب اس طرح دار معشوق تک پہنچنے کے لیے وسیع ذرائع استعمال کر رہا تھا۔ اسے تلاش کرنے کے لیے کرائے کے کھوجیوں کی خدمات حاصل کر رہا تھا۔ لیکن دن سے رات ہوگئی۔ رات سے صبح ہوگئی۔ وہ نظر نہیں آئی۔

سمیرا نے پہلی سہاگ رات گزاری تھی۔ دوسری رات کے لیے ترس گئی۔ جھنجلا کر ماروی کو کوسنے اور بددعائیں دینے لگی۔ اس نے فون پر معروف سے کہا۔ ''یہ تو منحوس گئی تھی۔ پھر اچانک یہاں مرنے کیوں آگئی ہے؟''

معروف نے کہا۔ ''مجھے حماد نے بتایا ہے۔ تعجب ہے اتنی جلدی کیوں لوٹ آئی ہے؟''

سمیرا نے کہا۔ ''محبوب کل سے گھر نہیں آئے ہیں۔ میں کال کرتی ہوں تو جھوٹی تسلی دیتے ہیں کہ صبر کرو۔ ایک آدھ گھنٹے میں آجاؤں گا۔ کل کا پورا دن پوری رات گزر گئی ہے۔ یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ایک نئی دلہن اپنی انسلٹ کیسے برداشت کر رہی ہوگی۔''

معروف نے کہا۔ ''سمیرا! تم آج سے نہیں، اسے شادی سے پہلے اچھی طرح دیکھتی سمجھتی آئی ہو۔ تم نے بہت

بوجھ کر اسے اپنایا ہے۔ لہٰذا اپنی انسلٹ محسوس نہ کرو۔ آگے اور نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہے گا۔ اس لیے تیار بیٹھی رہو۔''

وہ دوسرے دن دس بجے تھکا ہارا آیا۔ اس کی ناکامی اور گہری سنجیدگی کے آگے سمیرا کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے رونے لگی۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ ''کیوں رو رہی ہو؟ تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا ہوں۔ واپس آگیا ہوں۔''

وہ باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، وہ اچانک کیوں آئی تھی اور کہاں چلی گئی ہے؟ میرا سر گھوم رہا ہے۔ پلیز آنسو بہا کر موڈ خراب نہ کرو۔ گھر کے ماحول کو اچھا رکھو۔''

وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ بڑی دیر بعد غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرے میں آیا پھر بستر پر گر پڑا۔ وہ خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے گہری نیند میں ڈوب گیا۔

تب اس نے دل میں کہا۔ ''ماروی! اسے مجھ سے نہیں چھین رہی ہے۔ میں نے ماروی سے اسے چھینا ہے۔ میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ شادی کے بعد ایسا ہوگا اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔''

وہ محبوب کے پاس آ کر لیٹ کر اس سے لگ کر سوچنے لگی۔ ''میں نے شادی کر کے عقلمندی کی ہے۔ اسے اپنے نام کر لیا ہے۔ اب یہ کھونٹے سے بندھا ہوا بیل ہے۔ جہاں بھی بھاگے گا، رسی کی لمبائی تک جا کر واپس آجائے گا۔''

وہ اس سے ذرا اور لپٹ گئی۔ ''میرے سر کے تاج! میرے سر کے آسمان! آسمان سر پر ہی رہتا ہے۔ کہیں جاتا نہیں ہے۔ بس رنگ بدلتا رہتا ہے۔''

وہ بھی پچھلی رات سے جاگ رہی تھی، سو گئی۔

☆☆☆

مراد علی منگی نے کراچی کے ائرپورٹ میں قدم رکھا۔ اس کا نیا نام سکندر شاہ تھا۔ وہ دبئی کی ایک بہت بڑی کمپنی کا نمائندہ بن کر آیا تھا۔ وہ کمپنی تمام ممالک میں اپنے نمائندے بھیج کر وہاں کی ہوم انڈسٹریز کی بنی ہوئی چیزیں خریدتی تھی۔

وہ نمائندے گھریلو دستکاری کا سامان خرید کر دبئی بھیجتے تھے۔ ماسٹر نے اپنے ذرائع سے مراد کو اس بڑی کمپنی کا نمائندہ بنا دیا تھا۔ وہ ٹھوس کاغذی ثبوت کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان سے ہوم انڈسٹریز کی چیزیں خریدنے آیا تھا۔

کمپنی بہت ہی مستند اور مشہور تھی۔ کوئی مراد پر کسی طرح کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستان میں اس کمپنی کا جو سول

ایجنٹ تھا، وہ اسے ریسیو کرنے آیا تھا اور اسی نے اس کی رہائش کا انتظام کیا تھا۔

وہ اس کے ساتھ ہوٹل میں آیا تھا۔ ان کے درمیان دریردہ طے ہو چکا تھا کہ کوئی کاروباری بات نہیں ہوگی۔ وہ صرف نمائشی نمائندہ بن کر بیاری نگری میں پھر سے دل کا سودا کرنے آیا تھا۔

وہاں پہنچ کر جانِ حیات کے متعلق پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ یہی سوال ان دونوں عاشقوں کو روز استے رہنے والا تھا۔ جانِ حیات کہاں ہو؟ نقشِ پا تو چھوڑ دو۔ ہلکی سی آہٹ تو سناؤ۔ وہ روٹھنے والی آہٹ نہ سنائے تو ہوا کا کوئی جھونکا اس کے پسینے کی مہک لے آئے۔

وہ گم ہو کر دونوں کو پاگل بنائی رہنے والی تھی۔ مراد جانتا تھا کہ تنہا نہیں رہے گی۔ اس نے پہلے چاچی سے ملاقات کی ہوگی اور اب اسی کے ساتھ کہیں ہوگی۔

اسے یہ معلوم تھا کہ چاچی اور چاچا اس کے بیٹے شہزاد کو لے کر عظمت شاہ کے ساتھ اس کے گوٹھ گئے تھے اور وہیں رہنے والے تھے۔ اس نے ہوٹل کے کمرے میں آرام سے بیٹھ کر چاچی کے فون نمبر پر اسے کال کی۔ وہ فون بند پڑا تھا۔

چاچی نے آخری بار محبوب کی کال اٹینڈ کرنے کے بعد سم نکال کر پھینک دی تھی۔ ماروی بھی یہی کر چکی تھی۔ ان میں سے کسی کو مخاطب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے شہزاد کے ماموں عظمت شاہ کو اس کے فون پر مخاطب کیا۔ پھر سلام کرنے کے بعد کہا۔ ''میں چاچی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

عظمت شاہ نے کہا۔ ''چاچی اور چاچا دو دن پہلے ماروی سے ملنے کراچی گئے تھے۔ مجھ سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ ماروی بھی یہاں گوٹھ میں آ کر رہے گی لیکن وہ واپس نہیں آئے ہیں۔ فون پر بھی ان سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ کسی وجہ سے کراچی میں رک گئے ہوں گے۔ دو ایک روز میں ضرور آئیں گے۔ وہ جیسے ہی آئیں پلیز مجھے فون پر ضرور اطلاع دیں۔ میں آپ کی کال کا انتظار کرتا رہوں گا۔''

وہ رابطہ ختم کر کے سوچنے لگا۔ ''چاچی اور چاچا ماروی سے ملنے کراچی آئے تھے۔ پھر گوٹھ واپس نہیں گئے۔ اس کا مطلب ہے اسی شہر میں ہیں اور وہ کہاں ہیں؟ یہ محبوب جانتا ہوگا۔ ماروی نے یا چاچی نے اس دیوانے عاشق سے رابطہ رکھا ہوگا۔''

یہ بات صدمہ پہنچاتی تھی۔ وہ اپنی جان کو، قریب سے دور رکھنے کے لیے ہی بھاگم بھاگ آیا تھا۔ اب معلوم کرنا تھا کہ محبوب اور ماروی کے درمیان فاصلہ ہے یا نہیں؟

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ''اگر وہ اپنے عاشق کی پناہ میں ہے تو مجھ سے بات نہیں کرے گی۔ اس نے فون کال میں ہی کہہ دیا تھا کہ میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتی ہے۔''

اس نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ ''کوئی بات نہیں، وہ مجھ سے بات نہ کرے۔ یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ وہاں موجود ہے۔ پھر تو میں محبوب کا جینا حرام کر دوں گا۔ وہ میری ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر اس کے سامنے میں رہنے نہیں دوں گا۔''

وہ محبوب کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ وہ رات کی نیند پوری کرنے کے بعد کھانے کی میز پر میرا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ صبح اور دوپہر کا کھانا شام کو کھا رہا تھا۔ فون نے اسے متوجہ کیا تو اس نے انجانے نمبر پڑھے۔ پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ ادھر سے آواز آئی۔ ''میں مراد بول رہا ہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''مَن سٹی کا کوڈ نمبر نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کراچی آئے ہو؟''

وہ بولا۔ ''فون ماروی کو دو۔''

''ماروی.....؟ تم کیا سمجھتے ہو، وہ میرے گھر میں ہے؟''

میرا نے ماروی کا نام سنا تو کھانا بھول گئی۔ اس کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا۔ وہ محبوب کو اور فون کو دیکھنے لگی۔ محبوب نے پوچھا۔ ''یہ کیا چکر ہے مراد؟ کل ماروی یہاں تنہا آئی۔ آج تم آئے ہو۔ دونوں الگ کیوں ہو؟''

وہ سب سے پہلے علیحدگی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ دل و دماغ میں تجسس بھرا ہوا تھا۔ اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں میں نااتفاقی پیدا ہو گئی ہے؟''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''کوئی سوال نہ کرو۔ فوراً ماروی سے بات کراؤ۔''

''میں نے کہا نا، وہ یہاں نہیں ہے۔ میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔''

''جھوٹ بولتے ہو۔ صورت نہیں دیکھی اور کہتے ہو وہاں تمہارے پاس آئی ہے۔''

''یہاں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے گھر میں آئی ہے۔ وہ شہر میں دیکھی گئی ہے۔ حماد صدیقی نے اسے دیکھا تھا۔ پھر ہم اسے کل سے تلاش کر رہے ہیں۔ وہ اسی شہر میں چاچی اور چاچا کے ساتھ کہیں چھپی ہوئی ہے۔''

''چھپنے کے لیے تمہاری کوٹھی سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں ہے۔ [illegible] مسلح [illegible] بھی ہیں۔ میں زبردستی اس کے

بھی متاثر ہوتا ہے۔ وہ طلاق تک پہنچ گا یا نہیں؟"

"آپ حکم کریں۔ ہم طلاق بھی کرا دیں گے۔ وہ اسے آزاد کرنے کو راضی نہیں ہوگا تو اسے زندگی سے آزاد کر دیں گے۔ پھر تو ماروی تک آپ کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ اسے آپ کے پاس رہنے سے مراد سے نجات مل جائے گی۔"

محبوب کی شرافت اپنے رقیب کی ہلاکت گوارا نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ الجھ گیا تھا۔ مراد نے پہلے اسے بلاک کرنے کی دھمکی دی تھی اور یہ تو عقل سمجھاتی ہے کہ سانپ کو ڈسنے کے لیے زندہ نہ چھوڑو۔ یہ سراسر حماقت ہوگی۔ اسے عقل نے سمجھایا۔ پھر بھی اس نے زبان سے یہ نہیں کہا کہ اس کی ماروی کا اس کی جیتی جیتی حیات کا سہاگ اجاڑ دیا جائے۔

مراد ناکامیوں اور محرومیوں سے جھنجلایا ہوا تھا۔ ماروی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ عظمت شاہ سے باتیں کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کے ساتھ چاچی اور چاچا بھی گم ہو گئے ہیں۔ پہلے بھی ایک بار وہ تینوں چھپنے کے لیے ریتی کی طرف گئے تھے۔ اس وقت مراد ان کی تلاش میں وہاں تک گیا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ کیا پھر اسے سیکڑوں میل دور جانا ہوگا؟"

ابھی وہ محبوب کے خلاف شب دور کرنا چاہتا تھا۔ دماغ میں یہ بات آ رہی تھی کہ وہ محبوب کی مہربانیوں سے اور احسانات سے پہلے ہی متاثر تھی۔ اب پاکستان میں بے سہارا ہو کر پھر اسی شریف زادے کے پاس جائے گی۔ اس کا دماغ اس سے یہی چیخ چیخ کر کہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہوٹل سے باہر آ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کوٹھی کے قریب آیا جہاں ماروی چاچی چاچا کے ساتھ رہتی تھی۔ وہاں ویرانی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز بھی نہیں تھے۔ ایک بوڑھا چوکیدار تھا۔ اس نے پوچھا۔ "چاچی جی کہاں ہیں؟ میں ان کا رشتے دار ہوں۔ ان سے ملنے آیا ہوں۔"

چوکیدار نے کہا۔ "وہ تو چلی گئی ہیں اور ان کی بیٹی سمندر پار گئی ہے۔ اب یہاں کوئی نہیں رہتا ہے۔"

وہ وہاں سے محبوب کی کوٹھی سے کچھ دور آ کر ٹیکسی سے اتر گیا۔ ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا۔ ٹیکسی وہاں سے چلی گئی۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا سوچتا رہا۔ گلی کے آخری سرے پر کوٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ادھر پیدل جانے لگا۔ اسے اندیشہ نہیں تھا کہ پہچان لیا جائے گا۔ اس نے آئینے کے سامنے خود کو اجنبی پایا تھا۔ اب تو ماروی بھی اسے پہچان نہیں سکتی تھی۔

رفتہ رفتہ چلتا ہوا کوٹھی کے سامنے سے گزرنے لگا۔ باہر دو مسلح گارڈز تھے۔ ایک کھڑا ہوا تھا۔ دوسرا کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ احاطے کی دیوار اونچی تھی۔ ماروی گارڈن میں جھولا جھولتی ہوئی تو دکھائی دینے والی نہیں تھی۔ اس کی بے اعتقادی کہہ رہی تھی کہ وہ محبوب کی پناہ میں پہنچ کر محفوظ اور مطمئن ہوگئی ہے۔

وہ کوٹھی کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک طرف گھوم کر پچھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ احاطے کی اونچائی کے باعث کوٹھی کی صرف دوسری منزل دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پچھلے حصے کی طرف پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہ نظر آ گئی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ پہچان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے اپنا سر دوآنچل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ بالکونی سے گزرتی ہوئی کمرے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

اب وہ پہلی سے زیادہ بچھڑی ہوئی محبوبہ تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی تڑپ گیا تھا۔ اس کی من موہنی صورت دیکھنے کے لیے وہیں گلی میں رک گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ پھر بالکونی میں آئے گی۔

اسے پالینے کے بعد یہ غصہ بھڑک رہا تھا کہ وہ اس کے رقیب کے پاس آ گئی ہے اور محبوب نے اسے چھپا کر رکھا ہے۔ وہ سر جھکا اٹھا کر ادھر دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں قسم کھا رہا تھا کہ اسے رقیب کے گھر میں رہنے نہیں دے گا۔ پہلے فون کے ذریعے اس کی واپسی کا مطالبہ کرے گا۔ محبوب اسے واپس کرنے سے انکار کرے گا تو پھر وہ لہو اچھالنے پر مجبور ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی ملازمہ جھاڑو لے کر بالکونی کی صفائی کے لیے آئی۔ اس نے دور گلی میں کھڑے ہوئے مراد کو دیکھا۔ پھر اپنے کام سے لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر ادھر دیکھا تو مراد گردن اٹھا کر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ وہ اس امید سے کمرے کے دروازے کو دیکھ رہا تھا کہ شاید ماروی پھر بالکونی میں آئے گی۔

وہ ملازمہ گھبرا کر جھاڑو ایک طرف پھینک کر کمرے میں آئی۔ میرا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی اسکرین پر نئے ڈیزائن کیے ہوئے ملبوسات کے پکچرز کا مطالعہ کر رہی تھی۔

ملازمہ نے کہا۔ "بی بی جی! باہر گلی میں ایک آدمی کھڑا ہوا ہے۔ وہ گھور گھور کر ادھر دیکھ رہا ہے۔"

میرا نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ مجھے کیوں دیکھ رہا ہے؟"

"یہ کون بی بی جی! میرا مرد بھی کہتا رہتا ہے کہ میں

آج بھی جوان چھوکری لگتی ہوں۔''

سمیرا ہنس پڑی۔ اس نے وہاں سے اٹھ کر دروازے کے پردے کے پاس آکر چھپتے ہوئے دیکھا۔ پچھلی گلی میں ایک اجنبی کھڑا ہوا بالکونی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ادھر مراد کو اسی رنگین لباس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اسے یقین ہوگیا کہ ماروی چھپ کر اسے دیکھ رہی ہے۔ اس نے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔ پھر کہنا چاہا۔ ''ماروی! میں ہوں مراد......''

پھر عقل آگئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ سوچا ماروی کسی اجنبی کو مراد تسلیم نہیں کرے گی۔ پھر یہ کہ اسے خود کو ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ماروی کو بعد میں یقین دلائے گا تو وہ اسے مراد تسلیم کرلے گی۔

اس نے ایک ذرا ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا تھا۔ سمیرا پریشان ہوگئی۔ پتا نہیں کون تھا اسے بھی ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی فون پر سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔ ''کوٹھی کے پیچھے گلی میں کوئی شخص ہماری طرف دیکھ کر اشارے کررہا ہے۔ اسے پکڑو اور معلوم کرو وہ کون ہے؟''

ادھر وہ فون کررہی تھی۔ ادھر ملازمہ نے بالکونی میں آکر جھاڑو اٹھا کر اسے یوں دکھائی جیسے جھاڑو سے مارنا چاہتی ہو۔ وہ ناگواری سے منہ بنا کر وہاں سے جانے لگا۔ یہ خیال آیا کہ ملازمہ نے شور مچایا تو گارڈز آجائیں گے۔

یہ یقین ہوگیا کہ ماروی وہاں ہے۔ اب تو محبوب سے نمٹنا تھا۔ ماروی پردے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ سامنے نہیں آرہی تھی۔ اسے سامنے لانا تھا۔ وہ فون نکال کر محبوب سے رابطہ کرنے لگا۔ دو گارڈز نے پچھلی گلی میں آکر دیکھا۔ انہیں کوئی وہاں نظر نہیں آیا۔ مراد کے فون سے آواز آئی کہ مطلوبہ نمبر بزی ہے۔ وہ اس لیے بزی تھا کہ اسی وقت سمیرا فون پر محبوب کو اس اجنبی کے بارے میں بتارہی تھی۔

محبوب نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تعجب ہے وہ کون ہے؟ کیا گارڈز نے اسے پکڑلیا ہے؟''

''نہیں۔ میں پچھلی گلی میں دیکھ رہی ہوں۔ گارڈز اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ بھاگ گیا ہے۔''

''میں حیران ہوں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔''

''پہلے کبھی اس کوٹھی میں کوئی جوان عورت نہیں رہتی تھی۔ آپ یہاں تنہا رہا کرتے تھے۔''

''آج سے کوٹھی کے پیچھے بھی گارڈز کی ڈیوٹی لگاؤں گا۔ تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟''

''نہیں۔ میں ادھر کا دروازہ بند کررہی ہوں۔ جب آپ آئیں گے تو کھولوں گی۔''

محبوب نے رابطہ ختم کرکے اسکرین کو دیکھا۔ مراد کا فون نمبر تھا۔ اس کی مس کال تھی۔ اس نے وہ نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہونے پر پوچھا۔ ''کیا تم مجھے کال کررہے تھے؟''

''ہاں۔ تمہارا جھوٹ تمہاری مکاری کھل گئی ہے۔ میں نے ماروی کو تمہاری کوٹھی میں دیکھ لیا ہے۔ اسے فوراً وہاں سے نکالو۔ میں تمہارے سائے میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کروں گا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، وہ میری کوٹھی میں نہیں ہے۔''

''تھو ہے تمہاری جھوٹی قسم پر۔ میں نے ابھی پچھلی بالکونی میں اسے دیکھا ہے۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''اوگاڈ! وہ تم تھے۔ پیچھے گلی میں کھڑے ہوئے میری وائف کو اشارے کررہے تھے۔''

''تمہاری وائف کہاں سے آگئی؟ جھوٹ پر جھوٹ بولتے جارہے ہو۔''

''میں شادی کرچکا ہوں۔ سمیرا میری شریک حیات ہے۔ تم نے ابھی سمیرا کو دیکھا ہے۔''

''پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ سمیرا پردہ نہیں کرتی ہے۔ وہ ہوتی تو بالکونی میں آتی۔ ماروی مجھ سے چھپ رہی تھی اس لیے پردے کے پیچھے تھی۔ سامنے نہیں آرہی تھی۔''

''یا خدا...... میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ میرے گھر آؤ اور اپنی آنکھوں سے سمیرا کو دیکھو۔''

''ایسا احمق نہیں ہوں کہ آؤں اور پکڑا جاؤں۔ میں روپوش رہوں گا اور ماروی کو وہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟''

وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ وارننگ دے رہا تھا۔ ''آخری بار سمجھاتا ہوں۔ مجھ سے پنگا نہ لو۔ اسے اپنی کوٹھی سے نکالو۔ وہ باہر کسی بھی علاقے میں کسی بھی مکان میں چاچی کے ساتھ رہے گی۔ تب ہی مجھے اطمینان حاصل ہوگا۔''

''مراد! مجھے جھوٹا اور بے ایمان نہ سمجھو۔ اگر سمجھانے کے باوجود نہیں سمجھو گے تو جو کرنا چاہو کرو۔ تمہیں اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔''

یہ کہہ کر محبوب نے رابطہ ختم کردیا۔ مراد نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ اب تو ٹھن گئی تھی۔ دشمنی پکی ہوگئی تھی۔ اس نے فون پر منسر کو مخاطب کیا۔ اس نے پوچھا۔ ''ہاں مراد! بولو؟''

وہ بولا۔ ”مجھے ابھی، اسی وقت گن، بلٹس اور سائلنسر کی ضرورت ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیا ارادے ہیں؟ تم مجھ سے وعدہ کر کے گئے ہو کہ پاکستان میں پرامن رہو گے۔ تمہارا رقیب لڑنے جھگڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ ماروی اس کے پاس ہوگی تو اسے محبت اور صلح صفائی سے وہاں سے لے آؤ گے اور کسی دوسری جگہ اس کی رہائش کا انتظام کرو گے۔“

”میں یہی سوچ کر آیا تھا کہ محبوب سیدھی طرح مان جائے گا لیکن وہ میرے اور ماروی کے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے لیے لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔“

”یہی تو ہوتا ہے۔ جو ہم نہیں سوچتے وہی ہونے لگتا ہے۔ وہاں تم گن اٹھاؤ گے تو بڑی مشکلوں میں پڑ جاؤ گے۔“

”میں کوشش کروں گا کہ گولی نہ چلاؤں۔ کوئی خون خرابا نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ اسلحے کے ذریعے صرف دھمکیاں دوں گا۔ تب ہی کام بنے گا۔“

”دیکھو مراد! اگر بات بڑھے گی تو پولیس اور انٹیلی جنس والے تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ تم وہاں سے نکل کر انڈیا نہیں جا سکو گے۔ میرا کام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ کا کوئی کام کھٹائی میں نہیں پڑے گا۔ پلیز مجھ پر بھروسا کریں۔“

”تمہیں آج اور کل دو دن پاکستان میں رہنا ہے۔ پرسوں تم جہاز سے انڈیا جاؤ گے۔“

”میں ہر قیمت پر پرسوں یہاں سے جاؤں گا۔ اگر آپ کو اندیشہ ہے کہ ائرپورٹ اور بندرگاہ کی ناکابندی ہوگی تو بارڈر پر اپنے آدمیوں کو الرٹ رکھیں۔ جس طرح پہلے مجھے بارڈر کراس کرایا گیا تھا اسی طرح میں انڈیا پہنچ جاؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ ہوٹل میں رہو۔ تمہاری مطلوبہ چیزیں وہاں پہنچ جائیں گی۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ ہوٹل میں ایک مصیبت اس کی منتظر تھی۔ وہ ریسپشن پر اپنے کمرے کی چابی لینے گیا تو کاؤنٹر گرل نے کہا۔ ”ایک صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں ویزیٹرز ہال میں ہیں۔“

مراد نے ادھر گھوم کر دیکھا۔ وہاں کئی افراد مختلف صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان حماد صدیقی نظر آرہا تھا۔ وہ بھی دور سے کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہی مطلوبہ شخص ہے۔

حماد اپنی جگہ سے اٹھ کر آنے لگا۔ مراد پریشان ہو گیا لیکن بظاہر پرسکون رہا۔ وہ قریب آیا تو کاؤنٹر گرل نے کہا۔ ”یہ مسٹر سکندر شاہ ہیں۔“

حماد نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کرائم برانچ کا انسپکٹر حماد صدیقی ہوں۔“

اس نے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا پھر کہا۔ ”جو غیر ملکی آج اور کل یہاں آئے ہیں، ہم ان کے متعلق صحیح معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ میں آپ کا بھی کچھ وقت ضائع کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں نہ ہم وہاں چل کر بیٹھیں۔“

اس نے وزیٹرز ہال کی طرف اشارہ کیا۔ مراد نے کہا۔ ”اگر آپ میرے کمرے میں بیٹھنا پسند کریں گے تو میں اپنے متعلق اہم کاغذات آپ کو دکھا سکوں گا۔“

وہ لفٹ کے ذریعے تیسرے فلور پر آ گئے۔ مراد نے چابی نکال کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے خوش آمدید کہا۔ حماد صدیقی نے کمرے کے اندر آ کر اسے سر سے پاؤں تک توجہ سے دیکھا پھر کہا۔ ”مراد......!“

مراد نے اسے تعجب اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی خاموش نظریں پوچھ رہی تھیں کہ مراد کسے کہہ رہے ہو؟

حماد نے کہا۔ ”میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ یہاں تنہائی میں میرے سامنے کھل جاؤ۔“

مراد نے گہری سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ مجھے مراد کہہ رہے ہیں؟ کیا اس کی شکل صورت میرے جیسی ہے؟“

”سرجری کے ذریعے چند گھنٹوں میں صورتیں بدل جاتی ہیں۔ ہوٹل کے رجسٹر سے معلوم ہوا ہے کہ تم سن سٹی سے آئے ہو۔“

مراد نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اچھا تو سن سٹی سے جو بھی یہاں آئے گا، وہ مراد ہوگا۔“

حماد اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”میں تمہیں ماروی تک پہنچا سکتا ہوں۔ کھل جاؤ۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”آپ کیسے سمجھ گئے کہ میں حسن پرست ہوں۔ کون ہے یہ ماروی؟ اگر وہ بہت خوب صورت ہے تو میں مراد بن جاؤں گا۔“

”تم یہاں کس لیے آئے ہو؟“

”میں ورلڈ کاٹیج انڈسٹریز کا ایک نمائندہ ہوں۔ پاکستان اور ہندوستان کی کاٹیج انڈسٹریز کی مصنوعات خریدنے آیا ہوں۔“

اس نے اٹیچی کھول کر اس میں سے ورلڈ کاٹیج

انڈسٹریز کے کاغذات دکھائے۔ ان میں ہال کا آرڈر بک کرنے اور ان کی پیمنٹ کرانے کے کاغذات بھی تھے۔ وہ ٹھوس ثبوت کہہ رہے تھے کہ واقعی وہ ایک مشہور و معروف کمپنی کا نمائندہ ہے۔ یہ کسی بھی طرح ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ مراد علی منگی ہے۔

حماد نے پوچھا۔ ''تم یہاں کب تک رہو گے؟''

''میں پرسوں کی فلائٹ سے انڈیا جاؤں گا۔''

''کیا میں تمہارا فون استعمال کرسکتا ہوں؟''

مراد نے تھوڑی دیر پہلے محبوب سے بات کی تھی۔ کال کرنے اور کال وصول کرنے کی فہرست میں ماروی، محبوب اور چاچی وغیرہ کے نام تھے۔ فون حماد کے ہاتھ میں جاتے ہی بھید کھل جاتا۔

اس نے پوچھا۔ ''آپ یہ اچانک میرا فون کیوں استعمال کرنا چاہتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میرے فون میں بیلنس نہیں ہے۔ میں ایک ضروری کال کرنا چاہتا ہوں۔''

اسی وقت فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مراد نے فون کو دیکھا۔ ایک نیا نمبر تھا۔ کوئی اجنبی کال کررہا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھتے ہوئے حماد سے بولا۔ ''ایکسکیوزمی۔ میں ابھی آیا۔''

اس نے کمرے سے باہر آکر کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔ ''سر! آپ سکندر شاہ ہیں؟''

''ہاں میں سکندر شاہ ہوں۔ تم کون ہو؟''

''میں ماسٹر کا خادم ہوں۔ مطلوبہ مال لایا ہوں۔''

وہ کمرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''او گاڈ! میرے کمرے میں کرائم برانچ کا ایک انسپکٹر ہے۔ تم ہوٹل سے دور رہو۔ جب فون کروں تب آؤ۔''

اس نے رابطہ ختم کرتے ہی اس اجنبی کے نمبر مٹا دیے۔ ماروی محبوب اور چاچی کے نمبر بھی ڈیلیٹ کردیے۔ پھر کمرے میں آکر فون کو حماد کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کیا پینا پسند کریں گے ٹھنڈا یا گرم؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''جلد ہی تم سے ملوں گا پھر تمہیں ٹھنڈا بھی پلاؤں گا اور گرم بھی....''

وہ جانے لگا۔ مراد نے کہا۔ ''سر! آپ میرا فون استعمال کرنا چاہتے تھے۔''

وہ دروازہ کھول کر جاتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں اب اس میں کچھ نہیں رہا ہے۔''

وہ دروازے تک آکر بولا۔ ''اچھیں آپ شیئر کرتے رہتے ہیں پرسوں یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ کو آرام سے نیند آئے گی۔''

وہ لفٹ کے ذریعے نیچے چلا گیا۔ مراد نے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ماسٹر کے خادم کے نمبر پنچ کیے۔ پھر حماد کے متعلق پریشان ہوکر سوچنے لگا۔ اس کے رویے نے بتادیا تھا کہ وہ اس پر شبہ کررہا ہے بلکہ اسے یقین تھا کہ وہ مراد ہے اور اب وہ کڑی نگرانی میں رہنے والا ہے۔

اس نے رابطہ ہونے پر خادم سے کہا۔ ''ابھی اسلحہ نہ لاؤ۔ مجھ سے دور رہو۔ جب ضرورت ہوگی تو تمہیں کال کروں گا۔''

وہ فون بند کرکے اس کال کو ڈیلیٹ کرنے کے بعد ایک صوفے پر گر پڑا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح سوچنے لگا۔ ماروی کو محبوب کی کوٹھی سے کیسے نکالے؟

محبوب بڑی ذہانت سے پرامن جنگ کا آغاز کرچکا تھا۔ حماد کو اس کے پیچھے لگا کر اسے قانون کے حصار میں لا رہا تھا۔ ابھی حماد کے رویے نے بتادیا تھا کہ اس کی سخت نگرانی کی جارہی ہے۔

وہ اب تک اسلحے کے زور پر میدان مارتا آیا تھا۔ اب اپنی ماروی کو رقیب کے اثر سے نکالنے کے لیے اسلحہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ حماد کسی وقت بھی ہوٹل کے کمرے میں چھاپا مار سکتا تھا۔ اس کے آدمی کسی راستے چلتے اس کی تلاشی لے سکتے تھے۔ وہ اپنے لباس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس نے سوچا تھا۔ ایک گن ہوگی تو محبوب کو کہیں گھیرے گا۔ اس پر گولی چلائے گا۔ پہلی بار ہلاک نہیں کرے گا۔ صرف زخمی کرکے دہشت زدہ کرے گا۔ اس کے بعد بھی وہ ماروی سے دست بردار نہیں ہوگا تو اسے گولی مار کر اندیا چلا جائے گا۔ اسے اطمینان رہے گا کہ ماروی اس کبھی سے نکلے یا نہ نکلے، اسے ہاتھ لگانے والا رقیب دنیا میں نہیں ہوگا۔

ساری پلاننگ چوپٹ ہوگئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، کس طرح اسے وہاں سے باہر لائے۔ اسے کس طرح محبوب سے دور کرے؟ رہ رہ کر بالکونی کا منظر نگاہوں کے سامنے ابھر رہا تھا۔ وہ اپنے مراد سے اتنی نفرت کررہی تھی۔ پردے کے پیچھے کھڑی تھی۔ نہ اپنی صورت دکھا رہی تھی، نہ اس کو دیکھنا چاہتی تھی۔

اپنی نفرت کے پیش نظر یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ

اپنی مرضی سے بچپن کے پیار کی طرف لوٹنے گی۔ وہ پیار کی ہوچکا تھا۔ اب تو زبردستی اسے اپنا بنا کر رکھنا تھا اور وہ اپنی بن کر کیسے نہ رہتی؟ اس نے نکاح قبول کیا تھا۔ بیوی تھی' اسے ہزار نفرتیں بھول کر مروانی ہی بن کر رہنا تھا۔

اب یہ بے چینی تھی کہ وہ محبوب کی کوٹھی میں تھی۔ نگاہوں میں آگئی تھی۔ بالکل قریب تھی' وہ وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ آدھی رات کے بعد خطرہ مول لے کر کوٹھی میں گھس کر ماروی کو وہاں سے لاسکتا تھا۔ اس کے بعد جو ہوتا دیکھا جاتا۔

زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ آنے کے لیے راضی نہ ہوتی۔ محبوب اسے آنے نہ دیتا تو وہ رقیب کو گولی مار کر قانون کے شکنجے میں آجاتا۔ کوئی بات نہیں... ایک دن پھانسی چڑھ جاتا۔ کوئی بات نہیں... یوں مطمئن ہوکر دنیا سے جاتا کہ اس کی بیوی رقیب کی آغوش میں کبھی نہ جا سکے گی۔

وہ شام کو کمرے سے باہر نکل کر ہوٹل کے ریفریشمنٹ ہال میں آیا۔ وہاں بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ دشمنوں کو تاڑنے لگا۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کرائم برانچ والے اس کی نگرانی کررہے ہیں یا نہیں؟

کچھ صحیح اندازہ نہ ہوسکا۔ وہ پھر کمرے میں واپس آکر سوچنے لگا کہ اسے سمندر کے ساحل تک جانا چاہیے۔ تب صحیح اندازہ ہوگا۔ تب وہ تعاقب کرنے والوں کو اچھی طرح پہچان سکے گا اور ان نگرانی کرنے والوں کے طریقۂ کار کو پوری طرح سمجھ سکے گا۔

اسی وقت رنگ ٹون سنائی دی۔ اسکرین پر نمبر کہہ رہے تھے کہ محبوب کال کررہا ہے۔ اس کی چھٹی حس نے کہا۔ خطرہ ہے۔ محبوب کے فون سے حماد بول سکتا ہے۔ یوں معلوم کرسکتا ہے کہ محبوب سے اس بہروپیے کا رابطہ ہے جو سکندر شاہ بنا ہوا ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک فون کو دیکھتا اور سوچتا رہا۔ کالنگ ٹون بند ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا۔ "میں غلطی کررہا ہوں۔ مجھے فون اٹینڈ کرنا چاہیے تھا۔ ہوسکتا ہے محبوب گھٹنے ٹیکنے والا ہو۔ یہ کہنے والا ہو کہ آؤ اور آکر اپنی ماروی کو لے جاؤ۔"

وہ ماروی کو لے آنے کے لیے مچل گیا۔ محبوب کے فون نمبر کا پہلا نمبر پنچ کیا۔ پھر رک گیا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ گڑبڑ ہورہا ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے ایک ذرا سوچ کر اپنی اٹیچی سے ایک سم نکالی۔ یہ طے کیا کہ ابھی محبوب سے باتیں کرنے کے بعد موجودہ سم فون سے نکال کر چھپا دے گا۔ آئندہ نئی سم استعمال کرے گا۔

مراد کا اندیشہ درست تھا۔ حماد پھر اس ہوٹل میں آیا تھا۔ اس بار محبوب اس کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے رقیب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ خیال تھا کہ شاید اسے نئے بہروپ میں پہچان سکے گا۔ بڑی حد تک یقین تھا کہ وہ اس بار پکڑا جائے گا۔

وہ دونوں تھرڈ فلور پر اس کے کمرے کے قریب آگئے۔ محبوب نے تھوڑی دیر پہلے وہاں سے مراد کو کال کی تھی اور اس نے اٹینڈ نہیں کی تھی۔ وہ اپنے فون کی سم بدلنے کی تدبیر سوچتا رہا تھا۔ پھر محبوب نے دس منٹ کے بعد اس سے رابطہ کیا تو اس کی آواز سنائی دی۔ "جی محبوب صاحب! میں بول رہا ہوں۔ آپ پہلے یہ بولیں ماروی کو میرے حوالے کررہے ہیں۔"

محبوب نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں کہہ چکا ہوں کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔"

"وہ قسمت سے تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے۔ تم اسے میری ہوا بھی لگنے نہیں دو گے۔ تم چاہتے ہو میں تمہارے جھوٹ کو سچ مان کر واپس چلا جاؤں۔"

وہ دونوں کمرے کے باہر تھے۔ حماد بند دروازے سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ اندر گہری خاموشی تھی۔ مراد کمرے کے دوسرے کونے میں ایک صوفے پر بیٹھا بول رہا تھا۔ اس لیے حماد تک اس کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس نے محبوب کی طرف انگوٹھا دکھا کر اسے ہلاتے ہوئے اشارے میں کہا۔ "وہ نہیں ہے۔"

محبوب نے فون پر باتیں کرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر حماد سے اشارے میں کہا۔ "دستک دو۔"

اس نے دستک دی۔ کمرے کے اندر مراد نے کان سے فون ہٹا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر لائن کاٹ دی۔ ادھر محبوب نے فون بند کردیا۔ اس نے بھی حماد کے پاس آکر دروازے پر دستک دی۔ پھر وہ انتظار کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھنے لگے۔

دروازہ دو دستک پر نہیں کھلا تھا۔ حماد نے تیسری بار کال بیل کا بٹن دبایا تو وہ کھل گیا۔ حماد نے مراد کے ہاتھ میں فون دیکھ کر کہا۔ "فون پر باتیں ہورہی تھیں' اس لیے دروازہ نہیں کھول رہے تھے۔"

مراد محبوب کی طرف دیکھنے سے کترا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "باتیں نہیں ہورہی تھیں۔ میں ابھی سوس ڈسٹری بیوٹر کو فون کرنے جا رہا تھا۔ مسٹر حماد! انوسٹی گیٹر ہونے کا مطلب یہ

نہیں ہے کہ آپ مجھے بار بار پریشان کرتے رہیں۔''

ایسے وقت محبوب نے اپنے موبائل فون سے اس کی تصویر اتارتے ہوئے کہا۔ ''آپ ناراض نہ ہوں۔ ہم آپ سے تھوڑی دیر باتیں کریں گے۔ پھر چلے جائیں گے۔''

''سوری، میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ آپ یہاں سے جائیں ورنہ میں ہوٹل کی انتظامیہ سے شکایت کروں گا۔''

حماد نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مراد... اب تم چھپ نہیں سکو گے۔ تمہارا فون ابھی تمہیں بے نقاب کرے گا۔''

وہ مراد کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''اپنا فون دو۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ تم ابھی محبوب صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔''

مراد نے حماد کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا فون جھٹکنے کے انداز میں رکھا پھر کہا۔ ''کون ہے یہ مراد؟ کیوں اس کا نام لے کر مجھے پریشان کر رہے ہیں؟''

حماد نے اس کے فون کو آپریٹ کرتے ہوئے ریسیونگ اور ڈائلنگ کالز کی فہرستیں چیک کیں۔ ان میں کہیں محبوب کا فون نمبر نہیں تھا۔ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ اس نے ابھی محبوب سے بات نہیں کی تھی اور یہ کہ محبوب تھوڑی دیر پہلے جس مراد سے باتیں کر رہا تھا وہ کسی دوسری جگہ ہے۔

مراد نے اس سے فون چھین کر ہوٹل کے منیجر سے رابطہ کیا۔ پھر غصے میں بولا۔ ''میں سکندر حیات روم نمبر تھری زیرو ون سے بول رہا ہوں۔ یہ کرائم برانچ کا ایک افسر بار بار آ کر مجھے پریشان کر رہا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ آئندہ یہ آئے گا تو میں آپ کا ہوٹل چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

محبوب اور حماد فوراً ہی پلٹ کر وہاں سے لفٹ کے اندر چلے گئے۔ لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ تب مراد نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ حماد اور محبوب نے اسے گھیرا تھا اور وہ بے نقاب ہونے سے بال بال بچا تھا۔

ان کی بھاگ دوڑ بتا رہی تھی کہ جب تک وہ کراچی شہر میں رہے گا تب تک اس پر نظر رکھی جائے گی۔ ان کی سرگرمی کے باعث اس کی مشکلات بڑھ گئی تھیں۔ وہ ماروی کو حاصل کرنے محبوب کی کوٹھی کے قریب بھی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ دن گزر گیا۔ وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن کی فلائٹ سے انڈیا جانے کے لیے سیٹ کنفرم تھی اور وہ کسی بھی حال میں اپنی بیوی کو محبوب کے پاس چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر بحالت مجبوری چلا جاتا تو ذہنی طور پر الجھا رہتا۔ حاضر دماغی سے کوئی کام کر نہ پاتا۔ یوں اب سیٹ...

دشمنوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔

دیارِ غیر میں جا کر مرنے سے بہتر تھا کہ اپنے ہی شہر میں اپنی محبوبہ اپنی بیوی کو حاصل کرتے ہوئے جان دے دے۔ وہ سر پھرا آدھی رات کو ہوٹل سے نکل آیا۔ پہلی بار ہتھیار سے خالی تھا۔ جان پر کھیل جانا تھا اس لیے ہتھیار کی پروا نہیں کی۔ جب موت آتی ہے تو ہتھیار کے ساتھ بھی آتی ہے۔ پھر اسلحے کا سہارا کیا لیتا؟

دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سر سے کفن بھی نہیں باندھتے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ وہ کوٹھی کی پچھلی گلی میں آ گیا۔ تمام راستے محتاط رہا تھا۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ کسی نے تعاقب نہیں کیا ہے۔ چاندنی رات نہیں تھی۔

وہ احاطے کی دیوار پھاند کر اندر آ گیا۔ محبوب نے کوٹھی کے پچھلے حصے میں گارڈز کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ ادھر دن کے وقت ایک اور رات کے وقت ایک گارڈ. . باغ میں ٹہلتا رہتا تھا۔ اس گارڈ کو شبہ ہوا کہ کسی نے دیوار کی طرف آہٹ سنی ہے۔ وہ گن سیدھی کرتا ہوا دبے قدموں ادھر جانے لگا۔

مراد آگے نہیں، اس کے پیچھے زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر زمین سے اٹھتے ہوئے اس کے سر پر دے مارا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ پتھر کی ضرب ایسی تھی کہ دوسری آواز منہ سے نہ نکل سکی۔ وہ زمین پر گر کر بالکل ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر اس کی کلائی تھامی۔ نبض نہیں چل رہی تھی۔ یہ اطمینان ہوا کہ وہ مر چکا ہے یا بے ہوش ہو گیا ہے۔ اب آنکھیں کھول کر راستے کی رکاوٹ نہیں بنے گا۔

اسے ماروی سے ملنے کی جلدی تھی۔ وہ اس کی گن اٹھا کر دوڑتا ہوا دیوار کے پاس آیا پھر ایک پائپ سے چپک کر اوپر چڑھتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ وہاں سے ایک زینہ کوٹھی کے اندر گیا تھا۔ وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچ گیا۔ اس کے قدم رک گئے۔ ڈرائنگ روم سے بہت ہی دھیمی سی نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دل نے دھڑک دھڑک کر کہا۔ ماروی ہے۔ کسی سے بول رہی ہے۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا دروازے پر آ کر رک گیا۔

بولنے والی کی پشت نظر آ رہی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ فون پر کہہ رہی تھی۔ ''میں آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ آپ کی راتیں میرے لیے ہوتی چاہئیں۔ آپ کب تک ماروی کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔ فوراً گھر آ جائیں۔ میں جاگ رہی ہوں۔ آپ جانتے ہیں، جب سے بیمار ہوئی ہوں، راتوں کو جاگتی رہتی ہوں۔''

مراد کو اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے پہچان لیا کہ وہ سمیرا ہے۔ محبوب کی بات یاد آئی۔ وہ سمیرا سے شادی کر چکا ہے۔ اس وقت اسے یقین آیا کہ اس نے بالکونی میں پردے کے پیچھے ماروی کی نہیں سمیرا کی جھلک دیکھی تھی۔

وہ رابطہ ختم ہونے کے بعد فون کو آف کر کے صوفے سے اٹھی۔ ایسے ہی وقت مراد نے پیچھے سے جھپٹ کر اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''چپ رہو ورنہ مار ڈالوں گا۔''

اس نے صوفے پر لا کر اسے گرایا، کمرے کے بٹن سے کمرہ روشن کر لیا۔ وہ ابھی ہوئی نہیں تھی۔ وہ ایسی ہی تھی جو کھڑکی کی پچھلی گلی میں نظر آیا تھا۔ محبوب نے اس سے کہا تھا کہ وہ شاید مراد ہوگا۔

وہ خوف سے ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''تت... تم مراد ہو؟''

''ہاں مراد ہوں۔ میں پہلے بھی تمہاری عزت کرتا تھا۔ آج بھی کروں گا۔ نہ خود ماروں گا نہ تمہیں ہاتھ لگاؤں گا۔ مجھ سے سچ بولو، ماروی یہاں ہے؟''

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتی ہوں۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ محبوب تین دنوں سے اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ راتوں کو گھر نہیں آتے ہیں۔ اس وقت کسی نے اطلاع دی تھی کہ ایک لڑکی ہنی مون پر اور چوہدری کے ساتھ منظور پور کے ایک مکان میں دیکھی گئی ہے۔ وہ ادھر روانہ ہوئے گئے تھے۔ ابھی فون پر انہوں نے بتایا ہے کہ وہ ماروی نہیں ہے کوئی اور لڑکی ہے۔''

وہ بولا۔ ''میرے بھتیجے کے دوست عظمت شاہ نے بتایا ہے کہ چچی اور چچا کراچی گئے تھے۔ وہ بھی واپس نہیں آئے۔ ماروی کے ساتھ کہیں چھپ گئے ہیں۔''

اس نے ایک صوفے کے سنگھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کل بالکونی میں تم پردے کے پیچھے تھیں؟''

''ہاں میں نے تمہیں پچھلی گلی میں دیکھا تھا۔''

''میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ پردے کے پیچھے ماروی ہے۔ مجھ سے نفرت کر رہی ہے۔ اس لیے سامنے نہیں آ رہی ہے۔''

''وہ تمہیں جان سے زیادہ چاہتی ہے مراد! کبھی تم سے نفرت نہیں کرے گی۔ یہ تم معمولی عقل سے بھی نہیں سمجھ سکتے؟ تم سے نفرت کرتی تو محبوب سے محبت کرنے یہاں چلی آتی۔ وہ تو محبوب سے بھی جان چھڑا رہی ہے۔''

''ہاں تمہاری یہ بات مجھے تو صد فیصد سچی لگتی ہے۔ وہ صرف مجھے چاہتی ہے۔ کسی اور کی بھی نہیں ہوئی۔''

''مجھے دیکھ رہے ہو۔ میرا شوہر اس کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے اور میں آنسو نہیں بہاتی ہوں۔ مجھے ماروی پر اعتماد ہے۔ وہ تمہیں چھوڑ کر کبھی یہاں میری سوکن بننے نہیں آئے گی۔''

''یا خدا... تمہیں ماروی پر اس قدر اعتماد ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ اس پر شک کر رہا تھا اور بھول گیا تھا۔''

''تم اس کی عظمت کو سمجھو۔ تم نہیں جانتے اس نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اگر وہ احسان نہ کرتی تو بہت پہلے ہی محبوب کی نظروں سے گر چکی ہوتی۔ آج میں اس کی مہربانی سے محبوب کی شریک حیات بنی ہوئی ہوں۔''

وہ فون پر ہاتھ مار کر اسے ایک طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''جاؤ! یہ گن اور جا کر اسے ڈھونڈو۔ اسے ناراض ہونے دو۔ تم مناؤ گے تو وہ جلدی مان جائے گی۔''

وہ گن کا دستہ تھام کر بولی۔ ''جتنی جلدی ہو سکے اسے یہاں سے لے جاؤ مراد! ماروی نے ایک احسان یہ کیا کہ مجھے محبوب کی نظروں سے گرنے نہیں دیا۔ دوسرا احسان یہ کیا کہ تم سے روٹھنے کے باوجود محبوب کے پاس نہیں آئی۔ تم بھی مجھ پر احسان کرو۔ ماروی کو یہاں سے لے جاؤ۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''میں یہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔ تم میرا یہ چہرہ دیکھ رہی ہو۔ میرے جانے کے بعد محبوب سے اور حماد صدیقی سے بولو گی کہ تم مجھے پہچانتی ہو۔ تم ان کے سامنے مجھے دیکھ کر پہچانو گی تو میں پکڑا جاؤں گا۔''

''خدا کے لیے مجھ پر بھروسا کرو۔ میں تمہاری سلامتی اس لیے چاہتی ہوں کہ صرف تم ہی ماروی کو محبوب سے دور لے جاؤ گے۔ میں ماروی کے اور تمہارے احسانات کبھی نہیں بھولوں گی۔ پلیز اسے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھ پر بھروسا کرو۔''

اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ سمیرا نے پوچھا۔ ''کون ہے؟ محبوب تم ہو؟''

باہر سے آواز آئی۔ ''میڈم! میں سیکیورٹی گارڈ عدنان بول رہا ہوں۔ کسی نے کوٹھی کے پیچھے ہمارے ایک گارڈ کو زخمی کیا ہے وہ ادھر آ سکتا ہے۔ کیا چھت کی سیڑھیوں والا دروازہ بند ہے؟''

سمیرا اور مراد اس کی رپورٹ سن رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔ مراد کے واپس جانے کے راستے بند ہو چکے تھے۔ گارڈ نے یقین سے کہہ رہا تھا کہ وہ کوٹھی

میں گھسا ہے تو وہ باہر نکلے اور بھاگ گئے تھیں۔ وہ پس گئے۔

سمیرا نے سوچی ہوئی نظروں سے مراد کو دیکھا۔ پھر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "عدنان! میں مصیبت میں ہوں۔ مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو تم گارڈز سے بولو۔ ہتھیار پھینک دیں۔ میں اس کے نشانے پر باہر آؤں گی۔ کوئی اس پر گولی چلائے گا تو یہ مرتے مرتے مجھے مار ڈالے گا۔"

وہ پریشانی سے بولا۔ "میڈم! یہ کیا ہو گیا؟ ان سے بولیں، ہم ہتھیار پھینک دیں گے۔"

سمیرا نے کہا۔ "ڈرائیور سے بولو، گاڑی دروازے کے سامنے لے آئے پھر دور چلا جائے۔ یہ دھمکی دے رہا ہے کہ صاحب کو اور پولیس کو اطلاع دی جائے گی تو یہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ان سے بولیں ہم کسی کو اطلاع نہیں دیں گے۔ گاڑی ابھی آتی ہے۔"

پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ گارڈ میڈم کی سلامتی کے لیے مراد کا راستہ صاف کر رہا تھا۔ مراد نے کہا۔ "سمیرا! میں تم پر کیا احسان کروں گا۔ اس وقت تم ایسا احسان کر رہی ہو جسے کبھی بھلا نہیں پاؤں گا۔"

اس نے سمیرا کا دوپٹا لے کر اپنے منہ پر ڈھاٹا باندھا۔ چہرے کو اچھی طرح چھپا لیا۔ باہر سے گارڈ کی آواز سنائی دی۔ "میڈم! گاڑی آ گئی ہے۔"

اس نے سمیرا کو گن پوائنٹ پر رکھا۔ وہ اس کے آگے آگے چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ وہاں کچھ فاصلے پر تین مسلح گارڈز اور ایک ڈرائیور کھڑے تھے۔ مراد نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہتھیار پھینکو اور دور جاؤ۔ ورنہ یہ تمہارے سامنے گولی کھائے گی۔"

وہ سب ہتھیار پھینک کر دور چلے گئے۔ اس نے حکم دیا۔ "مین گیٹ کھولو۔ جلدی کرو۔"

گیٹ کھولنے کے لیے ایک گارڈ دوڑتا چلا گیا۔ وہ دونوں کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ سمیرا نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ مراد نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اسے نشانے پر رکھا تھا۔ یوں وہ دونوں کوٹھی کے احاطے سے نکل کر مین روڈ پر آ گئے۔

مراد نے کہا۔ "ابھی محبوب اور حماد صدیقی کو معلوم ہو گا کہ میں تمہیں گن پوائنٹ پر لے آیا ہوں تو وہ فوراً ہوٹل کی طرف دوڑے جائیں گے۔ مجھے ان سے پہلے وہاں پہنچنا ہو گا۔"

وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولی۔ "وہ تمہاری طرف گئے ہیں۔ تم ان سے پہلے ہوٹل میں پہنچ جاؤ گے۔"

پھر وہ بولی۔ "میں ان سے کہوں گی کہ تم مجھے سوسائٹی کے علاقے میں لے گئے تھے۔ وہاں گاڑی سے اتر کر ایک گلی میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔"

"تھینک یو سمیرا! میں وعدہ کرتا ہوں۔ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی سوکن نہیں آئے گی۔"

سمیرا نے ہوٹل کے پچھلے گیٹ پر گاڑی لا کر روک دی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کر کے دوڑتا ہوا پچھلے دروازے سے اندر آیا۔ پھر ایمرجنسی زینے کے ذریعے تیسری منزل پر آ کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اتنی بھاگ دوڑ رائیگاں گئی تھی۔ جانِ حیات کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

ادھر کوٹھی کے گارڈ نے محبوب کو فون پر بتایا کہ ایک شخص میڈم کو گن پوائنٹ پر لے گیا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ غصے سے لرز گیا۔ اس نے حماد سے کہا۔ "وہ مراد ہی ہو گا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

حماد نے گارڈ سے پوچھا۔ "وہ کوٹھی میں کیسے گھس آیا تھا؟"

گارڈ نے مختصر طور پر بتایا کہ وہ ایک گارڈ کو بے ہوش ہونے کی حد تک زخمی کر کے چھت کے زینے سے کوٹھی میں گھسا تھا۔

محبوب نے سمیرا کے فون نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی۔ وہ اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ حماد نے کہا۔ "وہ مجبور ہو گی۔ مراد نے اس سے فون چھین لیا ہو گا۔"

محبوب نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "وہ عذاب جان بن گیا ہے۔ حماد! میں تمہیں منع کرتا تھا کہ اسے گولی نہ مارنا۔ اب حکم دیتا ہوں، جب بھی وہ وکیل کمینہ سامنے آئے، اس سے کچھ نہ بولنا۔ فوراً ہی گولی مار دینا۔ اس نے ذلالت کی حد کر دی ہے۔ وہ ابھی سامنے ہوتا تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔"

وہ بڑی مہنگی آرام دہ گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا اور بے آرام تھا۔ دولت سے نہ رقیب کو ختم کر سکتا تھا، نہ سکون خرید سکتا تھا۔ آدھی رات کے بعد بھی ماروی کی تلاش میں دوڑ رہا تھا اور رقیب اس کے پیچھے لگا رہا تھا۔

پھر رنگ ٹون چیخنے لگی۔ اس نے اسکرین کو دیکھ کر بٹن دباتے ہوئے کہا۔ "سمیرا کال کر رہی ہے۔"

وہ بڑی بے تابی سے فون کو کان سے لگا کر بولا۔ "سمیرا... تم خیریت سے تو ہو؟"

جواب میں رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ تڑپ کر بولا۔ "سمیرا... کیا اس نے ظلم کیا ہے؟ کہاں ہے وہ کتا؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''اسے کال نہ دیں۔۔۔۔ بے شک وہ دشمن ہے مگر فرشتہ بھی ہے۔ اس نے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ بہت مجبور ہو کر مسلح گارڈز سے بچ کر نکلنے کے لیے مجھے گن پوائنٹ پر کوٹھی سے دور لے آیا ہے۔''

''فون اسے دو۔ مجھے اس سے بات کرنے دو۔''

''وہ جا چکا ہے۔ اس نے میرا فون واپس کر دیا۔ میں اس وقت زخمی سے زخمی ہوئی کوٹھی کی طرف جا رہی ہوں۔''

''تھینکس گاڈ اس نے شرافت سے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ میں حماد کے ساتھ ہوں۔ کوٹھی کی طرف جا رہا ہوں۔''

آدھے گھنٹے کے بعد وہ سب کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ محبوب نے کہا۔ ''میں کوٹھی کے آگے پیچھے سیکیورٹی اور سخت کروں گا۔ آئندہ وہ ادھر آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ او گاڈ! وہ میری شریک حیات کو میری عزت کو گن پوائنٹ پر لے گیا تھا۔ ایک بار وہ مجھے مل جائے۔''

سمیرا نے بات کاٹ کر کہا۔ ''تو آپ کچھ نہیں کریں گے۔ آپ کوٹھی کے چاروں طرف فوج کھڑی کر دیں۔ پھر بھی میں اس لیے غیر محفوظ رہوں گی کہ میرا مجازی خدا اپنے رقیب سے دشمنی مول لے کر مجھے راتوں کو چھوڑ کر باہر رہتا ہے۔''

وہ ذرا جھینپ کر بولا۔ ''تم نے حماد کی موجودگی میں بڑی سخت بات کہی ہے، لیکن بات سچی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کل سے راتوں کو گھر میں رہا کروں گا۔ تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔''

حماد نے کہا۔ ''میڈم! آپ نے مراد کو روبرو دیکھا ہے۔ یہ ہمارے لیے اچھا ہے۔ وہ کبھی پکڑا جائے گا تو آپ اسے مراد کی حیثیت سے پہچان سکیں گی۔''

محبوب نے اپنا موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یاد آیا۔ میں نے اس کی تصویر اتاری ہے۔ اسے دیکھو یہ وہی ہے؟''

اس نے سمیرا کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کی تصویر دکھائی۔ سمیرا کی آنکھوں کے سامنے وہی چہرہ تھا جسے ابھی قریب سے دیکھتی رہی تھی۔ اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ''کون ہے یہ؟''

''یہ مَن سُکی سے آیا ہے۔ ہمیں اس پر یقین کی حد تک شبہ ہے۔ کیا یہی ابھی آیا تھا؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''نہیں، مراد کی شکل ایسی نہیں تھی۔ بہت ہی خوبرو فلمی ہیرو کی طرح لگ رہا تھا۔''

حماد نے مایوس ہو کر کہا۔ ''میں خواہ مخواہ اس سکندر شاہ کو پریشان کرتا رہا۔ یہی سمجھتا رہا کہ وہ مَن سُکی سے آیا ہے اس لیے مراد ہی ہے۔ یہ مراد دراصل کسی اور ملک سے ہو کر آیا ہے۔''

سمیرا نے کہا۔ ''آپ بیرونی ممالک سے آنے والے ایسے شخص کو پکڑیں جو خوبرو اور اسمارٹ لگتا ہے۔''

سمیرا نے سکندر شاہ کہلانے والے مراد کی طرف سے ان کا دھیان ہٹا دیا۔ ادھر مراد کو یہ اطمینان ہوا تھا کہ ماروی محبوب کے گھر میں نہیں ہے۔ اس نے محبوب کو اپنی صورت بھی نہیں دکھائی ہے اور نہ آئندہ اس کی طرف جانے والی ہے۔

اب ایک ہی فکر تھی کہ وہ کہاں ہے؟ اسے تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اسے دوسرے دن کی فلائٹ سے انڈیا جانا تھا۔ وہ دو اہم مشن کو پورا کرنے کے بعد واپس آنے والا تھا اور واپس آنے تک وہ سکون سے نہ رہتا۔ یہ خیال ستاتا رہتا کہ محبوب اسے ڈھونڈ نکالے گا۔ ماروی اس سے راضی رہے یا نہ رہے لیکن اپنی عزت و آبرو کی سلامتی کی خاطر پہلے کی طرح اس کی پناہ میں رہنے کے لیے راضی ہو جائے گی۔

مراد نے سوچا۔ ''میرے اور ماروی کے جھگڑے سے محبوب فائدہ اٹھائے گا۔ اسے پھر اپنی مہربانیوں سے اور احسانات سے اپنی طرف مائل کرے گا۔ ہر شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔''

پھر اس نے سمجھوتا کرنے کے انداز میں سوچا۔ ''ویسے وہ رقیب فطرتاً شریف اور نیک انسان ہے۔ شیطان بن کر موقع سے فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ جب تک وہ راضی نہیں ہوگی اسے ہاتھ نہیں لگائے گا اور تب تک تو میں واپس آ جاؤں گا۔''

اس نے ماسٹر سے فون پر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں جب تک دونوں مشن سے واپس نہ آ جاؤں، تب تک یہاں میرا خاص آدمی ماروی کی نگرانی کرتا رہے اور میرے رقیب پر نظر رکھے۔''

ماسٹر نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری وائف کی نگرانی کے لیے وہاں تمہارے بھروسے کا کوئی آدمی ہے؟''

''میرے بھروسے کا آدمی صرف بلال احمد بٹ ہے۔ ابھی یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مراد بن کر لندن میں رہے۔ آپ اسے یہاں پاکستان آنے کے لیے کہہ دیں۔''

''وہ بھی پاکستان میں وانٹڈ ہے۔ تمہاری طرح اسے بھی بہروپ بدل کر وہاں جانا ہوگا۔''

''اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں پوری حاضر دماغی سے

"آ مدن یا ترسیب زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

ماسٹر کے لیے اپنے کام کی اہمیت تھی۔ اس نے کہا۔ "مراد! یہ دونوں مشن بہت اہم ہیں۔ تم شملہ میں رہ کر میکی براؤن کی بیٹی کے ذریعے اسے کمزور بناؤ گے۔ اس کے بعد یورپ کے کسی ملک میں اس کے بیٹے جیکی کو ختم کر کے اس کی کمر توڑ دو گے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

وہ بڑے جوشیلے انداز میں بولا۔ "جس دن میکی براؤن کا پورا خاندان نابود ہوگا اس دن میری عید ہوگی۔ میں ابھی بلّے سے بات کرتا ہوں۔ تم جو چاہتے ہو وہی ہوگا۔"

آدھے گھنٹے بعد بلّے نے فون پر کہا۔ "مراد! یہ معاملہ کیا ہے ماسٹر کہہ رہا ہے، ہماری بھابی تم سے جھگڑا کر کے پاکستان واپس چلی گئی ہیں اور وہاں کہیں جا کر چھپ گئی ہیں۔"

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "یعنی کہ تمہیں گھاس نہیں ڈال رہی ہیں۔ ماسٹر کہہ رہا تھا مجھے وہاں جا کر انہیں تلاش کرنا ہے۔ ان کی نگرانی کرنی ہے۔ اتنا ہی نہیں انہیں تمہارے رقیب کے پاس جانے سے بھی روکنا ہے۔"

مراد نے اسے تفصیل سے بتایا کہ ماروی کو اس کے اور مرینہ کے تعلقات کا علم ہوگیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ وہ انڈیا جا کر مرینہ سے نکاح پڑھوانے والا ہے۔ یہ انکشاف ہونے کے بعد وہ غصے اور جنون میں مبتلا ہوگئی ہے۔ اس سے نفرت کرنے لگی ہے۔ یہ اندیشہ ہے کہ اب وہ محبوب کو اس پر ترجیح دے گی۔

وہ سنجیدگی سے بولا۔ "مراد... میں تمہارا دوست ہو کر تمہاری مخالفت میں اور بھابی کی حمایت میں بول رہا ہوں۔ تم مرینہ کی خاطر بھابی پر ظلم کر رہے ہو۔ فار گاڈ سیک مرینہ پر لعنت بھیجو اور بھابی کو کسی طرح منا لو۔"

"میرے دوست یقین کرو وہ ابھی مل جائے تو اسے منانے کے لیے آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا۔ پر وہ ملے تو سہی۔ تم صرف دس بارہ دن کے لیے آجاؤ۔ یہاں مراد بن کر رہو۔ پھر میں تمام کاموں سے نمٹ کر واپس آجاؤں گا۔"

"یہ بتاؤ مجھے وہاں کرنا کیا ہے؟"

"تم اس دوران میں ماروی کو تلاش کرو گے اور محبوب کو دھمکیاں دو گے۔ یاد رکھو محبوب کو بھی کسی بھی حال میں جانی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ باقی اس کے خلاف جو کر سکتے ہو کرو گے۔"

"او کے۔ تم انڈیا جاؤ۔ میں آرہا ہوں۔"

مہکتی کلیاں

- ناکامیوں کا احساس کامیابی کی کنجی ہے۔
- کانٹوں سے بھری ہوئی ٹہنی کو ایک پھول پرکشش بنا دیتا ہے۔
- کردار ایک ایسا ہیرا ہے جو ہر پتھر کو کاٹ سکتا ہے۔
- محبت روح کا گلاب ہے جو گناہ کی دھوپ سے مرجھا جاتا ہے۔
- فضول امیدوں سے بچو کہ یہ احمقوں کا سرمایہ ہے۔

مرسلہ: راجہ فرخ حیات، پنڈ دادن خان

تن آسانی

اگر آپ کسی شخص کو یہ بتائیں کہ آسمان پر تین سو بلین ستارے ہیں، تو وہ فوراً یقین کر لے گا لیکن اگر آپ اسے بتائیں کہ کرسی پر ابھی ابھی روغن کیا گیا ہے۔ تو وہ کرسی کو چھو کر ضرور دیکھے گا۔

اسے بھی پڑھیے

لوگوں سے نرمی کا سلوک کرو، یاد رکھو کہ تم جس کسی سے بھی ملتے ہو۔ وہ زندگی کی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ جو ایک سخت جنگ ہے۔ (ٹی۔ ایچ۔ تھامپسن)

مراد کو اطمینان ہوا کہ اس کی غیر موجودگی میں ماروی گمراہ نہیں ہوگی۔ بلّا اسے محبوب کے پاس جانے نہیں دے گا اور وہ نظر نہ آئی تو اسے تلاش کرتا رہے گا۔

وہ دوسرے دن انڈیا جانے کے لیے ایئرپورٹ پہنچا تو سمیرا نے اسے فون پر مخاطب کیا اور کہا۔ "محبوب ادھر ایئرپورٹ گئے ہیں۔ دور سے تمہیں دیکھیں گے اور یقین کریں گے کہ تم واقعی یہاں سے جا رہے ہو۔"

"ہاں میں جا رہا ہوں۔ اچھا ہوا تم نے فون کیا ہے۔ تمہارا نمبر میرے پاس آگیا ہے۔ آئندہ فون کے ذریعے رابطہ رہے گا۔ ماروی کا جب بھی پتا چلے، تم مجھے ضرور اطلاع دو گی۔"

"ضرور اطلاع دوں گی۔ تمہارے اور ماروی کے لیے دعائیں کرتی رہوں گی۔"

سمیرا بھی اس کے لیے ایک سہارا بن گئی تھی۔ عورتوں کی فطرت کے مطابق یہ یقین ہوگیا تھا کہ وہ ماروی کو بھی سوتن کی حیثیت سے آنے نہیں دے گی۔ اس کا سراغ ملتے

ہی ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے پہلے اطلاع دے دی۔

اس نے فون سے میرا کی کال کو ڈیلیٹ کیا۔ بڑے اطمینان سے بڑی آسودگی سے دور جھڑتے ہوئے محبوب اور جارج کو دیکھ کر مسکرایا۔ پھر ان کی طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر بورڈنگ کارڈ لینے کے لیے اندر چلا گیا۔

☆☆☆

بشریٰ عرف للی اور بیٹے کی زندگی عجیب طرح گزر رہی تھی۔ وہ میکی براؤن کے خلاف ابھی ایکشن میں نہیں تھی۔ یہ انتظار تھا کہ اس کا بیٹا جیسی اپنی محبوبہ ڈایا کے ساتھ مسلسل سے باہر آئے گا۔ تب وہ مراد اور مرینہ کے ساتھ دشمنوں کی سیکیورٹی توڑ کر اپنے شکار تک پہنچے گا۔

فی الحال راوی عیش کر رہا تھا لیکن بشریٰ بیٹے کے ساتھ عیش و عشرت اپارٹمنٹ کی چار دیواری تک تھا۔ وہ بھی بھی ضرورت سے مجبور ہو کر باہر شاپنگ وغیرہ کے لیے جاتے تھے۔ کیونکہ میکی براؤن کے آدمی اس مراد کو تلاش کر رہے تھے جس نے اس کے بیٹے روڈی براؤن کو گولی ماری تھی۔

بشریٰ نے بھی ایئرپورٹ میں ڈیری دکھا کر گینگ وہیلی کی ایک اور خطرناک تنظیم ڈیڑنگ ڈاخمنڈ ز ریڈرز کے بگ باس میکا نو رابرٹ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اب اس بگ باس سے بھی ملنے کی خفیہ ملاقات اور خفیہ ڈیلنگ ہونے والی تھی۔

وہ دونوں ایسی کسی خفیہ ڈیلنگ کو نمٹانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ بشریٰ بیٹے سے کہتی تھی۔ ''میں بیزار ہو گئی ہوں۔ مجھے یہ زندگی اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ کیا ہم کسی تدبیر سے اپنے وطن میں جا کر نہیں رہ سکتے؟''

ایسے ہی وقت ماسٹر نے فون پر بیٹے سے کہا کہ اسے پاکستان جا کر رہنا چاہیے۔ بشریٰ خوشی سے اچھل پڑی۔ فون پر ماسٹر سے بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ جب رابطہ ختم ہو گیا تو اس نے پوچھا۔ ''ماسٹر کیا کہہ رہا تھا؟ ہم کب یہاں سے جائیں گے؟''

''مراد تو چاہتا ہے کہ ہم آج ہی پاکستان چلے جائیں لیکن میں میکا نو رابرٹ سے ملنے کا وعدہ کر چکا ہوں اور ماسٹر بھی چاہتا ہے کہ میں مراد بن کر اسے الو بناتا رہوں۔ ہم دو یا تین دنوں کے بعد یہاں سے جاسکیں گے۔''

تین دنوں کے بعد جانا تھی۔ وہ گن رہی تھی اور خوشی سے ناچ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ''وہاں مراد بھائی اور بھابی آجائیں تو مزہ آجائے گا۔ میں کسی روک ٹوک کے بغیر بھابی سے مل سکوں گی۔''

بیٹے نے کہا۔ ''تمہاری بھابی نے ہی مسائل پیدا کیے ہیں۔ اسی لیے ہم یہاں سے وہاں جا رہے ہیں۔''

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ''بھابی نے کیا کیا ہے؟''

''ماسٹر کہہ رہا تھا کہ وہ مراد سے لڑ جھگڑ کر اس سے الگ رہنے کے لیے پاکستان گئی ہیں۔''

''وہ کیوں چھوڑ کر جائیں گی۔ عورت اتنی نادان نہیں ہوتی کہ اچھا کھلانے پلانے اور دنیا گھمانے والے مرد کو چھوڑ کر چلی جائے۔ مراد بھائی نے بھابی کا دل دکھایا ہوگا۔''

اس نے مراد کی تصویروں کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ''مراد تیری بھابی کا دیوانہ ہے، وہ کبھی ان کا دل نہیں توڑے گا۔''

''میں کبھی مان ہی نہیں سکتی کہ وہ یونہی مراد بھائی سے الگ ہو جائیں گی۔ تو مرد ہے، مردوں کی حمایت میں بولے گا۔ میں وہاں جا کر پہلے بھابی سے ملوں گی۔ وہ سچ بتائیں گی کہ......''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''ان سے نہیں مل سکو گی۔ وہ وہاں جا کر کہیں چھپ گئی ہیں۔ مراد انہیں ڈھونڈنے میں ناکام رہا ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں جا کر گم ہو گئی ہیں۔ اب مجھے وہاں جا کر ڈھونڈنا ہے اور انہیں محبوب کے پاس جانے سے روکنا ہے۔''

وہ بڑی دیر تک ماروی اور مراد کے معاملے میں بحث کرتے رہے۔ بشریٰ ماروی کی حمایت میں بولتی رہی۔ بلا مراد کی طرف داری کرتا رہا پھر اس نے بشریٰ کو حقیقت بتائی کہ مراد مرینہ کو ماروی کی سوتن بنانا چاہتا ہے۔

بشریٰ تو یہ سنتے ہی سلگ گئی۔ اس نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ ''تھو ہے تمہارے مراد پر۔ بڑی تعریفیں کرتے تھے کہ وہ ماروی کا دیوانہ ہے۔ اس کے لیے کا خون پر چھتا آ رہا ہے۔ کیا عاشق دیوانے ایسے ہوتے ہیں؟''

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ ''وہ عاشق دیوانہ نہیں تھا۔ بھابی کے حسن کا اور ان کے بدن کا دیوانہ تھا۔ ہوس کا پجاری تھا۔ انہیں حاصل کرنے کے بعد دیوانگی رفو چکر ہو گئی۔ اب وہ مرینہ جیسی مردہ بدلنے والی عورت کے پاس جا رہا ہے۔''

''میری بہنا چپ ہو جا۔ غصے میں نہ بول۔۔۔''

لیکن وہ بول رہی تھی۔ ماروی بھی اتنی باتیں نہ سناتی جتنی وہ سنا رہی تھی۔ بیٹے نے سمجھایا۔ ''چپ ہو جا۔ مراد سے نفرت نہ کر۔ تو اس کی مجبوریوں کو نہیں سمجھتی ہے۔ وہ جیسے خطرناک دشمنوں کے درمیان جی رہا ہے اور جن حالات میں موت سے لڑتا رہتا ہے ان حالات میں مرینہ جیسی فائٹر کی بڑی ضرورت ہے۔''

وہ اسے پچکارتے ہوئے بولا۔ "تو مجھ سے شکی ہے۔ وہ ایک حسین اور جوان عورت کے ساتھ دن رات رہے گا تو کیا ہوگا؟ اندرونی گناہ کی طرف مائل ہوگا۔ وہ گناہ گار بننے سے پہلے اسے منکوحہ بنا لینا چاہتا ہے۔"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "واہ، گناہوں سے بچنے کا کیا کارآمد نسخہ ہے۔ جب بھی گناہ کی ترغیب ہو اپنی نیک سیرت بیوی پر سوکن لے آؤ۔ کیا آگے چل کر تو بھی یہی کرے گا؟"

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔ مجھ پر کیوں شبہ کرتی ہے۔ میں تو صرف تیرا دیوانہ ہوں۔"

"جیسے وہ مراد بھائی کا بھی دیوانہ تھا۔ اب میں تیرے مراد کو بھائی نہیں کہوں گی۔ تو اپنی بات کر۔ میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں نے جرائم کی دنیا میں اپنی آنکھوں سے بڑی مردمار عورتیں دیکھی ہیں۔ جو حسن بھی چاتی ہیں اور جوانی کا سینز بھی آن رکھتی ہیں۔" وہ اپنے بچوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "اب تو میں تجھ پر بھروسا نہیں کروں گی۔ یہ اچھا ہی ہے کہ ہم پاکستان جارہے ہیں۔ میں وہاں سے واپس نہیں آؤں گی اور تجھے بھی آنے نہیں دوں گی۔ میں اردوی نہیں ہوں۔ تیرے بارہ بجادوں گی۔"

"فضول باتیں کر رہی ہے۔ مجھ پر بھروسا کر۔ میں تیرے سوا کسی کا منہ بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"مجھ سے اتنا پیار کرتا ہے تو میری بات مان۔ ابھی پانی سر سے نہیں گزرا ہے۔ ابھی میری بھابی پر سوکن نہیں آئی ہے۔ اس سے پہلے اپنے یار کو غلطی کرنے سے باز رکھ۔ یہ نیکی کرلے۔"

پھر وہ اٹھ کر سینڈ ٹیبل کو لات مارتے ہوئے بولی۔ "بول، تیرے سمجھانے سے وہ غلطی سے باز آئے گا؟ نہیں آئے گا تو تو پاکستان جا۔ میں یہاں سے انڈیا جاؤں گی۔ اس سوکن بننے والی کتیا کو میں نے جہنم میں نہ پہنچایا تو ایک باپ کی بیٹی نہیں۔"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "اپنی بھابی کے لیے جوش میں آکر بچوں جیسی باتیں نہ کر۔ انڈیا جانے کی بات کرے گی تو ٹانگیں توڑ کر گھر میں بٹھا دوں گا۔"

"مرد، دوسری شادی کرتے ہیں؟ دھونس جماتے ہیں اور گھر والی کو چپ کرا دیتے ہیں۔ تو مجھے اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ میں دھونس میں آنے والی نہیں ہوں۔ تو میری ٹانگیں توڑے گا تو میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔ تو مجھے مان دے گا میری بات مانے گا تو میں تجھ پہ جان نچھاور کرتی رہوں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر واش روم میں جاتے ہوئے بولا۔ "تو بہوات رقی... کر رہی ہے، بہ تو میرا چوہا ہے۔"

ان نے واش روم میں جا کر دروازے کو بند کرلیا۔ وہ پریشان ہوکر سوچنے لگی۔ ... اس سے کس طرح رابطہ ہوتا تو دوائی کا بہت بڑا سہارا بن جاتی۔ اسے کیا نہ ہونے دیتی۔ اپنے پر نزحقوق سے بے مرادے کوزاملنا دیتی۔

وہ بے خیالی میں بیٹے کا فون اٹھا کر کال کرنے والوں کی لسٹ پڑھنے لگی۔ پھر وہ مراد کے نمبر پر آکر ٹھہر گئی۔ اس نے سوچا ایک ایک بھی ہو سکتا ہے۔ اس نمبر کا بٹن پنچ کر کے واش روم کے پاس آکر اس کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ دوسری طرف سے مراد کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو بھئی! کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "بات بہت شرمناک ہے۔ مراد بھائی آگے۔"

مراد نے پوچھا۔ "بشریٰ! تم بول رہی ہو؟"

"ہاں میں بول رہی ہوں۔ تمہیں اپنا بھائی کہتی تھی اب نہیں مانتی۔ تمہارا ضمیر اتنا مردہ ہو گیا ہے کہ تم نے ایک بازاری عورت کی خاطر بچپن کی محبت پر تھوک دیا ہے۔ اب میں مادری کو بھائی نہیں کہوں گی کیونکہ تم بھائی نہیں رہے۔ وہ آج سے میری بہن ہے۔ میں تم سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں۔ اس پر سوکن نہ لاؤ۔ مریشہ سے نکاح نہ پڑھاؤ۔"

"بشریٰ! تم میری مجبوریوں کو نہیں سمجھتی ہو۔"

"سمجھتی ہوں۔ بدترین دشمنوں سے لڑنے کے لیے مریشہ کے ساتھ دن رات رہنا ضروری ہے۔ کیوں ضروری ہے؟ کیا اب تک تم نے جتنی جنگیں لڑی ہیں اور جیتی ہیں ان میں بھی مریشہ ساتھ رہی ہے؟ بھی نہیں۔ تم اکیلے مردِ میدان کہلاتے آئے ہو۔ مرد کی شان یہی ہے کہ وہ تنہا اپنے بل پر لڑتا ہے۔ عورت کے کاندھے پر بندوق رکھ کر نہیں چلاتا۔ اسے مرد بناؤ... مریشہ ضروری نہیں ہے۔ کوئی مجبوری نہیں ہے۔ یہ تمہارے اندر چھپی ہوئی ہوس بولتی ہے۔ اگر سچ مچ میں مسلمان ہو اور مرد ہو تو آج سے کسی بھی مشن پر کسی عورت کے ساتھ نہ رہو۔ گناہ سے بچنے کے لیے یہ سب سے اچھی دینی ہدایت اور تدبیر ہے؟ اگر تم عمل کرنا چاہو تو ابھی مریشہ سے دور ہو جاؤ گے۔ جس مشن پر جارہے ہو وہاں ہمیشہ کی طرح تنہا میدان مار دو گے۔"

مراد نے کہا۔ "تم بہت اچھی باتیں کر رہی ہو۔ لیکن جواباً کچھ بول نہیں سکوں گا۔ جہاز میں جا کر بیٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کا سوچ کر کیا کرنا ہوگا۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ بیٹے نے دروازے کو پیٹتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا... دروازہ کیوں بند ہے؟"

وہ بولی۔ ''ذرا صبر کرو۔ میں جو باتیں کر رہی ہوں وہ تم برے نہیں دو گے۔ ابھی پانچ منٹ میں کھولوں گی۔''

کالنگ لسٹ پر مرینہ کا نام تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ بلال دروازہ پیٹ کر چیخ رہا تھا۔ ''تو کس سے باتیں کر رہی ہے۔ دروازہ کھول نہیں تو میں تیرا سر توڑ دوں گا۔''

دوسری طرف سے مرینہ کی آواز سنائی دی۔ ''بیٹے! کہاں ہو؟ کیسے یاد کیا؟''

بشریٰ دروازے کے بالکل قریب آ گئی۔ وہ دروازہ پیٹ کر بول رہا تھا۔ ''دیکھ میں تجھے سمجھاتا ہوں۔ مراد سے الٹی سیدھی باتیں نہ کرنا۔ اری! وہ مرینہ سے شادی کر رہا ہے تو تیرے باپ کا کیا جاتا ہے۔ تو انہیں شادی کرنے سے نہیں روک سکے گی۔''

مرینہ نے اس کی باتیں سن کر حیرانی سے پوچھا۔ ''بیٹے! تم کہاں ہو؟ اور کس سے بول رہے ہو؟''

بشریٰ نے کہا۔ ''یہ مجھ سے بول رہا ہے۔ میں اس کی گھر والی بشریٰ ہوں۔ مرادی کی بڑی بہن ہوں۔ سن لے مرینہ! میں تجھے اس کی سوکن نہیں بننے دوں گی۔ یہ نہ سمجھنا میں سمندر پار ہوں۔ تجھے سوکن بننے سے نہیں روک سکوں گی۔ میں ابھی نہیں جانتی میں کیا کروں گی۔ مگر تیرا جینا حرام کر دوں گی۔ مجھے نے بتایا ہے کہ تو مراد کا بچہ پیٹ میں رکھنے کے لیے باؤلی ہوئی رہتی ہے۔ میں تیرا پیٹ پھاڑ دوں گی۔ اگر ایسا نہ کر سکی تو تیرے بچے کو اغوا کرنے جاؤں گی۔ تجھے دن رات اپنے پیچھے دوڑاتی رہوں گی۔ تجھ سے لڑنے کے لیے مجھے کہیں ٹریننگ نہیں لینی پڑے گی۔ میرے پاس خدا کی دی ہوئی ذہانت ہی کافی ہے۔ بس آخری بار سمجھاتی ہوں مراد کے نکاح میں نہ آنا۔ بہت پچھتائے گی.....''

اس نے فون بند کر دیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر دروازے کو کھول دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے دروازے کو پوری طرح کھولتے ہوئے باہر آیا۔ پھر گرجتے ہوئے بولا۔ ''الو کی پٹھی! کیا بکواس کر رہی تھی مرینہ کے ساتھ.....؟''

وہ بولی۔ ''مرینہ سے پہلے مراد کو بھی خوب سنائی ہے۔''

اس نے ایک الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ مار کھا کر ذرا پیچھے گئی۔ پھر بولی۔ ''اللہ میاں نے کیا عورت کی فطرت بنائی ہے۔ اپنے مرد کی مار کھا کے اچھا لگتا ہے۔''

وہ دوسرا ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''کئی بار سمجھایا ہے کہ ہم مردوں کے معاملات ہیں۔ ہمارے کسی معاملے میں نہ بولا کر۔''

''مراد کے معاملے سے مرینہ وفع ہو جائے گی تو مان لوں گی کہ تم لوگوں کے معاملات صرف مردوں کے ہیں۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے اس کی پٹائی کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے بحث نہ کر۔ کئی بار سمجھایا ہے۔ مگر کتے کی دم ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ تو لاتوں کی بھوت ہے باتوں سے بھی نہیں مانے گی۔''

وہ مار کھا رہی تھی۔ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ پھر یکبارگی اسے دھکا دے کر اس سے دور ہو گئی۔ پھر تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی۔ ''تو جتنا مارتا ہے اتنا ہی تجھ پر پیار آتا ہے۔ وہ مرد ہی کیا جو اپنی عورت کی پٹائی نہ کرے لیکن...''

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولی۔ ''ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ بس اب نہ مارنا۔ ورنہ...''

''ورنہ کیا کرے گی؟''

''اپنی طاقت دکھاؤں گی۔''

''اچھا تو مجھ سے پنجہ لڑائے گی۔''

''مرد کے پاس بازو کی، عورت کے پاس عقل کی طاقت ہوتی ہے۔ دکھاؤں طاقت...؟''

وہ اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تیری تو ایسی کی تیسی کر دوں گا۔''

وہ فوراً ہی پلٹ کر دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی۔ پھر اسے کھول کر چیخنے لگی۔ ''ہیلپ۔ ہیلپ...''

وہ پریشان ہو گیا۔ وہاں کے قانون کے مطابق عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانا جرم ہے۔ وہ فوراً ہی پیچھے سے آ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا کرتی ہے؟ بھیڑ لگ جائے گی۔ پولیس آ جائے گی۔ مجھے بیوی کو ٹارچر کرنے کے الزام میں لے جائے گی۔ کیا میری انسلٹ کرانا چاہتی ہے؟''

وہ منہ پر سے اس کا ہاتھ ہٹا کر بولی۔ ''یہ لندن ہے۔ پولیس آنے میں دیر نہیں کرتی۔ چل میری پٹائی کر...''

وہ پلٹ کر ایک صوفے پر جا کر گر پڑا۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ بشریٰ نے اسے بڑے پیار سے دیکھا پھر وہاں صوفے پر آ کر لیٹ گئی۔ اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر بولی۔ ''چل اب پیار کر۔''

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان ثابت حوالہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ریت کی دیوار

رزاق شاہد کوہلر

محبت ایک لافانی جذبہ ہے مگر کہتے ہیں کہ محبت کی راہیں بہت کٹھن اور دشوار گزار ہوتی ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ ان راہوں پر چلنے والوں کے حوصلے ناقابلِ تسخیر ہوتے ہیں، وہ جان تو دیتے ہیں مگر ہار انہیں گوارا نہیں ہوتی۔ راستے کی ہر رکاوٹ کو وہ اپنے پاؤں کی ٹھوکر پر رکھتے ہیں۔ عشق کرنے والے کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں... لیکن وہ جن کے حوصلے پست ہوتے ہیں کبھی محبت کی معراج تک نہیں پہنچ پاتے۔ ان کے ہاتھ صرف راستوں کی دھول ہی آتی ہے۔

کارزارِ محبت میں پاؤں رکھنے والے

ایک کم حوصلہ شخص کا قصہ

''انسان: حساسات و جذبات کا مجموعہ ہے اور اس کے پاس طاقت ور ترین احساس بھوک کا ہے۔ جسے پیٹ کی آگ بھی کہتے ہیں۔'' کلاس روم میں پروفیسر ارشد زمان کی آواز گونج رہی تھی۔ پوری کلاس ہمہ تن گوش تھی۔ طلبا و طالبات کی نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پروفیسر ارشد زمان پوری یونیورسٹی میں اپنے پُرمغز، مدلل اور دلچسپ لیکچرز کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بلاتکان بولتا اور اس کے بولنے کا انداز مسحور کن تھا۔

اسٹوڈنٹس پوری دلچسپی اور شوق سے اس کے لیکچر سنتے تھے۔ بلاشبہ وہ پوری یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس کا پسندیدہ پروفیسر تھا۔ چنانچہ اس مقبولیت نے اسے کسی حد تک مغرور بنا دیا تھا۔

پروفیسر لیکچر جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دنیا میں ایسے لاتعداد واقعات رونما ہو چکے ہیں جب کسی انسان نے اپنی جان کے لیے اپنے ہی جیسے انسان کا گوشت کھانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ بھوک کے سامنے تمام انسانی جذبات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ایک بھوکے انسان کے سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ بھوک ہر انسانی جذبے پر غالب آجاتی ہے۔''

''بھوک سے بھی طاقت ور ترین انسانی جذبہ عشق کہلاتا ہے۔'' معاً درمیانی نشستوں سے ایک لڑکے کی آواز آئی اور پروفیسر کی بات ادھوری رہ گئی۔

''وہ...... عدنان حیدر صاحب ... یہی نام ہے نا تمہارا؟'' پروفیسر کا انداز سوالیہ مگر لہجے میں طنز تھا۔

''یس سر۔'' عدنان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ کو اچھا لگتا ہے تو آپ رکھ لیں، میں کوئی اور اچھا سا نام ڈھونڈ لوں گا۔''

کلاس روم میں ہنسی کی آواز گونجنے لگی، جسے پروفیسر نے نظرانداز کر دیا۔ وہ چند لمحے عدنان کو گھورتا رہا پھر گویا ہوا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہارا باپ ایک امیر آدمی ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر تمہیں بھوک کا تجربہ ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا عشق و محبت کے تجربے کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ شاید یہ تجربہ تمہیں ہو چکا ہو یا پھر ابھی ابتدائی مراحل میں ہو۔ بہرکیف میں اتنا جانتا ہوں کہ خالی پیٹ انسان محبت تو کیا خود کو بھی بھول جاتا ہے...''

''نہیں سر، ایسا نہیں ہے۔'' وہ زور دیتے ہوئے بولا۔

''ہاں آپ کی نگاہوں میں نہ ہو تو یہ اور بات ہے۔''

''لگتا ہے برخوردار کو کسی سے محبت ہو گئی ہے۔'' پروفیسر نے برجستہ کہا تو تمام کلاس بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ تو قسمت والوں کو دیا جاتا ہے۔ وہ جن کے پاس ظرف ہوتا ہے، کم ظرف کبھی محبت کی قدر نہیں کرتے۔'' اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

پروفیسر کے چہرے پر سے ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ عدنان کا جواب اس کے لیے کسی طمانچے سے کم نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر ذلت کا احساس ابھرا مگر دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گیا۔ شاید موسم گرم ہونے کی وجہ سے اس نے ہاف آستین کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی بازوؤں، کہنیوں کی ہڈیاں جوڑ سے قدرے ابھری ہوئی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا تھا جیسے کہنیوں کی ہڈیاں ٹوٹنے کے بعد دوبارہ جوڑی گئی ہوں اور یہ کام کسی اناڑی سرجن نے انجام دیا ہو۔ پروفیسر نے سر جھکا کر کہنیوں کی طرف دیکھا اور پھر سر اٹھا کر بولا۔ ''ہم بات طاقت ور ترین انسانی جذبے کی کر رہے تھے۔ نہ کہ ظرف اور کم ظرفی کی۔ اب بات صرف موضوع پر ہوگی۔''

''میں کہاں موضوع سے ہٹا ہوں سر؟ آپ نے خود ہی موضوع کو پس پشت ڈال دیا ہے۔'' عدنان نے احتجاج کیا۔

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''او کے، میں تم سے متفق ہوں... چلو اب ثابت کرو کہ محبت بھوک سے کس طرح طاقت ور ہے؟''

وہ بولا۔ ''سر! اسے ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟... یہ تو ثابت شدہ حقیقت ہے۔ کیا آپ نیوز پیپر نہیں پڑھتے، ٹی وی نہیں دیکھتے؟ روزانہ کتنے ہی لوگ محبت میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کر لیتے ہیں جب کہ کوئی بھوکا کبھی کبھار ہی ایسا قدم اٹھاتا ہے۔''

''کیا تم محبت میں ناکام ہونے کے بعد خودکشی کرنے کی ہمت کر سکتے ہو؟'' پروفیسر نے تذلیل کے انداز میں پوچھا۔

''ہو سکتا ہے... لیکن فی الحال میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔''

''اوہ...'' پروفیسر نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ''چلو یہ بتا دو کہ محبت ہوتی کیا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے سر کہ مجھ سے بہتر آپ یہ بات جانتے ہوں گے۔'' اس نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا اور کلاس روم میں ایک بار پھر ہنسی کی آواز گونج اٹھی۔

ایک ثانیے کے لیے عدنان نے اپنے کلاس فیلوز کی طرف دیکھا جو اسے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ بعض کی نظروں میں اس کے لیے ناپسندیدگی تھی۔ اس سے چند نشستیں دور بیٹھی ایک لڑکی اسے قدرے خفیف انداز میں گھور رہی تھی۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑکی سے استفسار کیا تو لڑکی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا مگر اس دوران پروفیسر اسے مخاطب کر چکا تھا۔

''کیوں بھئی! میں بھلا تم سے بہتر کس طرح جان سکتا ہوں...... کیا میں نے عشق کی دکان کھول رکھی ہے؟''

''سر! میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آپ نے نوجوانی

میں ضرور کسی نہ کسی سے محبت کی ہوگی... ورنہ آپ محبت سے نفرت کیوں کرتے؟"

پروفیسر کی رنگت ایک مرتبہ پھر سے پھیکی پڑ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ خیالات کی ایک یلغار تھی جو اسے گھیر چکی تھی اور وحشی کی ایک فلم سی اس کے دماغ میں چل پڑی تھی۔ وہ اب اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے عدنان حیدر جیسے منہ پھٹ لڑکے سے بحث چھیڑی تھی۔ عدنان انجانے میں اسے چرکے لگا رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ عدنان کو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ پروفیسر کو عشق و محبت سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اس کی نگاہوں میں محبت ایک بے کار ترین مشغلہ تھا جو فارغ لوگوں کو ہی راس آتا تھا۔

"عدنان حیدر!" وہ دوبارہ موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ بھوکا انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ محبت کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے بھوک کے سامنے۔"

"نہیں سر!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ خدا کو ہمیشہ پیٹ بھرے ہی بھولتے ہیں، بھوکے تو پل پل اسے یاد کرتے ہیں۔"

اس نے پروفیسر کو نیا جواب کر دیا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز اب اسے ستائشی انداز میں دیکھ رہے تھے۔ مگر محبت اور بھوک کی اس بحث میں پروفیسر کو محبت کی جیت کسی صورت میں بھی منظور نہیں تھی۔ وہ بولا۔ "بھوک نے دنیا میں کئی بڑے انقلاب برپا کیے ہیں لیکن محبت نے آج تک کچھ بھی نہیں دیا سوائے رونے دھونے اور خودکشیاں کرنے کے۔ تم ایسی ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکتے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ محبت بھوک کے مقابلے میں طاقت ور ہوتی ہے۔"

"میں ثابت کر سکتا ہوں۔" وہ پرجوش ہو گیا۔ "آج سے چودہ صدیاں قبل ایک انقلاب برپا ہوا تھا۔ جس نے اس وقت کی دنیا کا نقشہ بدل ڈالا تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ انقلاب بھوک کے مرہون منت نہیں تھا۔ اگر غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس عظیم انقلاب کو برپا کرنے میں محبت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ رسول ﷺ کی خدا سے محبت اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کی آپ ﷺ سے محبت ہی اس عظیم انقلاب کی سب سے بڑی وجہ تھی لیکن شاید آپ بھی ان لبرل مائنڈڈ لوگوں کی طرح یہ بات تسلیم نہیں کریں گے جو اس عظیم انقلاب کا سبب عربوں کی بھوک اور ان کی ملک گیری بتاتے تھے۔"

"یہ لبرل لوگ سب کچھ غلط تو نہیں کہتے میاں! سب تم بھی طرح ہر کوئی حقیقت سے انکار تو نہیں کر سکتا۔" پروفیسر نے جواب دیا۔

"سر! میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ بھوک جان لیتی ہے جب کہ محبت جان دیتی ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ جان لینا آسان ہوتا ہے مگر جان دینا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جان وہی لوگ دیتے ہیں جن کے دل میں عشق کی شمع روشن ہوتی ہے اور جان لینے والے بھی بھوک تو کبھی نفرتوں کے مارے لوگ ہوتے ہیں۔ محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے تو نفرت بابری مسجد شہید کرتی ہے۔ محبت عظیم ہوتی ہے سر... عظیم بھی نہ مٹنے والی جبکہ بھوک پیٹ بھرتے ہی مٹ جاتی ہے۔ سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ بھوک کی عشق کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔" اس نے جذباتی لہجے میں جواب دیا تو پوری کلاس نے باقاعدہ تالیاں بجا کر اسے داد دی۔

پروفیسر ارشد ذان ایک بار پھر لاجواب ہو کر رہ گیا مگر وہ شکست ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تیس برس قبل ہی وہ محبت پر لعنت بھیج چکا تھا۔ چنانچہ تالیوں کا شور تھمتے ہی پروفیسر نے کہا۔ "محبت بھی تو بھوک ہی کی ایک قسم ہے۔ بدن کے حصول کے بعد اکثر محبتیں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔"

"محبت اگر بدن کے حصول تک محدود ہوتی تو تاج محل کبھی تعمیر نہ ہوا ہوتا سر... اور ایک ماں اپنے بچے سے محبت بدن کے حصول کے لیے تو نہیں کرتی... مانا میں سر کہ محبت سے بڑا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ بھوک آپے سے باہر ہو کر خونی انقلاب لاتی ہے جبکہ محبت دلوں کو تسخیر کرتی ہے اور دائمی انقلاب کا باعث بنتی ہے۔ کائنات کی ساری رنگینیاں محبت ہی کے دم سے ہیں۔"

پروفیسر بولا۔ "تم کچھ بھی کہو مگر میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ میں اب بھی یہی کہوں گا کہ بھوک طاقت ور ترین احساس ہے۔ محبت میں ہارا ہوا انسان زندہ رہ سکتا ہے لیکن بھوک کا مارا ہوا...... ناممکن.. کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اسی دوران پیریڈ اختتام پذیر ہو گیا اور یہ بحث ادھوری رہ گئی۔ پروفیسر نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے عدنان کی طرف دیکھا اور پھر کلاس روم سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عائشہ نے گھور کر اسے دیکھا اور پھر شکایتی انداز میں بولی۔ "آج تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا لیکن تم نے پھر بھی پاپا کی انسلٹ کر دی۔ کیوں کرتے ہو

تم ایسا، آخر پاپا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

"میں نے کچھ غلط نہیں کہا عائکہ...... یہ تو صرف ایک بحث تھی جو بغیر کسی نتیجے کے ختم ہوگئی۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں تمہارے پاپا کی بہت عزت کرتا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں عدی...... لیکن تمہیں شاید نہیں معلوم کہ پاپا کو محبت کے نام سے سخت چڑ ہے۔ بلکہ انہیں تو محبت کا نام سننا بھی گوارا نہیں ہے۔"

اس وقت وہ دونوں ایک معروف ریسٹورنٹ میں بیٹھے کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کی دوستی کو تقریباً ایک سال کا عرصہ ہونے والا تھا مگر بات ابھی تک صرف دوستی تک ہی محدود تھی۔ پسندیدگی کے اظہار تک نہیں پہنچی تھی۔ البتہ دونوں ایک دوسرے کا دل سے احترام کرتے تھے۔ عائکہ پروفیسر ارشد زمان کی اکلوتی بیٹی تھی جبکہ عدنان حیدر کا تعلق گجرات کی ایک جاگیردار فیملی سے تھا۔ اس کا باپ چودھری فرمان حیدر...... ایک وسیع و عریض جاگیر کا مالک تھا اور روایتی جاگیرداروں کی طرح ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہتا تھا۔ گو کہ اس نے خود کبھی عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا۔ تاہم اپنے چھوٹے بھائی چودھری قربان حیدر...... کو وہ کئی بار صوبائی اسمبلی کی نشست پر بطور امیدوار کھڑا کر چکا تھا مگر جیت ایک بار بھی قربان حیدر کے حصے میں نہیں آئی تھی۔

عائکہ کی بات سن کر عدنان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ پروفیسر بھی نا! بس عجیب ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں چودھریوں کے نام سے چڑ ہو جاتی ہے تو کبھی محبت کے نام سے۔ پتا نہیں ان کی پرابلم کیا ہے؟"

"جس دن پاپا کو پتا چل گیا ناکہ تم بھی چودھری ہی ہو تو اس دن تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ کیا چیز ہیں؟"

"نہیں بھئی! یہ بات انہیں پتا نہیں چلنا چاہیے۔" اس نے باقاعدہ کانوں کو چھوتے ہوئے پرامس کیا تو عائکہ کھل اٹھی۔

"عدی!" وہ کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ "یہ یونیورسٹی میں ہم دونوں کا فائنل ایئر ہے نا؟"

"ہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کوئی پریشانی ہے کیا؟"

"مطلب ہم دونوں چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے؟" اس نے افسردہ ہو کر پوچھا۔

"عائکہ! ہم یہاں انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں۔ کامیاب انسان وہی ہوتا ہے جو ہر قسم کے حالات میں خوش رہنا سیکھ لیتا ہے۔ جو آج سے لطف اندوز ہونا جانتا ہے، اسے آنے والے کل کی فکر بھی پریشان نہیں کرتی ... یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے عدی۔" وہ مصر ہوئی۔ "تم بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"تو کیا کہوں تم بتاؤ نا؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔

"محبت کے فیور میں اس قدر بڑھ چڑھ کر بولنے والا کیا اتنا انجان ہو سکتا ہے؟"

"اوہ...... آئی سی... مطلب تم سنجیدہ ہو؟" وہ حیران رہ گیا۔

"ہاں......" عائکہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں...... میں تم سے......"

"پلیز عائکہ!" اس نے جھنجلا کر قطع کلامی کی۔ "میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔"

"لیکن کیوں؟" وہ مستفسر ہوئی۔

"بس ہم صرف اچھے دوست ہیں اور ہمیشہ دوست رہیں گے۔"

"مگر جب تم چند ماہ کے بعد ہمیشہ کے لیے چلے جاؤ گے تو کیا یہ دوستی قائم رہ سکے گی؟"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہیں کراچی ہی میں رہوں گا۔"

"یہ بات تو تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو ورنہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لیے......"

"ڈونٹ بی سلی عائکہ۔" اس نے تیز لہجے میں بات کاٹی۔ "میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہارا ایک خاص مقام ہے اور وہ خاص مقام شاید میں کسی کو بھی نہ دے سکوں لیکن ......" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" وہ مضطرب ہوگئی۔

"ابھی میں نے ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا...... اور پھر یہ ضروری بھی تو نہیں ہے کہ انسان جس سے پیار کرے شادی بھی اسی سے کرے۔ کیا محبت کرنے کے لیے شادی کرنا لازمی شرط ہے؟" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

عائکہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ لمحہ بھر کے لیے اس کا چہرہ متغیر ہو گیا مگر اسے چہرے کے تاثرات چھپانے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ ایک دم کھلکھلا کر بولی۔ "ارے خونچو! میں تو مذاق کر رہی تھی، تم تو سیریس ہی ہو گئے۔ میں جانتی ہوں کہ پاپا مجھے زہر دینا پسند کریں گے مگر کسی چودھری کے ساتھ مجھے دلہن بنا کر رخصت کرنے کے لیے راضی نہیں

ہوں گے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" وہ قدرے پھیکا پڑ گیا۔

"تمہارے پاپا کی چودھریوں سے نفرت سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تمہیں کیا دکھ ہے اس بات کا؟" اس نے انجانی سی خوشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔" وہ بے تاثر آواز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے پاپا کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے بھلا اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور دکھ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... ان کی مرضی جس سے نفرت کریں، جس سے پیار کریں؟"

اس کی وقتی خوشی کافور بن کر اڑ گئی۔ دل مرجھا سا گیا مگر لبوں پر بدستور ہنسی رقصاں تھی۔ عدنان حیدر بہت گہرا آدمی تھا۔ کسی الجھی ہوئی پہیلی کی طرح سمجھ میں نہ آنے والا۔

"ارے، کہاں کھو گئی ہو؟" عدنان نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"پاپا کے متعلق سوچ رہی تھی۔" اس نے سفید جھوٹ بولا مگر چہرے کے تاثرات سے اس جھوٹ کا بھرم قائم رکھا۔

"پاپا سے بھی پوچھو نا کہ وہ چودھریوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

عائکہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سوچا کہ یہ وہی شخص ہے جو کچھ دیر قبل اس بات کو پاپا کا ذاتی معاملہ کہہ رہا تھا۔ تاہم اپنی اس سوچ کو وہ لفظوں کا جامہ پہنانے سے قاصر رہی اور..... ٹالنے والے انداز میں بولی۔ "کئی بار کوشش کر چکی ہوں مگر پاپا ہمیشہ میرے اس سوال پر چپ سادھ لیتے ہیں، کچھ بتاتے ہی نہیں۔"

"اور محبت کے نام سے کیوں چڑتے ہیں؟" عدنان نے ہنس کر پوچھا۔

وہ بولی۔ "عدی! تم پاگل تو نہیں ہو..... کوئی بھی مشرقی لڑکی اپنے باپ سے ایسا سوال پوچھنے کی جسارت نہیں کر سکتی۔"

"اوکے تو پھر میں ہی پوچھ لوں گا، بس موقع ملنے کی دیر ہے۔"

"وہ تمہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے بلکہ الٹا تمہاری بے عزتی کر دیں گے۔"

"نہ بتائیں مگر میں ان سے پوچھوں گا ضرور، بے عزتی ہوتی ہے تو ہونے دو۔" اس نے اٹل انداز میں جواب دیا۔

"اوکے، یہ حسرت بھی پوری کر لینا مگر یہ یاد رکھنا کہ آئندہ تم نے پاپا سے کسی بھی موضوع پر بحث نہیں کرنی ورنہ ہماری دوستی میں دراڑ پڑ جائے گی۔" اس نے دھمکاتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے دھمکی دے رہی ہو؟" عدنان نے جیب سے پرس نکالتے ہوئے پوچھا۔

"حقیقت بتا رہی ہوں۔ تم بس پاپا سے بحث مت کیا کرو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"میری جیت بری لگتی ہے؟" اس نے ناراض انداز میں سوال کیا۔

"نہیں، پاپا کو ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

عدنان نے پرس سے ایک نوٹ نکال کر بل چکایا اور پلٹ کر بولا۔ "میں اگر بحث میں تمہارے پاپا سے ہار جایا کروں تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟"

"پتا نہیں۔" وہ کشمکش کا شکار ہو گئی۔ "اس بارے میں شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔"

اس دوران میں وہ ریسٹورنٹ سے نکل کر گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ عدنان نے کہا۔ "جب دو شخص آپس میں کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو ان میں سے کسی ایک کو ہارنا پڑتا ہے۔ تم سچ بتاؤ تمہیں کس کی جیت اچھی لگتی ہے، میری یا پھر اپنے پاپا کی؟"

"کسی کی بھی نہیں۔"

"یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔" وہ مصر ہوا۔

"عدی! ساندوں کی لڑائی میں پودے کچلے جاتے ہیں۔ تمہاری اور پاپا کی بحث سے تکلیف مجھے پہنچتی ہے۔ میں ایک کی ہار اور دوسرے کی جیت کی خوشی ایک ہی وقت میں کیسے منا سکتی ہوں؟ میرے سینے میں ایک ہی دل ہے جو تمہاری اور پاپا کی یکساں قدر کرتا ہے۔ پلیز یا تو پاپا سے بحث کرنا چھوڑ دو یا پھر مجھ سے اس قسم کے سوالات مت پوچھا کرو۔" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو بیٹھو۔" وہ گاڑی کی کھڑکی کھولتے ہوئے بولا۔ "آئندہ میں خیال رکھوں گا۔" وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

پروفیسر ارشد زمان سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ اسے عدنان حیدر پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی اسٹوڈنٹ نے اسے یوں چیلنج کیا تھا۔ اس سے قبل بھی کسی نے کلاس کے دوران اس سے بحث نہیں کی تھی۔ پروفیسر کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا مان تھا مگر آج یہ مان ٹوٹ گیا تھا اور یہ مان توڑنے والا کوئی دانش ور نہیں بلکہ ایک عام سا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ اگر کوئی پروفیسر، دانش ور یا

تجزیہ نگار ہوتا تو شاید پروفیسر زمان کو اس قدر دکھ نہ ہوا ہوتا۔ وہ خود کو لفظوں کا کھلاڑی سمجھتا تھا مگر ایک اناڑی نظر آنے والے نوجوان نے اسے کلین بولڈ کر دیا تھا۔ اپنے پاس معلومات کا خزانہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے ایک شاگرد سے بری طرح ہار گیا تھا۔ ذلت کا احساس کسی زہریلے بچھو کی طرح اسے ڈنک مار رہا تھا اور وہ فطرتاً انتہائی بزدل انسان تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جانے والا۔ اپنی اس بزدلی کے ہاتھوں اس نے زندگی میں کئی بار ناقابلِ تلافی نقصانات اٹھائے تھے لیکن ان نقصانات کا الزام وہ ہمیشہ مخالف فریق پر لگا دیتا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے کبھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ خود کو ہی حق بجانب سمجھا کرتا تھا۔ اسی ہٹ دھرمی کے سبب وہ کئی رشتوں اور مخلص دوستوں سے ہاتھ دھو چکا تھا اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اپنی ہر بات کو حرفِ آخر سمجھنے والا پروفیسر ارشد زمان بھری دنیا میں تنہا رہ گیا سوائے اپنی اکلوتی بیٹی عائکہ زمان کے..... اس کے پاس کوئی رشتہ رہا اور نہ ہی دوست۔ بس اب عائکہ ہی اس کی زندگی کا مقصد و محور تھی۔ وہ بچپن ہی سے پروفیسر کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرتی چلی آرہی تھی۔ پروفیسر اس کے لیے آئیڈیل باپ تھا۔ اس نے کبھی کسی معاملے میں باپ سے بحث نہیں کی تھی۔

عائکہ کی ماں عائشہ بیگم تو پروفیسر جیسے شخص کے ساتھ بہ مشکل دس برس ہی گزار سکی تھی اور یہ دس برس بھی اس بے چاری نے روتے اور کڑھتے ہوئے گزارے تھے۔ پروفیسر نے ازدواجی زندگی کے دوران اسے سکھ کم اور دکھ زیادہ دیے تھے۔ پروفیسر اپنی ہر غلطی اس کے سر تھوپ دیا کرتا تھا اور جب وہ اپنے دفاع میں کچھ بولنے کی کوشش کرتی تو پروفیسر اپنی دانشورانہ گفتگو سے اسے چپ کرا دیا کرتا تھا۔

عائکہ اس وقت تین برس کی تھی جب عائشہ بیگم دماغی نس پھٹنے کی وجہ سے اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس کے مرنے کے بعد پروفیسر نے اپنی تمام تر توجہ عائکہ پر مرکوز کر دی۔ اس نے بیٹی کی ہر ضرورت کا خیال رکھا اور اسے اس قدر توجہ اور پیار دیا کہ وہ ماں کی کمی محسوس ہی نہ کر سکی۔ پروفیسر ہمیشہ بیٹی کی ہر خواہش کو مقدم سمجھتا تھا۔ حتیٰ کہ بڑی ہو کر جب عائکہ نے عدنان حیدر سے دوستی کی تو تب بھی پروفیسر نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ عدنان ایک اچھا لڑکا تھا اور پروفیسر اسے پسند کرتا تھا لیکن آج عدنان کے ساتھ ہونے والی بحث کے بعد پروفیسر کے خیالات تبدیل ہو چکے تھے کہ اسے بیٹی کی خوشی سے زیادہ اپنی انا عزیز تھی۔ اب عدنان اسے دنیا کا بدترین لڑکا محسوس ہو رہا تھا اور ایسے بدترین لڑکے سے اپنی بیٹی کی دوستی سے سخت تکلیف پہنچ رہی تھی۔

پروفیسر ایک بنگلہ نما سے شاندار گھر میں رہتا تھا اور یہ گھر اس نے اپنی حلال کی کمائی سے تعمیر کیا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے اس نے ایک ادھیڑ عمر نوکرانی رکھی ہوئی تھی۔ فاطمہ نامی اس عورت کو پروفیسر کے ہاں کام کرتے ہوئے طویل عرصہ ہو چکا تھا اور اب اس کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ فاطمہ کا چونکہ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے وہ بھی پروفیسر کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ عائکہ کی فاطمہ سے خوب بنتی تھی۔ عائکہ اسے بچپن ہی سے بوا کہتی چلی آرہی تھی اور فاطمہ نے بھی کبھی اسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ محض ایک نوکرانی ہے۔ وہ عائکہ کو سگی بیٹی کی طرح چاہتی تھی اور اس کے پیار میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں تھا۔

پروفیسر نے کبھی ان دونوں کے اس رشتے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ عائکہ اس کی موجودگی میں بھی فاطمہ کو بوا کہتی تھی۔ مگر پروفیسر کے لیے فاطمہ ہمیشہ ایک غیر عورت ہی رہی تھی۔ پروفیسر اب بھی اسے باقاعدگی سے تنخواہ دیتا تھا۔ گو کہ اب تنخواہ لینے کو فاطمہ کا دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ پروفیسر کو اچھی طرح جانتی تھی اس لیے انکار کر کے وہ یہ محفوظ ٹھکانا نہیں کھونا چاہتی تھی۔ بہت عرصہ پہلے ایک بار اس نے تنخواہ لینے سے انکار کیا تو تب پروفیسر نے اسے دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا۔ "فاطمہ! میں کسی کا احسان لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں گھر میں کام کاج کے لیے رکھا ہوا ہے۔ اگر تم تنخواہ نہیں لوگی تو پھر میں تمہیں اس گھر میں نہیں رکھ سکوں گا۔ میں کوئی اور کام والی ڈھونڈ لوں گا۔" فاطمہ کو پروفیسر کے کہے گئے الفاظ آج بھی یاد تھے۔ اس وقت تو اسے پروفیسر پر بے حد غصہ آیا تھا اور شاید وہ وہاں سے چلی بھی جاتی مگر عائکہ کی محبت نے اسے یہ انتہائی قدم اٹھانے سے روک دیا تھا۔

اس دن پروفیسر جب یونیورسٹی سے گھر پہنچا تو لنچ کا ٹائم نکلنے والا تھا لیکن اس کی بھوک مر چکی تھی۔ ڈائننگ روم کا رخ کرنے کے بجائے وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی سماعتوں میں اب بھی عدنان حیدر کے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے۔ "محبت ظاہر ہوتی ہے ہر

بھی نہ مٹنے والی تھی، جبکہ بھوک پیٹ بھرنے ہی سے جاتی ہے۔ سیر ہونے کے بعد بھوک کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ محبت تاج محل تعمیر کرتی ہے۔"

"ہونہہ محبت۔" پروفیسر منہ بناتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ "تاج محل محبت نے نہیں بلکہ ایک شہنشاہ کی دولت نے تعمیر کیا تھا۔ ان مزدوروں اور ان مستریوں نے تعمیر کیا تھا جن کے نام تک تاریخ یاد نہ رکھ سکی۔"

پروفیسر یوں برے برے منہ بنا رہا تھا جیسے اس نے کونین کی گولی چبا ڈالی ہو۔ پھر یونہی کسی خیال کے تحت اس نے عائکہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد عائکہ کے بجائے فاطمہ اندر داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد بولی۔ "صاحب! عائکہ بی بی تو ابھی تک یونیورسٹی سے واپس نہیں لوٹیں۔"

"کیوں؟" پروفیسر نے چلا کر پوچھا۔ "کیا اس نے تمہیں لیٹ آنے کے متعلق بتایا تھا؟"

"نہیں صاحب! اس نے ایسا کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"میں جانتا ہوں وہ کسی بدتمیز کے ساتھ گھوم رہی ہوگی۔ اب بہت ہو گیا۔ آج کے بعد اس کے ساتھ عائکہ کا ملنا جلنا بند۔"

"کیوں صاحب! کیا عدنان صاحب نے کچھ..."

"صاحب مت کہو اسے۔" پروفیسر نے چلا کر قطع کلامی کی۔ "ایک نمبر کا بدتمیز اور بے شرم ہے وہ۔ اسے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز تک نہیں ہے۔"

"صاحب! کھانا لگا دوں؟" فاطمہ نے موضوع بدل کر پوچھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیا مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہے صاحب؟" فاطمہ نے سہم کر پوچھا۔

"بس تم جاؤ۔" پروفیسر چلایا اور فاطمہ حیرانی اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں کمرے سے باہر نکل گئی۔

پروفیسر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا دماغ مسلسل عدنان حیدر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ عدنان کے الفاظ کسی ہتھوڑے کے مانند اس کی سماعتوں پر برس رہے تھے۔ عدنان حیدر سے بحث کرنے کی وجہ سے اس کا بلڈ پریشر قدرے بلند تھا، رہی سہی کسر گھر میں بیٹی کی عدم موجودگی نے پوری کر دی تھی۔ وہ جوں جوں عدنان حیدر کے بارے میں سوچتا گیا، اس کا غصہ بھی بڑھتا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بلند فشار خون کے مریضوں کی خاصیت ہوتی ہے۔ پہلے اسے کنپٹیوں پر دباؤ محسوس ہوا اور دل کی دھڑکن رفتار پکڑنے لگی۔ اس کے بعد اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے چلا کر فاطمہ کو پانی لانے کا حکم دیا اور پھر بیڈ کی دراز کھول کر بی پی کنٹرول کرنے والی گولیاں تلاش کرنے لگا۔ دراز میں گولیاں موجود نہیں تھیں۔ اس کا غصہ شدید تر ہو گیا۔ اب اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا اور وہ بلند فشار خون کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہونے لگا تھا۔

"کہاں مر گئی ہو فاطمہ۔" وہ حلق کے بل چلایا اور پھر لرزتا کانپتا بستر پر گر گیا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس نے کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ اس کے بعد اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

عائکہ عدنان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو فاطمہ بوا اسے کوریڈور میں پریشانی کے عالم میں چکر لگاتی ہوئی نظر آئی۔ اسے یوں بے چین دیکھ کر عائکہ کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ فاطمہ بوا کی پریشانی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً یہ کسی اہم واقعے کا ردعمل ہی ہو سکتا تھا۔ فاطمہ بوا کی نظر جونہی عائکہ پر پڑی وہ تقریباً بھاگ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"کیا بات ہے بوا جی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟" عائکہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ... وہ... بی بی جی... صاحب... صاحب... اپنے کمرے میں..." اس نے کچھ بتانے کی کوشش کی مگر شدت غم سے اس کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔

عائکہ کوئی سوال کیے بغیر دوڑتی ہوئی باپ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ عدنان بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا تھا۔ کمرے میں پروفیسر اپنے بیڈ پر آڑی ترچھی حالت میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر پڑا تھا۔ عائکہ نے چلا کر اسے پکارا۔ "پپا... پاپا" اور پھر روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

یہ صورت حال دیکھ کر عدنان کچھ دیر کے لیے تو بے حد پریشان ہو گیا مگر جلد ہی اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ پروفیسر بالکل بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ عائکہ کے لپٹنے پر بھی اس کے جسم میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ وہ عالم رنگ و بو سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ چکا ہے اور کبھی نہ اٹھنے کے لیے سو چکا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر پروفیسر کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ نبض چل رہی تھی لیکن رفتار معمول کے مطابق نہیں تھی۔ اسے فوراً اسپتال پہنچانا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ عائکہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں بولا۔ "فکر نہ کرو عائکہ! سر زندہ ہیں۔ تم حوصلہ رکھو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم انہیں فوراً اسپتال لے چلتے ہیں۔"

عائکہ کو تسلی دینے کے بعد وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ بنگلے کے مین گیٹ کے سامنے ہی اس کی سنہرے ماڈل کی پراڈو جیپ پارک تھی۔ اس نے نہایت ہی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مین گیٹ کو مکمل کھول دیا۔ وہ بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا، گاڑی اسٹارٹ کی اور بنگلے کے اندر ڈرائیو وے کے عین سامنے روک دی۔ گاڑی کا انجن بند کیے بغیر وہ تیزی سے نیچے اترا اور دوڑتا ہوا پروفیسر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ عائکہ بدستور روئے جا رہی تھی جبکہ فاطمہ بوا اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ بولے بغیر آگے بڑھا، پروفیسر کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ عائکہ اور فاطمہ بوا بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئیں۔

اس دوران میں عدنان پروفیسر کو گاڑی کی عقبی سیٹ پر لٹا چکا تھا۔ عائکہ بھی باپ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ گاڑی کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ تھا۔ عدنان نے گیئر لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کیا سر دل کے مریض ہیں؟" اس نے بغیر پیچھے دیکھے عائکہ سے پوچھا۔

"نہیں۔" عائکہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"مگر کیوں...... اس میں میرا کیا دوش ہے؟" اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "یہ سب تمہاری فضول بحث کا نتیجہ ہے۔ فاطمہ بوا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ پاپا تم پر بے حد غصہ تھے اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے ان کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا ہوگا۔"

"آئی ایم رئیلی سوری عائکہ۔" وہ نادم لہجے میں بولا۔ "لیکن میرا نہیں خیال کہ سر کی اس حالت کی وجہ میری بحث ہو سکتی ہے۔ میں اس سے قبل بھی ان سے کئی بار بحث کر چکا ہوں۔ پہلے تو کبھی ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تو پھر آج..."

"آج ان کے پاس بی پی کنٹرول کرنے والی ٹیبلٹس نہیں تھیں۔" عائکہ نے قطع کلامی کی۔

"عائکہ! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ دراصل میں سر کی بیماری سے لاعلم تھا۔ ورنہ کبھی ان سے بحث نہ کرتا۔"

"کیا تمہاری شرمندگی پاپا کی اس تکلیف کا ازالہ کر سکتی ہے؟" عائکہ کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

وہ بولا۔ "تم حوصلہ رکھو انشاء اللہ سر کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"کیسے حوصلہ رکھوں؟" وہ پھٹ پڑی۔ "پاپا کے علاوہ کون ہے میرا؟ بھری دنیا میں سوائے پاپا کے آج تک میں نے کسی رشتے دار کی صورت تک نہیں دیکھی۔ ماں بھی میرے بچپن میں ہی گزر گئی۔"

عدنان سے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ سو وہ چپ ہو گیا۔ ویسے بھی اس وقت ان کی گاڑی ایک نجی اسپتال کا مین گیٹ کراس کرتے ہوئے اندر داخل ہو چکی تھی۔ عدنان چونکہ راستے ہی میں اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے بات کر چکا تھا اس لیے بغیر کسی تاخیر کے پروفیسر کو ایڈمٹ کر دیا گیا۔ عدنان اور عائکہ ڈاکٹر کے آفس روم میں ہی بیٹھ گئے۔ عائکہ کے چہرے پر بدستور مردنی چھائی ہوئی تھی اور وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ عدنان اس کی حالت دیکھ کر اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا اور دل ہی دل میں پروفیسر کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پروفیسر کے علاوہ عائکہ کا کوئی نہیں ہے۔ خدانخواستہ اگر پروفیسر کو کچھ ہو گیا تو عائکہ بھری دنیا میں تنہا رہ جائے گی۔ اس کی زندگی عدنان کے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھی۔

عائکہ کی نم آلود آنکھیں دیکھ کر وہ خود کو اس کا مجرم تصور کر رہا تھا۔ پروفیسر کی اس حالت کا وہ ذمے دار وہی تھا۔ اسی خاموشی میں مزید چند لمحات گزر گئے۔ تب وہ پہل کرتے ہوئے بولا۔ "عائکہ! میں ... میں تم سے سخت شرمندہ ہوں لیکن خدا جانتا ہے کہ یہ سب کچھ انجانے میں ہوا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ سر اس قدر میری بحث کا اثر لیں گے۔ خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں سر کے سامنے زبان ہی نہ کھولتا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ سر ہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔"

"پاپا دل کے بہت اچھے ہیں عدنی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مگر جب کوئی شخص ان کے سامنے محبت کی برائی بیان کرتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ وہ محبت سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" اس نے

تائید کی۔ ”ورنہ محبت تو میں ان سے کئی بار کر چکا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ سر نوجوانی میں محبت کرتے رہے ہیں اور بے وفائی کا شکار ہوئے ہیں۔ محبت سے اس قدر نفرت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے اس کی محبت نے ٹھکرا دیا ہو۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ ...ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ میں نے کبھی پاپا سے ان کے ماضی متعلق...“

ایسے ہی وقت عدنان کا دوست ڈاکٹر سہیل نیازی اندر داخل ہوا اور عائکہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

”ڈونٹ وری عدنان۔“ ان کی اتری ہوئی شکلیں دیکھ کر ڈاکٹر نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”اب وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تم لوگ ان سے مل سکتے ہو۔“

”تھینکس گاڈ۔“ عدنان نے اطمینان بھری سانس لی اور پھر عائکہ سے بولا۔ ”چلو سر سے ملتے ہیں۔ میں ان سے سوری بھی کر لوں گا۔“

وہ بولی۔ ”معافی مانگنے کے لیے یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ ابھی تم ان کے سامنے مت جاؤ۔ ان کی طبیعت دوبارہ بھی بگڑ سکتی ہے۔“

عائکہ کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے تو اس کی رنگت متغیر ہو گئی لیکن پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”اوکے... مجھے ابھی سر کے سامنے نہیں جانا چاہیے۔ ٹھیک ہے، تم چلی جاؤ۔ میں یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔“

”پلیز عدی! مائنڈ مت کرنا۔“ وہ قدرے شرمندہ ہو کر بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ یہ بداخلاقی ہے لیکن کیا کروں مجبوری میں ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔“

”میں بھلا کیوں مائنڈ کروں گا؟“ وہ مسکرایا اور پھر ڈاکٹر نیازی کی طرف متوجہ ہو گیا، جو متحیر ہو کر ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

”یہ کیا چکر ہے بھئی؟“ عائکہ کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے سوال کیا۔

”چکر وکر کوئی نہیں ہے یار! بس عائکہ کے پاپا مجھے پسند نہیں کرتے۔“

”دیکھو عدنان! تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ عائکہ تم سے اس لہجے میں بات کر ہی نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے۔“

”کچھ بھی نہیں ہوا یار۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا لیکن جب ڈاکٹر نیازی کا اصرار جاری رہا تو اسے ساری کہانی سنانی پڑی۔

”اوہ... تو یہ بات ہے۔“ ساری کہانی سننے کے بعد ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔ ”پھر تو سمجھو تم بے موت مارے گئے۔“

”کیا مطلب؟“

ڈاکٹر بولا۔ ”تم عائکہ سے محبت کرتے ہو اور پروفیسر محبت کا دشمن نمبر ایک۔ لگتا ہے تمہاری کشتی تو بیچ منجدھار میں ڈوبنے والی ہے۔ تم پروفیسر کو کبھی راضی نہیں کر سکتے۔“

”احمق ہو تم۔“ عدنان نے قہقہہ لگایا۔ ”عائکہ اور میں صرف اچھے دوست ہیں۔ دوستی کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”وقت آنے پر تم سے پوچھوں گا چودھری

صاحب!'' ڈاکٹر کے انداز میں تمسخر تھا۔ ''بہت جلد تم دونوں کے بیچ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔''

''اچھا مذاق چھوڑو، پھوپھو سر کے متعلق بتاؤ؟'' عدنان نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بس بلند فشار خون کی وجہ سے یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوا ہے۔''

''مطلب ہرگز کوئی ہارٹ پرابلم نہیں ہے؟''

''فی الحال تو ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر بعد میں شکایت ہو بھی سکتی ہے..... یہ مسئلہ توجہ طلب ہے۔ پروفیسر کو پرہیزی کھانے کے ساتھ ساتھ روزانہ ورزش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر نیازی نے جواب دیا اور عدنان نے سنجیدگی انداز میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

عائشہ کمرے میں داخل ہوئی تو پروفیسر سفید بستر پہ آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر قدرے نقاہت کے آثار تھے۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ لمحہ بھر کے لیے عائشہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس نے عائشہ کو جن نظروں سے دیکھا تھا ان میں اپنایت کی جگہ ناراضی اور سرد مہری تھی۔ عائشہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ چند لمحے تو وہ پروفیسر کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی مگر جب پروفیسر اس کی طرف متوجہ نہ ہوا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''پاپا! میں..... عائشہ ہوں..... کیا آپ مجھے معاف نہیں کریں گے؟''

پروفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ عائشہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ایسے ہی وقت وہ روتی ہوئی پروفیسر سے لپٹ گئی۔ ''پاپا..... پاپا..... پلیز مجھے معاف کر دیجیے..... آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا..... میں شرمندہ ہوں پاپا۔''

بیٹی کو آنسوؤں کے ساتھ یوں روتے دیکھ کر پروفیسر کے ضبط کے بندھن بھی ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور عائشہ کے سر کے بال سہلانے لگا۔ یہ واضح طور پر اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ عائشہ کو معاف کر چکا ہے۔ عائشہ بدستور اس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹی رہی۔ ایسا کرنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پروفیسر کی انگلیاں اس کے بالوں میں متحرک رہیں۔ وہ باپ کی انگلیوں میں چھپی شفقت محسوس کر رہی تھی۔ محبت کے کئی روپ ہوتے ہیں، یہ بھی محبت ہی کا ایک روپ تھا لیکن شاید پروفیسر اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ جو محبت کا دشمن تھا، اسے بیٹی کی محبت نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''پاپا! آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟'' پروفیسر کی سماعتوں سے عائشہ کی آواز ٹکرائی۔

''میں بھلا اپنی گڑیا سے روٹھ سکتا ہوں؟'' اس کا لہجہ پدری شفقت سے معمور تھا۔

وہ بولی۔ ''آپ بہت اچھے ہیں پاپا! میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسا پیار کرنے والا باپ ملا ہے۔''

''لیکن میں خود کو خوش قسمت نہیں سمجھتا۔'' اس نے شکوہ کیا۔ ''تم پاپا کا دل کیوں دکھاتی ہو؟''

''پاپا! یہ سب کچھ میں نے جان بوجھ کر تو نہیں کیا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ آپ ناراض ہو جائیں گے تو میں کبھی ان کے ساتھ نہ جاتی۔''

پروفیسر بولا۔ ''وہ اچھا لڑکا نہیں ہے گڑیا! بہت بدتمیز ہے۔ اسے بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں ہے۔ تم اس سے نہ ملا کرو۔''

''ٹھیک ہے پاپا! اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔ اس سے زیادہ مجھے اپنے پاپا کی خوشی عزیز ہے۔''

''میری اچھی گڑیا۔'' پروفیسر نے فرط مسرت سے اس کی پیشانی چوم لی اور پھر پوچھا۔ ''مجھے یہاں کون لایا ہے؟''

سوال غیر متوقع تھا۔ وہ ایک دم گڑبڑا گئی۔ وہ باپ سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتی تھی اور سچ بولنے میں بھی رسک تھا۔ لہٰذا وہ کشمکش کا شکار ہو گئی۔

پروفیسر اسے کشمکش کا شکار دیکھ کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت کس کیفیت سے گزر رہی ہو..... بہرکیف اب میں اس نالائق کی گاڑی میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اسے بول دو کہ میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''او کے پاپا! میں گھر سے اپنی گاڑی لے آتی ہوں لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''لیکن کیا؟'' پروفیسر کے انداز میں حیرت تھی۔

''پاپا! وہ..... وہ عدنان..... آپ سے سوری بولنا چاہتا ہے۔'' اس نے بمشکل جواب دیا۔

''میں اس کی سوری پر لعنت بھیجتا ہوں۔'' پروفیسر نے غصے کے عالم میں کہا۔ ''اسے بولو کہ ملاقات کے علاوہ میں اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں۔''

''جی پاپا۔'' وہ فرماں برداری سے سر جھکاتے ہوئے

باہر نکل گئی۔

بات بہت معیوب تھی مگر وہ پاپا کو انکار کرنے کی ہمت نہ کرسکی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس نے پاپا سے بحث چھیڑ دی تو ان کی طبیعت دوبارہ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ عدنان کمرے کے سامنے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔ اسے کمرے سے نکلتے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور بولا۔ ''سر کی طبیعت کیسی ہے؟ وہ ٹھیک تو ہیں نا؟''

''ہاں۔'' اس نے پھیکے سے انداز میں جواب دیا۔

''پاپا بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن... وہ... وہ... تم سے ملنا نہیں چاہتے۔''

عدنان کو بے حد سبکی محسوس ہوئی مگر وہ ضبط کر گیا۔ عائکہ نے کہا۔ ''عدی! اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ پلیز تم مجھ سے ناراض مت ہونا۔''

''ارے بھئی! میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہونے لگا!؟'' وہ ہنس دیا مگر یہ ہنسی صرف نام کی ہنسی تھی۔ اندر سے احساسِ ذلت اسے چوکے لگا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''عدی! میں جانتی ہوں کہ اس وقت تم خود کو بہت ہی چھوٹا محسوس کر رہے ہوگے لیکن یہ بھی تو سوچو نا کہ پاپا کی جو حالت ہے اس کے پیش نظر...''

''عائکہ! خود کو کیوں ہلکان کر رہی ہو؟'' اس نے ایک دم ایک جاندار قہقہہ لگایا۔ ''میں نے کوئی نسبت وغیرہ محسوس نہیں کی ہے۔ تمہارے پاپا میرے سر ہیں۔ یعنی کہ میرے استاد ہیں اور استاد تو روحانی باپ ہوتا ہے۔ اب اگر ایک باپ بیٹے کو برا کہتا ہے تو بیٹے کو چاہیے کہ خطا کو رہنا ہے نہ کہ باپ۔ ایسے بیٹے کو باپ سے ناراض ہونے کے بجائے اپنا ہی صبر کرنا چاہیے۔''

''تھینکس عدی!'' سر سے بوجھ ہٹتے ہی وہ کھل اٹھی۔

''تو... دوستوں میں تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''تو چلو پھر مجھے گھر تک ذرا ڈراپ کر دو۔''

''لیکن وہ...''

''انہوں نے ہی تو مجھے گاڑی لانے کے لیے کہا ہے۔'' عائکہ نے قطع کلامی کی۔

''یار! گاڑی سے کیسی ناراضی؟ قصور میں نے کیا ہے نہ کہ میری گاڑی نے!'' عدنان نے احتجاج کیا۔

عائکہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اس انداز پر ہنس دی۔

وہ بولا۔ ''دانت مت نکالو، مجھے تو تم بھی پری کی طرح خبطی لگتی ہو۔''

''ظاہر ہے پاپا کی بیٹی ہوں۔'' وہ دوبارہ ہنس دی۔

''میں اس قابل کہاں کہ دوڑ کا کام کر سکوں''
''مگر بار نہیں تو یہ سمجھو، تمہارے پاس ایک کا بیٹا''
''کا، یہ تبھی تو مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا ہے۔''

''مصیبت میں ایک نہیں، دو دو خطیبوں کے بیچ پھنس گیا ہوں... یا خدا! میرا کیا بنے گا؟''

''وقت آنے پر سب کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔'' عائکہ نے دوستی انداز میں جواب دیا اور عدنان بغلیں جھانکنے لگا۔

''چلو تمہیں گھر چھوڑ دوں۔'' بالکل غیر متوقع طور پر وہ سنجیدہ ہو گیا۔

عائکہ نے قدرے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بغیر کچھ بولے اسپتال کے پارکنگ ایریا کی طرف چل دی۔

☆☆☆

زندگی دوبارہ معمول پر آگئی تھی مگر اب عائکہ اور عدنان کے ملنے پر پابندی تھی۔ پروفیسر نے سختی کے ساتھ عائکہ کو منع کر دیا تھا کہ وہ عدنان سے بالکل نہ ملے۔ اب وہ خود ہی اپنی گاڑی میں عائکہ کو یونیورسٹی لے جاتا تھا اور واپسی پر بھی اسے ساتھ لانا نہیں بھولتا تھا۔ چند دن تو عائکہ نے جیسے تیسے گزار لیے مگر پھر وہ اس روٹین سے تنگ آگئی۔ وہ عدنان سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ان چند دنوں کی جدائی نے اس پر اس قدر اثر ڈالا کہ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ پروفیسر اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ دوسرے دن جب وہ پروفیسر کے ساتھ یونیورسٹی سے واپس لوٹی تو اس نے لنچ کرنے سے انکار کر دیا۔ پروفیسر نے وجہ پوچھی تو وہ کچھ بتانے کے بجائے رونے لگی۔ پروفیسر بچہ نہیں تھا کہ اس کے رونے کی وجہ نہ سمجھ سکتا۔ بیٹی کے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ وہ عدنان حیدر پر دل ہار بیٹھی ہے۔ پروفیسر چند لمحے تو اس کے بولنے کا منتظر رہا مگر جب وہ کسی طرح بھی نہ بولی تو پروفیسر کو خود ہی پہل کرنا پڑی۔

''دیکھو عائکہ!'' پروفیسر نے ناصحانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی ناسمجھ ہو۔ تمہیں اچھے برے کی پہچان

نہیں ہے۔ عدنان ایک امیرزادہ ہے اور یہ امیرزادے محبت کو محض دل لگی سمجھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تم سے فلرٹ کر رہا ہے۔ نہ اگر تم سے واقعی محبت ہوتی تو وہ کب کا اظہار کر چکا ہوتا۔ یوں دوسری لڑکیوں کے آگے پیچھے نہ گھوم رہا ہوتا۔ امیر کسی سے محبت نہیں کرتے۔"

"پاپا!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں گے؟"

"کیسا سوال؟" پروفیسر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ محبت سے اس قدر چڑتے کیوں ہیں؟"

"اس لیے کہ میں محبت کو محض وقت کا زیاں سمجھتا ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بات کچھ اور ہے۔ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟"

"یہ تمہارا وہم ہے عاتکہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"وہم نہیں ہے پاپا بلکہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے نوجوانی میں کسی سے محبت کی ہے۔ جس میں آپ کو سوفی صد ناکامی ہوئی ہے۔"

وہ بولا۔ "تم احمق ہو باپ پر شک کر رہی ہو۔ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے۔"

"اوکے تو پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ آپ نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی؟"

"مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے پاپا! پلیز مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتائیں.... کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کسی سے بے وفائی کر چکے ہیں؟"

"عاتکہ!" پروفیسر چلایا۔ "تم ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہی ہو اور کس سے کہہ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "پاپا! دکھ شیئر کرنے سے اس کا احساس کم ہو جاتا ہے اور پھر میں تو آپ کی بیٹی ہوں۔ کیا مجھے اتنا بھی حق حاصل نہیں ہے کہ میں اپنے پاپا کے ماضی کے بارے میں جان سکوں؟"

پروفیسر ایک دم چپ ہو گیا۔ یوں جیسے چابی والے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔ عاتکہ بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی پھر اچانک ہی پروفیسر کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اندر کا درد نمکین پانی کا روپ دھارے باہر ابلنے لگا۔

☆☆☆

"ارشی! تم میرے بھائیوں سے بات کیوں نہیں کرتے۔ ہم کب تک یوں چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے؟"

صفیہ نے سوال کیا۔

وہ بولا۔ "صفیہ! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمہارے بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلا سکوں۔"

"ہمت نہیں تھی تو پھر پیار کیوں کیا؟"

"پیار کوئی جان بوجھ کر تھوڑی کرتا ہے۔ یہ تو بس ہو جاتا ہے۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟"

وہ بولی۔ "تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے مجھے سپنے دکھائے تھے اور اب مجھے ان سپنوں کی تعبیر چاہیے؟"

"خوابوں اور سپنوں کی تعبیر بازار میں بکتی تو میں اپنا آپ بیچ کر بھی خرید لاتا۔"

"تم ایک بار میرے بھائیوں سے بات کر کے تو دیکھو کیا پتا وہ مان جائیں۔" صفیہ نے مشورہ دیا۔

"نہیں صفیہ! میں بے موت مرنا نہیں چاہتا۔ تم خود کیوں نہیں بات کرتیں اپنے بھائیوں سے؟"

"سوری، میں یہ بے شرمی والا کام نہیں کر سکتی۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "بھائی مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے لیکن میری بات نہیں مانیں گے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہاری بات وہ ضرور سنیں گے۔ ماننا یا انکار کرنا ان کی صوابدید پر منحصر ہے۔"

"پھر تو ہمارا ملاپ ناممکن ہے۔" اس نے متاسف لہجے میں جواب دیا۔

"مطلب تم بات نہیں کرو گے؟"

"بالکل نہیں کروں گا۔" اس نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

"یعنی تم مجھے یہ بے شرمی والا کام کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہو؟" اس نے طنزاً پوچھا۔

وہ بولا۔ "میں نے ایسا کب کہا ہے؟"

"کہا نہیں ہے مگر تمہارا رویہ تو یہی ظاہر کر رہا ہے کہ مجھے ہی اپنے بھائیوں سے بات کرنا پڑے گی۔"

"فی الحال بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پہلے مجھے اپنے قدموں پر کھڑا ہونے تو دو۔ جب میں کچھ بن جاؤں گا تو پھر تمہارے بھائیوں سے بات بھی کر لوں گا۔"

"کاش تمہارے ماں باپ زندہ ہوتے تو آج ہم دونوں یوں مجبور نہ ہوتے۔"

وہ بولا۔ "ماں باپ تو تمہارے بھی نہیں ہیں اور شاید یہی ہم دونوں کی بدقسمتی ہے۔"

وہ سر جھکا کر سوچوں میں غرق... ہو گئی۔ جبکہ ارشد زمان پریشانی کے عالم میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' چند لمحوں کے بعد ارشد زمان نے سوال کیا۔

''سوچ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔''

''پشیمان ہو تو راستہ کھلا ہے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

''یعنی تمہیں مجھ سے بچھڑنے کا کوئی غم نہیں ہوگا؟'' صفیہ نے حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔

''کیا تم اپنے حق کے لیے بھائیوں سے نہیں لڑ سکتیں؟'' جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا سوال کر دیا۔

''لڑ سکتی ہوں مگر پہل تمہیں کرنا پڑے گی۔ تم ایک دفعہ رشتہ تو مانگو باقی میں خود سنبھال لوں گی۔''

پھر اس سے قبل کہ وہ صفیہ کی بات کا جواب دیتا ایک بڑی سی جیپ ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ جیپ کو دیکھتے ہی صفیہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور نے اس کے لیے گاڑی کی کھڑکی کھولی، صفیہ نے ارشد پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور پھر جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

چودھری فرمان حیدر ایک سجے سجائے خوب صورت سے کمرے میں بڑی بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک دبیز صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید وہ کسی کا منتظر تھا۔ چند سے قبل ہی اسے ایک گمنام فون کال موصول ہوئی تھی کہ وہ اپنی نوجوان بہن پہ نظر رکھے ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے زق نہیں رہے گا۔ فون کرنے والے نے اپنا نام و پتا بتانے سے انکار کر دیا تھا۔ بس صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ اس کا خیر خواہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک وہ صوفے سے اٹھا اور پھر حلق کے بل چیخ کر کسی سکینہ نامی خاتون کو آوازیں دینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوجوان لڑکی کمرے میں داخل ہو کر سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ''حکم سائیں! سکینہ حاضر ہے۔''

''صفیہ پہنچی کہ نہیں؟'' اس نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

''سائیں! دلاور اسے لینے کے لیے جا چکا ہے مگر ابھی تک واپس نہیں آیا۔'' سکینہ نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''کیوں واپس نہیں آیا؟ کیا کر رہا ہے وہ الو کا پٹھا؟'' چودھری نے گرج کر پوچھا۔

''م ......م...... مجھے کیا پتا سائیں!'' وہ مزید سہم گئی۔

''تمہیں پتا ہونا چاہیے، دلاور تمہارا شوہر ہے۔''

''سائیں! وہ بی بی جی کبھی کبھار اپنی کسی سہیلی سے بھی ملنے چلی جاتی ہیں۔ کیا پتا آج بھی بی بی جی......''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' چودھری نے قطع کلامی کی۔ ''کون ہے اس کی سہیلی، کیا تم اسے جانتی ہو؟''

''ن......نہیں سائیں......م......میں تو نہیں جانتی......شا......شاید دلاور کو پتا ہو؟'' سکینہ نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم دفع ہو جاؤ، دلاور جب واپس آجائے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔''

وہ سلام کرتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ جبکہ چودھری نے ایک بار پھر بے چینی کے عالم میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اب اسے وہ گمنام فون کال حقیقت پر مبنی لگ رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہرکیف جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

لگ بھگ پچیس منٹ کے بعد دلاور اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا اور چودھری کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ چودھری فرمان چند لمحے تو اسے گھورتا رہا پھر گرج کر پوچھا۔ ''تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟''

''وہ......وہ چودھری جی......دیر میں نے تو نہیں لگائی...... دراصل صفیہ بی بی اپنی ایک سہیلی سے ملاقات......''

''دلاور!'' چودھری نے غضب ناک انداز میں اس کی بات کاٹی۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے ساری بات کا پہلے ہی سے علم ہے۔ لیکن میں تمہاری زبان سے ساری کہانی سننا چاہتا ہوں۔ جھوٹ بولو گے تو جان سے جاؤ گے اور سچ بتاؤ گے تو انعام پاؤ گے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''وہ...... وہ چودھری جی......رب دی سوں......م...... میں بالکل بے قصور ہوں جی۔'' دلاور نے تھرتھر کانپتے ہوئے کہا۔

چودھری گرجا۔ ''الو کے پٹھے! جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو ورنہ زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔''

''چودھری جی! صفیہ بی بی ایک...... ایک......لڑکے سے...... ملتی ہے جی...... پر رب دی سوں...... اس...... میں میرا......کوئی دوش نہیں ہے جی۔''

دلاور نے اٹکتے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''کب سے مل رہے ہیں وہ دونوں؟'' خیر متوقع طور

پر چودھری نے زیرِ اندازمیں پوچھا۔
"چھ مہینے ہوگئے جی۔"
"نمک حرام ہو تم۔" چودھری گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے گرجا۔ "چھ مہینوں سے تم اس کے رازدار ہو اور مجھے اب بتا رہے ہو...... کیوں؟"
"وہ... چودھری جی!...... دراصل...... صفیہ بی بی نے مجھے دھمکی دی تھی... کہ میں نے کسی کو بھی یہ بات بتائی تو وہ مجھے کسی جھوٹے الزام میں پھنسوا کر مروا دیں گی... تم...... میں کیا کرتا جی...... زندگی تو سبھی کو پیاری ہوتی ہے نا! اس لیے میں اپنی جان کے خوف سے خاموش رہا۔"
"اگر تمہارا یہ الزام جھوٹا نکلا تو جانتے ہو میں کیا کروں گا؟" چودھری نے اسے غضب ناک نگاہوں سے گھورا۔ "میں تجھے زندہ اپنے شکاری کتوں کے سامنے ڈال دوں گا جو تیری ہڈیاں تک چباڈالیں گے۔"
"رب دی سوں چودھری جی! ایہی سچ ہے۔"
"سچ جھوٹ کا میں جلد پتا لگا لوں گا۔ فی الحال تم ایک کام کرو۔"
"حکم کریں چودھری جی۔"
"اس حرام زادے کا نام کیا ہے؟"
"ارشد زمان ہے جی۔"
"کوئی پتا ٹھکانا؟"
"یہ تو جی صفیہ بی بی کو معلوم ہوگا۔" دلاور نے سر جھکا کر جواب دیا۔
چودھری تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ لیکن خبردار یہ بات اگر تم نے کسی کو بتائی تو پھر مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"
"توبہ کریں جی۔" دلاور نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "میں انسان تو کیا کسی دیوار کے سامنے بھی یہ بات نہیں کہوں گا۔"

☆☆☆

اس روز وہ دونوں ملے تو صفیہ قدرے اداس تھی۔ ارشد نے جب استفسار کیا تو وہ بولی۔ "چند روز سے مجھے فرمان بھائی کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔ یوں جیسے وہ مجھ پر شک کرنے لگے ہوں۔"
"یہ تمہارا وہم بھی تو ہوسکتا ہے۔ شاید وہ اپنی کسی پریشانی کے سبب تم پر توجہ نہیں دے پا رہا ہو۔" اس نے دلیل دی۔
"بات توجہ کی نہیں ہے۔ بھائی جان مجھ سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔"
"ڈونٹ بی سلی صفیہ! تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔"
وہ بولی۔ "نہیں، میں بچی نہیں ہوں کہ بے اعتنائی اور پریشانی کے درمیان فرق محسوس نہ کرسکوں۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے؟"
"تم...... مطلب...... اسے ہماری محبت کے بارے میں...... ما...... معلوم ہوگیا ہے۔" اس نے اٹکتے ہوئے بات مکمل کی۔
"ارشی! تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو رہے ہو؟" صفیہ نے متحیر انداز میں پوچھا۔
"تو اور کیا قہقہے لگاؤں؟" وہ ایک دم بگڑ گیا۔
وہ بولی۔ "عشق اور مشک بھی بھلا کبھی چھپتے ہیں۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ اگر بھائی کو سچ مچ ہماری محبت کے بارے میں پتا چل گیا ہے تو یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ اب میں آسانی کے ساتھ ان سے بات کرسکوں گی۔"
"تم... میرے خیال میں... اب ہمیں احتیاط برتنا چاہیے۔" اس نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔
"تم اس قدر بزدل نکلو گے، یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ڈرنا ہی تھا تو پھر مجھ سے پیار کیوں کیا؟"
"احمقانہ سوال مت کرو۔" وہ تیوری پر بل ڈالتے ہوئے بولا۔ "ڈرنے اور احتیاط برتنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں ڈر نہیں رہا، احتیاط برت رہا ہوں۔"
"ہم نے کوئی جرم نہیں کیا کہ احتیاط برتیں۔ پیار کیا ہے اور پیار کرنے والے تو جلتے ہوئے انگاروں پر بھی چلنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ وہ تو راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ٹھوکر مار کر گزر جاتے ہیں۔ پہاڑ، دریا اور صحرا تو ان کے راستے کے سنگ میل ہوتے ہیں۔"
وہ بولا۔ "یہ سب فلمی ڈائیلاگ ہیں۔ حقیقت ان سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ تمہارے بھائی نہ تو پہاڑ ہیں اور نہ ہی صحرا اور دریا۔ وہ جیتے جاگتے انسان ہیں اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ان کا تعلق انسانوں کے جس قبیل سے ہے وہ احساسات و جذبات سے قطعی طور پر عاری ہوتے ہیں۔ وہ گولی پہلے چلاتے ہیں اور جرم بعد میں پوچھتے ہیں۔"
ارشد زمان کا یہ روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسی بزدلی کی باتیں بھی کرسکتا ہے مگر یہ حقیقت تھی کوئی خواب نہیں تھا کہ وہ اسے جھٹلا دیتی۔ وہ چند لمحے تو حیرت اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "چلو

اچھا ہوا کہ جلد ہی تمہارا اصل روپ میرے سامنے آ گیا ورنہ میں تو تمہیں اب تک مرد ہی سمجھتی آ رہی تھی۔''

وہ بولا۔ ''تمہارے بھائی بڑی توپ چیز ہیں اور میں چیونٹی۔ ان سے بھڑوں گا تو مسل دیا جاؤں گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی راہیں الگ کر لیں۔''

''راہیں ہی الگ کرنا تھیں تو مجھے ان راہوں پر لائے کیوں تھے؟''

''یہ بات تو تمہیں سوچنا تھی نا کہ...''

ایسے وقت چودھری فرمان کے بھیجے ہوئے چند غنڈے ان کے سر پر پہنچ گئے اور ارشد زمان کی بات ادھوری رہ گئی۔

''اوئے کی ناں اے تیرا؟'' غنڈوں کے سرغنہ نے پولیس والوں کے انداز میں سوال کیا۔

ان کے تیور اور خوف ناک شکلیں دیکھ کر وہ ایک دم گھبرا گیا۔ گھگیا کر بولا۔ ''میں... میں جی... یہاں کا... کا... کالج میں پڑھتا ہوں۔''

''اوئے! میں نے تیرا ناں پوچھا ہے۔ یہ نہیں پوچھا تو کالج میں پڑھتا ہے یا یونیورسٹی... ی میں؟''

''ار... ار... شد... زمان ہے جی۔'' اس نے... بہ مشکل جواب دیا۔

''یہ تو ہر بات پر جی جی کیوں کہتا ہے۔ کیا مجھے سکول ماسٹر سمجھ رکھا ہے؟'' سرغنہ نے دانت نکالے تو اس کے تینوں ساتھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔

صفیہ جو غصے میں تاؤ کھا رہی تھی، مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟''

''بی بی! آپ سے تو میں نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ آپ یہاں سے نکل لیں، یہ اس کا اور ہمارا معاملہ ہے۔''

''تم جانتے ہو کس سے بات کر رہے ہو؟'' اس کے جاگیردارانہ لہو نے جوش مارا۔ ''میں چودھری فرمان حیدر کی چھوٹی بہن ہوں۔ اسے پتا چلا تو تم لوگوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دے گا۔''

وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں بی بی! ہم لوگ ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے نہیں ڈرتے۔ آپ جائیں اور اپنے بھائی سے بلاجھجک ہماری شکایت کر دیں۔ ہم اسے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اس سے کچھ حساب کتاب چکتا کرنا ہے۔ اس کے بعد اسے چھوڑ دیں گے۔''

''میرے ہوتے ہوئے تم لوگ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔'' وہ اپنے محبوب اور غنڈوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

''تو ٹھیک ہے، ہم اسے سید عطا اللہ میاں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔'' سرغنہ نے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ ''پھر اس کی لاش پر بیٹھ کر بین کرتی رہنا۔''

''صفیہ! پلیز تم جاؤ...... میں... میں ان کے ساتھ جاتا ہوں۔'' پستول دیکھ کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''بالکل درست فیصلہ کیا ہے تم نے۔'' سرغنہ نے استہزائیہ انداز میں صفیہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ بی بی تو تجھے بے موت مروانے پر تلی ہوئی ہے۔ اب چلو پارک کے مین گیٹ سے ساتھ ہی ہماری گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔''

وہ بغیر کسی حجت کے ان کے ساتھ چل دیا۔ جبکہ صفیہ محض دانت پیس کر رہ گئی۔

☆☆☆

چاروں غنڈے اسے لیے چودھری فرمان کے فارم پر پہنچ گئے۔ ارشد زمان اس قدر خوف زدہ تھا کہ وہ ان میں سے کسی سے یہ تک پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا کہ وہ اسے کیوں اور کس جرم میں یوں اٹھا کر لے جا رہے ہیں؟

چودھری فرمان اپنے چھوٹے بھائی قربان کے ساتھ فارم میں موجود تھا۔ ارشد زمان کو دیکھ کر وہ سرغنہ کو شاباش دیتے ہوئے بولا۔ ''تم صرف نام کے رستم نہیں ہو بلکہ کام کے بھی رستم ہو۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو توقع سے بھی زیادہ انعام ملے گا۔''

''چودھری صاحب! یہ رستم آپ کا خادم ہے اور ہمیشہ خادم ہی رہے گا۔'' رستم نے خوشامدی لہجے میں جواب دیا۔

چودھری نے کہا۔ ''تمہاری یہی ادا تو مجھے پسند ہے۔ تم ناممکن کام کو بھی ممکن بنا دیتے ہو۔''

''آپ کی مہربانی اور بندہ پروری کا ممنون ہوں جناب۔''

''اوکے۔'' چودھری نے سر ہلایا۔ ''تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر بیٹھ کر انتظار کرو۔ تب تک میں اس مجنوں کی اولاد سے چند باتیں کر لیتا ہوں۔''

وہ چاروں سلام کرتے ہوئے باہر نکل گئے تو چودھری فرمان ارشد زمان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تجھے شیر کی کچھار میں گھسنے کی کیا پڑی تھی؟''

''م...... میں... کچھ سمجھا نہیں...... جناب! آپ کون ہیں اور مجھے...... یہاں کس لیے بلایا ہے؟''

''ہم تیری منحوس شکل دیکھنا چاہتے تھے۔'' چودھری

قربان نے مداخلت کی۔ ''حرام کے پیلے! تو نے کیا سوچ کر ہماری معصوم بہن کو ورغلایا... کیا تجھے اپنی زندگی سے ذرا سا بھی پیار نہیں ہے؟''

''اس میں... م... میرا کوئی دوش نہیں جناب! م... میں... میں...''

''بکواس بند کرو۔'' چودھری فرمان نے اسے ٹوک دیا۔ ''ہم کیا تجھے بے وقوف نظر آتے ہیں؟''

''نن... نہیں جناب!... م... میں نے... ایسا کب کہا ہے؟'' اس نے خوف سے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ڈرو نہیں، ہم تجھے قتل نہیں کریں گے... بس تیرے دونوں بازو توڑ کر تجھے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ تیری زندگی اب بھیک کے ٹکڑوں پر گزرے گی۔ یہ کم سے کم سزا ہے تیرے لیے۔'' چودھری قربان نے بے رحم انداز میں اسے گھورا۔

''م... میں... صف... صفیہ... کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں... خدا کے لیے... م... مجھے معاف کردو۔'' وہ فریاد کرتے ہوئے رونے لگا۔

''اوئے! تم مرد ہو؟'' چودھری فرمان نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''یا پھر تمہارا تعلق تیسری صنف سے ہے؟''

وہ خوف و دہشت کے مارے چودھری کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ بس روئے جارہا تھا۔ شاید اس توقع پر کہ چودھری اسے معاف کردے گا مگر چودھری رحم کے لفظ سے ناآشنا تھا۔ معافی کا لفظ اس کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔ دونوں بھائی اس کے رونے سے اور بھی غضب ناک ہوگئے۔ چنانچہ چودھری قربان نے نتھنے پھلاتے ہوئے رستم کو آواز دی۔

رستم چراغ کے جن کی طرح فوراً حاضر ہوگیا۔ ''حکم سائیں؟''

''لے جاؤ اس حرام زادے کو اور اس کے دونوں بازو توڑ کر اسے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دو۔'' چودھری قربان نے بے رحمانہ انداز میں حکم دیا۔

''بے فکر رہیں سائیں، ایسا ہی ہوگا۔'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ارشد زمان کو پکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا۔

وہ کئی کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا وسیع و عریض فارم تھا۔ رستم اور اس کے ساتھی اسے رہائشی حصے سے قدرے فاصلے پر لے گئے اور پھر اس پر یوں جھپٹے جیسے بھوکا باز چڑیا پر جھپٹتا ہے۔ لاتیں اور گھونسے اس پر بارش کی طرح برسنے لگے۔ وہ چیختا رہا، ان سے رحم کی فریاد کرتا رہا مگر اس کی فریاد و آہ و زاری ان لوگوں کے قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔ وہ نہایت ہی بے رحمی کے ساتھ اسے مارتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کے دونوں بازو کہنیوں سے ٹوٹ کر کھال کے سہارے جھولنے لگے۔ درد کے کئی دریا عبور کرنے کے بعد آخرکار وہ بے ہوش ہوگیا۔ تب رستم اور اس کے ساتھیوں نے اسے گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالا اور فارم سے دور کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک دیا۔

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر اس نے خود کو ایک نجی اسپتال کے سفید بستر پر پایا۔ اس کے دونوں بازوؤں پر پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ بیڈ کے قریب ہی کرسی پر ایک اجنبی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اجنبی کی عمر پینتالیس اور پچاس برس کے درمیان تھی۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اجنبی کے چہرے پر اطمینان کے آثار پھیل گئے اور وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا۔ ''اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا۔''

''آپ... آپ کون ہیں؟'' اس نے نحیف لہجے میں پوچھا۔

''بیٹا! میں ہی تمہیں یہاں لایا ہوں۔ تم کوڑے کے ایک ڈھیر پر پڑے ہوئے تھے۔ تم اگر برا نہ مانو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری یہ حالت کس ظالم نے کی؟'' اجنبی نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

''انکل! آپ نے مجھے مرنے دیا ہوتا!... کیوں اٹھا کر لے آئے؟'' اس نے الٹا سوال کردیا۔

''کیسی بات کرتے ہو بیٹا؟'' اجنبی مسکرایا۔ ''میں ایک انسان کو بھلا مرنے کے لیے چھوڑ سکتا تھا۔ گوکہ میں تمہارے لیے اجنبی ہوں مگر انسانیت کا رشتہ بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے؟''

''وہ بھی تو انسان ہی تھے جنہوں نے میرا یہ حال کیا؟''

''انسان انسانیت سے بنتا ہے محض شکل و شباہت سے نہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ دو ہاتھ اور دو پاؤں رکھنے والا ہر شخص انسان ہی ہو... ان میں بہت سارے لوگ آدمی کے روپ میں بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔''

''ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں، وہ وحشی بھیڑیے ہی تھے۔''

''پھر مجھے بتاؤ کہ وہ کون تھے؟''

وہ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہوگیا۔ یوں جیسے

ٹوٹی کہانی کی کڑیاں جوڑ رہا ہو۔ اس کے بعد تمام واقعات اس نے اجنبی کے سامنے بیان کر دیے۔

اجنبی بولا۔ ''مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔ غلطی تمہاری تھی، اس لڑکی کی نہیں۔ دل کی مثال اس معصوم بچے کی سی ہوتی ہے جو چاند کو دیکھ کر اس کی طرف ہمکتا ہے لیکن چاند اس کی رسائی سے بہت دور ہوتا ہے۔ انسان کو دل کی ترغیبات پر نہیں بلکہ دماغ کی ترغیبات پر توجہ دینا چاہیے۔''

''ہاں واقعی یہ میری بھول تھی۔ مجھے صفیہ کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ ایک جاگیردار باپ کی اولاد ہے جبکہ میں ایک گمنام اور لاوارث انسان ہوں۔ ہمارا ملن کسی صورت ممکن نہیں ہے۔''

وہ تقریباً پندرہ روز تک اسپتال میں ایڈمٹ رہا۔ اس دوران میں وہ اجنبی جس کا نام جمیل احمد تھا برابر اس کا خیال رکھتا رہا۔ اسپتال کے سارے اخراجات جمیل احمد نے ادا کیے تھے۔ جس کی یہ مہربانیاں اس کی سمجھ سے باہر تھیں مگر وہ اس سے کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ بیسویں روز وہ جمیل احمد کے ساتھ کراچی پہنچ چکا تھا۔ جس کا تعلق کراچی کی ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ گھر میں کل دو ہی افراد تھے ایک جمیل احمد اور دوسری اس کی نوجوان بیٹی عائشہ جو میٹرک تک پڑھی تھی۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ٹوٹا ہوا تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ پڑھنے لکھنے میں وہ ویسے بھی بہت تیز تھا۔ چنانچہ چار سال کے بعد وہ نفسیات میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ تب جمیل احمد نے اپنے سورس استعمال کرتے ہوئے اسے اسی یونیورسٹی میں لیکچرار لگوا دیا اور یوں وہ ارشد زمان سے پروفیسر ارشد زمان بن گیا۔

سروس ملنے کے بعد اس کے حالات تیزی سے بہتر ہوتے گئے اور پھر اس کی رضامندی سے جمیل احمد نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی۔ شادی کے ساتویں سال جب عائشہ پیدا ہوئی تو اس وقت جمیل احمد انتقال کر چکا تھا۔ عائشہ کی پیدائش سے قبل بھی عائشہ بیگم نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا مگر وہ چند ماہ سے زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ پروفیسر نے سسر کی وفات کے بعد اس کا پرنٹنگ پریس اور ذاتی گھر جو وہ اپنی بیٹی کے نام کر گیا تھا، دونوں کو ایک ساتھ بیچ دیا اور شہر کے پوش علاقے میں ایک بنگلہ نما مکان خرید لیا۔ شادی کے دسویں سال پروفیسر کی بیوی عائشہ بیگم بھی ننھی عائشہ کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تب پروفیسر نے دوسری شادی کرنے کے بجائے اپنی ساری توجہ عائشہ پر مرکوز کر دی۔ اس نے عائشہ کی دیکھ بھال اور گھریلو کام کاج کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی جس کا نام فاطمہ تھا۔

☆☆☆

''پاپا! ایک سوال پوچھوں؟'' جونہی پروفیسر کی سرگزشت اختتام پذیر ہوئی عائشہ نے سوال کیا۔

''ہاں پوچھو۔'' پروفیسر نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ ''پاپا! آپ کی کہانی سن کر مجھے اس بات کی سمجھ تو آ گئی کہ آپ چودھریوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں مگر اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ آپ محبت سے کیوں نفرت کرنے لگے؟ اس میں محبت کا کیا دوش ہے؟''

''یہ بات تو میں خود بھی نہیں جانتا۔'' اس کے لبوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے پاپا؟'' وہ الجھ گئی۔

''بس جیسے بھی ممکن ہے تم اس قصے کو چھوڑو اور اپنا دھیان تعلیم پر دو۔'' اس نے بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں پاپا! ابھی میرے کچھ سوال تشنہ ہیں۔ مجھے ان کے جوابات معلوم کرنے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''میں نے سب کچھ تو بتا دیا ہے اور کیا جاننا چاہتی ہو؟''

''مثلاً اس لڑکی صفیہ کا کیا بنا جسے چھوڑ کر آپ کراچی چلے آئے تھے؟''

''میں نے اسے چھوڑا نہیں تھا۔'' پروفیسر نے احتجاج کیا۔ ''اپنی جان بچانے کے لیے کراچی آیا تھا اور اب مجھے اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ مگر میرا قیاس کہتا ہے کہ اسے اس کے بھائیوں نے مار ڈالا ہوگا۔''

''آپ کا قیاس غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ زندہ ہو؟''

''ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ ہو اور اس نے کسی چودھری سے شادی کر لی ہو۔''

عائشہ بولی۔ ''پاپا! اگر وہ زندہ ہے تو پھر مجھے یقین ہے کہ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہوگی۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' اسے غصہ آ گیا۔ ''یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو..... تمہیں کیا پتا کہ اس نے شادی کی ہے یا نہیں؟''

''پاپا! میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اس نے شادی نہیں کی ہوگی۔''

اتنا عرصہ بیت جانے کے بعد بھی پروفیسر صفیہ حیدر کو بھلا نہیں پایا تھا۔ تاہم اس کے بھائیوں کے خوف سے

اس نے کبھی صفیہ کے متعلق کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جب بھی اپنی بہنوں کی طرف دیکھتا تھا تو اس کے سامنے صفیہ کے بھائیوں کے غضب ناک چہرے آجاتے اور وہ ایک جھرجھری سی لے کر رہ جاتا تھا مگر اب جبکہ اس کی اپنی بیٹی صفیہ کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی تو وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"پاپا! ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"ہوں..... کیا کہنا چاہتی ہو؟ میں برا نہیں مانوں گا۔"

"پاپا! مجھے لگتا ہے کہ آپ اب تک اسے بھلا نہیں پائے۔ اب بھی اس کے بارے میں سوچتے ہیں اور تنہائیوں میں یاد کرتے ہیں۔"

"نہیں یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بھلا میں کیوں اس کے بارے میں سوچوں گا؟"

جواب دیتے ہوئے اس نے چہرہ دوسری جانب کر لیا تھا تاکہ عائکہ اس کی بھیگی پلکیں نہ دیکھ سکے۔ مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ عائکہ بچی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ بولی۔ "پاپا! میں جانتی ہوں کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ لیکن کاش میں ان کا مداوا کر سکتی۔"

☆☆☆

"عدنان! تم آج کل یونیورسٹی کیوں نہیں جا رہے؟"

اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی پوچھا۔

"بس ایسے ہی امی! دل نہیں چاہتا۔" اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"دل... لیکن کیوں؟" وہ مسکرائی۔ "کیا کسی کو دل دے بیٹھے ہو؟"

"نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم عائکہ کو چاہتے ہو لیکن تسلیم نہیں کرتے۔ بتاؤ بات کیا ہے۔ کیا وہ تم سے ناراض ہو گئی ہے؟"

"میں نے کہا نا امی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ تو خوامخواہ ہی میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔" وہ جھنجلا اٹھا۔

"عدنان بیٹے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے ورنہ اس سے قبل تو تم نے کبھی یونیورسٹی سے ناغہ کیا ہے اور نہ مجھ سے اس لہجے میں بات کی ہے؟"

"سوری امی۔" وہ نادم انداز میں بولا۔ "دراصل .... میں.... میں کچھ پریشان ہوں۔ بات بھی ایسی ہے کہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "پاگل .... ماں سے بھی بھلا کوئی بات چھپاتا ہے۔ بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"امی! وہ..... وہ..... عائکہ کے ابو نے اسے مجھ سے ملنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا ہے۔"

"لیکن کیوں..... کس لیے؟"

وہ بولا۔ "اس کے ابو ہماری ہی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ایک دن محبت کے موضوع پر میں نے ان سے بحث چھیڑ دی اور اس بحث میں میرا پلڑا بھاری رہا۔ بس اسی دن سے وہ میرے دشمن بن گئے۔ دراصل وہ لفظ محبت سے بہت زیادہ متنفر ہیں۔ مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ وہ محبت سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کی ساری رونقیں محبت ہی کے دم سے ہیں۔"

"اوہ... تو یہ بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ پروفیسر محبت میں ناکام ہونے کے بعد محبت سے چڑنے لگا ہو؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ پروفیسر کے ماضی کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔"

وہ بولی۔ "چلو دفع کرو پروفیسر کو، تم عائکہ سے موبائل فون کے ذریعے بات کیوں نہیں کرتے؟"

"امی! موبائل فون تو اس کے پاس بھی ہے۔ وہ کیوں نہیں کرتی مجھ سے بات؟"

"عدنان! محبت میں انا کی قربانی دینا پڑتی ہے، ورنہ انسان تہی دست رہ جاتا ہے۔ تم اگر واقعی عائکہ کو چاہتے ہو تو پھر اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ مت بناؤ ورنہ عائکہ کو کھو بیٹھو گے۔"

"نہیں امی۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں پہل نہیں کروں گا۔ اسے اگر مجھ سے پیار ہے تو وہ خود ہی بات کرے گی۔"

وہ بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم عائکہ سے محبت نہیں کرتے ورنہ ایک معمولی سی بات کو تم یوں اپنی انا کا مسئلہ نہ بناتے؟"

"انا کا مسئلہ میں نے نہیں اس نے بنا رکھا ہے۔"

"نہیں۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں یہ بات نہیں مان سکتی۔ اس لیے کہ محبت میں ہمیشہ مرد ہی دھوکا دیتے ہیں۔ عورت بے چاری تو اپنا سب کچھ اپنے محبوب پر وار دیتی ہے مگر پھر بھی تہی دست رہتی ہے۔"

"آپ میری ماں ہیں کہ عائکہ کی؟" اس نے غصے کے عالم میں سوال کیا۔

وہ بولی۔ ''دنیا کی ہر عورت پہلے عورت ہوتی ہے، بعد میں ماں۔ بے شک میں تمہاری ماں ہوں مگر ہوں تو عورت ہی نا؟ تم میں اگر عائکہ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہے تو میں خود اس سے بات کرلوں گی۔ لاؤ مجھے دو اپنا فون۔''

''میں عائکہ کو اٹھا کر لے آؤں گا۔ پھر پروفیسر کیسے گا کہ میں نے غلط قدم اٹھایا ہے؟ پروفیسر ایک خبطی انسان ہے۔ ردعمل میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''اٹھا کر نہیں بلکہ پروفیسر کو منا کر لاؤ۔ پیار میں زور زبردستی نہیں ثابت قدمی کام آتی ہے۔''

وہ بولا۔ ''پروفیسر کو منانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ وہ مر تو سکتا ہے مگر مجھے اور عائکہ کو ایک نہیں ہونے دے گا۔ وہ تو دشمن ہے محبت کا۔''

''یہ بات تمہیں پیار کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ محبت میں دکھ درد اور زمانے کی سختیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ محبت ایک راہِ خارزار ہے۔ اس پر چلتے ہوئے پاؤں کے چھالوں کا حساب نہیں رکھا جاتا۔ اسے جیتنا ہے تو پہلے پروفیسر کا دل جیتو۔''

''بہت مشکل ہے امی۔''

''مشکل ہے نا ناممکن تو نہیں ہے۔ پیار کرنے والے تو ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتے ہیں۔ تم کیسے مرد ہو کہ محبت میں مشکلات کا رونا رو رہے ہو؟''

''امی! آپ کس زمانے کی بات کرتی ہیں۔ آج کل لیلیٰ مجنوں والی محبت نہیں رہی۔ بس لڑکی کو بھگا کر لے جاؤ اور کورٹ میرج کرلو۔ اللہ اللہ خیر صلا۔''

''وہ محبت نہیں ہوس کہلاتی ہے۔ تم ایسا کوئی بھی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ اتوار کا دن تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد پروفیسر اسٹڈی روم میں مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ جبکہ فاطمہ بوا کچن میں مصروف تھی۔ عائکہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کھولے نیٹ پر ٹائم پاس کررہی تھی۔ ایسے ہی وقت اس کا سیل فون گنگنانے لگا۔ اس نے لیپ ٹاپ سے نظر ہٹاتے ہوئے سیل فون اٹھالیا۔ اسکرین پر عدنان حیدر کا نام جھلملا رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔ عدنان سے اس کا رابطہ کئی روز سے منقطع تھا اور اب وہ خود ہی پہل کررہا تھا تو اس نے کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو عائکہ! کیسی ہو؟'' اس کی سماعتوں سے عدنان کی مانوس آواز ٹکرائی۔

''میں... میں ٹھیک ہی ہوں بس۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی۔

''یہ... تمہاری آواز کو کیا ہوگیا ہے۔ کہیں فلو وغیرہ تو نہیں ہوگیا ہے؟'' عدنان نے مذاق کے انداز میں پوچھا۔

''پاپا سچ کہتے تھے کہ یہ جاگیردار لوگ کسی کے بھی نہیں ہوتے۔ یہ محض دوسروں کے دلوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''دلوں سے جاگیردار کب کھیلتے ہیں؟ وہ تو تم جیسی مغرور لڑکیاں کھیلتی ہیں۔''

''مغرور میں نہیں تم ہو۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''میں کیسے مغرور ہوگیا، میں نے تو کبھی تم سے پیار کا اظہار ہی نہیں کیا؟''

''تو اب کرلو! کسی نے روکا تو نہیں ہے؟''

''کیسے کروں تمہارے پاپا سے ڈر لگتا ہے۔ وہ تو مجھے اس جرم میں شوٹ کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ ویسے بھی وہ چودھریوں سے بے انتہا نفرت کرتے ہیں۔''

''ان کی نفرت بے جا تو نہیں ہے۔ تمہارے باپ اور چچا نے پاپا پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ مجھے پاپا نے سب کچھ بتادیا ہے۔''

وہ حیرت سے چلایا۔ ''یہ... یہ تم کیا کہہ رہی؟ میں نہیں مان سکتا۔ ایسا ناممکن ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گی؟ یہ سچ ہے تم مانو یا نہ مانو تمہاری مرضی مگر حقیقت جھٹلانے سے بدل نہیں سکتی۔''

''مجھے لگتا ہے تمہارے پاپا نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تمہیں مجھ سے دور رکھنے کے لیے یہ جھوٹ گھڑا ہے۔''

''وہ بھلا ایسا کیوں کریں گے۔ اس سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟''

''اس سوال کا جواب تو تمہارے پاپا کے پاس ہوگا۔ ویسے تمہارے پاپا نے تمہیں کہانی کیا سنائی ہے؟''

''انہوں نے مجھے کہانی نہیں اپنی آپ بیتی سنائی ہے اور یہ آپ بیتی فون پر بتانے والی نہیں ہے۔''

''چلو آپ بیتی سہی مگر تم مجھے بتاؤ گی کیسے ہمارے ملنے پر تو پابندی ہے؟''

وہ بولی۔ ''میں کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ پاپا سے بہانہ بناتی ہوں کہ مجھے کسی کیلی سے

ملنا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے اجازت دے دیں گے۔''

''لیکن کب؟ میں تمہارے پاپا کی داستان سننے کے لیے بہت بے چین ہوں۔ مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔''

''فکر مت کرو، اب بہت جلد میں تم سے ملنے آؤں گی۔ پاپا کی...''

''پاپا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر۔'' بالکل غیر متوقع طور پر کمرے میں داخل ہو کر پروفیسر نے اس کی ادھوری بات مکمل کرتے ہوئے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

''پاپا! ہم...... میں...... وہ...... دراصل...... بات۔''

''خاموش۔'' پروفیسر پوری قوت سے چلایا تو وہ سہم کر رہ گئی۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی باپ کو دھوکا دیتے ہوئے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں بالکل ہی بدھو ہوں؟ مجھے کسی بات کا علم نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ عدنان حیدر کون ہے؟ وہ چودھری فرمان کا بیٹا ہے۔ اگرچہ تم نے کبھی مجھے اس کے متعلق نہیں بتایا لیکن میں اسے آج سے نہیں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ اس دن سے جب اس نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ یونیورسٹی میں ہر اسٹوڈنٹ کے مکمل کوائف درج ہوتے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''پاپا! آپ باپ کے گناہوں کی سزا بیٹے کو کیوں دینا چاہتے ہیں...... آپ اگر پیار میں ناکام ہوئے ہیں تو اس میں عدنان کا کیا قصور ہے؟''

''بکواس مت کرو۔'' پروفیسر چلایا اور اس کے ساتھ ہی کمرا ''تڑاخ تڑاخ'' کی آواز سے گونج اٹھا۔ ''تم نے اگر دوبارہ اس کا نام لیا تو میں تمہیں کاٹ کر پھینک دوں گا۔ وہ میرے دشمن کا بیٹا ہے اور میں اسے اسی طرح تڑپاؤں گا جس طرح اس کے باپ نے مجھے تڑپایا تھا۔''

عاتکہ نے کال منقطع نہیں کی تھی۔ عدنان ان کی باتیں سن رہا تھا۔ چنانچہ وہ بلند آواز سے چلایا۔ ''عاتکہ! میں...... میں آرہا ہوں...... میں آرہا ہوں۔''

پروفیسر نے عاتکہ کے ہاتھ سے فون چھینا اور سرد انداز میں بولا۔ ''شوق سے آجاؤ، آج تمہاری لاش ہی یہاں سے جائے گی۔''

وہ بولا۔ ''میں نے پیار کیا ہے سر...... مر گیا تو شہید محبت کہلاؤں گا۔ البتہ آپ ایک قاتل کے نام سے پہچانے جائیں گے۔''

''میرا بس چلے تو ہر چودھری کا نام و نشان مٹا دوں۔''

''جیسے ایک ہاتھ کی ساری انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح سارے چودھری بھی برے نہیں ہوتے۔''

''تم بے وقوف ہو اور بے وقوف ہی رہو گے۔ اگر زندگی پیاری ہے تو میرے گھر میں قدم مت رکھنا۔'' پروفیسر نے دھمکی دی۔

وہ بولا۔ ''مجھے زندگی سے عاتکہ زیادہ پیاری ہے۔ میں آرہا ہوں اپنا موقف ثابت کرنے۔ آپ نے ایک دن مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں محبت میں جان دے سکتا ہوں؟ تو سنو پروفیسر صاحب! میں محبت میں جان دے سکتا ہوں۔ اس لیے کہ محبت جان دیتی ہے اور نفرت جان لیتی ہے۔ آج یہ سچ ثابت ہو جائے گا۔''

''محبت کی ایسی کی تیسی۔'' پروفیسر نے غصے کے عالم میں سیل فون پلٹ کر دیوار پر دے مارا جو ایک چھناکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھر گیا۔

''دیکھ لیا تم نے۔'' پروفیسر بیٹی کو غضب ناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے چلایا۔ ''اس لڑکے نے مجھے دو کوڑی کا بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں نے منع کیا تھا تمہیں کہ اس سے کوئی تعلق مت رکھنا۔ پھر تم نے کیوں کیا ایسا؟''

''پاپا! آپ مجھے گولی کیوں نہیں مار دیتے؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں رہوں گی تو آپ ہر جھنجھٹ سے آزاد ہو جائیں گے۔''

''تمہیں نہیں میں اسے گولی ماروں گا جو یہاں مرنے کے لیے آرہا ہے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا اور پھر بیٹی کو روتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ کمرے کی کھڑکی سے عدنان کو عاتکہ کے ساتھ سیل فون پر باتیں کرتے ہوئے نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ عدنان کی باتیں اسے سنائی بھی دے رہی تھیں۔ یک طرفہ گفتگو سن کر وہ پوری صورت حال تو نہ جان سکی البتہ اس پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ عدنان محبت کی خاطر اپنی جان دینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ وہ بغیر وقت ضائع کیے کمرے میں داخل ہوئی اور عدنان سے بولی۔ ''بیٹے! میں تمہاری ہمت کی داد دیتی ہوں مگر پروفیسر کے گھر تم اکیلے نہیں جاؤ گے، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''نہیں امی۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''یہ میری لڑائی ہے اور اسے میں اکیلا ہی لڑوں گا۔ آپ بس دعا کیجیے گا ان شاء اللہ مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''میں محبت کے اس دشمن کو دیکھنا چاہتی ہوں

جوانی تعلیم یافتہ ہو کر بھی سگی بیٹی کے ارمانوں کا خون کرنا چاہتا ہے۔"

"پروفیسر آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر مجھے بزدلی کا طعنہ دے گا جو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اکیلے جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

"آج آپ تو کیا مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر گیراج کی طرف بڑھ گیا۔

"رکو عدنان۔" وہ عقب سے چلائی۔ "یہ حماقت ہے۔ میں تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی؟"

عدنان نے ان سنی کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چوکیدار نے اسے دیکھتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا۔ گلی شاہراہ پر پہنچتے ہی اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اسے رہ رہ کر عائکہ کا خیال آ رہا تھا۔ تین دنوں کی جدائی نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ عائکہ کو کتنا چاہتا ہے۔ حالانکہ جدائی سے قبل اس چاہت کا اسے کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ عائکہ کے اظہار محبت کو ہنسی میں اڑا دیا کرتا تھا۔ بارہا اس نے عائکہ کا دل توڑا تھا۔ بیتے دنوں کی یادیں مناظر کا روپ دھار کر اس کے ذہن کے پردے پر کسی فلم کے مانند چلنے لگی تھیں۔ یہ یادیں خوش گوار بھی تھیں اور ناخوش گوار بھی۔ پل میں اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور دوسرے پل میں یہی مسکراہٹ کرب کا روپ دھار لیتی۔ ایسے ہی وقت اسٹیئرنگ وہیل پر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی اور گاڑی فراٹے بھرنے لگتی۔ کئی جگہ تو اس کی گاڑی ٹکرانے ٹکرانے بچی مگر خوف کا ایک ہلکا سا شائبہ بھی اس کے چہرے پر نمودار نہ ہوا۔ اس وقت اس کے ذہن پر صرف عائکہ سوار تھی۔

تقریباً نصف گھنٹے کی خطرناک ڈرائیونگ کے بعد وہ پروفیسر کے بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچ گیا۔ گیٹ پر تعینات چوکیدار نے اسے رکنے کا اشارہ کیا مگر اس پر تو گویا جنون سوار تھا۔ چوکیدار کے اشارے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے طاقت ور جیپ آگے بڑھا دی۔ چوکیدار بھاگ کر ایک طرف ہو گیا جبکہ جیپ گیٹ کو توڑتے ہوئے بنگلے کے اندر داخل ہو گئی۔ پورچ کے سامنے جیپ روک کر وہ تیزی سے نیچے اترا اور پھر چلا کر بولا۔ "کہاں ہو عائکہ! میں آ گیا ہوں۔"

عائکہ کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ تیزی سے

ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا۔ سامنے ہی صوفے پر پروفیسر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ میں ایک ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ پروفیسر کے سپاٹ چہرے پر بے رحمی کے تاثرات تھے۔

''مجھے یقین تھا کہ تم مرنے کے لیے یہاں ضرور آؤ گے۔'' پروفیسر نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے تمہاری موت کا سامان میرے ہاتھ میں موجود ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں اگر موت سے ڈرتا تو یہاں آتا ہی کیوں؟''

پروفیسر نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ تم اگر الٹے قدموں واپس لوٹ جاؤ تو تمہاری جان بچ جائے گی۔''

''میں نے آپ سے موقع کب مانگا ہے؟'' وہ ہونٹوں پر طنزیہ ہنسی سجاتے ہوئے بولا۔ ''آپ گولی چلائیں میرا سینہ حاضر ہے۔ دیکھتے ہیں آج جیت کس کا مقدر بنتی ہے۔ محبت یا پھر نفرت کا؟''

''نام مت لو محبت کا۔'' پروفیسر چلایا۔ ''اس دور کا سب سے بڑا دھوکا ہے محبت..... یہاں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا، سب اپنی اپنی خواہشات کے غلام ہیں، ڈھونگی ہیں۔ بے وقوف بناتے ہیں محبت کے نام پر ایک دوسرے کو۔''

''سر! اگر آپ کے ساتھ محبت میں دھوکا ہوا ہے تو اس میں میرا اور عائشہ کا کیا دوش ہے۔ ہم نے کیا بگاڑا ہے آپ کا؟''

''تمہارا..... تمہارا قصور یہ ہے کہ تم چودھری فرمان کے بیٹے ہو۔'' پروفیسر نے بالکل غیر متوقع طور پر یوں قہقہہ لگایا جیسے اس کا دماغ الٹ گیا ہو۔ ''اور..... اور میں چودھری فرمان کے بیٹے کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ آنکھیں بند کرلو..... میں گولی چلانے لگا ہوں۔''

''آپ گولی چلائیں سر! میں موت سے نہیں ڈرتا۔'' عدنان نے نڈر لہجے میں جواب دیا۔

''اوکے..... جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ ''میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد گولی چلا دوں گا..... ایک..... دو.....''

ایسے ہی وقت وہ آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی اور پروفیسر کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔

''ایک ماں کے ہوتے ہوئے کوئی اس کے بیٹے کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ ہمت ہے تو چلاؤ گولی۔'' اس کے لہجے سے عزم جھلک رہا تھا۔

''صف..... صف..... صفیہ..... تت..... تم۔'' پروفیسر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''یہ..... یہ..... تمہارا بیٹا ہے؟''

''ہاں یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ اسی لیے تو پشت کے بجائے سینے پر گولی کھانا چاہتا ہے۔ تمہاری طرح بزدل ہوتا تو کب کا بھاگ چکا ہوتا۔ اس نے تمہاری بیٹی سے محبت کی ہے اور محبت جان دینا سکھاتی ہے۔ پشت پھیر کر بھاگنا نہیں۔ سمجھے تم پروفیسر ارشد زمان صاحب۔'' صفیہ نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

''نہیں نہیں صفیہ! میں بزدل نہیں ہوں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چلایا۔ ''میں..... میں موت سے نہیں ڈرتا۔ خدا گواہ ہے کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ بالکل غلط سمجھ رہی ہو۔''

وہ بولی۔ ''چلاؤ مت، چلانے سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔ تم بزدل تھے، بزدل ہو اور بزدل ہی رہو گے۔ ریت کی دیواریں محبت کے بپھرے ہوئے دریاؤں کو نہیں روک سکتیں۔ کبھی نہیں روک سکتیں۔''

''اوکے تو پھر یہ دیکھو۔'' اچانک ہی پروفیسر نے ریوالور سیدھا کرلیا۔

صفیہ کا دل دہل کر رہ گیا اور قوت گویائی پل بھر کے لیے سلب ہوگئی۔ موت اس سے محض چند فٹ کی دوری پر تھی۔ اس نے شدت خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ ایسے ہی وقت پروفیسر نے ریوالور گھما کر اپنی کنپٹی پر رکھا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''صفیہ! آنکھیں کھول کر دیکھو میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بالکل نہیں ڈرتا۔ یقین نہیں آتا تو یہ دیکھو۔''

معاً ایک دھماکا ہوا اور پروفیسر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمیں بوس ہوگیا۔ اس کی کنپٹی سے بہتا ہوا سرخ لہو قالین میں جذب ہونے لگا۔ صفیہ بھاگ کر پروفیسر کے قریب پہنچی اور روتے ہوئے بولی۔ ''ارشی! یہ..... یہ..... تم نے کیا کردیا..... ارے ظالم! مجھ سے پوچھا تو ہوتا کہ تمہارے گم ہوجانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی؟ عدنان میرا نہیں بلکہ میرے بھائی فرمان کا بیٹا ہے۔ اس کی ماں اس کے بچپن میں گزر گئی تو میں نے اسے اپنا آخری سہارا سمجھتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ میں نے..... میں نے شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور آج تک اس قسم پر قائم ہوں۔''

وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی مگر پروفیسر کب کا ابدی نیند سوچکا تھا۔

صنف کرخت میں بے شمار اولیا نے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے لیکن صنف نازک میں رابعہ بصری مدظلہ نے جس طرح اس معبود برحق کی عبادت و ریاضت کا حق ادا کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اللہ کی پاک ذات پر توکل نے آپ کو جو بلند مقام عطا کیا اس کا تصور ایک عام انسان کی سوچ سے باہر ہے۔

رابعہ بصری کی کرامات و مشاہدات پر مبنی حیرت انگیز تحریر

تسلیم و رضا کا پیکر

ضیا تسنیم بلگرامی
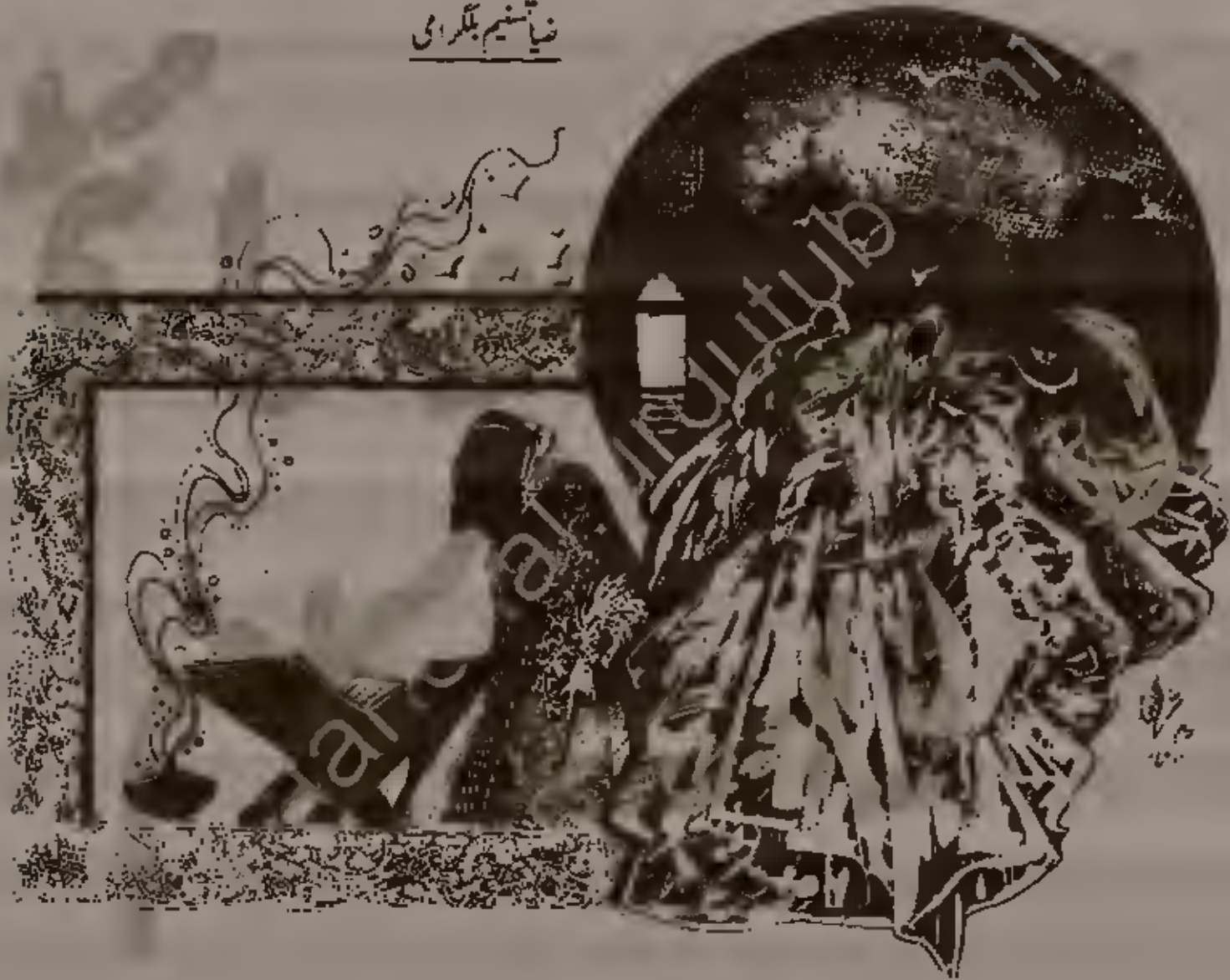
79 ہجری کی ایک تاریک رات میں بصرہ کے ایک غریب گھر میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تین بچیاں برابر برابر لیٹی ہوئی گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ ان کا باپ اسماعیل اپنی بیوی کے پاس کھڑا بڑی بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اندھیرے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے تھے۔ گھر میں نہ تو تیل تھا کہ چراغ جلایا جا سکتا اور نہ ہی کوئی اور چیز کہ تیل کی جگہ اس سے کام لے لیا جاتا۔

بیوی کا درد کے مارے برا حال تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ "اسماعیل! اگر تم دایہ کا انتظام نہیں کر سکتے تو نہ سہی لیکن کسی طرح کہیں سے کچھ تیل ہی مانگ لاؤ کہ اندھیرا تو دور ہو۔ مجھے تو اس اندھیرے میں بڑی وحشت ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں میں زندہ

بھی رہوں گی یا مر جاؤں گی۔"

شوہر نے حسرت سے کہا۔ "گھبراؤ مت، خدا بڑا مہربان اور رحم والا ہے، وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے۔"

بیوی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "کیا تم پڑوس سے تیل نہیں مانگ کر لا سکتے؟"

شوہر نے کسی قدر تحمل سے جواب دیا۔ "مانگ کر تو لا سکتا ہوں لیکن رات زیادہ ہو چکی ہے، میرا خیال ہے پڑوسی بھی سو گئے ہوں گے۔"

بیوی کا تکلیف سے برا حال تھا۔ منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اسماعیل! مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں مر جاؤں گی۔" اس کے بعد اپنی سوتی ہوئی بچیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے بعد ان کا کیا ہوگا؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "خدا بڑا کارساز ہے، یہ باتیں ہمارے سوچنے کی نہیں ہیں۔ تم مت گھبراؤ اور اپنے خدا پر یقین رکھو اور پھر ایسے معاملات پر غور کرنے سے کیا حاصل جو ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔"

بیوی نے درد و اذیت سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے، بولی۔ "لیکن سوچ پر قفل ڈال دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں یہ سب کچھ خود بخود سوچنے پر مجبور ہوں۔ میں جاندار ہوں، پتھر نہیں ہوں جو بے جان اور بے حس ہوتا ہے۔"

درد کی ایک لہر نے بیوی کو بے ہوش سا کر دیا، بڑی بے بسی سے کہا۔ "خدا کے لیے ذرا سے تیل کا انتظام کرو، میرا اس تاریکی میں دم گھٹ رہا ہے۔"

اسماعیل نے بے دلی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو میں کوشش کرتا ہوں، شاید کام بن جائے۔"

وہ درد زہ میں تڑپتی ہوئی بیوی کو چھوڑ کر باہر چلا گیا اور ایک پڑوسی کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہر طرف سکوت اور خاموشی کا عالم طاری تھا۔ اندھیرا اور خاموشی۔ اسماعیل کا دل بھر آیا۔ اس نے اپنے رب سے عرض کیا۔ "خدایا! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے آج تک کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ آج میری بیوی کا درد زہ سے بہت برا حال ہے۔ گھر میں ذرا سا تیل بھی نہیں کہ روشنی کی جا سکے۔ بیوی مصر ہے کہ میں کسی پڑوسی کے سامنے دست سوال دراز کروں لیکن تو میرے استغنا اور میری قانع اور راضی برضا طبیعت سے خوب واقف ہے۔ تو ہی بتا میں کسی سے کچھ کس طرح مانگ سکتا ہوں۔ اے اللہ! تو میری اور میری بیوی کی مشکل دست طلب دراز کرائے بغیر ہی حل کرا دے۔"

اسماعیل دروازے پر دستک دیے بغیر ہی واپس آ گیا اور بیوی سے کہا۔ "افسوس کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ دروازے پر دستک دے کر ذرا سا تیل مانگ لوں لیکن ہمت ہی نہ پڑی۔"

اب بیوی کا درد سے بہت برا حال تھا، کراہتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے۔ میں صبر و شکر سے کام لوں گی۔ واے کاش! اس بار لڑکا ہو کیونکہ تین لڑکیاں تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔"

کچھ دیر بعد کسی دایہ کے بغیر ہی ایک نیا وجود دنیا میں آ گیا۔ بچے کے رونے کی آواز نے اسماعیل کو خوشی سے دیوانہ کر دیا۔ بیوی پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وہ خدا جو مہربان اور رحیم بھی ہے، اس نے ان دونوں پر رحم کیا تھا۔ اسماعیل ذرا سا بیوی کی طرف بڑھا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ یہ نیا وجود لڑکی ہے یا لڑکا اور جب یہ معلوم ہوا کہ پیدا ہونے والی لڑکی ہے تو اسماعیل کو چکر سا آ گیا۔

بیوی نے نحیف آواز میں پوچھا۔ "کیا ہے؟ لڑکی یا لڑکا؟"

اسماعیل نے آواز میں خوشی اور طمانیت کا تاثر بھرنا چاہا اور جواب دیا۔ "لڑکی۔"

بیوی نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی، کہا۔ "میں لڑکی کو ناپسند تو نہیں کرتی۔ یہ بھی خدا کی دین ہے۔ اس نے جو کچھ دے دیا میں اس پر اس کی شکر گزار ہوں۔"

یہ لڑکی چونکہ تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اس لیے اسماعیل نے اس کا نام رابعہؒ (چوتھی) رکھ دیا۔

اسماعیل نے خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہیں اور اسماعیل سے کہہ رہے ہیں۔ "اسماعیل! مت پریشان ہو، تیری یہ بچی جس کا تو نے رابعہؒ نام رکھا ہے، بہت زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی اور اس کی شفاعت سے ایک ہزار افراد بخشے جائیں گے۔"

اسماعیل نے کہا۔ "یا رسول اللہ ﷺ! عسرت اور تنگ دستی نے مجھے بہت زیادہ پریشان کر رکھا ہے اور میں کسی کے آگے دست طلب بھی نہیں دراز کر سکتا۔"

رسول اللہ ﷺ نے جواب میں فرمایا۔ ''تو والیِ بصرہ کے پاس یہ تحریر لے کر چلا جا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے تو ہر روز مجھ پر ایک سو بار درود بھیجتا ہے اور جمعے کی شب چار سو بار۔ لیکن آج جمعے کی شب تو درود بھیجنا بھول گیا ہے۔ لہٰذا کفارے کے طور پر حاملِ ہٰذا کو چار سو دینار دے دے۔''

بیداری کے بعد اسماعیل پر رقت طاری ہوگئی اور دیر تک رونے کے بعد رسول ﷺ اللہ کی ہدایت پر انہوں نے والیِ بصرہ کے نام وہ تحریر لکھ دی اور والیِ بصرہ کے دربان کے حوالے کر دیا۔ پرچے کا اندر پہنچنا تھا کہ والیِ بصرہ کے قصر میں زلزلہ سا آ گیا۔ اس نے حکم دیا۔

''حضورِ اکرم ﷺ کی یاد آوری کے شکرانے میں دس ہزار دینار اسی وقت فقرا میں تقسیم کر دیے جائیں اور چار سو دینار اس شخص کو دے دیے جائیں جو یہ تحریر لے کر آیا ہے۔''

اس کے بعد والیِ بصرہ، اسماعیل کی خدمت میں خود بھی حاضر ہوا اور التجائی لہجے میں کہا۔ ''آپ کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے، بے تکلف مجھ سے مانگ لیا کریں۔ آپ کی ضرورت پوری ہو جایا کرے گی۔''

لیکن غیرت مند اسماعیل کے بس کی بات ہی نہ تھی کہ وہ اپنی ضروریات اور خواہشات کے لیے والیِ بصرہ کو تنگ کرتے رہتے۔

☆☆☆

رابعہؒ اپنی تینوں بہنوں کے ساتھ پرورش ہوتی رہی۔ غیرت مند باپ نہایت عسرت اور پریشانی سے ان کی پرورش کر رہا تھا لیکن ایک شام اسماعیل کو ایک چونکا دینے والے واقعے سے دوچار ہونا پڑا۔

ایک ہی دستر خوان پر پورا کنبہ بیٹھا تھا۔ ہر کوئی تیزی سے کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا لیکن رابعہ خاموش بیٹھی کھانے والوں کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔ باپ بھی محویت سے رابعہؒ اس کیفیت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ باپ کے علاوہ کسی کو بھی اس کی فکر نہ تھی کہ رابعہ کھانے میں ان کا ساتھ کیوں نہیں دے رہی ہے۔

باپ سے رہا نہ گیا نہایت شفقت سے پوچھا۔ ''رابعہ بیٹی!''

رابعہؒ نے چونک کر جواب دیا۔ ''جی بابا جان! کیا بات ہے؟''

باپ نے پوچھا۔ ''تو کھانا کیوں نہیں کھا رہی؟''

رابعہؒ نے غمزدہ آواز میں جواب دیا۔ ''بابا جان! میں سوچتی ہوں کہ خدا جانے یہ کھانا حلال ہے یا مشتبہ؟''

باپ نے بڑے دکھ سے بیٹی کی طرف دیکھا، کہا۔ ''بیٹی رابعہ! ایک بات تو خود تو نے بھی محسوس کی ہوگی کہ میں نے ہمیشہ حرام حلال کا ضرور خیال رکھا ہے۔ اگر میں کبھی حلال رزق سے محروم رہا ہوں تو میں نے حرام کھانے پر فاقے کو ترجیح دی ہے۔''

رابعہؒ نے کہا۔ ''لیکن بابا جان! میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں بھوک پر صبر کر لینا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ہمیں آخرت میں آگ پر نہ صبر کرنا پڑے۔''

پھر ایسا ہوا کہ باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا، ماں بھی چل بسی۔ اب چاروں بہنیں ایک ساتھ رہ رہی تھیں۔

ان دنوں بصرے پر قحط کا عذاب نازل ہوا۔ لوگ رزق کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔ دوستوں نے دوستوں کو پہچاننا چھوڑ دیا۔ خونی رشتے اپنا پاس و لحاظ ختم کر بیٹھے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا بازار گرم تھا۔ رابعہؒ کی تینوں بہنیں رابعہؒ کو چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں چلی گئیں۔ رابعہؒ پریشان ہو کر ادھر ادھر رہنے کا ٹھکانا تلاش کرنے لگیں۔ یہ کسی سہارے کی تلاش میں بصرے کے اس حصے کی طرف چل پڑیں جہاں متمول خاندان رہتے تھے۔ گلی کے نکڑ پر ایک شخص نے انہیں روک لیا اور پوچھا۔ ''لڑکی! تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''دونوں فوت ہو چکے۔''

اس شخص نے قہقہہ لگایا، بولا۔ ''خوب! اب تیرا سرپرست کون ہے؟''

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''اللہ... جو ہم سب کا سرپرست ہے۔''

اس شخص نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو تجھے کسی سے ڈرنا بھی نہیں چاہیے۔ آ تو میرے ساتھ چل۔''

رابعہؒ نے پوچھا۔ ''کہاں؟ تو مجھے کہاں لے جائے گا؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''لڑکی! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی بہت بھوکا ہوں۔ کئی دن سے کچھ بھی نہیں کھایا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے بھوک کے مسئلے کو کس طرح حل کروں گا لیکن ابھی ابھی جیسا کہ تو نے مجھے بتایا تھا کہ ہم سب کا سرپرست خدا ہے، میں تیری ذہانت اور حاضر جوابی کا قائل ہو گیا۔ اس نے تجھے بیچ کر میری بھوک کا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ بڑا کارساز اور مہربان ہے۔''

اس نے رابعہؒ کو پکڑ لیا اور ایک دوسرے شخص کے ہاتھ بیچ دیا۔ خریدنے والے نے چند دن رابعہؒ سے خدمت لی اور اس کے بعد

اچھی قیمت پر کسی دوسرے کے حوالے کر دیا۔ اس نئے خریدار نے رابعہؒ سے بڑی بے دردی سے کام لینا شروع کر دیا۔ بازار کے سودے کی خریداری سے لے کر گھر کے کام کاج تک، ہر کام رابعہؒ کو انجام دینا پڑتا۔

ایک دن آپ بازار سے سودا خرید کر لا رہی تھیں کہ کسی اوباش نے آپ کا پیچھا کیا۔ آپ اس سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگنے لگیں لیکن اس شاطر نے بھی آپ کا پیچھا کیا۔ آخر اس شخص نے آپ کو گھیر لیا۔ آپ نے اس کے گھیراؤ سے نکلنے کی کوشش کی تو اتنے زور سے گریں کہ ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ راہ گیروں نے آپ کی مدد کی اور انہیں گھر پہنچا دیا۔ رابعہؒ کے مالک کو کچھ علم نہ تھا کہ رابعہؒ کا ہاتھ ٹوٹ چکا ہے۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ سجدے میں گر گئیں اور خدا سے عرض کیا۔ ”اے اللہ! میں ... بے یار و مددگار تو پہلے ہی تھی، اب ایک ہاتھ بھی ٹوٹ گیا لیکن میں پھر بھی تیری رضا چاہتی ہوں۔ تو مجھے جس حال میں چاہے رکھ، میں تجھ سے گلہ نہیں کروں گی۔“

رابعہؒ نے جواب میں ایک پراسرار سی آواز سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”رابعہ! غمگین نہ ہو، کل تجھے وہ مرتبہ ملنے والا ہے کہ مقرب ملائکہ بھی تجھ پر رشک کرنے لگیں گے۔“

رابعہؒ نے سکوت اختیار کیا اور بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی گلہ و شکوہ نہ کرنے کا عہد کر لیا۔

یہ دن میں روزے رکھتیں اور رات بھر عبادت میں مشغول رہتیں۔ ان کے مالک کو رابعہؒ کے مرتبے کا ابھی تک کوئی علم نہ تھا۔ ایک رات ان کے مالک کی نصف شب کو آنکھ کھل گئی۔ رابعہؒ کے بستر پر جو نظر کی تو وہ خالی نظر آیا۔ وہ حیران ہو کر اٹھ بیٹھا اور رابعہؒ کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے آپ کو ایک کونے میں نماز پڑھتے دیکھا۔ اس وقت وہ سجدے میں پڑی تھیں اور ان کے سر پر نور کا ایک گول دائرہ ہالہ کیے ہوئے تھا۔ رابعہؒ سسک سسک کر کہہ رہی تھیں۔ ”خدایا! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں چوبیس گھنٹے تیری عبادت میں گزار دیتی لیکن تو ہی بتا میں کیا کروں۔ تو نے خود ہی تو مجھے غیر کا محکوم بنا دیا ہے۔ غیر کی اسی محکومی نے مجھے مجبور کر رکھا ہے کہ میں تیرے دربار میں دیر سے حاضری دوں۔“

رابعہؒ کا مالک حیران رہ گیا۔ اس وقت تو وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اپنے بستر پر واپس گیا لیکن اب اس کی نیند اڑ چکی تھی، وہ پوری رات جاگتا رہا۔ علی الصباح رابعہؒ کے پاس پہنچا اور ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا، ادب سے کہنے لگا۔ ”رابعہ! مجھے افسوس ہے کہ میں اب تک تیرے مرتبے سے لاعلم تھا لیکن رات میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے تو تجھ سے اپنی خدمت لینے کے بجائے تیری خدمت کرنا چاہیے تھی۔ میں کتنا نالائق اور اندھا ہوں جو تجھے پہچان نہ سکا۔ اب میں اس کا اسی طرح کفارہ ادا کر سکتا ہوں کہ یا تو آپ بدستور اسی گھر میں رہیں اور میں آپ کی خدمت کروں اور اگر کسی طرح آپ کو میری یہ بات منظور نہ ہو تو میری طرف سے آپ آزاد ہیں، جہاں چاہیں چلی جائیں۔“

رابعہؒ مدتوں پنجرے میں بند رہنے والے پرندے کی طرح جلد ہی باہر نکلیں اور ان مجلسوں کا رخ کیا جہاں اس عہد کے صوفیائے کرام وعظ و تلقین فرمایا کرتے تھے۔ انہی میں خواجہ خواجگان حسن بصریؒ بھی شامل تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی ریاضت اور زہد و تقویٰ کے چرچے ہونے لگے۔ اس عہد کے نامی گرامی صوفی بھی ان پر رشک کرنے لگے۔

رات کے سناٹے میں وہ چھت پر چڑھ جاتیں اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے کہتیں۔ ”خدایا! رات نے پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ زمانہ محو خواب ہے، امراء اور بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ حبیب اپنے حبیب سے محو راز و نیاز ہے لیکن میں رابعہ تیرے سامنے کھڑی ہوں اور تیری محبت کی آگ میں جل رہی ہوں۔“

آپ نے یہاں تک شہرت حاصل کر لی کہ بصرہ کے نامی گرامی حضرات ان سے شادی کی درخواست کرنے لگے۔ خدا نے حسن و جمال بھی ایسا دیا تھا کہ جو دیکھتا شادی کی توقعات وابستہ کر لیتا۔

ایک دن صبح ہی صبح والی بصرہ محمد بن سلیمان ہاشمی کی سواری رابعہؒ کے دروازے پر رکی۔ گلی میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ رابعہؒ کے گھر کی طرف رشک و حسد سے دیکھنے لگے۔ والی بصرہ کے غلام نے رابعہؒ کے در پر دستک دی۔ جب رابعہؒ نے دروازے کی آڑ سے پوچھ کر تو میرے پاس کس لیے آیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا۔ ”رابعہ! میں والی بصرہ محمد بن سلیمان ہاشمی ہوں۔ لوگ صبح سے شام تک میرے در پر درخواستیں پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اتفاق تو دیکھ، آج میں خود تجھ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”اے والی بصرہ! تو کتنا نادان اور احمق ہے کہ اپنی درخواست اللہ کے پاس لے جانے کے بجائے میرے پاس لے آیا۔“

والی بصرہ نے کہا۔ ”رابعہ! میری آمدنی دس ہزار درہم ماہانہ ہے، میں یہ ساری کی ساری تمہیں دے دیا کروں گا۔“

رابعہؒ نے پوچھا۔ "اور اس کے عوض تو مجھ سے کیا چاہے گا؟"

والی بصرہ نے جواب دیا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "اے بصرہ کے حاکم! جب تک تو دنیا سے رغبت رکھے گا، پریشان رہے گا۔ دور رہ کہ بے رغبتی اور زہد، دنیا میں باعث راحت ہیں، رغبت رنج و ملال پیدا کرتی ہے۔ تو اپنے لیے توشۂ آخرت تیار رکھ اور اسے آگے روانہ کر دے۔ اپنا وارث تو خود بن، دوسروں کو تو اپنا وارث ہرگز نہ بنا۔ ورنہ وہ تیرا ترکہ آپس میں تقسیم کرلیں گے۔ ہمیشہ روزے رکھا کر اور دل میں اس خیال کو مستقل کرلے کہ گویا تو ابھی پیدا ہوا ہے۔ اور رہا میرا معاملہ تو! اگر خدا مجھے تیری پیشکش سے زیادہ دے دے تب بھی میرا دل خوش نہ ہوگا کیونکہ میں اپنے اللہ سے ایک گھڑی بھی غافل رہنا نہیں چاہتی۔"

والی بصرہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

آپ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوگئیں۔ ایک گدھا آپ کے ساتھ تھا۔ جس پر آپ کا سامان لدا ہوا تھا۔ اس قافلے نے ایک جنگل میں پڑاؤ ڈالا اور آپ عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئیں۔ رابعہؒ کا گدھا بہت کمزور تھا، مر گیا، قافلے والوں کو آپ سے ہمدردی ہوئی، کہا۔ "رابعہؒ! تم فکرمند نہ ہو۔ ہم لوگ تمہارا سامان اپنے مویشیوں پر لاد لیں گے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "خوب! کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میں نے یہ سفر تمہارے سہارے کے پیش نظر کیا ہے؟ اگر تم لوگوں نے میرا ساتھ دیا بھی تو میں اسے قبول نہیں کروں گی۔ میں اسی کا سہارا قبول کروں گی جس کے علاوہ دوسرا کوئی سہارا نہیں۔"

قافلے والے تنگ آکر، انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ رابعہؒ اپنے گدھے کے پاس پہنچیں اور خدا سے کہنا شروع کیا۔ "خدایا! کسی نادار اور عاجز کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے کہ پہلے تو اسے اپنے گھر کی طرف رجوع کیا، پھر راستے ہی میں میرے گدھے کو ہلاک کر دیا اور مجھے جنگل میں تنہا چھوڑ دیا۔"

ابھی آپ کے کلمات پوری طرح ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ گدھے میں حرکت ہوئی۔ وہ ایڑیاں رگڑتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آپ نے اپنا سامان اس پر لادا اور کعبے کی طرف دیکھنے لگیں۔

جب آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئیں تو وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ ایک ویرانے میں نکل گئیں اور خدا سے کہنا شروع کیا۔ "خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ میری تخلیق خاک سے ہوئی ہے اور کعبہ بھی پتھر سے بنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں تجھ سے کسی ذریعے سے ملوں۔ تو میرے اور اپنے درمیان سے بیچ کو نکال دے۔ میں تجھ سے براہ راست ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔"

انہیں جواب ملا۔ "رابعہؒ! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جب موسیٰؑ نے دیدار کی خواہش کی تھی اور ہم نے اپنی تجلیات میں سے ایک چھوٹی سی تجلی کوہ طور پر ڈال دی تھی تو وہ اس سے جل کر خاک ہوگیا تھا۔ یہ سب جاننے کے باوجود بھی تو براہ راست ملاقات کی خواہش مند ہے؟"

اس کے ایک عرصے بعد آپ دوبارہ حج کرنے پہنچیں تو آپ نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ "دیکھا، خانہ کعبہ" ان کے استقبال کی خاطر بڑھا چلا آرہا ہے۔

آپ نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا اور کہا۔ "تو واپس جا، مجھے مکان کی نہیں مکین کی ضرورت ہے۔"

انہی دنوں کی بات ہے کہ بلخ کے مشہور حکمران، جو بعد میں صوفی ہوگئے تھے، ابراہیم ادہمؒ بھی حج کرنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ کو دیکھا تو وہ غائب دکھائی دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیر تک دیکھتے رہے لیکن انہیں وہ نظر نہ آیا۔ ابراہیم ادہمؒ کو یہ شبہ گزرا کہ ان کی بصارت زائل ہو چکی ہے۔ وہ رونے لگے لیکن اسی وقت انہیں ایک آواز نے مطلع کیا۔ "ابراہیمؒ! تیری بصارت موجود ہے۔ وہ زائل نہیں ہوئی۔ کعبہ تو رابعہؒ کے استقبال کو گیا ہوا ہے۔"

ابراہیم ادہمؒ نے حیرت سے سوال کیا۔ "خدایا! یہ کون سی برگزیدہ ہستی ہے جس کے استقبال کو کعبہ چلا گیا۔"

جواب ملا۔ "ابراہیمؒ! وہ بہت ہی قابل احترام ہستی ہے۔" پھر کچھ توقف کے بعد حکم دیا گیا۔ "ابراہیمؒ! اپنے داہنی طرف مڑ کر دیکھ، رابعہؒ آرہی ہے۔"

ابراہیمؒ نے رابعہؒ کو دیکھا تو دم بخود رہ گئے۔ ابراہیمؒ نے رابعہؒ سے کہا۔ "رابعہؒ! آخر کو تم نے نظام عالم کو درہم برہم کیوں کر رکھا ہے۔ کعبہ تمہارے استقبال کی خاطر اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "ابراہیمؒ! ہنگامہ میں نے نہیں، تم نے کھڑا کیا ہے۔ تم نے ہر گام پر دو رکعت نماز پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ تک پہنچنے میں چودہ سال ضائع کر دیے، یہ فضول سی بات ہے۔"

ابراہیمؒ نے کہا۔ "میں نے ہر قدم پر دو رکعت نفل ادا کی ہیں، اسی لیے اتنی دیر سے پہنچا ہوں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "ابراہیمؒ! ہم دونوں میں یہ فرق پڑ جاتا ہے کہ تم تو نمازیں پڑھ پڑھ کر یہاں تک پہنچے ہو اور میں نے اس فاصلے کو عجز و انکسار سے طے کیا ہے۔"

ابراہیمؒ خاموش ہو گئے۔

رابعہؒ نے حج کرنے کے بعد خدا سے کہا۔ "خدایا! تو نے حج پر بھی اجر مقرر فرمایا ہے اور مصیبت پر صبر کرنے کی تلقین کی ہے۔ بندہ میری تجھ سے یہ درخواست ہے کہ اگر تو میرا حج قبول نہیں فرماتا تو مصیبت پر صبر کرنے کا اجر ہی عطا فرما دے کیونکہ حج کی عدم قبولیت سے بڑھ کر اور کون سی مصیبت ہو سکتی ہے۔"

حج سے فراغت حاصل کر کے آپ بصرہ واپس چلی گئیں۔

☆☆☆

دو بھوکے آپس میں باتیں کرتے ہوئے رابعہؒ کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ "بھائی میں نے رابعہؒ کے زہد و عرفان کا بڑا شہرہ سنا ہے۔ آؤ آج اس کا امتحان ہی کر لیں۔"

دوسرے نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

پہلے نے کہا۔ "غالباً میری طرح تم بھی بھوک کی آگ محسوس کر رہے ہو گے؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "ہاں، بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

پہلے نے کہا۔ "ہم دونوں رابعہؒ کے پاس چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کچھ بتائے بغیر ہی ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ اس طرح ہم اس کے کشف اور علم کا امتحان بھی لے لیں گے۔"

دونوں بھوکے رابعہؒ کے در پر پہنچے اور زور زور سے دستک دینے لگے۔ رابعہؒ نے دروازے کے پاس آ کر تسلی دی اور کہا۔ "پریشان مت ہو۔ میں تم دونوں کو ابھی شکم سیر کراتی ہوں۔ افسوس کہ تم لوگ ذرا دیر میں پہنچے ہو۔"

دونوں بھوکے حیرت سے رابعہؒ کی آواز سننے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

رابعہؒ نے ان دونوں کو اپنے اندرونی کمرے میں بٹھایا اور ان کے سامنے دو روٹیاں رکھ دیں کہ ... "کھاؤ اور اپنے رب کا شکر ادا کرو۔" ابھی یہ دونوں کھانا شروع بھی نہ کر سکے تھے کہ کسی سائل نے آواز لگائی۔ "بی بی! خدا بھلا کرے اور تجھے سب سے زیادہ چاہے۔"

رابعہؒ نے دونوں بھوکوں کے سامنے سے روٹیاں اٹھا لیں اور انہیں درویش کے حوالے کر دیا۔ دونوں بھوکوں کو رابعہؒ کی یہ حرکت بری لگی۔ ابھی ان دونوں کے دلوں کا تکدر دور بھی نہ ہوا تھا کہ ایک کنیز باہر سے آئی۔ اس کے کاندھے پر روٹیوں کا خوان رکھا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی رابعہؒ سے کہا۔ "حضور! یہ روٹیاں میری مالکہ نے آپ کو بھیجی ہیں۔"

دونوں بھوکے بے صبری سے ان گرم گرم روٹیوں کو دیکھنے لگے۔

رابعہؒ نے پوچھا۔ "یہ کتنی روٹیاں ہیں۔"

کنیز نے جواب دیا۔ "اٹھارہ روٹیاں۔"

رابعہؒ نے فوراً کہا۔ "ان روٹیوں کو واپس لے جا۔ یہ کسی اور کو بھیجی گئی ہوں گی۔"

بھوکے پریشان ہو گئے۔ ایک نے دوسرے کے کان میں کہا۔ "میاں! یہ عجیب و غریب عورت ہے۔ اسے بھوک یا کھانے کی کوئی پروا ہی نہیں۔"

دوسرے نے جواب میں کہا۔ "اگر اسے کھانے کی پروا نہیں ہے تو اس کو ہماری بھوک کا تو کچھ خیال کرنا چاہیے۔"

کنیز اپنے کاندھے پر روٹیاں لیے بدستور کھڑی تھی۔ اس نے رابعہؒ سے کہا۔ "حضور! یہ روٹیاں آپ ہی کو بھیجی گئی ہیں آپ یقین تو کریں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "کنیز میرا خدا منصف ہے اور اپنے قول کا پکا اور سچا ہے۔ تو میری بات مان لے۔ یہ روٹیاں کسی اور کے لیے بھیجی گئی ہیں تو انہیں اپنی مالکہ کے پاس واپس لے جا اور میں نے جو کچھ کہا ہے ان کے گوش گزار کر دے۔"

کنیز روٹیوں سمیت واپس چلی گئی۔ اس نے رابعہؒ کی گفتگو سے اپنی مالکہ کو مطلع کیا تو اس نے ایک لمحہ بھی تامل میں ضائع نہیں کیا۔ کنیز سے کہا۔ "تو اپنی روٹیوں میں دو کا اضافہ کر کے پھر سے جا اور رابعہؒ سے کہہ دے کہ یہ روٹیاں تمہارے ہی پاس بھیجی گئی ہیں۔ انہیں قبول فرمائیں اور ہمیں شرمندہ نہ کریں۔"

کنیز روٹیوں لے کر دوبارہ پھر پہنچ گئی، رابعہؒ نے دیکھتے ہی پوچھا۔ "تو اب کیوں آئی ہے؟"

کنیز نے جواب دیا۔ ”میں نے مالکہ سے بات کی تھی، وہ کہتی تھیں کہ یہ روٹیاں آپ ہی کو بھیجی گئی تھیں۔ صرف مالکہ نے اس میں دو روٹیاں اور شامل کرا دی ہیں۔“

آپ نے برجستہ کہا۔ ”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ خدا اپنے قول کا پکا اور سچا ہے۔“

کنیز چلی گئی اور رابعہؒ نے دونوں بھوکوں سے کہا۔ ”اب تم کھا سکتے ہو۔“

دونوں کھانے پر ٹوٹ سے پڑے، خوب شکم سیر ہو کر کھایا لیکن ان کے سامنے جو واقعہ پیش آیا تھا وہ ایک معما تھا اور دونوں اس معمے کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے لیکن جب وہ عاجز آ گئے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مجبوراً رابعہؒ سے دریافت کیا۔ ”بی بی! ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھا لیا، طبیعت سیر ہو گئی لیکن یہ معاملات ابھی سمجھ میں نہیں آئے۔“

رابعہؒ نے دریافت کیا۔ ”کون سے معاملات؟“

دونوں میں سے ایک نے کہا۔ ”پہلے آپ نے ہمارے سامنے دو روٹیاں رکھی تھیں، پھر سائل کی آواز پر دونوں روٹیاں اس کے حوالے کر دیں اور جب ذرا دیر بعد ایک کنیز تھارہ روٹیاں لے کر آئی تو آپ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ روٹیاں آپ کو نہیں کسی اور کو بھیجی گئی ہیں لیکن جب ان میں دو کا اضافہ کر دیا گیا تو آپ نے انہیں قبول کر لیا۔ یہ سب کیا تھا؟ ہم اس معمے کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”جب تم دونوں میرے پاس آئے تھے تو میں نے ایک نظر میں معلوم کر لیا تھا کہ تم دونوں بہت بھوکے ہو۔ میں نے دو روٹیاں تم دونوں کے آگے رکھ دیں کیونکہ گھر میں موجود یہی دو روٹیاں تھیں لیکن اسی دوران سائل آ گیا تو میں نے وہ دونوں روٹیاں تمہارے سامنے سے اٹھا کر سائل کو دے دیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ خدا نے انسان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ ایک کی جگہ دس دے گا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے عرض کیا کہ خدایا! جب تو نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ایک کی جگہ دس دے گا تو پھر ایک کی جگہ نو کیوں، تیرا وعدہ غلط تو نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ تم دونوں نے دیکھ لیا کہ خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور دو کی جگہ بیس روٹیاں مرحمت فرما دیں۔“

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر تک آپ بے شدید ریاضت کی اور عبادت کے بعد آرام کرنے کے خواہش مند تھے۔ آپ جس جگہ مصروفِ عبادت تھیں، اس سے ذرا ہٹ کر لیٹ گئیں۔ تھکے ہوئے اعضا عالمِ خواب میں چلے گئے۔ اسی وقت ایک چور آپ کے حجرے میں داخل ہوا اور آپ کے سرہانے سے چادر اٹھا کر چلنے لگا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کی بینائی رخصت ہو چکی ہے۔ وہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ اسے باہر نکلنے کے لیے دروازہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر اسے ڈر لگا کہ کہیں رابعہؒ کی آنکھ نہ کھل جائے اور وہ پکڑا جائے۔ اس نے چادر جس جگہ سے اٹھائی تھی وہیں رکھ دی۔ چادر کے رکھتے ہی بینائی بحال ہو گئی۔ بینائی کا واپس آنا تھا کہ حرص نے پھر زور کیا۔ اس نے چادر دوبارہ اٹھائی اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ بینائی پھر جاتی رہی اور وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس نے چادر پھر رکھ دی اور چادر رکھتے ہی بینائی پھر واپس آ گئی۔ اسی حالت میں رابعہؒ کی آنکھ کھل گئی۔ حجرے میں چور کو دیکھ کر ذرا بھی پریشان نہ ہوئیں اور پوچھا۔ ”تو کون ہے اور یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

چور نے جواب دیا۔ ”بی بی! میں آپ سے کیا چھپاؤں، میں چور ہوں اور کافی دیر سے ایک نا قابلِ فہم چکر میں مبتلا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کس چکر میں؟“

چور نے پوری روداد سنا دی، آخر میں کہا۔ ”اب میں جب بھی چادر اٹھاتا ہوں اپنی بینائی کھو دیتا ہوں اور جب چادر رکھ دیتا ہوں تو میری بینائی واپس آ جاتی ہے۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“

رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”تو خود کو کسی آفت میں مبتلا کیوں کرنا چاہتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میں نے برسوں سے خود کو خدا کے حوالے کر دیا ہے، اور اب عالم یہ ہے کہ میرے پاس شیطان تک نہیں پھٹکتا، پھر تیری کیا مجال ہے کہ چوری کر سکے۔ میں اس حقیقت پر یقین رکھتی ہوں کہ اگرچہ میں سو جاتی ہوں لیکن میرا دوست میرا خدا ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔“

چور آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ چوری کی عادت چھوڑ دی اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو گیا۔

ایک دن رابعہؒ ایک پہاڑی پر تشریف لے گئیں۔ تمام صحرائی جانوروں نے آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سب آپ سے بے حد مانوس نظر آتے تھے۔ اسی دوران میں ایک دوسرے مشہور زمانہ صوفی اور رابعہؒ کے ہم وطن حسن بصریؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان کے پہنچتے ہی تمام جانور ادھر ادھر بھاگ کر روپوش ہو گئے۔ حسن بصریؒ یہ منظر دیکھتے رہے، آخر تعجب سے پوچھا۔ ”رابعہ! یہ معاملہ کیا ہے، جانور مجھے دیکھتے ہی فرار کیوں ہو گئے؟“

رابعہؒ نے پوچھا۔ ”آج آپ نے کھانے میں کیا کھایا ہے؟“

حسن بصریؒ نے جواب دیا۔ ”گوشت اور روٹی۔“
رابعہؒ نے کہا۔ ”جب آپ ان کا گوشت کھائیں گے تو یہ آپ سے کس طرح مانوس ہوں گے؟“
حسن بصریؒ حیرت زدہ سے دیکھتے رہ گئے۔
گھر میں کھانے کی چیزیں تو موجود تھیں لیکن رابعہؒ کئی دن کی بھوکی تھیں۔ گھر میں آپ کی ایک ارادت مند خادمہ کی طرح کام میں لگی رہتی تھی۔ اس نے آپ کے لیے کھانا تیار کیا، کھانا پکانے کے دوران گھر میں اسے پیاز نہیں ملی، رابعہ سے کہا۔ ”بی بی! اگر آپ اجازت دیں تو میں پڑوس سے پیاز مانگ لاؤں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بغیر پیاز ہی کے کھالوں گی۔“
ہانڈی چولہے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اس میں سے لذیذ خوشبو نکل کر ناک کی راہ سے دل اور دماغ کو بے چین کر رہی تھی۔ اسی وقت ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور کھلی ہوئی ہانڈی پر منڈلانے لگا۔ اس کی چونچ میں کوئی سفید چیز دبی ہوئی تھی۔ پھر وہ اس سفید چیز کو ہانڈی میں گرا کر چلا گیا۔ رابعہؒ نے اپنی ارادت مند سے کہا۔ ”دیکھنا تو یہ پرندہ ہانڈی میں کیا گرا گیا ہے؟“
اس نے ہانڈی سے وہ چیز نکال لی اور مارے خوشی کے پھولی نہ سمائی، بولی۔ ”بی بی! یہ پیاز ہے۔ آپ نے مانگنے سے منع کیا تھا۔ خدا نے اس پرندے کے ذریعے آپ کا بھرم رکھ لیا اور اس طرح پیاز بھیج دی۔“
آپ نے کہا۔ ”لیکن میں اس ہانڈی کا سالن چکھوں گی بھی نہیں۔ میں اسے نہیں کھا سکتی۔“
خادمہ نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟ اس ہانڈی میں کیا خرابی پیدا ہو گئی؟“
رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”پرندے کی جس حرکت کو تو اشارۂ خداوندی قرار دے رہی ہے، یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ فریب شیطانی ہو۔“
اور آپ نے اس ہانڈی کا سالن چکھا تک نہیں۔
رابعہ بصری فرات کے ساحل پر کھڑی تھیں، مصلیٰ ان کی بغل میں تھا۔ اتفاق سے حسن بصریؒ بھی وہاں پہنچ گئے۔ دونوں کا آمنا سامنا جو ہوا تو حسن بصریؒ نے کہا۔ ”آیئے، ہم دونوں نماز ادا کرلیں۔“
یہ کہہ کر حسن بصریؒ نے فرات کے پانی پر اپنا مصلیٰ بچھا دیا۔
رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”حسن! اگر تمہارا یہ عمل مخلوق کی نمائش کے لیے ہے تو بہت خوب ہے ورنہ دوسرے لوگ ایسا نہیں کرسکیں گے۔“
اس کے بعد رابعہؒ نے اپنا مصلیٰ ہوا میں بچھا دیا، بولیں۔ ”وہاں نہیں، یہاں ہوا کے دوش پر آ جاؤ، ہم دونوں ایک ساتھ نماز پڑھ لیں۔“
حسن بصریؒ نے تعجب سے کہا۔ ”یہ کیا ہے رابعہ؟“
رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”ہوا کے دوش پر نماز پڑھنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہمیں اس طرح نماز پڑھتے کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔“
حسن بصریؒ، رابعہؒ کی صورت دیکھتے رہ گئے۔
رابعہؒ نے کہا۔ ”آپ میری شکل کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے جو عمل انجام دیا تھا وہ تو پانی کی معمولی مچھلیاں بھی انجام دے سکتی ہیں اور جو میں نے کیا، اسے ایک حقیر مکھی بھی کرسکتی ہے لیکن یہ دونوں ہی فضول باتیں ہیں۔“
لوگ آپ سے طرح طرح کے سوال کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی نے پوچھا۔ ”رابعہ! تم کہاں سے آئی ہو اور کہاں جاؤ گی؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں جس جہان سے آئی ہوں، وہیں واپس چلی جاؤں گی۔“
پھر سوال کیا گیا۔ ”اس جہان میں آپ کا کیا کام ہے؟“
جواب دیا۔ ”کف افسوس ملنا۔“
سوال کیا گیا۔ ”کف افسوس ملنے کی وجہ؟“
جواب دیا۔ ”میں رزق تو اس جہان کا کھاتی ہوں لیکن کام دوسرے جہان کا کرتی ہوں۔“
سوال کرنے والے نے کہا۔ ”رابعہ! تمہاری شیریں بیانی اس قابل ہے کہ تمہیں کسی مسافر خانے کا نگران مقرر کر دیا جائے۔“
رابعہؒ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے مسافر خانے کی خود ہی نگران ہوں اور خود ہی محافظ بھی۔“
پوچھا گیا۔ ”وہ کس طرح؟“
جواب دیا۔ ”جو کچھ میرے اندر ہے باہر نکال دیتی ہوں اور جو باہر ہے اسے اندر نہیں جانے دیتی۔ اس لیے مجھے کسی کی آمد ورفت کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ میں قلب کی نگہبان ہوں، جسد خاکی کی نہیں۔“

پھر سوال ہوا۔ ”رابعہ! تم ابلیس کو دشمن تصور کرتی ہو یا نہیں؟“
جواب دیا۔ ”میں رحمٰن کی دوستی میں اتنی محو رہتی ہوں کہ ابلیس کی معاندت کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔“

☆☆☆

آپ کو کمبل کی سخت ضرورت تھی۔ اپنے کسی ارادت مند کو چار درہم دیے اور کہا۔ ”میرے لیے ایک کمبل خرید لاؤ۔“
اس شخص نے پوچھا۔ ”کمبل کس رنگ کا آئے گا، سیاہ یا سفید؟“
آپ نے کہا۔ ”میرے درہم واپس تو دینا۔“
اس شخص نے درہم واپس کر دیے۔ آپ نے چاروں درہم دریا میں پھینک دیے اور کہا۔ ”ابھی کمبل خریدا بھی نہیں اور سیاہ و سفید کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ خریداری کے بعد جانے کیا ہو؟“
خادمہ آپ کی باتیں سن رہی تھی، بہار کا موسم تھا۔ ”بی بی! آپ کنج تنہائی سے باہر نکلیں اور دیکھیں کہ فطرت کتنی رنگین ہے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”باہر نکل کر اگر کچھ دیکھ تو پس منزل کی کیا بات ہے؟ ادھر میرے پاس اور گوشہ نشین ہو کر میری طرح صانع حقیقی کا مشاہدہ کر۔ کیونکہ میں صانع کے نظارے کو صنعت کے نظارے پر ترجیح دیتی ہوں۔“
ایک دن آپ کی مجلس میں ایک دوسرے بزرگ صالح مری تشریف فرما تھے، کہنے لگے۔ ”رابعہ! اگر کسی کا دروازہ مسلسل کھٹکھٹایا جائے تو کسی نہ کسی دن کھل ہی جاتا ہے۔“
رابعہ نے حیرت سے صالح مری کی شکل دیکھی اور کہا۔ ”دروازہ کھلنے کا کیا مطلب؟ کیونکہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ بند ہی کب ہوا تھا؟“
اس جواب نے صالح مری کو چونکا دیا۔ بولے۔ ”بی بی! مجھے آپ کی دانش مندی پر مسرت اور اپنی کم عقلی پر رنج ہو رہا ہے۔“
ان سے سوال کیا گیا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ خدا بندے سے کس وقت خوش ہوتا ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اس وقت جب بندہ محنت پر اس طرح شکر گزار ہوتا ہے جیسے کوئی نعمت مل گئی ہو۔“
کسی نے پوچھا۔ ”رابعہ! خدا عاصی کی توبہ قبول کرتا ہے یا نہیں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اگر خدا توفیق نہ دے تو کیا کوئی شخص توبہ کر سکتا ہے؟“
جواب ملا۔ ”ہرگز نہیں۔“
آپ نے کہا۔ ”جب یہ طے ہے کہ توفیق ایزدی کے بغیر توبہ نہیں کی جا سکتی تو جب خدا نے توفیق دے دی تو پھر توبہ کو قبول بھی فرمائے گا۔“
آپ کا لباس بہت میلا تھا۔ ایک بزرگ نے آپ سے کہا۔ ”رابعہ! آپ کا لباس بہت میلا ہے حالانکہ اگر آپ ذرا سا اشارہ کر دیں تو بصرہ میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ کو نفیس سے نفیس ترین لباس فراہم کر سکتے ہیں۔“
آپ نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں کسی غیر سے کچھ اس لیے نہیں طلب کرتی کہ ایسے مواقع پر میں حیا کا شکار ہو جاتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں، دنیا کا مالک تو خدا ہے اور دنیا والوں کو جو کچھ بھی ملا ہے، عاریتاً مستعار ملا ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ جب مخلوق کے پاس خود ہی ہر شے عاریتاً ہو تو اس سے طلب کرنا کیا معنی؟ بلکہ ایسا کرنا شرمناک ہے۔“
آپ کے جواب نے اس بزرگ کو شرمسار کر دیا۔
آپ کے ہاں مجلس جمی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے مباحث چھڑے ہوئے تھے لیکن یہ سارے کے سارے تھے دنیا، آخرت، خدا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ایسے ہی دیگر موضوعات سے متعلق۔
آپ نے کہا۔ ”لوگو! میں تمہاری عبادت سے ذرا بھی مطمئن نہیں۔“
کسی صوفی نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“
آپ نے پوچھا۔ ”تم جو عبادت کرتے ہو اس کا تمہیں صلہ ملے گا؟ اور اگر بالفرض تم عبادت نہ کرو تو اس کی سزا کیا ملے گی؟“
صوفی نے جواب دیا۔ ”اگر ہم عبادت کریں تو اس کے عوض ہمیں جنت ملے گی اور اگر عبادت نہ کریں تو جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے جس سے سبھی واقف ہیں۔“
رابعہ نے کہا۔ ”لیکن میں کہتی ہوں کہ اللہ کی عبادت کسی لالچ سے نہیں کرنی چاہیے۔“
ایک دن آپ نے ایک ہاتھ میں آگ لی اور دوسرے میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا اور نہایت جوش و خروش سے چلی جا رہی تھیں۔

کسی نے پوچھا۔ "رابعہ! یہ کیا؟ کہاں جا رہی ہو؟"
رابعہؒ نے جواب دیا۔ "اس آگ سے میں جنت کو جلا دوں گی اور پانی سے دوزخ کو بجھا دوں گی۔"
کسی نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟ ایسا کیوں کرو گی؟"
آپ نے جواب دیا۔ "تاکہ لوگ خدا کی عبادت کسی حرص و لالچ کے بغیر کریں۔"
کسی حاسد نے کہا۔ "رابعہ! تم عورت ہو، کچھ بھی ہو تم مردوں کے مرتبے میں فضیلت اور بزرگی حاصل نہیں کرسکتیں۔"
رابعہؒ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"
حاسد نے جواب دیا۔ "اللہ نے خود مرد کو عورت سے افضل بنایا ہے اور ہمیشہ ہی مرد رسول اور نبی بنا کر بھیجا ہے اور کسی عورت کو آج تک یہ شرف حاصل نہیں ہوا ہے۔"
رابعہؒ نے کہا۔ "تو صحیح کہتا ہے لیکن یہ بھی تو دیکھ کہ آج تک کسی بھی عورت نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا جبکہ مردوں نے اکثر یہ دعویٰ کیا ہے۔"
حاسد لاجواب اور شرمندہ ہو کر چپ ہو گیا۔

☆☆☆

ایک شخص پیشانی پر پٹی باندھ کر آپ کی مجلس میں شریک ہوا۔ آپ نے قریب بلا کر پوچھا۔ "تو نے پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"
اس شخص نے پٹی کو چھوتے ہوئے کہا۔ "سر میں شدید درد ہے۔"
آپ نے پوچھا۔ "تیری کیا عمر ہوگی؟"
اس نے جواب دیا۔ "تیس سال۔"
آپ نے پوچھا۔ "اتنی مدت تم بیمار رہے یا تندرست؟"
اس نے جواب دیا۔ "عجیب اتفاق کی بات ہے کہ میں اپنے ہوش میں تو بیمار نہیں ہوا کبھی۔"
آپ نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا۔ "اتنے عرصے تک تم تندرست رہے تو تم نے ایک دن بھی شکر کی پٹی نہیں باندھی اور اب جو ایک دن ذرا سا سر میں درد ہوا تو شکایت کی پٹی فوراً باندھ لی۔"
اس شخص نے شرمندہ ہو کر سر کی پٹی فوراً کھول دی۔
ایک دن ایک شخص کو اس حال میں دیکھا کہ رو رو کر "ہائے افسوس، ہائے افسوس" کہہ رہا تھا۔ آپ نے اسے منع کیا کہا۔ "تم ایسا مت کہو۔ بلکہ یوں کہو ہائے بے حسی ہائے بے حسی۔"
اس نے پوچھا۔ "میں یہ کیوں کہوں؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ اگر تم واقعی غم زدہ ہوتے یا متاسف ہوتے تو ہائے افسوس ہائے افسوس کہنے کی تم میں نہ ہمت ہوتی نہ جرأت۔"
آپ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ صوفیائے کرام اور دوسرے زیارت مند آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ عیادت کرنے والوں میں حسن بصریؒ بھی شامل تھے۔ جس وقت حسن بصریؒ حجرے میں داخل ہونے والے تھے، انہوں نے ایک دولت مند کو حجرے کے دروازے پر اس طرح کھڑے دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں اشرفیوں کی تھیلی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
حسن بصریؒ نے پوچھا۔ "جناب! کیا ماجرا ہے؟ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"
دولت مند نے جواب دیا۔ "میں اس زمانے کی زاہدہ عورت کے لیے ایک چیز لایا ہوں۔ اگر یہ مجھ سے بات چیت کرنا پسند کریں تو میں بڑی خوشی کے ساتھ یہ اچھی سی چیز انہیں پیش کردوں۔"
حسن بصریؒ نے کہا۔ "پیش کرنے میں کیا حرج ہے؟"
دولت مند نے کہا۔ "میں اس بات سے خوفزدہ ہوں کہ وہ لینے سے کہیں انکار کردیں۔ ہاں اگر آپ میری سفارش کردیں تو وہ شاید قبول فرمالیں۔"
حسن بصریؒ اندر گئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس رئیس کی سفارش کی۔ رابعہ بصریؒ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "حسن! تم جانتے ہو کہ جو شخص اللہ کو برا کہتا ہے اللہ اس کی روزی بند نہیں کرتا اور جس کی زندگی اس کی محبت میں ختم ہوا ہے تو کیا وہ بغیر رزق ہی کے زندہ رہ سکتا ہے۔ حسن! جب سے میں نے اسے دیکھا ہے مخلوق سے منہ پھیر لیا ہے، اب تم ہی بتاؤ کہ جس شخص سے میں واقف نہیں، اس کا مال

کس طرح قبول کروں۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس شخص کا مال حرام کا ہے یا حلال کا۔ بس سے جدا ہو جائے۔"

اس موقع پر دوسرے مشہور صوفی سفیان ثوریؒ آپ کی عیادت کو پہنچے۔ وہ رابعہؒ سے اتنے مرعوب تھے کہ کوئی بات ہی نہ کہہ سکے۔

رابعہؒ نے خود ہی پوچھا۔ "فرمایئے سفیانؒ! کیسے آنا ہوا؟"

سفیان ثوریؒ نے کہا۔ "میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس تکلیف سے آپ کو نجات دے۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! کیا تمہیں اتنی سی بات بھی نہیں معلوم کہ یہ بیماری بھی اسی کے حکم سے ہے۔"

سفیانؒ نے مرعوب لہجے میں کہا۔ "آپ درست فرماتی ہیں۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "تب پھر دوست کی مرضی کے خلاف کرنے کی یہ بات کیوں کہی کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس تکلیف کو دور فرمادے۔"

سفیانؒ پریشان ہوگئے، گھبرا کر پوچھا۔ "آپ کو کسی چیز کی خواہش محسوس ہوتی ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! تم سمجھدار انسان ہو اور ایسی باتیں کرتے ہو۔ آج دو سال سے میں تازہ خرما کھانے کی خواہش رکھتی ہوں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ خرمے یہاں کتنے سستے ملتے ہیں اور کتنی بے قدری سے فروخت ہوتے ہیں لیکن میں انہیں نہیں کھا سکی۔"

سفیانؒ نے پوچھا۔ "ان کے کھانے میں کیا قباحت ہے؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "میں تو غلام ہوں اور غلام کو خواہش سے کیا سروکار؟ میں ڈرتی ہوں کہ اگر میں کسی چیز کی خواہش کروں اور میری یہ خواہش خدا کو ناپسند ہو تو میرے لیے یہ کفر ہوگا۔"

سفیانؒ نے بے بسی سے عرض کیا۔ "آئندہ میں آپ کے کاموں میں دخل نہیں دوں گا۔ آپ میرے متعلق کچھ فرمائیں۔"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "سفیانؒ! اگر تم دنیا کو دوست نہ رکھتے تو ایک مرد ہوتے۔"

سفیانؒ نے کہا۔ "میں دنیا کو کہاں دوست رکھتا ہوں؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "تم باتیں بہت زیادہ کرتے ہو اور یہ دنیا داری ہے۔"

رابعہؒ کی اس بات نے سفیانؒ کو رلا دیا۔ دعا کی۔ "خدایا! رابعہ کہتی ہیں کہ میں دنیا کو دوست رکھتا ہوں تو مجھ سے راضی ہو جا۔ میں یہی درخواست کر سکتا ہوں۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "سفیانؒ! تجھے شرم نہیں آتی۔ اللہ کی رضا تو چاہتا ہے لیکن خود اللہ سے راضی نہیں ہے۔"

مشہور زاہد صوفی مالک بن دینارؒ آپ کی ملاقات کو پہنچے تو دیکھا رابعہؒ ٹوٹے ہوئے لوٹے سے وضو کر رہی ہیں۔ سامنے ایک بوسیدہ چٹائی بچھی تھی جس پر سرہانے ایک اینٹ کا تکیہ رکھا ہے۔

مالک بن دینارؒ نے کہا۔ "رابعہؒ! میرے ارادت مندوں میں بہت سے مالدار ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے آپ کے لیے کچھ طلب کرلوں؟"

رابعہؒ نے پوچھا۔ "ابن دینارؒ! ایک بات تو بتاؤ، کیا مجھے، تمہیں اور دولت مندوں کو رزق عطا کرنے والی ایک ہی ذات نہیں ہے؟"

مالک بن دینارؒ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں؟"

رابعہؒ نے کہا۔ "تو کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اللہ نے درویشوں کو ان کی غربت کی وجہ سے فراموش کر دیا ہے اور اسے محض امراء کو رزق دینا یاد رہ گیا ہے؟"

مالک بن دینارؒ نے کہا۔ "نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "جب یہ بات نہیں ہے تو پھر وہ ذات جو ہم سب کی ضروریات سے واقف ہے، اسے یہ کہاں زیب دیتا ہے کہ اپنی احتیاج کی یاد دہانی کرائیں۔ اس شرم سے میں خاموش رہتی ہوں کہ وہ میری ضروریات سے اچھی طرح واقف ہے، پھر یاد دہانی کرانے سے کیا حاصل؟"

ایک بار لوگوں نے دیکھا آپ زار و قطار رو رہی ہیں۔ لوگوں نے پوچھا۔ "اس طرح رونے کا سبب؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "لوگو! میں ان کے فراق سے خوفزدہ ہوں، میں ڈرتی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بوقت نزع یہ صدا نہ آجائے کہ تو اس بارگاہ کا اہل نہیں ہے۔"

حسن بصریؒ رات بھر رابعہؒ کے گھر مقیم رہے اور حقیقت و معرفت پر گفتگو کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہوتے حسن بصریؒ نے محسوس کیا کہ رابعہؒ علم و معرفت کا سمندر ہیں اور خود مفلس ہیں۔

حسن بصریؒ نے دوران گفتگو دریافت کیا۔ "رابعہؒ! کیا تمہیں نکاح کی خواہش نہیں محسوس ہوئی؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "نہیں بالکل نہیں۔"

حسن بصریؒ نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "حسنؒ! نکاح کا تعلق تو جسم و وجود سے ہے اور جس کا وجود اپنے مالک میں ختم ہو گیا ہو تو اسے نکاح کی ضرورت کیونکر محسوس ہو سکتی ہے؟"

اس کے بعد ایک مرتبہ رابعہؒ نے حسن بصریؒ کے پاس موم، سوئی اور بال روانہ کیے اور لے جانے والے سے کہا۔ "تم حسنؒ سے کہہ دینا کہ موم کے مانند پگھل کر روشنی فراہم کرو، سوئی کے مانند برہنہ ہو کر مخلوق کی خدمت کرو اور جب تم ان دونوں امور کی تکمیل کر لو گے تو تم بال کے مانند ہو جاؤ گے اور کبھی بھی تمہارا کوئی عیب نہیں ہو گا۔"

بصرہ کے صوفیوں میں سے کسی ایک نے آپ کی مجلس میں دنیا کی شکایت شروع کر دی۔ رابعہؒ نے کہا۔ "حضرت! معلوم ہوتا ہے آپ کو دنیا سے بہت لگاؤ ہے؟"

ان صاحب نے کہا۔ "نہیں تو، میں تو دنیا سے نفرت کرتا ہوں۔"

رابعہؒ نے کہا۔ "جناب! یہ ایک کلیہ ہے کہ جس کا جس چیز سے لگاؤ ہوتا ہے وہ اس کا ذکر بہت زیادہ کرتا ہے۔ اگر آپ کو دنیا سے واقعی نفرت ہوتی..... تو اس کا تذکرہ زیادہ نہ کرتے۔"

ایک رات عبادت میں گزار کر صبح کے وقت سفیان ثوریؒ سے کہا۔ "سفیانؒ! مجھے عبادت گزاری کی جو توفیق عطا ہوئی ہے میں اس کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بطور شکرانہ میں اس کا روزہ رکھوں۔" اس کے بعد آپ نے خدا کی بارگاہ میں روتے ہوئے عرض کیا۔ "خدایا! اگر تو نے مجھے روزِ محشر جہنم کی آگ میں جھونکا تو میں تیرا ایک ایسا راز افشا کروں گی کہ اسے سن کر جہنم مجھ سے ایک ہزار سال کی مسافت پر بھاگ جائے گا۔ خدایا! دنیا میں میرا جو حصہ مقرر ہے وہ اپنے معاندین کو دے دے اور میرا جو حصہ عقبیٰ میں ہے، اسے اپنے دوستوں میں تقسیم فرما دے کیونکہ میں اپنے لیے تجھی کو کافی سمجھتی ہوں۔ اے اللہ! اگر میں جہنم کے ڈر سے عبادت کروں تو تجھے اختیار ہے کہ مجھے جہنم میں جھونک دے اور اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں جنت کے لالچ میں مصروف عبادت رہتی ہوں تو تو فردوس کو مجھ پر حرام کر دے اور اگر میری عبادت تیرے دیدار کی خاطر ہے تو پھر مجھے اپنے جمال عالم افروز سے مشرف فرما دے۔ اور اگر تو نے پھر بھی مجھے جہنم میں ڈال دیا تو میں یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہوں گی کہ دوستوں کے ساتھ دوستوں ہی جیسا سلوک ہونا چاہیے تھا۔" اس کے بعد آپ نے دعا مانگی۔ "خدایا! یا تو مجھے حضوری قلب عطا فرما یا پھر بے رغبتی کی عبادت ہی کو شرفِ قبولیت بخش دے۔"

185 ہجری میں آپ 88 برس کی ہو چکی تھیں آہستہ آہستہ صحت اتنی گر گئی کہ صاحب فراش ہو گئیں۔ صبح و شام عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک دن آپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے عیادت کرنے والوں سے کہا۔ "لوگو! تم سب ذرا دیر کے لیے باہر چلے جاؤ۔ فرشتے آرہے ہیں ان کے لیے جگہ چھوڑ دو۔"

عیادت گزار باہر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد اندر سے آواز آئی۔ "اے مطمئن نفس! اپنے مولیٰ کی طرف لوٹ چل۔"

اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ عیادت کرنے والے دوبارہ اندر داخل ہوئے۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان کی روح قفسِ عنصری چھوڑ چکی ہے۔

اسی رات کسی صوفی نے رابعہؒ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا۔ "رابعہؒ! منکر نکیر کے ساتھ کیسا معاملہ رہا؟"

رابعہؒ نے جواب دیا۔ "منکر نکیر نے مجھ سے پوچھا۔۔ تیرا رب کون ہے؟ میں نے جواب دیا۔ واپس جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ جب تو نے پوری مخلوق میں ایک ناچیز عورت کو فراموش نہیں کیا تو پھر رابعہؒ تجھے کس طرح بھول سکتی ہے اور جب دنیا میں تیرے سوا اس کا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں رہا تو پھر ملائکہ کے اس قسم کے سوال و جواب کا مطلب؟"

تذکرۃ الاولیاء۔ شیخ فرید الدین عطار۔ حکایات صوفیہ۔ طالب ہاشمی۔ نور احمد
رابعہ بصری۔ ود دالکابیلی۔ الطبقات الکبریٰ۔ الشعرانی۔ حکایات شیریں۔

جاں نثار

منظر امام

محبتوں میں بڑے بڑے چاہنے والوں نے نام روشن کیے ہیں، اس کا شمار بھلا کس گنتی میں ہوتا لیکن... چاہت کے اظہار کا یہ انوکھا انداز اس کا خاصہ تھا۔ اپنی ملکیت کا ایسا احساس جس میں کسی کی ذرا سی شرکت بھی اسے گوارہ نہ تھی۔

جدائی کے غم میں مبتلا ایک ناکام عاشق کا حوصلہ

دروازہ کھلا اور وہ اس آدمی کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹ گئی۔

وہ ایک عجیب سا آدمی تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ چہرے کا رنگ گہرا سیاہ، بہت دبلا پتلا، ستواں ناک اور بھنچے ہوئے ہونٹ۔

بیلا نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے بوسیدہ کوٹ سے ایک پستول نکال کر اس کا رخ بیلا کی طرف کر دیا۔

''اندر چلو۔'' اس کی آواز کسی سانپ کی پھنکار جیسی
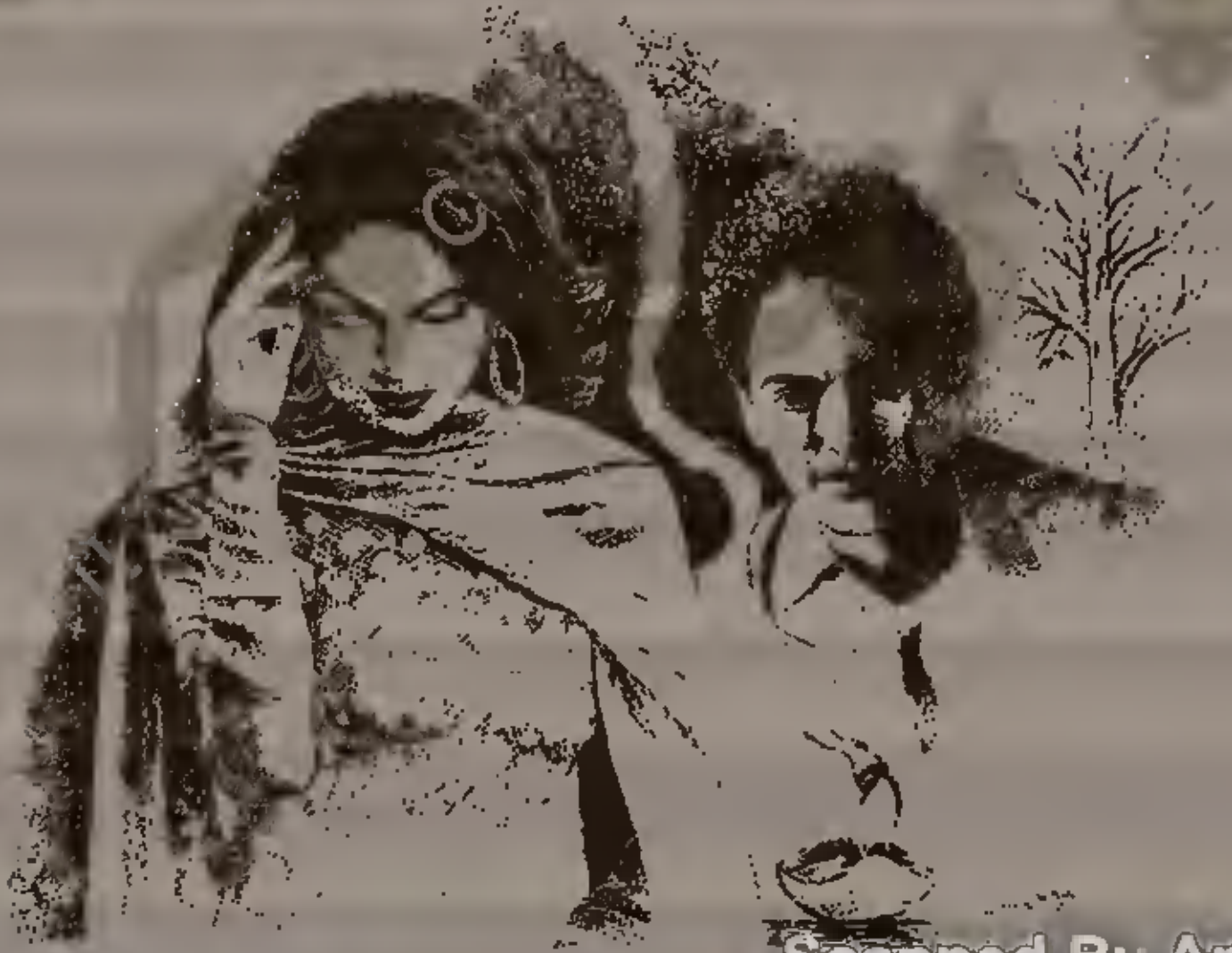
تھی۔ اس کی پوری شخصیت کے بالکل برعکس۔

بیلا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

''اندر چلو۔'' اس نے دوبارہ کہا۔ اس بار اس کی آواز بلند تھی۔

بیلا خوف سے کانپتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس آدمی کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے پستول یوں ہی نہیں دکھایا بلکہ وہ اسے استعمال کرنے کی قوت اور ارادہ بھی رکھتا ہے۔

اس آدمی نے اندر آ کر چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے باریک ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بہت اچھا سجا رکھا ہے تم نے۔ لگتا ہے بہت پیسے ہیں تمہارے پاس۔''

''دیکھو! اگر تمہیں پیسے چاہئیں تو بتا دو۔ اگر ہوئے تو میں تمہیں دے دوں گی، اس کے بعد تم چلے جانا۔''

''بے وقوف ہو تم۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں پیسوں کے لیے آیا ہوں۔''

''تو پھر؟''

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''میں جھلاتی ہوئی عورتوں کو نہیں مارتا۔ شرم آتی ہے۔ مجھے وہ عورتیں پسند ہیں جو موت کی آنکھوں میں بھی آنکھیں ڈال سکیں۔''

''دیکھو، میں ایسی نہیں ہوں، میں ایک کمزور دل کی عورت ہوں۔''

''ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''تمہارا دل کمزور ہے لیکن تمہارا حسن بہت طاقت ور ہے۔ تم نے اس طاقت ور ہتھیار سے اب تک نہ جانے کتنوں کو مار دیا ہوگا۔''

''تم۔ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔'' بیلا نے کہا۔ ''میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔''

''خاموش رہو۔ ہر لڑکی یہی دعویٰ کرتی ہے جبکہ مجھے نفرت ہے ایسی لڑکیوں سے۔ تمہیں گھروں میں رہنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا اور تم کیٹ واک کر کے اسٹیج پر اپنے جلوے دکھاتی پھرتی ہو۔''

''یہ میرا کام ہے۔'' بیلا جلدی سے بولی۔

''اور یہ میرا کام ہے جو میں کرنے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بس ایک گولی اور کام ختم۔ اف۔ تم کیا جانو اس لمحے کی لذت کو۔ وہ لذت جو کسی کا خون کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ مرنے والی کے سینے سے بہتا ہوا خون۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں۔ اس کی دم توڑتی ہوئی چیخیں۔ یہ سب اتنا مزا دیتی ہیں کہ کچھ مت پوچھو۔''

بیلا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ اس آدمی کے بارے میں اس کا اندازہ ٹھیک ٹھیک ثابت ہوتا جا رہا تھا۔ یہ آدمی نفسیاتی مریض تھا اور ایسے لوگ بہت خطرناک ہوا کرتے ہیں۔

اس نے یہ کہا تھا کہ اسے دم توڑتی ہوئی عورتوں کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ پہلے بھی کئی خون کر چکا ہوگا اور اب بیلا کے پاس آ گیا تھا۔

بیلا کو یاد آ رہا تھا کہ اس کے دوستوں نے اسے کتنا منع کیا تھا کہ اسے اکیلے نہیں رہنا چاہیے۔ حالات بہت خطرناک ہیں لیکن اس نے کسی کی بات نہیں مانی تھی۔

اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ آدمی کسی چیتے کی طرح ہوشیار ہو گیا۔ ''کون ہے یہ؟'' وہ پھنکارا۔ ''کس کو بلایا ہے تم نے؟''

''کیسی بات کر رہے ہو۔ میں تو تمہارے سامنے ہوں۔ میں بھلا کسی کو بھی کس طرح بلا سکتی ہوں؟'' بیلا نے کہا۔

''کوئی اشارہ، کوئی خفیہ بٹن تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔''

''نہیں، نہیں۔ تم یقین کرو، میں نہیں جانتی کہ کون آیا ہوگا۔''

دستک پھر ہونے لگی۔ لگتا تھا آنے والا ہر حال میں دروازہ کھلوانا چاہتا ہے۔ ''چلو دروازے پر۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''جو بھی ہو اسے باہر سے چلتا کر دینا۔ میں ایک سائڈ میں کھڑا ہو کر تمہیں کور کر رہا ہوں گا۔ اگر تم نے ذرا بھی ہوشیاری دکھائی تو۔'' اس نے پستول والے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔

''نہیں، میں کچھ نہیں کروں گی۔''

''تو پھر چلو دروازے تک۔''

دروازے تک پہنچ کر وہ آدمی ایک سائڈ میں کھڑا ہو گیا۔ بیلا نے دروازہ کھولا۔ دستک دینے والی اس کی باتونی پڑوسن جمیلہ تھی۔

''ارے بابا! کتنی دیر سے دستک دے رہی ہوں۔'' پڑوسن نے کہا۔

''میں واش روم میں تھی۔'' بیلا نے جواب دیا۔

''خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں۔ سب خیریت ہے۔ گھر میں اکیلی تھی میں نے سوچا کچھ دیر تم سے گپ شپ کروں۔''

''مجھ سے'' بیلا نے خوفزدہ ہو کر اس آدمی کی طرف

دیکھا پھر جمیلہ سے مخاطب ہوئی۔ ''نہیں جمیلہ سوری۔ اس وقت نہیں۔ کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ شوبز کے لوگ ہیں، ان کے جانے کے بعد میں خود تم کو بلالوں گی۔''

''ارے تو کیا ہوا مجھے تو ایسے لوگوں کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ تم لوگ باتیں کرتے رہنا۔ میں ایک طرف بیٹھ کر دیکھتی رہوں گی۔''

''نہیں، یہ مناسب نہیں ہوگا۔ تم اس وقت چلی جاؤ۔'' بیلا کا لہجہ سخت تھا۔

پڑوسن برا سامنہ بنا کر واپس چلی گئی۔ کاش اس نے سمجھ لیا ہوتا کہ بیلا کیسی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے لیکن وہ کیسے سمجھتی۔ بیلا تو اسے کوئی اشارہ بھی نہیں کرسکی تھی۔

''دروازہ بند کردو۔'' اجنبی نے کہا۔ ''اور اب کسی کے لیے دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

بیلا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ بند کردیا تھا۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

''چلو بیٹھ جاؤ۔'' اس آدمی نے کہا۔

بیلا اس کے اشارے پر ایک طرف بیٹھ گئی۔

''تمہاری زندگی اور موت کے درمیان بس تھوڑی سی دیر رہ گئی ہے۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''فرصت کے اس وقفے کو یادگار ہونا چاہیے، باتیں کرو مجھ سے۔''

''کیا باتیں کروں؟'' بیلا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ''خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟''

''ہاں۔ تم نے اب ایک کام کی بات پوچھی ہے کہ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب یہ سن لو کہ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ تم مجھے شروع ہی سے بہت پسند ہو۔ میں نے جب پہلی بار تمہیں ایک ٹی وی ڈرامے میں دیکھا تو اس وقت سے میں تمہارا دیوانہ ہوگیا تھا۔''

''دیکھو۔ اس میں بھی میرا تو کوئی قصور نہیں ہوا نا؟''

''بے قصور تمہارے بے پناہ حسن کا قصور ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کشش کا قصور ہے جو تمہارے اندر موجود ہے۔ تم میں دوسروں کو پاگل کردینے کی صلاحیت ہے۔''

''اس طرح تو اس ملک کے بہت سے لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔''

''ہاں، لیکن مجھ میں اور ان میں بہت فرق ہے۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''وہ صرف پسند کرتے ہوں گے لیکن میں پاگل ہوں۔ جنونی ہورہا ہوں تمہارے لیے اور تمہارے لیے سب کچھ کرسکتا ہوں جبکہ دوسرے صرف باتیں کرتے ہیں لیکن میں کچھ کر دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ اس سے اندازہ لگالو کہ دوسرے صرف آہیں بھر کر رہ جاتے ہوں گے اور میں پستول لے کر تمہارے فلیٹ میں گھس آیا ہوں۔''

''اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو تو یہ رویہ کس لیے؟'' بیلا نے پوچھا۔ ''محبت کا جذبہ رکھنے والے اپنے محبوب کو دکھ تو نہیں دیتے۔ خوفزدہ تو نہیں کرتے۔''

''میں بھی تمہیں کوئی دکھ دینے نہیں آیا۔ اپنی محبت کا اظہار کرنے آیا ہوں۔'' وہ بولتا جارہا تھا۔ ''اف میں اب تک چار عورتوں کو قتل کرچکا ہوں۔ پوچھو کہ میں نے انہیں کیوں قتل کیا؟ پوچھو۔''

''چلو تم ہی بتادو۔'' بیلا کی آواز کانپ رہی تھی۔

''تمہارے لیے۔'' اس نے بتایا۔

''میرے لیے؟'' بیلا نے حیرت سے پوچھا۔ ''میں نہیں سمجھی۔ میرے لیے کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ چاروں تم سے مشابہ تھیں۔'' اس نے بتایا۔ ''کسی کی آنکھیں تم جیسی تھیں۔ کسی کے ہونٹ تم سے ملتے تھے۔ کسی کے چلنے کا انداز تم جیسا تھا۔''

''مگر تم نے ان کا خون کیوں کیا؟ اگر وہ مجھ جیسی تھیں تو پھر تمہیں تو میرے حوالے سے ان کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ انہیں مارنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت تھی کیونکہ وہ چاروں کسی نہ کسی سے وابستہ تھیں۔ کسی کا شوہر تھا۔ کسی نے منگنی کررکھی تھی، کوئی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ تھی اور یہ سب میری برداشت سے باہر تھا۔ میں یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ تم کسی اور کی ہوجاؤ۔''

خواب

نوکر۔ ''جناب میں نے رات خواب میں دیکھا کہ آپ نے مجھے دو ماہ کی تنخواہ پیشگی دی ہے۔''

مالک۔ ''بہت خوب! اب میں تمہیں دو ماہ تک تنخواہ نہیں دوں گا۔''

مرسلہ۔ راجکماری، مرزا۔ واسنان

''لیکن وہ عورتیں تو میں نہیں تھی، وہ کوئی اور تھیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ تم جیسی تو تھیں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''ارے جب یہ پتا چلا کہ تم کسی اور سے منگنی کرنے جارہی ہو تو پھر بات میری برداشت سے باہر ہوگئی۔''

بیلا کو اپنے دوست انس کا خیال آگیا۔ بیلا سے اس کی دوستی بہت پرانی تھی لیکن منگنی کا اعلان انہوں نے حال ہی میں کیا تھا اور تقریباً تمام اخبارات نے اس خبر کو کوریج دی تھی۔ یہ آدمی بھی شاید وہی خبر پڑھ کر یہاں تک چلا آیا تھا۔

''دیکھو۔ اس میں ایسی کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔'' بیلا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''مجھے کسی نہ کسی کے ساتھ تو زندگی گزارنی ہے نا۔''

''ہاں۔ گزارنی تھی لیکن کسی اور کے ساتھ نہیں۔ صرف میرے ساتھ، کیونکہ اپنی محبت کے حوالے سے میں ہی سب سے زیادہ حق دار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن تم۔ تم تو اب میرے سامنے آئے ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس شہر میں کوئی تم جیسا بھی ہے۔''

''بے وقوف مت بناؤ مجھے۔'' وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی بھی بہت زہریلی سی تھی۔ ''تم بہت اچھی طرح جانتی ہو مجھے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمہیں بالکل بھی نہیں جانتی۔'' بیلا نے کہا۔

''جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو۔'' اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ ''یاد کرو اس شخص کو۔ جو پچھلے سال تمہاری ریکارڈنگ کے موقع پر تم سے ملا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ ایک تصویر بنوانا چاہتا تھا۔ صرف ایک تصویر تاکہ وہ جی بھر کر تمہاری تصویر کو دیکھتا رہے۔ اس سے باتیں کرتا رہے۔ بس یہی خواہش تھی اس کی لیکن تم نے اس کو اپنے سیٹ سے نکلوا دیا تھا۔ بہت بے عزتی کی تھی اس کی۔ یاد ہے تمہیں؟''

بیلا کو یاد آیا کہ ایسا ایک واقعہ ہوا تو تھا۔ اس نے ایک آدمی کو سیٹ سے نکلوا دیا تھا۔ وہ آدمی تصویر اتروانے پر ضد کر رہا تھا جبکہ ڈائریکٹر ایکشن کا اشارہ دے چکا تھا۔ اس کی شوٹنگ تیار تھی لیکن وہ آدمی اس کا وقت ضائع کیے جارہا تھا۔

ہاں یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا لیکن وہ تصویر کے لیے ضد کرنے والا آدمی تو اچھا خاصا صحت مند تھا

اور یہ تو ایک مدقوق سا کمزور انسان تھا۔ اگر اس کے ہاتھ میں پستول نہیں ہوتا تو بیلا خود اس پر قابو پاچکی ہوتی۔

''یاد آیا؟'' اس کی آواز گونجی۔

''ہاں یاد آگیا۔'' بیلا نے کہا۔ ''لیکن تم تو بہت صحت مند تھے۔''

''ہاں بہت صحت مند تھا میں لیکن تمہارے رویے نے میرا دل توڑ دیا۔ میں بیمار ہوتا چلا گیا۔''

''چلو معاف کردو۔ تم خود سوچ سکتے ہو، میں اس وقت کتنی مصروف تھی۔ تمہاری طرف دھیان نہیں دے سکتی تھی۔''

''نہیں، میں تم کو معاف نہیں کرسکتا۔'' اس نے کہا۔ ''اتنی مشکلوں سے اتنے خطرے اٹھا کر تم تک پہنچا ہوں۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں یوں ہی واپس چلا جاؤں۔''

''تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟''

''تمہاری موت۔'' اس آدمی کا لہجہ سرد اور بے رحم تھا۔

''تم کیسے محبت کرنے والے ہو۔'' بیلا نے کہا۔ ''محبت کرنے والے تو اپنے محبوب پر جان دے دیتے ہیں اور تم جان لینے چلے آئے ہو۔''

''ہاں۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''تم زندہ رہیں تو تم اپنے منگیتر کی ہوجاؤ گی اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا یا تو تم ہمیشہ کے لیے میری ہوجاؤ یا پھر کسی کی نہیں ہوسکتیں۔''

''فرض کرو۔ اگر میں اپنے منگیتر کو چھوڑ دوں تو پھر۔''

وہ ہنس پڑا۔ بہت تلخ ہنسی تھی اس کی۔ طنز کرتی ہوئی۔ بیلا اور پوری دنیا کا مذاق اڑاتی ہوئی ہنسی۔ ''واہ۔'' اس نے کہا۔ ''موت کا خوف بھی کیا ہوتا ہے، تم اس کے لیے اپنے منگیتر کو چھوڑ رہی ہو۔ جس کو دھکے دے کر نکال چکی ہو۔ واہ، واہ۔ مزہ آگیا۔''

''میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں؟'' بیلا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''یقین تو میں تمہیں دلاؤں گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اور وہ یقین تمہاری موت سے ہوگا۔ جب تم گولی کھا کر مرنے لگو گی تو پھر یقین آجائے گا کہ میں نے تم سے کتنی محبت کی تھی۔''

اس نے پستول کا رخ بیلا کی طرف کردیا اور اسی وقت دروازے پر پھر دستک ہونے لگی۔

''اب یہ کون آگیا؟'' اس نے جھلا کر پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ کون آیا ہے۔" بیلا نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"خیر جو بھی ہو۔ اب کسی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اپنا کام کرلینا چاہیے۔"

دستک اب بہت زور زور سے ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا پستول والا ہاتھ نیچے کرلیا۔ "لعنت ہو۔" اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ "جاؤ دیکھو جاکر۔ کون ہے؟ لیکن کوئی اشارہ مت کرنا۔ ایک بار پھر تمہیں بتا رہا ہوں۔" مگر بیلا نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کرلیا تھا۔

وہ چاہے کسی کو بتانے پانہ بتائے۔ یہ آدمی تو اسے مارنے ہی آیا تھا۔ بتا دینے کے بعد کم از کم اتنا تو ہوتا کہ بیلا کے بچ نکلنے کے امکان تو پیدا ہوجاتے شاید کوئی راستہ نکل آئے۔ ورنہ اسے تو اس جنونی کے ہاتھوں مرنا ہی تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس دوران اس آدمی نے اب اِدھر اُدھر ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ سامنے صوفے پر ہی بیٹھا رہا تھا۔

دروازے پر اس کی پڑوسن کھڑی تھی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ دو چاق و چوبند پولیس والے بھی تھے۔ جن کے ہاتھوں میں پستول دبے ہوئے تھے۔

دروازہ کھولتے ہی بیلا نے چیخنا شروع کردیا۔ "بچاؤ مجھے، وہ سامنے بیٹھا ہے۔ مجھے مارنے آیا ہے۔"

وہ آدمی اچھل کر ایک طرف ہونے لگا تھا کہ دونوں میں سے ایک پولیس والے نے اس پر گولی چلادی۔ وہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گیا۔

بیلا روتی ہوئی جمیلہ سے جاکر لپٹ گئی تھی۔ جو اس کے شانے کو تھپک تھپک کر اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ "بس بس۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔" جمیلہ کہہ رہی تھی۔ "وہ مرچکا ہے۔ اس کی کہانی ختم ہوچکی ہے۔"

دونوں پولیس والے اس آدمی کی لاش کے پاس جاچکے تھے۔

بیلا کی پڑوسن جمیلہ اسے یہ بتارہی تھی کہ مجھے تو اسی وقت شک ہوگیا تھا جب تم نے مجھے اندر آنے سے منع کردیا تھا، کیونکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ تم نے ہمیشہ میرے لیے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا ہے۔ میں واپس تو چلی گئی تھی لیکن میرے دل میں کھٹکا ہوتا رہا اور کچھ دیر بعد واپس آکر میں نے اپنے کان دروازے سے لگادیے۔ پھر اس آدمی کی آواز سنی۔ جو تمہیں مارنے کی بات کررہا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں خود پولیس والوں کے پاس پہنچ کر انہیں بلاکر لے آئی۔"

بیلا جیسے ایک بھیانک خواب کے عالم سے باہر نکل آئی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ جیسے فلمی سا تھا۔ اس آدمی کا آنا۔ اس کو مارنے کی دھمکیاں دینا۔ اپنے بارے میں بتانا۔ پھر پولیس کی آمد اور خود اس آدمی کی موت۔ ایسا تو صرف کہانیوں اور قصوں میں ہوتا ہوگا لیکن یہ سب کچھ ایک بے رحم سچائی کی طرح بیلا کے سامنے ہوا تھا۔

پولیس کے بہت سے لوگ آگئے تھے۔ اس آدمی کی لاش پولیس ایمبولینس کے ذریعے لے جائی گئی۔ اس کے بعد ایک اسمارٹ سے پولیس آفیسر نے اس کا بیان قلم بند کیا۔

"ہاں تو بیلا صاحبہ۔ ایک بار پھر تفصیل سے اپنی رپورٹ لکھوا دیں۔"

"دیکھو، میں سب کچھ بتا تو چکی ہوں۔ اب اور کیا رہ گیا ہے بتانے کے لیے؟" بیلا نے کہا۔

"اس نے آپ سے باتیں کیا کی تھیں؟"

"یہی کہ وہ ایک سیریل کلر ہے۔ وہ اب تک کئی عورتوں کو مار چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات؟"

"ہاں۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پاگل پن کی حد تک محبت کرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس لیے میری جان لے رہا ہے کہ میں کسی اور کی نہ ہوجاؤں۔"

"یہ اس نے غلط کہا تھا۔ وہ آپ کی جان لینے نہیں آیا تھا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"اس لیے کہ اس نے جو پستول لے رکھا تھا۔ وہ کھلونا پستول تھا۔ بچوں کے کھیلنے والا۔" آفیسر نے بتایا۔ "اس کے علاوہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ بتایا ہے کہ وہ کینسر کا مریض بھی تھا۔"

"وہ خدا! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ..."

"ہاں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مجنوں تمہارے پاس جان لینے نہیں بلکہ جان دینے آیا تھا۔" آفیسر نے کہا۔

بیلا کے پاس اب کہنے اور پوچھنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

بے پروائی اور بے وقعتی کے سبب عہد حاضر کا انسان نہ تو اپنے قول کی پاسداری کرتا ہے اور نہ ہی اپنے فعل کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی کھیل اس کی زندگی کے ساتھ بھی کھیلا جارہا تھا جس کے قول و فعل میں اگرچہ کوئی تضاد تو نہ تھا مگر اس کی زندگی ایک خاموش وعدے کے عوض گروی رکھ دی گئی تھی جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی ورنہ... بے وفائی کی صورت میں ویرانے اس کے منتظر تھے لیکن جس لمحے کا انتظار اس نے برسوں کیا... جب اس کی برسات میں بھیگنے کا وقت آیا تو تپتی دھوپ میں اس کے قدم صحرا کی جانب اٹھ گئے۔ جانے وہ اسی بھولے بسرے عہد سے منحرف ہونے کا نتیجہ تھا یا مقدر کی ستم ظریفی نہ کسی کے ہاتھوں کی مہندی اور سہرے کے پھولوں کی مہک بھی اس کے قدموں کو روک نہ سکی... اس نے منہ کیا پھیرا کہ خوابوں نے بھی آنکھوں سے رخت سفر باندھ لیا... بے سمت بھٹکتے ہوئے اس لمبی مسافت میں اب اسے اجنبی چہروں کے سوا اور کیا ملنا تھا۔ تاریک رستوں پر اس کا ہم سفر بس ایک سایہ تھا جو آسیب کی مانند اسے ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا۔ خدا جانے یہ محبتوں کی انتہا تھی یا نفرتوں کا انتقام... جو بھی تھا اسے زندگی سے دور جانا تھا، چاہے آگ کا دریا عبور کرتے ہوئے یا گرم صحرا پار کرتے ہوئے... بہر حال میں اس عہد کی پاسداری لازم تھی کہ جس کی وفاداری میں ہی اس کی بقا تھی۔

منظور نظر کی نظروں میں رہنے کے لیے ایک اندھے راستے کا

دوسرا حصہ

میں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ایک صحت مند شخص کھڑا تھا۔ اسی نے مجھے گھسیٹ کر دونوں قبروں کے درمیانی خلا میں سے نکالا تھا۔ اب وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو آپ؟" میں نے اردو میں اس سے پوچھا۔

اس نے عربی میں جواب دیا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آئے۔ تاہم اندازہ ہوا کہ وہ بے حد حیران ہے کہ میں یہاں رات کے دو بجے دو قبروں کے درمیان گھر کیے ہوئے ہوں۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔ "میں پردیسی ہوں، مزار کے خادم نے مجھے اندر نہیں گھسنے دیا تھا اس لیے قبرستان کی طرف چلا آیا۔" میرے لہجے میں لرزش تھی۔

معلوم نہیں کہ میری کوئی بات اس باریش شخص کی سمجھ میں آئی یا نہیں۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جوتے پہنے اور اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس کی عمر ساٹھ پینسٹھ کے لگ بھگ تھی۔ اس نے لمبا چغہ پہن رکھا تھا اور چہرہ پُروقار تھا۔ وہ مجھے سیدھا غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر لے گیا۔ مزار کا بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا تو وہی خادم باہر نکلا جس نے مجھے ڈانٹ پلائی تھی اور دروازہ نہیں کھولا تھا۔ میں نے چغے والے کو اشاروں کنایوں میں بتایا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے قبروں میں لیٹنے پر مجبور کیا۔

چغے والا شخص سمجھ گیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس نے خادم سے بڑے بارعب انداز میں بات کی یوں لگا کہ وہ اسے ڈانٹ رہا ہے۔ خادم سر جھکائے کھڑا تھا۔ چغے والا

بارعش شخص مجھے اندر مزار کے احاطے میں لے آیا اور پھر ہم ایک برآمدے میں سے گزر کر ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ اسی خادم خاص کا کمرا ہے جس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی بڑی سی الماری تھی جس میں کتابیں اور قرآن پاک کے نسخے رکھے تھے۔ بائیں جانب ایک پلنگ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ شیشے کی تپائی پر واٹر کولر پڑا تھا۔ دائیں طرف دیوار پر موٹے دانوں والی ایک بڑی تسبیح جھول رہی تھی۔

مجھے شدید حیرت ہوئی جب چغے والے شخص نے مجھے اپنے جوتے اتارنے اور خادم خاص کے بستر پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں پہلے تو جھجکتا رہا پھر اس ہدایت پر عمل کیا۔ خادم خاص شرمسار سا کھڑا تھا۔ مجھ پر حیرت کا دوسرا شدید حملہ اس وقت ہوا جب پینتالیس پچاس سالہ خادم خاص نے اردو میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم اردو جانتے ہو؟''

میں نے فوراً ''ہاں'' میں جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''حضرت کا حکم ہے کہ تم یہاں آرام سے لیٹو۔ تم ہمارے مہمان ہو۔'' حضرت سے اس کی مراد وہی خاکی چغے والے بزرگ تھے۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، بزرگ نے شفقت سے میرا شانہ تھپکا۔ عربی میں تسلی تشفی کے بول بولے اور چل دیے لیکن باہر نکلنے کے فوراً بعد ہی دوبارہ اندر آگئے۔ انہوں نے خادم خاص سے کچھ کہا۔ خادم خاص نے ترجمان کے فرائض انجام دیتے ہوئے اردو میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم نے کھانا وغیرہ کھایا ہے؟''

میں نے سچ بولتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

چغے والے بزرگ فوراً باہر چلے گئے۔ دس پندرہ منٹ بعد لوٹے تو ان کے ہاتھوں میں ایک گول ٹرے تھی اور اس میں میرے لیے کھانا تھا۔ چار مٹن تکے کی بوٹیاں، ایک خمیری روٹی اور کوئی پاؤ بھر کھجوریں۔ انہوں نے بڑی شفقت سے مجھے کھانا کھلایا۔ اسی دوران میں ایک خادم بغدادی قہوہ لے آیا۔ مجھے کھلا پلا کر وہ بزرگ رخصت ہوگئے۔ میں حیران پریشان بستر پر بیٹھا رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ کہاں یہ کہ مجھے گیٹ سے اندر گھسنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی اور کہاں یہ کہ میں خادم خاص کے کمرے میں اسی کے بستر پر براجمان تھا۔

میں نے خادم خاص سے پوچھا۔ ''آپ اردو کس طرح جانتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''یہاں اکثر انڈیا اور پاکستان وغیرہ سے زائرین آتے ہیں۔ ان سے رابطے کے لیے ضروری تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کو اردو کی سمجھ بوجھ ہو۔ میں نے ڈھائی تین سال میں کافی محنت سے تھوڑی بہت سیکھی ہے۔'' اس کے لہجے میں عربی کی جھلک تھی اور اکثر الفاظ کی ادائیگی بھی درست نہیں تھی۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''چلو اب تم سو جاؤ۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں، مجھے یہ مناسب نہیں لگ رہا۔ آپ میرے لیے نیچے کوئی کپڑا بچھا دیں۔ میں وہاں لیٹ جاؤں گا۔'' میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خادم خاص نے مجھے زبردستی روکا اور مجبور کر دیا کہ میں بستر پر ہی لیٹوں.... میرے بہت منع کرنے کے باوجود اس نے خود قالین پر ایک گدا بچھا لیا۔

میں اس کایا کلپ پر ششدر تھا۔ رات کے دو بجے اس نامعلوم شخص نے مجھے کھینچ کر دونوں قبروں کے درمیان میں سے نکالا تھا اور پھر کھلا پلا کر اس شاندار بستر پر سلا دیا تھا۔ کون تھا وہ؟ اور کیسے مجھ تک پہنچا تھا؟ شاید یہ اس خاموش گریہ وزاری کا نتیجہ تھا جو میں نے ایک قبر کے کنارے بیٹھ کر مزار کی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کی تھی۔

میں نے خادم خاص سے پوچھا۔ ''یہ بزرگ کون تھے؟''

وہ جواب دینے سے مسکرایا اور بولا۔ ''صبح سب کچھ بتاؤں گا۔ اب سو جاؤ۔'' میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ عجیب حالات کے باوجود جلد ہی سو گیا۔

میں اذانِ فجر کی دلکش آواز سے جاگا تھا۔ یہ اذان مزار سے ملحقہ مسجد سے بلند ہو رہی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بے حرکت لیٹے لیٹے غور کیا اور اندازہ ہوا کہ وہی خادم خاص جائے نماز پر بیٹھا رو رہا ہے۔ میں نے اس کے خشوع وخضوع میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھا اور لیٹا رہا۔

کچھ دیر بعد ہم نے مزار کی وسیع وعریض مسجد میں نماز ادا کی اور دوبارہ کمرے میں آگئے۔ یہ کمرا ایک طرح سے اس خادم خاص کا حجرہ تھا۔ خادم خاص کا نام مجھے ابوسیاف معلوم ہوا۔ وہ عرصہ بیس سال سے خادم خاص کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کا تعلق بصرہ سے تھا۔ نماز کے بعد ابوسیاف نے باقاعدہ مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ اسے

اپنے رات والے سلوک پر افسوس ہے۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں ایک ناچیز بندہ ہوں۔ آپ کو اللہ نے اتنا معتبر منصب دے رکھا ہے۔ آپ ایسی بات نہ کریں۔''

ابوسیاف نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ ''دکھوں کے مارے معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے بہت مصیبتیں اٹھا کر یہاں تک پہنچے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا لیکن آپ بھی مجھے بتایئے کہ رات والے بزرگ کون تھے؟ وہ مجھے نماز میں تو نظر نہیں آئے۔''

ابوسیاف نے کہا۔ ''وہ کبھی کبھار ہی یہاں آتے ہیں۔ یہاں کے سب سے بڑے تین چار بزرگان میں سے ایک ہیں۔ انہیں حضرت عالی مقام کہا جاتا ہے۔''

اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو کچھ مزید آگے بڑھتی، طالب علموں کا ایک گروہ ملاقات کے لیے اندر آ گیا اور خادم خاص ابوسیاف ان سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

میں نے وہ سارا دن مزار اور ملحقہ مسجد میں گھومتے پھرتے گزارا۔ ایک عجیب سا سکون اور روحانیت کا احساس تھا جو میرے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ یہاں میں نے دیکھا کہ پردے اور ستر پوشی کا تصور کچھ اور طرح کا تھا۔ دن دس بجے کے قریب بہت سی عراقی خواتین مزار کے احاطے میں دکھائی دیں۔ اس وسیع احاطے میں اینٹوں کا فرش تھا۔ میں نے دوپہر کا کھانا خادم خاص ابوسیاف کے ساتھ ہی کھایا۔ بہرحال میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ آج میں اس کے بستر پر نہیں سوؤں گا۔ اگر مجھے زیادہ مجبور کیا گیا تو یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے یہ کسی طور گوارا نہیں تھا کہ مجھ سے بڑی عمر کا ایک شخص میرے قریب زمین پر سوئے اور میں اس کے بستر پر قبضہ جما کر لیٹوں۔ میں نے گرمی ہونے کا بہانہ بھی کیا اور عشا کے بعد مزار کے اینٹوں والے احاطے میں ایک دری بچھائی اور تکیہ رکھ لیا۔ کئی اور افراد بھی وہاں شب بسری کے لیے موجود تھے۔

تاروں بھرے آسمان کے نیچے وہ رات سکون سے تو گزری لیکن یادیں بھی مسلسل حملہ آور ہوتی رہیں۔ ستاروں کو دیکھ کر میں نے سوچا یہی ستارے میرے گھر کے آسمان پر بھی چمک رہے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ آج مجھے گھر سے نکلے کم و بیش پندرہ روز

باتوں سے خوشبو آئے

☆ زیادہ مت ہنسو کیونکہ جس دل کا رشتہ اور تعلق اللہ سے بندھ جاتا ہے وہ ہمیشہ پُرسکون اور باوقار رہتا ہے۔

☆ سننے والے کی ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں گفتگو مت کرو کیونکہ یہ رعونت کا اظہار ہے۔

☆ دوست کا امتحان مصیبت میں، بیوی کا غربت میں اور مومن کا امتحان غصے میں ہوتا ہے۔

☆ آنکھ کا امتحان بازار میں، زبان کا محفل میں اور دل کا امتحان عشق میں ہوتا ہے۔

☆ ہاتھ کا امتحان کمانا کھانے میں اور انسان کا امتحان قبر میں ہوتا ہے۔

مرسلہ۔ عرفان جی سیال اینڈ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

ہو چکے تھے لیکن لگتا تھا کہ یہ پندرہ سال کا وقت ہے۔ ان پندرہ دنوں یا پندرہ سالوں میں کون کون سے لوگ مجھ سے ملے اور بچھڑے تھے... ان میں مہرو بھی تھی۔ وہ بھی اسی شہر بغداد میں کہیں رہنے کے لیے آئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ صحیح سلامت اپنے وارثوں کے پاس پہنچ گئی تھی۔

اگلے روز میں مزار اور مسجد کے گرد و نواح میں گھومتا رہا اور لوگوں کے رہن سہن کو دیکھتا رہا۔ میں نماز بڑی باقاعدگی سے ادا کر رہا تھا اور اس میں مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔ میں نے ابوسیاف کو اپنے حالات سے تھوڑا بہت آگاہ تو کیا تھا لیکن تفصیل نہیں بتائی تھی۔

رات کو میں جب پھر دری اور چادر وغیرہ لے کر احاطے کی طرف جانے لگا تو ابوسیاف نے مجھے روکا اور کہا کہ آج بادل ہیں۔ رات کو بارش کا امکان ہے، میں کمرے میں ہی سو جاؤں لیکن مجھے باہر سونا ہی مناسب اور اچھا لگا۔ بہرحال رات کو وہی کچھ ہوا جس کا خطرہ ابوسیاف نے ظاہر کیا تھا۔ گیارہ بارہ بجے کا وقت ہوگا جب یکایک تیز بارش

ہونے لگی۔ صحن میں سونے والے ہم سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور برآمدوں کی طرف بھاگے۔ برآمدے تک پہنچتے پہنچتے میں بری طرح بھیگ گیا اور بستر بھی گیلا ہو گیا۔ وہیں برآمدے کے ایک کونے میں اپنا گیلا بستر بچھایا اور گیلے کپڑوں کے ساتھ لیٹ گیا۔ اپنی حالت زار پر خود ہی ترس آیا اور ساتھ ہی ان لمحوں میں اپنی ماں بھی بے طرح یاد آئی۔ انہوں نے کبھی، چند منٹ بھی ہمیں گیلے کپڑوں کے ساتھ رہنے نہیں دیا تھا۔ دل بوجھل ہو گیا۔ یہ غریب الوطنی تھی اور اس غریب الوطنی نے ابھی پتا نہیں کیا کچھ دکھانا تھا۔

ہوا تیز تھی۔ بارش کی کوئی کوئی بوچھاڑ برآمدوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں ٹھٹھرتا رہا اور اونگھتا رہا۔ اچانک کسی نے میرا کندھا ہلایا اور اٹھنے کو کہا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہی پہلے روز والے بزرگ میرے قریب بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری کمر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور مجھے اٹھا کر خادم خاص کے حجرے میں لے آئے۔

خادم خاص ابوسیف ایک بار پھر شرمندہ شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔ بہر حال میں نے اسی کے ذریعے حضرت عالی مقام تک یہ بات پہنچائی کہ ابوسیف نے بہت اصرار کیا تھا لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور اپنی مرضی سے صحن میں سو گیا۔

وہ بڑی طوفانی شب تھی۔ حجرے سے باہر مزار کا صحن بھی نظر آتا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ موسلا دھار بارش جاری تھی۔ ابوسیاف نے مجھے اپنے کپڑے پہنا دیے تھے اور میں نے اپنے کپڑے حجرے میں ہی ایک طرف پھیلا دیے تھے۔ دو بارش کی اس شب میں حجرے کی تنہائی میں میرے اور حضرت عالی مقام کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس میں ابوسیاف نے ترجمان کے فرائض انجام دیے۔

یہ گفتگو کچھ اس طرح تھی۔ جناب عالی مقام نے مجھ سے سوال کیا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور اس در بدری کی حالت میں کیوں پھر رہا ہوں؟

ان کے شفقت بھرے لہجے نے میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ میں نے کہا۔ "یا حضرت! آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھو بیٹا۔" انہوں نے میری کمر پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے کہا۔ "یا حضرت! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ بندہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھے اور جاگتی آنکھوں کا وہ خواب اتنا واضح ہو کر حقیقت اور تصور میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے؟"

انہوں نے گہری سانس لی۔ "ایسا ناممکن نہیں ہے۔ انسان کا ذہن قدرت کے عظیم معجزوں میں سے ہے۔ ذہن کا پیدا کیا ہوا تخیل کبھی کبھی ٹھوس حقیقتوں سے بھی بڑھ کر حقیقی ہو جاتا ہے۔ یہ تخیل ماضی، حال یا مستقبل میں بہت دور تک سفر کر جاتا ہے لیکن تم مجھے بتاؤ گے تو پھر بات کھلے گی۔"

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بجلی کی چمک میں بارش کی موسلا دھار بوچھاڑیں ایک سیکنڈ کو جھلک دکھا کر پھر تاریکی میں اوجھل ہو جاتی تھیں اور بغداد کے آسمان پر بادل دہاڑنے لگتے تھے۔

میں نے کہا۔ "یا حضرت ... میری شادی ہو رہی تھی۔ وہ میری مہندی کی رات تھی۔ میں گھر سے آیا تھا..... اچانک میں نے شامیانے کے پیچھے کسی کو دیکھا..... جی حضرت! میں نے اسے جاگتی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ بالکل سفید کپڑوں میں مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے لگا کہ میں اٹھ کر ہاتھ بڑھاؤں تو اسے چھو سکتا ہوں۔ لیکن پھر یوں لگا حضرت کہ میں غنودگی کی حالت میں ضرور تھا لیکن جاگ رہا تھا۔ وہ بولا تو اس کے الفاظ ایسے ہی میری سماعت سے ٹکرائے جس طرح میرے الفاظ اب آپ کی سماعت مبارک سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس نے میرا نام لیا اور کہا۔ "کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلانا تھا اور ایسا نہیں ہوا۔ اب اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی....." یہ کہہ کر وہ چلا گیا لیکن اس کے یہ الفاظ جیسے میرے سینے میں پیوست ہو کر رہ گئے یا حضرت۔ میرے دل کے اندر جیسے کھلبلی سی مچ گئی اور مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے، کچھ بہت برا، اور پھر میری شادی کی رات یہ "بہت برا" میرے سامنے آ گیا یا حضرت!"

میری آواز بھرا گئی اور میں چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔

حضرت عالی مقام نے پھر میری پشت پر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ پھیرا اور مجھے بات جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ میں نے آبدیدہ لہجے میں انہیں شادی کی رات کا وہ واقعہ بتایا جب میں نے شامیانے کے پاس سے گزرتے ہوئے محلے کی دو عورتوں کو اپنے بارے میں باتیں کرتے سنا اور پتا نہیں کیوں میرے اندر کی ساری روشنیاں ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بدل گئی تھیں۔ میں بے حد کوشش کے باوجود اپنے لیے یا اپنی دلہن کے لیے اس اندھیرے میں سے روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ڈھونڈ سکا تھا اور سب

کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے جگمگاتے گھر میں سے نکل آیا تھا۔

میری پوری روداد سننے کے بعد حضرت عالی مقام خاموش ہو گئے۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور لمبی داڑھی سینے کو چھو رہی تھی..... کافی دیر چپ رہنے کے بعد انہوں نے ابوسیاف کی وساطت سے مجھ سے کہا۔ ''بیٹا... مجھے یہ صدقہ، خیرات اور خدا ترسی میں کمی کا کوئی معاملہ لگتا ہے۔ کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہے... ہاں.... کہیں ہوئی ہے... جس کی وجہ سے تم پر یہ مشکل آئی ہے۔''

وہ چند سیکنڈ خاموش رہے، پھر دوبارہ عربی میں بولے جس کا ترجمہ کرتے ہوئے ابوسیاف نے مجھ سے کہا۔ ''حضرت کہتے ہیں کہ کیا وہاں پاکستان میں تمہاری مالی حالت اچھی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جی ہاں..... اللہ کا شکر ہے، آسانی سے گزر بسر ہوتی ہے۔''

حضرت عالی مقام نے کہا۔ ''کہیں تم صدقہ خیرات وغیرہ کی طرف سے غافل تو نہیں ہو؟''

میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں حضرت! ہمارا گھرانا الحمدللہ مذہبی ہے۔ ہم اپنی استطاعت کے مطابق ہمیشہ کچھ نہ کچھ خیر خیرات نکالتے ہیں۔ میرے پڑدادا تو اس سلسلے میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ ہمارے پڑدادا کے گھر میں ہمیشہ لنگر کا اہتمام ہوتا تھا۔ مستحق افراد اس لنگر سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ میرے دادا کا بھی ایسا ہی وتیرہ تھا۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور ایک دوسرے علاقے میں رہتے تھے، دادا جی اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے، جب تک قریبی مسجد کے نابینا حافظ جی کو کھانا نہیں بھیج دیتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔ پھر حافظ جی وفات پا گئے تو دادا جی نے ایک قریبی مدرسے میں کھانا بھجوانا شروع کر دیا۔ وہ تینوں وقت باقاعدگی سے وہاں کھانا بھیجتے تھے۔ دادا جی کے انتقال کے بعد والد صاحب نے یہ نیک سلسلہ جاری رکھا۔ ہر روز صبح دوپہر اور شام مدرسے میں کھانا بھجوایا جاتا تھا۔ بعد میں جب ہم نے رہائش تبدیل کر لی تو والد صاحب نے یہ کام میرے ذمے لگایا کہ میں ہر روز شام کو پکا ہوا کھانا مدرسے میں پہنچایا کروں۔''

''تم نے یہ کام جاری رکھا؟'' حضرت عالی مقام نے پوچھا۔

''جی حضرت! دو تین سال میں مسلسل ہر روز مدرسے جاتا رہا لیکن فاصلہ زیادہ تھا، اس لیے میں نے والد صاحب کے مشورے سے مدرسے میں ماہانہ پیسے دینے شروع کر دیے۔''

''اب یہ پیسے دے رہے ہو؟'' حضرت عالی مقام نے پوچھا۔

''جی حضرت! اگر کسی ماہ کوتاہی ہو بھی جاتی ہے تو اگلے ماہ یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں یا والد صاحب، خود جا کر پیسے دے آتے ہیں... یا کسی با اعتماد ملازم کو بھیج دیتے ہیں۔''

حضرت عالی مقام ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ وہ جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ تسبیح بڑے ہموار طریقے سے ان کی انگلیوں میں گردش کر رہی تھی۔ مزار کے صحن میں بارش کبھی دھیمی اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ کئی منٹ کے بعد حضرت عالی مقام بولے۔ ''اچھا، اب تم دونوں سو جاؤ۔ فجر میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔''

میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ وہ اٹھے اور بہت آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں اور ابوسیاف ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میرے ذہن میں عجیب کھد بد سی شروع ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کم از کم ایک بھوکے کو کھانا کھلانے والی بات اور میرے باپ دادا کے خیرات کرنے میں کوئی خاص تعلق ہے۔

اگلے روز عشا کے بعد میں، ابوسیاف اور حضرت عالی مقام پھر حجرے میں موجود تھے۔ آج بادل نہیں تھے لیکن موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہمارے سامنے خوشبودار بغدادی قہوے کی پیالیاں پڑی تھیں۔ حضرت عالی مقام بول رہے تھے اور ابوسیاف اردو میں ان کی باتوں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ عالی مقام کہہ رہے تھے۔ ''تم نے بتایا ہے کہ جب تمہارا گھر مدرسے کے پاس تھا... تم مدرسے کے بچوں کو تینوں وقت کھانا دینے کے لیے جاتے تھے؟''

''جی حضرت! ایسا ہی تھا۔''

''کیا کبھی تمہارے والد نے تمہیں بتایا کہ وہ اتنی باقاعدگی کے ساتھ کھانا کیوں بھجواتے ہیں؟''

''وہ بس یہی کہتے تھے حضرت... کہ دادا ایسا کرتے تھے، اس لیے وہ بھی کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ یہ روٹین خراب ہو۔ ویسے بھی دادا کی طرح والد بھی نیکی کے کاموں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔''

"لیکن بیٹا! جب یہ سب تمہارے ساتھ ہو رہا تھا تو کیا اس کی وہ اہمیت تو نہ رہی۔"

"ہمم..... میں سمجھا نہیں حضرت۔"

"تم نے خود ہی بتایا ہے کہ پہلے تم نے مدرسے میں ایک وقت کا کھانا پہنچانا شروع کیا پھر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے تم ماہانہ خرچہ بھجوانے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ یہ بھی ماہانہ خرچہ بھی نہ دیا گیا... ایسا ہوا ہے نا؟"

میرے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہوا ہے بلکہ اس سے زیادہ ہوا ہے جتنا میں نے حضرت عالی مقام کو بتایا ہے۔

عالی مقام ایک دم موضوع بدل کر بولے۔ "کیا تمہارے پڑدادا اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے؟"

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جی حضرت! میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔"

"اور تمہارے دادا؟"

"جی حضرت! میری معلومات کے مطابق وہ بھی سب سے چھوٹے ہی تھے۔"

"اور والد؟"

میرے اندر حیرت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "جی حضرت! والد بھی دو بھائیوں میں چھوٹے تھے... اور... اور میں بھی۔"

وہ ایک بار پھر جیسے کسی گہرے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ ماحول پر سکوت رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص کا لگتا تھا جو بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ وہ بولے۔ "غیب کا علم تو صرف خدائے ذوالجلال کو ہے لیکن اگر ہم چیزوں پر غور و فکر کریں تو وہ رب اپنی عظیم صفات میں سے ایک تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی دے دیتا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے... بیٹا یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ تمہارے بزرگوں میں سے کسی نے ایک بہت اہم مقام پر کسی خاص کیفیت میں کوئی عہد کیا تھا اور اسے زندگی بھر بلکہ نسل در نسل نبھانے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ عین ممکن ہے..... عین ممکن ہے کہ تمہارے پڑدادا ہی وہ شخص ہوں۔ انہوں نے زندگی بھر وہ عہد نبھایا اور پھر وہ عہد اپنے سب سے چھوٹے بیٹے یعنی تمہارے دادا کو منتقل کر دیا۔ تمہارے دادا نے یہ عہد تمہارے والد تک منتقل کیا..... اور پھر یہ تم تک آیا لیکن تم تک پہنچتے پہنچتے اس عہد کی شکل و صورت بدل گئی اور اس پر عمل کرنے والے کا ارادہ اور جذبہ بھی وہ نہ رہا۔ اگر دوسرے لفظوں میں کہا جائے کہ اس عہد کی خلاف ورزی ہوئی تو غلط نہ ہوگا۔"

میں گم صم بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا۔ عالی مقام خاموش ہوئے تو میں نے ہمت کر کے کہا۔ "یا حضرت ..... یہ کس قسم کا عہد ہو سکتا ہے؟"

"میں ایک بار پھر کہوں گا کہ میں سو فیصد یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن یہ میرے دل کی گواہی ہے کہ گئے وقتوں میں کسی وقت شاید تمہارے پڑدادا نے کسی وجہ سے کسی متبرک مقام پر یہ منت مانی ہو کہ وہ زندگی بھر جب تک کسی ایک بھوکے کو کھانا نہیں کھلائیں گے خود کھانا نہیں کھائیں گے... شاید تمہیں یہ بات اور یہ عہد معمولی لگے لیکن نہیں ..... ایسے عہد معمولی نہیں ہوتے بیٹا! انسانی زندگی پر ان کے اثرات بہت گہرے اور طویل ہوتے ہیں۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کیے گئے ایسے عہدوں کو توڑا جائے تو اس کا بڑا اثر ہے۔"

یقیناً ہماری یہ گفتگو مزید جاری رہتی لیکن اسی دوران میں دوسرے چند مہمان آ گئے جو عالی مقام سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کی آمد کے بعد مجھے اور یوسف کو حجرہ چھوڑنا پڑا۔ اس رات کا زیادہ تر حصہ میں نے بس جاگتے ہوئے گزارا۔ آنکھوں میں بار بار آنسو جمع ہوتے رہے۔ حضرت عالی مقام کی کچھ باتیں تو میری سمجھ میں آئی تھیں اور کچھ نہیں آئی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے عالی حضرت نے مجھے میرا مسئلہ تو بتا دیا ہے لیکن اس کا حل نہیں بتایا۔ اگر وہ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا عالی مقام نے فرمایا تھا تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا کوئی کفارہ تھا جس کو ادا کرنے کے بعد میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ ختم ہو سکتی تھی؟

میں بڑی شدت سے اگلے دن کا انتظار کرتا رہا اور دل میں یہ امید پالتا رہا کہ کل پھر عالی مقام سے بات ہوگی اور وہ مجھے میری بے چینیوں کا کوئی حل بتائیں گے۔ کوئی ایسا راستہ جسے اختیار کرنے کے بعد میرے اندر پھیلی ہوئی گھٹاٹوپ تاریکی میں روشنی اور زندگی کی رمق نمودار ہو سکے۔

جانے کیوں اب میرا دھیان بار بار اپنی روزمرہ زندگی اور مذہبی معاملات کی طرف بھی جاتا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے دادا پڑدادا کے زمانے میں، ہمارے خاندان میں جتنی دین داری موجود تھی، وہ اب دکھائی نہیں دیتی تھی۔ خاص طور پر ہماری نئی نسل تو کافی حد تک اپنے بزرگوں کے راستے سے ہٹ چکی تھی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں بھی ان میں شامل تھا۔ نماز بھی پڑھ لی، کبھی نہ

پڑھی ..... روزے آسان لگے تو رکھ لیے ورنہ چھوڑ دیے۔ کبھی والدہ نے سختی سے کہا تو قرآن پاک پڑھنا شروع کیا لیکن کچھ دنوں بعد پھر چھوڑ دیا۔ پتا نہیں یہی غفلت تھی جس کی وجہ سے مجھ سے وہ غفلت بھی ہوئی جس کا ذکر کل رات عالی مقام نے فرمایا تھا۔ میں ایک عہد شکنی کا سبب بن گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کل عالی مقام نے جو کچھ کہا، وہ بچانوے فیصد سے زیادہ درست ہے۔ اب مجھے بھی تھوڑا تھوڑا یاد آرہا تھا کہ گھر میں ایک دوبار کوئی ایسی قسم کی بات ہوئی تھی۔ شاید والد صاحب نے والدہ کو کسی شخص کے بیے کھانا پہنچانے کے حوالے سے تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے بڑوں کی روحوں کو تکلیف ہو...

میں نے رات تک عالی مقام کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آئے۔ اگلا دن بھی ایسے ہی گزرا اور پھر اس سے اگلا دن بھی۔ رات کے وقت میں ابوسیاف کے سامنے بلک پڑا۔ میں نے کہا۔ ”عالی مقام کیوں نہیں آرہے؟ کہاں چلے گئے ہیں وہ؟“

ابوسیاف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا ہارون کہ ان کا یہاں آنا جانا ان کی مرضی پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کل ہی آجائیں، ہوسکتا ہے کہ اگلے پندرہ بیس روز یا مہینے دو مہینے تک نظر نہ آئیں۔ اگر تم مجھ سے ان کے ٹھکانے کا پوچھنا چاہو گے تو بھی تمہیں مایوسی ہوگی۔ مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔“

میں نے ابوسیاف کو چچی سیاف کہنا شروع کردیا تھا لیکن میں یہ لفظ عربی میں ادا کرتا تھا۔ یعنی عم سیاف ... پھر ”یا عم“۔“

میں نے کہا۔ ”یا عم! آپ کا کیا خیال ہے۔ مجھ سے ایک خاص گناہ سمیت جو گناہ ہوئے ہیں، ان کے ازالے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

ابوسیاف نے نرم لہجے میں کہا۔ ”دیکھو ایک بہت بڑے معالج نے تم کو تمہارا مرض بتایا ہے لیکن اس مرض کا علاج تم اس معالج کے بجائے مجھ جیسے معمولی شاگرد پیشہ طبیب سے پوچھ رہے ہو۔ تمہیں کچھ دیر انتظار کرنا چاہیے۔“

میں انتظار کرتا رہا۔ عالی مقام تو پھر روضے یا مسجد میں تشریف نہیں لائے تاہم دوسرے یا تیسرے روز ابوسیاف نے مجھے ایک چھوٹی سی سفید پرچی دی۔ اس پر سبز روشنائی سے عربی کے چند الفاظ لکھے تھے۔ ابوسیاف نے مجھے بتایا۔ ”تمہارے لیے حضرت نے یہ پیغام بھیجا ہے۔“

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ابوسیاف نے ان الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے پڑھا۔ ”مصیبت اپنے وقت پر ٹلتی ہے۔ تمہاری مصیبت بھی ان شاءاللہ ضرور ختم ہوگی۔ صبر کا دامن تھامے رکھو۔ معافی مانگو اور نیکی کے راستے سے دور نہ جاؤ۔“

یہ حوصلہ افزا تحریر تھی لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو فوری طور پر میرے سکون کا باعث بنتی۔ اس تحریر میں حضرت نے ملاقات کی بھی کوئی نوید نہیں سنائی تھی۔ میں نے ابوسیاف سے یہ پرچہا لے لی اور بڑے احترام سے اپنے کوٹ کی اوپری جیب میں رکھ لی۔ یاد رہے کہ چوبیس پچیس روز گزر جانے کے باوجود میرے جسم پر وہی میری شادی کی رات والا پینٹ کوٹ تھا۔ اب اس کی حالت ابتر ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اگلے کئی روز میں نے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار اور مسجد کے اندر گزار دیے۔ میرے چہرے اور سر کے بال بڑھ چکے تھے۔ کوٹ پتلون مضحکہ خیز شکل اختیار کرچکے تھے۔ میں نے بوٹ اتار پھینکے تھے اور بازار سے ایک چپل خرید لی تھی۔ میں صبح سے ظہر کی اذان تک مزار کے گردونواح میں گھومتا رہتا۔ کبھی بازار سے روٹی سوکھی لے کر کھا لیتا۔ کبھی مزار میں تقسیم کیے جانے والے کھانے سے پیٹ بھر لیتا۔ میرا حال فقیروں جیسا ہوتا جارہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آرہی تھی کہ اگر واقعی مجھ پر کسی سنگین عہد شکنی کا وبال آیا ہے تو اس کا توڑ کیا ہوسکتا ہے۔ یہ وبال تو بدستور موجود تھا۔ میرے اندر بھی اندھیرا تھا۔ میں اب بھی واپسی کا نہیں آگے جانے کا سوچ رہا تھا۔

میرے پاس جو رقم موجود تھی، وہ دن بدن کم ہوتی جارہی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں نے سوچا مجھے کوئی کام ڈھونڈنا چاہیے۔ کام کی تلاش میں، میں دن بھر مزار کے گردو کے بازاروں میں گھومتا رہتا۔ یہیں پر ایک حیدرآبادی شخص کی دکان تھی۔ اس کا نام عطااللہ تھا۔ عطا کی عمر پچپن کے لگ بھگ تھی۔ وہ عرصہ پچیس سال سے بغداد میں مقیم تھا.... اور اسلحہ مرمت کرنے کا کام کرتا تھا۔ بہت سی پرانی رائفلیں، توڑے دار بندوقیں، طمنچے اور جدید ریوالور پسٹل وغیرہ اس کی دکان کی دیواروں پر آویزاں تھے۔ وہ رائفلوں کے بیرل بنانا تھا اور لکڑی کے دستے وغیرہ بھی۔ میں چونکہ خود بھی ٹیکنیکل تھا، مجھے اس کے کام میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی اور میں اس کی دکان کے پاس کھڑا اس

کا کام دیکھتا رہتا تھا۔ پھر کبھی کبھی میں ان کی اجازت سے ان کے پاس بھی بیٹھنے لگا۔ اس نے دو چار بار میرے لیے کھانا منگوایا اور قہوہ بھی پلایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اسے مجھ سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ہے۔ میں نے یہ بات بڑی اچھی طرح نوٹ کی تھی کہ اجنبی لوگ بہت جلد مجھ سے ہمدردی محسوس کرنے لگتے تھے اور ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے کچھ کریں۔ ایک دن میں نے کہا۔ ''عطا صاحب! آپ مجھے کوئی کام دے دیں۔ میں ہر طرح کا کام کرلوں گا۔''

انہوں نے کہا۔ ''تم دیکھ ہی رہے ہو ہارون! ورکشاپ میں میرے ملازم پورے ہیں۔''

دو روز بعد عجیب اتفاق ہوا۔ میں عطا صاحب کے پاس بیٹھا انہیں کام کرتے دیکھ رہا تھا کہ اندر سے چلانے کی آوازیں آئیں۔ ہم بھاگم بھاگ اندر پہنچے۔ ایک ملازم کی قمیص کو آگ لگی ہوئی تھی۔ دھات کو گرم کرنے والا ایک اسٹوو پھٹ گیا تھا۔ ہم نے بہ مشکل آگ بجھائی۔ کاریگر لڑکے کی دونوں کلائیاں بری طرح زخمی ہوئی تھیں۔ لوگ اسے طبی امداد کے لیے فوراً اسپتال لے گئے۔

شام کو عطا صاحب کچھ دیر تک گم صم سے میری طرف دیکھتے رہے، پھر ہولے سے بولے۔ ''اگر تم کام کرنا چاہتے ہو تو کل سے آجانا۔''

میں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''عطا صاحب! میں کام تو چاہتا تھا لیکن اس طرح سے نہیں۔ مجھے اس حادثے کا بڑا افسوس ہے۔''

''بس یہ اللہ کے کام ہوتے ہیں، وہی ان کی حکمت جانتا ہے۔'' عطا صاحب نے کہا اور مجھے اگلے روز آنے کی تاکید کی۔

اگلے روز میں غوث پاک کے مزار سے تقریباً چار میل پیدل چلنے کے بعد عطا صاحب کی ورکشاپ پر پہنچا۔ عطا صاحب نے مجھے پہلے دن جو کام سونپا وہ آری سے لوہا کاٹنے کا تھا۔ میں نے آری کے دندانے درست کیے اور دوپہر تک اتنی تیزی سے لوہا کاٹا کہ وہ حیران رہ گئے۔ نہ صرف وہ خود حیران ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے تین چار پڑوسی دکانداروں کو بھی بلا کر میرا کام دکھایا۔

شام کو میں خوشگوار موڈ میں واپس مزار پر پہنچا۔ وہاں پر موجود خادم خاص ابو یوسف تو میرا خیر خواہ تھا ہی، مزار کے کئی خدمت گار بھی دوستوں کی طرح ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں جب خبر سنائی کہ مجھے کام مل گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں اپنے پہلے دن کی ''کمائی'' سے کچھ مٹھائی لے آیا تھا۔ انہوں نے چائے بنائی اور ابو یوسف سمیت ہم سب نے برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی۔

عطا اللہ میرے کام سے بہت خوش تھا۔ ایک دن وہ مجھے اپنی بیوی سے ملانے اپنے گھر لے گیا۔ سورج ڈوبتے ہی ورکشاپ بند ہو جاتی تھی۔ عطا اللہ نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور لے کر چل دیا۔ ہم مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد دریائے دجلہ کے کنارے پہنچے۔ شام نے رنگ بکھیر رکھے تھے اور دجلہ میں تفریحی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ ہم کنارے کی ایک گنجان بستی میں پہنچے۔ یہ پرانا شہر تھا۔ تنگ گلیاں، اینٹوں اور مٹی کے گھر، کھجوروں کے جھنڈ۔ مجھے لگا کہ میں نسیم حجازی کے ناول آخری چٹان کے دور میں پہنچ گیا ہوں۔ خدا خدا کرکے عطا اللہ کا گھر آیا۔ یہ پانچ چھ مرلے کا گھر ڈبل اسٹوری تھا اور ارد گرد کے مکانوں سے کافی اچھا تھا۔ یہ علاقہ بھی قدرے بہتر تھا۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ صحن میں پہنچے تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ اگر میرے سر پر ایک وزنی بم پھٹ جاتا تو شاید تب بھی مجھے اتنا شاک نہ لگتا جتنا اپنے سامنے بیٹھے جعفر کو دیکھ کر لگا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی زخمی ٹانگ اٹھا کر ایک دوسری کرسی پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ واپس مڑ جاؤں لیکن اب یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی دوران میں سیڑھیوں پر سے ایک گھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ یہ میرو تھی، جو ایک چھوٹی ٹرے میں چائے لیے نیچے اتر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اور پہچان کر وہ بھی بری طرح ٹھٹک گئی۔ ٹی ٹرے اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی تھی۔

''آپ ایک دوسرے کو پہچانتے ہو؟'' عطا صاحب نے پوچھا۔ ان کا اشارہ میرے اور جعفر کی طرف تھا۔

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلایا۔ میرو جلدی سے واپس جا چکی تھی۔ جعفر نے خود کو حیرت کے شدید لمحے سے سنبھال لیا تھا۔ اس نے عطا صاحب سے مخاطب ہو کر عربی میں کچھ پوچھا۔ غالباً میرے بارے میں ہی پوچھا تھا کہ میں یہاں کیسے ہوں؟ عطا صاحب نے جواب میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

پانچ دس منٹ بعد ساری صورت حال واضح ہو چکی تھی۔ جعفر جان چکا تھا کہ میں یہاں کیسے پہنچا ہوں اور میں بھی جان چکا تھا کہ یہ دراصل جعفر ہی کا گھر ہے۔ پچیس چھبیس برس پہلے عطا صاحب بالکل نوجوان تھے، وہ یہاں جعفر

اور مہرو اسکے والد کے شاگرد کے طور پر کام کرتے تھے۔ بعد میں جعفر اور مہرو کے والد تو مہرو سمیت پاکستان واپس چلے گئے لیکن عطا صاحب یہیں پر رہے۔ وہ مہرو کی والدہ حبیبہ بیگم کو اپنی ماں اور جعفر کو چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے تھے۔ اب عطا صاحب شادی شدہ تھے اور ان کی اپنی ماشاءاللہ تین بیٹیاں بھی تھیں۔ وہ تینوں نوجوان تھیں اور اسی گھر میں اپنی عراقی والدہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ بالائی کمروں سے ان کے چہکارنے کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ میں کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے عطا صاحب کی ورکشاپ تک پہنچا اور پھر وہاں سے جعفر اور مہرو کے گھر آ گیا۔ شاید ہماری زندگی ایسے ہی خوشگوار اور ناخوشگوار اتفاقات کا مجموعہ ہے۔

جعفر کے چہرے پر حسب معمول گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے بتایا۔ "میری پنڈلی کی ہڈی میں ایک بار یک فریکچر ہے۔ اس کے علاوہ زخم بھی ہے۔ دونوں چیزوں کا علاج ہو رہا ہے۔ مجھے کل پھر سٹی سینٹر کے اسپتال میں چیک اپ کے لیے جانا ہے۔" میں نے اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ اسی دوران میں عطا صاحب کی عراقی بیوی اور ان کی تینوں بیٹیاں بھی آ گئیں۔ لگتا تھا کہ وہ آزادی کے ماحول میں پلی بڑھی ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بول لیتی تھیں کیونکہ باپ اردو بولتا تھا۔ وہ بے تکلفی سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کی والدہ بھی مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ عطا صاحب نے کہا۔ "یہ ایک تو تمہارے قیمتی سوٹ کی خستہ حالی سے حیران ہے۔ دوسرے اس بات پر بھی حیران ہے کہ تم نے جتنا لوہا کاٹنے میں تین گھنٹے لگائے ہمارے کاریگر اتنا لوہا کاٹنے میں نو دس گھنٹے لگاتے ہیں۔"

پروگرام کے مطابق مجھے رات وہیں ٹھہرنا تھا۔ میرے لیے گھر کا بیٹھک نما کمرا کھلوا دیا گیا۔ اس ہوادار کمرے سے دریائے دجلہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ مجھے اچھا کھانا کھلایا گیا اور پوری مہمان نوازی کی گئی لیکن مہرو مجھے نظر نہیں آئی۔ شاید وہ اپنے بھائی جعفر سے ڈرتی تھی۔

میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ اگلے روز جعفر صبح سویرے اپنے کسی دوست کے ساتھ اسپتال جانے کے لیے نکل گیا۔ اسے اب شام کو ہی واپس آنا تھا۔ ورکشاپ سے چونکہ آج چھٹی تھی اس لیے مجھے اور عطا صاحب کو گھر میں ہی رہنا تھا۔ میرا ناشتا مہرو ہی لے کر آئی۔ اس نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور ناشتا میز پر رکھ کر کسی خادمہ کی طرح ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

میں نے اسے ڈانٹا۔ "یہ کیا حرکت ہے مہرو۔ مجھے شرمندہ مت کرو۔ مجھے مذاق مت کرو۔ پلیز بیٹھ جاؤ۔"

وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی اور اپنے معصوم انداز میں باتیں کرنے لگی۔ ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ اس نے پوچھا کہ میں نے برسوں پرانی کی باتیں؟

میں نے کہا۔ "کیا تمہیں پتہ ہے تمہارے بغیر کیسے رہا ہوں؟"

وہ ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے اس کی ناک کی ہڈی ذرا اور بھی اچھی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بولی۔ "بابو صاحب! یہ آپ نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کیا آپ ہمارے ملنگ بنے پھر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "حالات تو ایسے ہی ہیں کہ مجھے ملنگ بن جانا چاہیے۔"

"اللہ سائیں نہ کرے کہ ایسا ہو۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ اتاریں یہ کپڑے۔ میں آپ کو دوسرے کپڑے دیتی ہوں۔ ان کو مشین سے دھو دیتی ہوں۔ ایک دم ٹھیک ہو جائیں گے۔"

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانی۔ اندر سے شاید عطا صاحب کا کوئی جوڑا لے آئی اور میرا پتلون کوٹ دھونے کے لیے لے گئی۔

عطا صاحب ابھی تک گھر سو رہے تھے۔ ان کی تینوں تیز طرار بیٹیاں میرے ارد گرد جمع تھیں۔ میں ان کے لیے جیسے کوئی تماشے کی چیز تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی بیٹی ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ "باجی مہرو... آپ کی بہت تعریفیں کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ آپ ایک لڑکے بھی ہیں اور بزرگ بھی ہیں یعنی دو کے برابر۔ وہ ایسا کیوں کہتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔"

ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے اگر آپ کا بھی دوسری شادی کا پروگرام بن جائے تو مہرو کو ضرور بتایئے گا۔ وہ فوراً تیار ہو جائے گی..."

"جعفر ماموں دونوں کو اٹھا دیں تو اور بات ہے۔" سب سے بڑی نے کہا۔ تینوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

شام تک مہرو نے میرا کوٹ پتلون بڑی اچھی حالت میں مجھے لوٹا دیا۔ اس نے خود استری کی تھی اور میری چپل تک پالش کروائی تھی۔

شام کو جعفر واپس آ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح گہرے سنجیدہ موڈ میں تھا۔ میں نے ابھی تک اسے مسکراتے نہیں

یہاں پانی میں چند کشتیاں اور موٹر بوٹس کنارے سے بندھی ہوئی تھیں اور ڈول رہی تھیں۔ کئی بوٹس کے اگلے حصے پانی سے باہر ریت پر چڑھے ہوئے تھے۔ اور دور دور تک کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ شخص کچھ فاصلہ رکھ کر مسلسل میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں ایک بڑی بوٹ کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ ڈیڑھ دو منٹ بعد مدھم چاندنی میں اس شخص کا ہیولا نظر آیا۔ وہ پریشانی سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی شکل دیکھی... وہ سندھی یا بلوچی نوجوان تھا۔

"میں یہاں ہوں۔" میں نے اسے آواز دی۔

وہ جیسے اچھل پڑا۔ میں سائے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ چند سیکنڈ تک ہم یک ٹک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ممکن تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ بھی ہو لیکن میں ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھ سے کیا چاہیے تمہیں؟ کیوں پیچھے آ رہے ہو میرے؟"

وہ اب سنبھل چکا تھا۔ حسب توقع اردو میں بولا۔ "میں نے تم سے بات کرنی ہے۔"

"کرو بات۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب ہی خشکی پر ایک پرانی موٹر بوٹ تھی۔ یہ نہ جانے کب سے دلدل کی ریتلی مٹی میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس ٹوٹی پھوٹی کشتی کے اندر نیم تاریکی تھی۔ وہ بھاری آواز میں بولا۔ "یہاں کھڑے ہونا ٹھیک نہیں۔ چلو آؤ اس کے اندر بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔" اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے لگتا تھا جنہیں اپنی قوت بازو اور ہمت پر بھروسا ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ مضبوط اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے نشہ کیا ہوا ہے۔ بہرحال میں بھی ڈرنے والا نہیں تھا۔ میں اس کے ساتھ کشتی کے اندر آ گیا۔ یہاں جالے لگے ہوئے تھے اور مردہ مچھلیوں کی ہلکی سی بو بھی تھی۔ ہم کاٹھ کباڑ کے قریب لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھ گئے۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی، میں نے ٹارچ کی روشنی میں نووارد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر تیس پینتیس سال رہی ہوگی۔ رنگ گہرا گندمی تھا۔ چہرے کے نقوش موٹے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ ٹھیک ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ سندھی ہے۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ یہ نشے میں ہونے کی علامتیں تھیں۔ بہرحال بعد میں پتا چلا کہ وہ نشے میں نہیں بلکہ تیز بخار میں تھا۔

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "کیا بے وقوفی کرتے ہو۔ ٹارچ بجھا دو۔ نہیں تو ابھی کوئی چوکیدار پہنچ جائے گا یہاں۔"

میں نے ٹارچ بجھا دی۔ وہ ترت بولا۔ "جعفر سائیں اور مہرو سے کیا تعلق ہے تمہارا؟"

"تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟" میں نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

"صرف میری بات کا جواب دو۔ ورنہ میں یہاں تمہاری گردن بھی کاٹ سکتا ہوں۔" وہ پھنکارا۔

میں نے کہا۔ "تو پھر پہلے تم گردن ہی کاٹ لو۔ سوال جواب بعد میں کریں گے۔"

مجھے بے حد حیرت ہوئی جب اس نے اپنے لبادے کے نیچے سے واقعی ایک تیز دھار چاقو نکال لیا۔ بگڑے ہوئے لہجے میں دانت پیس کر بولا۔ "میں جو کہتا ہوں وہ کر بھی دیتا ہوں۔ میرے سوال کا جواب دو۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں۔ اس کی یہ نیم دیوانگی میرے یا اس کے اپنے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے اندرونی طیش کو دباتے ہوئے کہا۔ "میں جعفر صاحب کی ورکشاپ میں کام کرتا ہوں۔"

اس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ وہ بھیگی آواز میں بولا۔ "اچھا تو... میرا اندازہ درست ہے... مہرو کے رشتے کی بات تم سے ہی ہو رہی ہے۔"

میں ٹھٹکا گیا۔ "پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"لیکن میری سمجھ میں سب کچھ آ رہا ہے۔" وہ پھنکارا۔ "وہ تم ہی ہو جو میری مہرو پر ڈاکا ڈالنے والے ہو۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ کان کھول کر سن لو تم! وہ میری ہے۔ اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" دیوانگی کے عالم میں اس نے چاقو کی تیز نوک میری گردن سے لگا دی۔

"لگتا ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے...."

ابھی میرا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ اس نے مشتعل ہو کر الٹے ہاتھ کی ضرب میرے چہرے پر لگانی چاہی۔ وہ مجھے "انڈر اسٹیمیٹ" کر رہا تھا اور اپنی طاقت کا بھی شاید غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر خود کو اس کے تھپڑ سے بچایا اور پھر ٹانگ کی ضرب سے اسے ایک دیوار کے ساتھ دے مارا۔ چوبی دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ پھر میری

طرف دھکا۔ تیز دھار، لمبے پھل والا چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور یہی چیز زیادہ خطرناک تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کی کلائی تھامی اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں ہم کشتی کے فرش پر گر پڑے۔ وہ کافی زورآور تھا۔ شاید بخار کی مدہوشی نے اس کی طاقت اور جرأت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ تک میرے اور اس کے درمیان زبردست جدوجہد ہوئی۔ اس کے گھونسوں سے میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا اور میری ضربات نے اس کا جبڑا ہلا دیا۔ میرے جسم پر تو کوسنا تھا لیکن اس کا چہرہ تار تار ہو گیا تھا۔ آخر مجھے ایک موقع مل ہی گیا۔ چہرے پر میرے سر کی زوردار ٹکر کھا کر وہ ذرا ڈھیلا پڑا تو میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ چاقو لکڑی کے فرش پر گرا اور دو چیخ آواز آئی۔ چاقو گرنے کے بعد میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ قریباً ایک منٹ بعد وہ چاروں شانے چت میرے سامنے پڑا تھا۔ میرے گھونسوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے اس کا چاقو اٹھا لیا اور اسے سر کے بالوں سے کھینچ کر کشتی کے تختے پر بٹھا دیا۔ اس نے گردن ڈال رکھی تھی اور مسلسل خون تھوک رہا تھا۔

اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے میں نے ٹارچ روشن کی۔ اس کے سانولے چہرے پر دو تین جگہ گہری چوٹیں تھیں اور خون رس رہا تھا۔ نیچے والا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔

''کچھ اور ہاتھ پاؤں چلانے کی حسرت ہے تو نکال لو۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

وہ بس ہانپتا رہا۔ اس کا جبہ اس کے بالائی جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ ٹارچ کی روشنی اس کی توانا چھاتی پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ چھاتی کے علاوہ اس کے پورے جسم پر کئی چھوٹے چھوٹے نشان نظر آ رہے تھے۔ جیسے کسی گرم مہر سے جسم کو داغا گیا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا اور میری حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔ یہ ایک لفظ تھا جسے شاید گرم مہر سے جسم پر نقش کیا گیا تھا.... اور یہ لفظ تھا ''عبرو''۔ یہ صاف پڑھا جا رہا تھا۔

☆☆☆

قریباً دو گھنٹے بعد میں اس سندھی نوجوان کے ساتھ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار کے احاطے میں موجود تھا۔ خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ رات کے ایک بجے کا عمل تھا۔ پہلی راتوں کا چاند مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا۔

اس نوجوان نے اپنا نام ابراہیم بتایا تھا۔ دجلہ کے کنارے سے ہم ایک چھوٹی ٹیکسی میں بیٹھ کر مزار پر پہنچے تھے۔ راستے میں، میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے ''پائیوڈین'' لے کر ابراہیم کے چہرے کی چوٹوں پر لگائی تھی۔ ٹیکسی میں سفر کرنے کے لیے ابراہیم کے پھٹے ہوئے لبادے کو گرہیں دے کر باندھنا پڑا تھا۔

''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے ابراہیم سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔

میری نگاہوں میں ابھی تک وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے داغ گھوم رہے تھے جو ابراہیم کے برہنہ جسم پر نظر آئے تھے.... بہرحال ابھی میں یہ موضوع چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''جو کچھ ہوا اس میں تمہاری ہی غلطی زیادہ تھی لیکن اب تم مجھے اپنا دشمن نہیں دوست سمجھو اور جو معاملہ بھی تمہارے ساتھ ہے وہ مجھے صاف صاف بتاؤ۔ میں تمہاری مدد نہ بھی کر سکوں تو تمہیں کوئی ایسا مشورہ ضرور دے سکتا ہوں جو تمہیں فائدہ دے۔''

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''پہلے تم مجھے بتاؤ کہ اگر تم ورکشاپ کے وہ کاریگر نہیں ہو جس کے ساتھ جعفر اپنی بہن کی شادی کرنا چاہتا ہے.... تو پھر وہ کون ہے؟''

''میں ایک بار پھر خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں۔ تمہاری طرح مجھے بھی یہاں بغداد میں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے اور ورکشاپ میں کام کرتے ہوئے تو صرف دو تین دن ہوئے ہیں۔''

''وہ ورکشاپ میں ''نور مینی'' کرتا ہے۔''

میں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ''نورمین تو ایک عراقی ہے۔ چوبیس پچیس سال عمر ہوگی۔ زبیر نام ہے شاید اس کا۔''

ایک دم میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ ابراہیم نے طیش میں ہاتھ چلایا۔ سامنے رکھے ہوئے قہوے کے برتن دور تک لڑھک گئے۔ میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆☆

اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے اور سر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر گھسا لیا۔ چہرے پر شدید کرب کے تاثرات تھے۔ مزار کے احاطے میں موجود اکا دکا افراد نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔

''کیا ہوا ابراہیم؟'' میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

چپل ویسی ہی رکھ دی اور سنبھال کر رکھ دیا۔ اس چپل پر ہاتھ پھیرتا اور اسے سہلانا اسے اچھا لگنے لگا۔ ایک دن میرو محلے والی کسی گھر سے گھر آئی تو اس نے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ اس کے چند بال برش میں الجھے رہ گئے۔ ابراہیم نے وہ چند بال کسی قیمتی چیز کی طرح برش میں سے نکالے اور انہیں اپنی اشیا کے ”خزینے“ میں شامل کرلیا۔ اس کے پاس ایسی کئی چھوٹی چھوٹی اشیا جمع تھیں۔ میرو کی ٹیسٹ کا ایک ورق تھا، اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، اس کی پانچویں کلاس کی ایک کاپی جس میں اس کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔ اس کے لکھے ہوئے بچکانا شعر تھے۔ یہ سب اشیا اس کے لیے ایک خزانے کی طرح تھیں۔ وہ ان چیزوں میں اپنے محبوب کی قربت ڈھونڈتا اور سرشار رہتا تھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جارہا تھا۔ میرو اب سترہ سال کی ہوگئی۔ ابراہیم کی عمر بیس برس کی۔ وہ سرتاپا اس کے عشق میں ڈوب چکا تھا لیکن وہ اپنے عشق کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ عشق اب تک یک طرفہ تھا۔ کم از کم ابراہیم کو تو یک طرفہ ہی نظر آتا تھا۔ میرو کی طرف سے بھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جس کے سبب ابراہیم کو یہ پتا چلتا کہ وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ ہاں وہ اس سے بے تکلف ضرور تھی۔ کبھی موڈ میں ہوتی تو اسے لطیفے سناتی۔ چٹپٹی باتیں کرتی اور کبھی کوئی چھوٹی موٹی شرارت بھی۔

ایک کزن کی حیثیت سے اس کے دل میں یقیناً ابراہیم کے لیے ہمدردی اور انسیت کا جذبہ بھی تھا۔ جب ابراہیم کے والد بہت زیادہ بیمار ہوئے تو ان کی مالی حالت بہت پتلی ہوگئی۔ ان کے گھر میں فاقے رہنے لگے۔ انہی دنوں ابراہیم کی والدہ کو ان کی ایک پرانی سہیلی نے پانچ ہزار روپے ادھار دیے۔ ان روپوں سے ابراہیم کے والد کا علاج بھی شروع ہوا اور گھر میں چولہا بھی جلنے لگا۔ بعد ازاں ابراہیم کے والد جانبر نہ ہوسکے تھے۔ بہرحال ان کے گھر کا خرچہ ان ہی پانچ ہزار روپوں سے کئی ماہ تک چلتا رہا۔ اب ابراہیم کی مالی حالت تھوڑی سی بہتر ہوگئی تو ابراہیم نے ماں سے کہا کہ وہ اپنی سہیلی کو روپے واپس کردے۔ تب اس کی والدہ نے بتایا کہ وہ روپے کسی اور نے نہیں میرو نے دیے تھے اور وہ واپس بھی نہیں لے گی (یہ روپے میرو نے اپنی پرانی بالیاں بیچ کر دیے تھے اور بعد ازاں گھر والوں کو یہ بتایا تھا کہ بالیاں کہیں گم ہوگئی تھیں) پھر جب پیر فرش پر پھسل جانے سے ابراہیم کی والدہ کی ہڈی فریکچر ہوگئی تو ابراہیم کو گھر میں خود روٹیاں پکانا پڑیں۔ میرو کو پتا چلا تو وہ پہنچنے سے اس کے اور ماں کے لیے کھانا بھجوانے لگی۔ موقع ملنے پر وہ وہاں کی تیاری میں اپنے لیے بھی آجاتی تھی۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب ماں سوئی ہوئی تھی۔ ابراہیم نے بہت ہمت کی۔ وہ دونوں برآمدے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ ”میرو! ہم بہت غریب ہیں۔ اگر غریب نہ ہوتا تو تمہارے گھر والوں سے تمہیں مانگ لیتا۔“

”مانگ لیتا! کیا مطلب؟“

”تمہیں اپنے گھر لے آتا۔“

”وہ تو میں اب بھی آسکتی ہوں۔ پھپھو کی خدمت کرسکتی ہوں۔ تم دونوں کے لیے روٹی بھی پکا سکتی ہوں۔ میرے خیال میں اگر پھپھی خود کہے تو شاید اباجی اجازت بھی دے دیں۔“

”میں اس طرح آنے کی بات نہیں کررہا میرو! میں اور طرح آنے کی بات کررہا ہوں۔“

”کس طرح؟“ وہ معصومیت سے بولی۔

”میں تم سے.... شادی.... کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ”شادی.... شادی تو میں نے کرنی ہی نہیں۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”وہ کیوں میرو!“

”بس مجھے اچھی نہیں لگتی یہ شادی۔ میں اکیلی سوتی ہوں اور شادی کے بعد تو کمرے کے اندر اپنے بندے کے ساتھ سونا پڑتا ہے نا....“ اس نے کہا اور پھر خود ہی ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ شاید اسے کوئی بات یاد آگئی تھی۔

اس کی ایسی ہی معصوم ادائیں ابراہیم کو بھاتی تھیں اور اس کے اندر دور تک کھب جاتی تھیں۔

دن بہ دن اس کی حالت عجیب ہوتی جارہی تھی۔ وہ ایک سائیں جی سے ملا اور ان سے اپنے دل کا حال بیان کیا۔ سائیں جی کوئی شعبدہ باز فقیر نہیں تھے۔ صحیح معنوں میں اللہ والے تھے۔ انہوں نے ابراہیم کو بتایا کہ اسے عشق ہوچکا ہے اور یہ عشق بہت قربانی مانگتا ہے۔ اس میں پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنا پڑتا ہے اور بہت دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ وہ ان سب تکلیفوں کے لیے تیار ہوجائے... اور اگر ایسا نہیں کرسکتا تو پھر اس لڑکی کا خیال ذہن سے نکال کر تب بھی فوراً شادی کرلے۔

اگلے چند مہینوں میں ابراہیم نے بہت کوشش کی۔ جو سائیں کے بتائے ہوئے وظیفے بھی پڑھے مگر وہی بات تھی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

میرو بہت شوخ تھی مگر کبھی کبھی وہ اداس بھی ہوجاتی

تھی۔ وہ اپنی ماں کو دیکھنا چاہتی تھی جو عراق میں رہ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو تو نہ دیکھ سکی لیکن ایک دن اپنے باپ کو بھی دیکھنے سے محروم ہوگئی۔ اس کے والد یعنی ابراہیم کے چھوٹے تایا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی وفات کے بعد مہرو اپنی دادی اور بڑے تایا فضل الٰہی کے پاس رہنے لگی۔ چھوٹے تایا کی وفات کے بعد ابراہیم کو تھوڑی سی امید پیدا ہوئی تھی کہ شاید اب مہرو سے اس کے رشتے کی بات آگے بڑھ سکے اور دادی جو ابراہیم سے بھی یکساں پیار کرتی تھی، اس کے اور مہرو کے رشتے پر آمادہ ہوجائے لیکن یہ خیال بھی خام ہی نکلا۔ بڑے تایا کا ایک اپنا بیٹا بھی شادی کے قابل تھا اور تایا نے اس کے لیے مہرو پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ دادی اس بارے میں غیر جانبدار رہی تھی۔ بڑے تایا کے گھر جانے کے بعد مہرو پر پابندیاں اور بڑھ گئیں۔ اب ابراہیم اس کی صورت دیکھنے کو بھی ترس گیا۔ کسی وقت اسے لگتا تھا کہ مہرو سے اس کی یہ دوری آہستہ آہستہ اس کو گوارا ہونا شروع ہوجائے گی۔ وہ اس سے دور رہنے کا عادی ہوجائے گا۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے اندر مہرو کی طلب کی آگ ہر وقت بھڑکتی رہے۔ کئی دن سے جب اپنے جنون میں اس نے پہلی بار اپنے جسم کو لوہے کی مہر سے داغا۔ یہ مہر اس نے خود ہی بنائی تھی اور اس پر اردو میں "مہرو" کندہ تھا۔ پہلی بار یہ مہر ابراہیم نے اپنے سینے پر عین دل کے مقام پر لگائی تھی۔ تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن اس تکلیف میں بھی لذت تھی۔ جب اس نے ایک بار یہ لذت حاصل کی تو پھر بار بار حاصل کرنے کو دل چاہا۔ وہ ہر دو تین ہفتے بعد اس مہر سے اپنا سینہ داغنے لگا۔ جب بھی اسے لگتا کہ مہرو کو یاد کرنے میں اس سے کوتاہی ہورہی ہے وہ جیسے سزا کے طور پر اپنے جسم کو داغ لیتا۔ یہ عجیب لذت تھی..... عجیب سرور تھا۔ مہرو تایا کے بیٹے کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی، اس لیے کبھی کبھی ابراہیم کے دل میں یہ امید پیدا ہوتی تھی کہ شاید دادی کا فیصلہ اس کے حق میں ہوجائے اور وہ مہرو کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس کی توقع ابراہیم کو ہرگز نہیں تھی۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ تایا کے گھر میں ایک مہمان آیا ہے۔ اس نے اس دراز قد مہمان کو دیکھا وہ مقامی نہیں لگتا تھا بلکہ پاکستانی بھی نہیں لگتا تھا۔ بعد میں ابراہیم کو پتا چلا کہ وہ عراق سے آیا ہے۔ اس کا نام جعفر ہے اور وہ مہرو کا سگا بھائی ہے۔ مہرو کبھی کبھی اپنی والدہ کے علاوہ اپنے بھائی کا ذکر بھی کیا کرتی تھی۔ اب وہ بھائی اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ دن بعد ابراہیم پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ مہرو کا بھائی جعفر اسے اپنے ساتھ بغداد لے جانا چاہتا ہے اور اس کا پاسپورٹ وغیرہ بنوا رہا ہے۔

ابراہیم دم بخود رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر مہرو یہاں سے چلی گئی تو وہ کس طرح جی پائے گا۔ اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ مہرو سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن بات کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔ ایک دن اس نے بہت کوشش کرکے تایا کے گھر کی چھت پر مہرو سے تھوڑی سی بات کی۔ وہ بہت لمبی چوڑی باتیں سوچ کر آیا تھا مگر جب مہرو سامنے آئی تو وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "مہرو! تم چھوڑ کر نہ جاؤ... میں کیا کروں گا؟"

"کیوں؟ کیا تم اداس ہوجاؤ گے؟" وہ سادگی سے بولی تھی۔

"ہاں.... بہت زیادہ۔"

"تو تم مجھ کو خط لکھا کرنا۔ یہاں سے سب کی تصویریں بھیجا کرنا اور میں بھی آیا کروں گی۔ زیادہ نہیں تو سال دو سال بعد تو چکر لگا کرے گا۔"

"تم بالکل نہیں سمجھ پا رہی ہو مہرو... میں تم سے... میں تم سے..." اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ وہ کھانسنے لگا۔

"پانی لاؤں۔" وہ جلدی سے بولی۔

یہی وقت تھا جب تایا اوپر آگئے۔ انہوں نے ابراہیم کو شعلہ بار نظروں سے گھورا اور مہرو کو ڈانٹ کر بولے۔ "یہاں کیا کررہی ہو، چلو نیچے جاؤ۔"

مہرو چلی گئی اور ابراہیم بھی نظر چرا کر سیڑھیوں کی طرف آگیا۔

اس دن کے بعد تایا نے اپنے گھر میں ابراہیم کا داخلہ بالکل بند کردیا۔

چار پانچ دن بعد اپنی والدہ کی زبانی ابراہیم کو پتا چلا کہ مہرو کا پاسپورٹ بن گیا ہے اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ جارہی ہے۔ والدہ نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بھائی جعفر نے بغداد میں مہرو کا رشتہ بھی ڈھونڈ رکھا ہے۔ وہ وہاں اس کی شادی کرائے گا۔

یہ خبریں ایسی تھیں جنہوں نے ابراہیم کو ہوش وحواس سے بیگانہ کردیا۔ وہ دو تین دن بخار میں بے ہوش پڑا رہا۔ اسی دوران میں اسے پتا چلا کہ مہرو اپنے بھائی اور اپنے ایک خالو نور بخش کے ساتھ نواب شاہ سے کوئٹہ کے لیے روانہ ہوگئی ہے۔ وہاں سے انہوں نے بس کے ذریعے ایران اور پھر بغداد شریف چلے جانا تھا۔

مہرو کے چلے جانے کے بعد قرب و جوار ابراہیم کے لیے سنسان ہو گئے۔ اسے لگا کہ اس کے اردگرد ایک ویرانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہاں زرد دھوپ میں خاک اڑتی ہے اور اداسیوں کے گدھ منڈلاتے ہیں۔ وہ ان خالی جگہوں کو دیکھتا جہاں جہاں اسے مہرو نظر آیا کرتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ ایک دن وہ چپکے سے پاسپورٹ کے دفتر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی محنت مزدوری کی کمائی میں سے تھوڑا تھوڑا اپنی شادی کے لیے بچایا ہوا تھا۔ یہ کوئی چھ ہزار روپے تھے۔ اس نے ارجنٹ پاسپورٹ کے لیے درخواست جمع کرادی اور چپکے چپکے سفر کی تیاری میں مصروف ہو گیا...... وہ مہرو کے پیچھے جانا چاہتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اور پھر جب مرنا ہی تھا تو وہ کیوں نہ اپنی مہرو کے سامنے مرتا۔

جونہی اس کا پاسپورٹ بنا، وہ اپنی جمع پونجی لے کر اور اپنی ماں کو کراچی جانے کا بتا کر بغداد کے لیے روانہ ہو گیا۔

اب اسے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس کے پاس جعفر کا پتا موجود تھا۔ پھر بھی اسے جعفر کے ٹھکانے تک پہنچنے میں کافی کوشش کرنا پڑی۔ ایک مرتبہ تو وہ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہوتے بچا۔ اب وہ جعفر کے گھر کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں بس ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ مہرو کو حاصل کرنا یا پھر اس کی شادی سے پہلے پہلے اس کے سامنے اپنی جان دے دینا...... اور یہ ثابت کر دینا کہ وہ اس سے سچا عشق کرتا تھا۔

میں ابراہیم کی باتیں سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ وہ مجھے جیتے جاگتے انسان کے بجائے کہانیوں کا کوئی کردار لگا۔ سر تا پا اپنے عشق میں ڈوبا ہوا اور اپنے محبوب کو پانے کے لیے ہر مشکل سے ٹکرانے کو تیار۔ اس کا دل ہی نہیں اس کا جسم بھی مہرو کی محبت میں داغ داغ تھا۔ یہ کیسا جذبہ تھا؟ یہ کیسی طلب تھی؟

اس کی گفتگو ختم ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم میرے پیچھے کس طرح لگ گئے ابراہیم؟“

وہ بولا۔ ”سائیں! میں نے پرسوں آپ کو مہرو کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ آپ ایک بندے کے ساتھ موٹرسائیکل پر بیٹھ کر اندر گئے تھے۔ مجھے لگا کہ شاید آپ ہی ابراہیم کو بچانے والے ہیں جس کے ساتھ جعفر اپنی بہن کی شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر وہ آپ کو اپنے گھر کیوں لایا اور کیوں رات کو وہاں رکھا۔ تو سائیں جب آج رات میں نے آپ کو مہرو کے گھر سے نکلتے دیکھا تو آپ کے پیچھے لگ گیا۔“

”تم نے بتایا ہے کہ جعفر اپنی بہن کی شادی کسی عراقی ملازم سے کر رہا ہے۔ کیا میں تم کو عراقی لگ رہا تھا؟“

”نہیں سائیں! اسی لیے مجھے کچھ شک بھی ہوا تھا کہ شاید میں آپ کے بارے میں غلط اندازہ لگا رہا ہوں۔“

رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا۔ دجلہ کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا کی آمد ہونے لگی تھی۔ فاصلے میں لوگ یہاں وہاں سوئے ہوئے تھے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے ابراہیم سے کہا۔ ”ابراہیم! محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مہرو بھی تم سے محبت کرتی ہے؟“

وہ عجیب انداز میں بولا۔ ”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں سائیں! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اتنی...... جتنی کوئی کسی سے کرسکتا ہے۔ لیکن... یہ بات بھی نہیں کہ وہ مجھے ناپسند کرتی ہے۔ اگر تایا اس کے ساتھ میری شادی کر دیتے تو مجھے یقین ہے وہ بہت خوش ہوتی۔“

”کیا تم یہاں آنے کے بعد مہرو یا جعفر سے ملے ہو؟“

”نہیں سائیں! ابھی تک تو نہیں ملا لیکن آج نہیں تو کل... کل نہیں تو پرسوں یہ ملاقات ہونی ہی ہے۔“

”تمہارے ذہن میں کیا پروگرام ہے؟“

”کوئی پروگرام نہیں سائیں! پروگرام تو ان کے ہوتے ہیں، جن کی عقل سمجھ کام کر رہی ہوتی ہے۔ میرا دماغ تو جیسے بند ہو چکا ہے سائیں۔ میں سچ کہتا ہوں سائیں! مجھے مہرو کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور نہ سنائی دیتا ہے۔ میں تو جعفر سے یہ کہوں گا کہ میں اپنی ساری زندگی اور اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اس کے نام لکھ دیتا ہوں۔ وہ زندگی بھر کے لیے مجھے اپنا غلام بنا کر رکھ لے...... اور اگر اسے یہ غلامی قبول نہیں تو پھر مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے۔“

میں نے دل میں سوچا کہ جس طرح کا وہ بندہ ہے وہ تمہیں گولی مار بھی سکتا ہے...... ابراہیم مجھے اپنی جیب سے کوئی کاغذ نکال کر دکھانا چاہ رہا تھا... شاید کوئی خط تھا...... لیکن اسی دوران مجھے ابوسیاف اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ ابوسیاف نے آتے ہی کہا۔ ”ہارون! تمہیں پتا ہے، پاکستان سے تمہارے کچھ مہمان آئے ہیں۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ پتا نہیں، وہ کس کی بات کر رہا تھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

ابوسیاف نے مجھے اور ابراہیم کو ساتھ لیا اور دوسے

کے پہلو میں واقع ایک چھوٹے احاطے میں آ بیٹھا۔ میں یہاں ان کا تعارف کرا دیتا۔ یہ پاکستان کی معروف گلوکارہ ریشماں اور ان کے ساتھی تھے۔ ان دنوں ریشماں کا حوال مال اور صحت اچھی تھی اور تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر ان سے ملا اور بتایا کہ میں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ وہ اور ان کے ساتھی گرمجوشی سے ملے۔ یہ چھوٹا گروپ تھا جس میں سازندے وغیرہ بھی شامل تھے۔ ریشماں نے سیدھے سادے دیہاتی لہجے میں بتایا۔ "بادشاہ جی! دیکھو ہم ہزاروں میل کا سفر کر کے یہاں آئے ہیں۔ غوث پاک کے مزار پر حاضری دینے کے لیے۔ سدا خوش رہو یہاں پہنچ کر ساری تھکاوٹ منٹوں میں دور ہو گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "یہاں آپ کیا کریں گی؟"

وہ بولی۔ "اپنی آواز کا نذرانہ دیں گے، کچھ پڑھیں گے یہاں۔"

"لیکن یہاں سختی بہت ہے۔ یہ نہ ہو کہ آپ گانا بجانا کریں اور یہ لوگ آپ کو پکڑ لیں۔"

"نہیں، ہم یہاں سے دور ہٹ کر بیٹھیں گے۔" ریشماں نے کہا۔

ابو سیاف اور ایک پاکستانی منتظم نے گروپ کی خاطر مدارات کی۔ میں نے بھی ابو سیاف کا ہاتھ بٹایا۔ یہ لوگ بہت تھکے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ صبح دس بجے کے قریب پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ ریشماں اور ان کے ساتھی احاطے سے باہر ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ ریشماں کے چہرے پر عقیدت اور نیاز مندی کے تاثرات تھے۔ وہ دھیمی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ جیسے ریہرسل کر رہی ہو۔ یہ شاید کسی کافی کے بول تھے۔

دوپہر کو میں نے ابو سیاف سے اجازت لے لی کہ میں ابراہیم کو یہاں اپنے ساتھ مزار میں لے آؤں۔ ابراہیم دریائے دجلہ کے بڑے پل کے پاس ایک مسافر سرائے میں رہ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ مسافر سرائے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس سے کچھ افراد کے گھناؤنے کردار پر روشنی پڑی۔ سچ کہتے ہیں کہ حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک انڈین ملا۔ اس کا نام سلیمان تھا اور میں نے اسے اکثر مزار کے خدمت گاروں میں دیکھا تھا (مزار کے اکثر خادم پاکستانی یا انڈین تھے) سلیمان کے ہاتھ میں کپڑوں کا ایک بڑا سا بیگ تھا۔

سلیمان سے میری علیک سلیک ہوئی اور میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "عبدالغفور صاحب کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر جا رہا ہوں۔"

"عبدالغفور؟" میں نے پوچھا۔

"وہی چھوٹی چھوٹی داڑھی والے۔ وہ مزار کی انتظامیہ کے افسر تھے۔"

"لیکن ان کے کھانے پینے کا سامان تم مزار میں سے کیوں نہیں جا رہے؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "یہ سامان مزار میں نہیں جا سکتا۔ غفور صاحب کی اپنی رہائش گاہ بھی ہے یہاں۔ کچھ دنے کچھ نے پیتے ہیں۔"

جلد ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ بیگ میں خمیر شدہ شراب ہے... یعنی شراب ہے... بوتلوں پر "روح مسیح" اور "روح قدس" جیسے الفاظ لکھے نظر آئے۔ سلیمان کی باتوں سے پتا چلا کہ یہ دہلی کا رہنے والا یہ شخص اکثر نشے میں غرق رہتا ہے اور اس نے نوجوان لڑکیوں کو نکاح میں لانے اور پھر طلاق دینے کا مذموم مشغلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ سلیمان نے یہ بھی بتایا کہ مزار کے نیک نام متولی "خانی متو" ان سے بہت نالاں ہیں۔

خانی متو کا ذکر آیا تو میرے سینے میں پھر بے چینی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ خانی متو کا اصل نام تو شیخ ابو الحسن تھا۔ "خانی متو" کی حیثیت لقب کی تھی۔ ابھی تک او پر وہ ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس بارے میں سلیمان سے بھی کچھ سن گن لینے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ اس کی معلومات کے مطابق حضرت آج کل بغداد سے باہر ہیں۔

سلیمان کے انکشافات پر چلتے گزرتے ہم مسافر سرائے پہنچے تو تیز آندھی آ گئی۔ یہ ریتیلی ہوا تھی جو ہر چیز کو ڈھانپ رہی تھی اور دھندلا رہی تھی۔ آندھی کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ ابراہیم نے مشورہ دیا کہ اس وقت مزار واپس جانے کے بجائے رات یہیں گزاری جائے۔ مجھے یہ تجویز مناسب لگی۔ سرائے میں ہم رات گئے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اپنے بارے میں بھی ابراہیم کو تھوڑا بہت بتایا۔ بہرحال اسے اس بات سے آگاہ نہیں کیا کہ میں اپنی نئی نویلی دلہن کو سہاگ رات میں چھوڑ کر ہزاروں میل دور چلا آیا ہوں۔

ابراہیم سے باتیں کرتے ہوئے میرے زخم جیسے پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ عارفہ کی صورت میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس کی نگاہیں مجھ سے پوچھنے لگیں... مجھے بتاؤ

عورتیں اور کھلے لبادوں والے مرد، زمانۂ قدیم کے کرداروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید کے دور کے واقعات پڑھیں تو ایسے ہی منظر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ میں اس بازار میں تیز رفتاری سے چلتا چلا جا رہا تھا۔ میرے ماتھے پر پسینا تھا اور خط والا لفافہ میں نے بڑی مضبوطی سے مٹھی میں دبا رکھا تھا۔ مجھے لگا کہ آج کئی دنوں کے بعد وہی آواز پھر میرا تعاقب کرنے لگی ہے جس نے لاہور میں اور پھر ساہیوال کے ریلوے اسٹیشن پر میری سماعت میں ہلچل مچائی تھی... مجھے سرتاپا دہلا دیا تھا۔ ہذیانی وحشی آواز تھی۔ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ہارون! کم از کم ایک بھوکے کو تو کھانا کھلاتا تھا . اور ایسا نہیں ہوا اب اس کی قیمت چکانا ہوگی۔

کہاں سے آرہی تھی یہ آواز؟ کیا وہ سفید پوش شخص میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا؟ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بے حد اضطراب کے عالم میں، میں نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر دیکھا، پیچھے کوئی نہیں تھا۔ دور تک اس سفید پوش کی جھلک دکھائی نہیں دی لیکن آواز . آواز بدستور موجود تھی اور میرے کانوں میں سرگوشیوں کی صورت میں گونج رہی تھی۔ میں ایک ایک لفظ علیحدہ علیحدہ سن رہا تھا ... کم از کم ایک بھوکے کو..... کم از کم ایک بھوکے کو.....

کیا بھوک اور بھوکے کا مطلب کچھ اور تھا؟ کیا مجھے کسی طرح کا کوئی اشارہ دیا جا رہا تھا؟ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے نہیں پتا میں نے پوسٹ آفس سے روضے تک کا طویل فاصلہ کیسے طے کیا۔ کہاں کہاں ٹھوکر کھائی۔ کہاں کہاں کس سے ٹکرایا اور کتنی بار گرتے گرتے بچا۔ میں بس بڑھتا ہی چلا گیا اور مسجد میں پہنچ کر دم لیا۔ وہ خط جو میں نے عمرو والوں کے نام لکھا تھا، راستے میں ہی پھاڑ کر اور پرزے پرزے کر کے پھینک دیا تھا۔ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بس اس وقت مجھے یہی لگا تھا کہ مجھے یہ خط پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے کیونکہ میں اسے کبھی پوسٹ نہیں کر سکوں گا۔ میں جس وقت احاطے میں پہنچا عشا کی اذان ابھی ابھی ہوئی تھی۔ بس اکا دکا افراد ہی نظر آرہے تھے۔ میرے سینے میں جیسے خوف آمیز دکھ کا دریا بہہ رہا تھا۔ میں ایک گوشے میں چلا گیا، پھر سجدے میں گرا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا... اے میرے اللہ! میری مدد کر۔ میں بڑا کمزور ہوں مزید دکھ نہیں جھیل سکتا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میرے مالک! یقیناً میں گناہ گار ہوں لیکن مجھے اپنے گناہوں کا پتا تو چلے۔ یہ تو معلوم ہو کہ میں کس طرح توبہ کر سکتا ہوں۔ بے کفارہ ادا کر سکتا ہوں۔ جو تیری منشا ہے، میں وہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر یہ واقعی بھوکوں کو کھانا کھلانے والی بات ہے تو میں اپنی ساری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دوں گا۔ مالک! تو غفور الرحیم ہے۔ سننے والا ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ دیکھ میں تیرے سامنے بلک بلک کر رو رہا ہوں۔ میری مدد کر میرے مولا! میرے ذہن درست کام نہیں کر رہے۔ میں نامعلوم آوازیں سن رہا ہوں۔ مجھے انجانے خوف گھیرے ہوئے ہیں۔ میں بالکل بے دست و پا ہو گیا ہوں میرے مالک! میرا امتحان ختم کر دے ... میری آزمائش مختصر کر دے۔

میں سجدے میں گرا رہا اور روتا رہا۔

کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے، مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں نے سجدے سے سر اٹھایا اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ یہ ابوسیاف تھا۔ ابوسیاف مجھے کبھی ہارون اور کبھی پیار سے بچہ کہہ کر بلاتا تھا۔ کہنے لگا۔ "بچہ! کیا بات ہے۔ خیریت سے تو ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

ابوسیاف اپنی قبا سنبھالتا ہوا میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور ان پر اپنی پیشانی ٹکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ، میں کب تک انتظار کروں، کب تک ان کی راہ دیکھوں؟ وہ کب دوبارہ آئیں گے؟"

"تم حضرت عالی مقام کی بات کر رہے ہو؟" ابوسیاف نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، انہی کی بات کر رہا ہوں۔ میں ان کی راہ دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں۔ انہوں نے مجھے رستے میں چھوڑ دیا ہے۔ ایسی کیا غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟"

ابوسیاف مجھ سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جاننا چاہ رہا تھا کہ میرے ساتھ ایسی کیا تازہ بات ہوئی ہے جس نے مجھے اتنا غمزدہ کیا ہے۔ میں نے اس بارے میں ابوسیاف کو کچھ نہیں بتایا۔ اسی دوران میں ابراہیم بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا آگیا۔ اس کے آنے کی وجہ سے ہماری گفتگو رک گئی۔ تاہم عشا کی نماز کے بعد جب میں نے ایک بار پھر ابوسیاف کے سامنے آہ و زاری کی تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ حضرت امام کاظم کے روضے کے قریب ایک جامع مسجد ہے۔ کبھی کبھی عالی مقام ادھر بھی نماز پڑھتے تھے۔ اس نے

نہا ہے، اگر وہ بغداد واپس آگئے ہیں تو وہاں سے ان کا پتا نکل سکتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود وہاں چلا جاتا ہوں۔''

ابو سیاف بولا۔ ''پہلے مجھے دیکھ لینے دو، پھر اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں بتا دوں گا۔''

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ابھی ابو سیاف ہمارے پاس سے اٹھ کر گیا ہی تھا کہ احاطے میں ہنگامے کی آوازیں آئیں۔ دیکھا تو کچھ پولیس والے تیزی سے مسجد کے احاطے کی طرف لپک رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر پاکستانی اور انڈین زائرین کی ایک ٹولی اپنی جگہ سے اٹھی اور اندھا دھند بیرونی دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ان بھاگنے والوں میں سے ایک پاکستانی نے پکار کر ہم سے کہا۔ ''اوئے..... اوئے نس جاؤ (بھاگ جاؤ) نہیں تو مارے جاؤ گے۔''

ایک دم میں اور ابراہیم بھی خوف کے نرغے میں آگئے۔ ہم اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بھاگے۔ یقیناً ہم مسجد سے نکل کر بغداد کی گلیوں میں گم ہو جاتے لیکن اس دروازے کے باہر بھی پولیس کے دس پندرہ اہلکار موجود تھے۔ ہمارے عقب سے پولیس والوں کی سیٹیوں کی آوازیں آئیں اور پھر سے تازہ دم پولیس والے بھی ہم پر جھپٹے۔ ہم اندھا دھند تنگ گلیوں میں گھس گئے۔ کچھ خبر نہیں تھی، کدھر جا رہے ہیں۔ بس یہی خیال تھا کہ یہاں کی ظالم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا۔ ہمیں سامنے ہی سڑک پر چند سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں اور ابراہیم بغیر سوچے سیڑھیاں چڑھ کر ایک کشادہ چھت پر آگئے۔ یہ ایک ہوٹل کی دوسری منزل تھی۔ اردگرد اونچی عمارتیں بھی تھیں۔ چھت کی منڈیر ڈیڑھ دو فٹ سے اونچی نہیں تھی۔ ہمارا چھت پر چڑھنا ہمارے لیے سودمند ثابت ہوا۔ ہم نے بلندی سے گلی کا منظر دیکھا جو خوفزدہ کر دینے والا تھا۔ پولیس والوں نے پانچ پاکستانی اور انڈینز کو گھیر لیا تھا اور ان کی خوب ٹھکائی کر کے انہیں سڑک پر ہی اوندھا لٹا دیا تھا۔ ایک شخص نے کچھ زیادہ مزاحمت کی تو اسے دبوچ کر کوئی نشہ آور انجکشن لگا دیا تھا۔ ہم پولیس کی نگاہوں سے بچنے کے لیے چھت کی ایک چوڑی چمنی کے پیچھے چھپ گئے اور اسی اوٹ سے گلی کا منظر بھی دیکھتے رہے۔ اردگرد کی بلند چھتوں پر بھی چند افراد موجود تھے اور ہمیں دیکھ رہے تھے۔ شکر کا مقام تھا کہ انہوں نے پولیس کو ہماری موجودگی سے آگاہ نہیں کیا۔

تاہم بکرے کی ماں نے زیادہ دیر تک خیر نہیں منائی۔ نیچے سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ پولیس والے اوپر آ رہے ہیں۔ ''اب کیا کریں؟'' ابراہیم نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔

ہم اٹھے اور پاس ہی ایک بند دروازے پر زور آزمائی کی۔ یہ اندر سے لاک تھا۔ پولیس والے اب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک قریبی دروازہ کھلا اور کوئی شخص ٹھیٹ پنجابی لہجے میں بولا۔ ''اندر آجاؤ۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم تیزی سے اندر گھس گئے۔ دروازہ فوراً اندر سے لاک ہو گیا۔ میں نے مڑ کر اپنے مددگار کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ کوئی اور نہیں وہی رحیم یار خان کا ہٹا کٹا ایرانی سیاح امین تھا۔ اس کے حلیے پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک تنومند عراقی بھی تھا۔ شرٹ اور پتلون والا یہ عراقی ہمارے آگے چلتا ہوا زینے اترنے لگا۔ اس کے پیچھے امین اور امین کے پیچھے ہم دونوں تھے۔ امین سے کوئی سوال جواب کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ ہم تیزی سے آگے پیچھے چلتے زینے اترے اور ہوٹل کی لابی میں پہنچے۔ اکا دکا افراد نے ہمیں دھیان سے دیکھا لیکن چونکہ ایک عراقی ہمارے ساتھ تھا اس لیے کسی نے ہمیں روکنے یا کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم ہوٹل کے عقبی دروازے سے نکلے اور ایک تنگ سڑک پر تیس چالیس قدم چلنے کے بعد ایک اور ہوٹل کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ جدید طرز کا ہوٹل لگتا تھا۔ لفٹ کے ذریعے ہم تیسری منزل پر پہنچے اور پھر چار پانچ کمروں پر مشتمل ایک شاندار سوئٹ میں داخل ہو گئے۔ اس لگژری اپارٹمنٹ میں تکلف کے علاوہ نسوانی خوشبو بھی رچی بسی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی بار غور اور دھیان سے امین کو دیکھا۔ ان پندرہ بیس روز میں اس کا حلیہ مزید تبدیل ہو چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی فرنچ کٹ داڑھی اور اچھے لباس نے اسے کافی مختلف روپ دے دیا تھا۔

اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس نے دو تین گہری سانسیں لیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یہاں کیسے پھنس گئے یار ان بھائی!''

میں نے کہا۔ ''بس کچھ نہ پوچھو۔ پتا ہی نہیں چلا۔ مسجد کے اندر سے پاکستانی اور انڈینز بھاگے تو افراتفری میں ہم بھی بھاگ پڑے..... لیکن..... تم یہاں کیسے..... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے ایسے ملاقات ہوگی۔''

وہ بولا۔ ''ہم اس ہوٹل کی چھت پر سے سب کچھ دیکھ

رہے تھے۔ جب آپ دونوں چھی کے پیچھے پیچھے ہو رہے
تھے، میں نے آپ کو پہچان لیا اور پھر کمال صاحب کے
ساتھ آپ کی مدد کو پہنچ گیا۔" کمال یقیناً ان گھنگرالے
بالوں والے تنومند عراقی کا نام تھا۔ وہ شکل سے سخت گیر نظر
آتا تھا۔

امین نے مزید بتاتے ہوئے کہا کہ کمال رشید اس کا یا
دوست ہے اور وہ اس سے ملنے یہاں ہوٹل میں آیا ہوا تھا۔

میں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ پاکستان سے نکلنے
کے بعد امین کتنی شدت سے اور کتنی تیزی سے تبدیل ہو رہا
ہے۔ عراقی کمال باہر چلا گیا۔ شاید یہ دیکھنے گیا تھا کہ پولیس
کی کارروائی کیسی جا رہی ہے۔ جاتے جاتے اس نے عربی
میں تسلی دی کہ ہم یہاں بالکل محفوظ ہیں، ڈرنے والی کوئی بات
نہیں۔ ایک لڑکی جس نے نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا،
ہمارے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی اور پھر وہ بھدی سی پستہ لڑکی
بھی دکھائی دی جو ڈائیوڈ ان میں دو تین مرتبہ امین کے ساتھ نظر
آئی تھی۔ وہ آکر بے تکلفی سے امین کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ وہ
بھی مختصر لباس میں تھی۔ کسی پاس کے کمرے سے کسی لڑکی
کے بلند لہجے میں بولنے کی آواز آئی۔ وہ شاید کسی مرد سے
جھگڑ رہی تھی۔ مرد نے بھی ترش کر کچھ کہا۔ لڑکی ہولے سے
چلائی پھر ایک دروازہ جھٹکے سے کھلا اور لڑکی تیز قدموں سے
چلتی ہوئی مخالف سمت میں گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے
تھے اور اس نے اپنے جسم کے گرد ایک سفید چادر لپیٹ رکھی
تھی۔ جواں سال مرد اس کے پیچھے گیا اور راستہ روکنے کی
کوشش کی۔ لڑکی غیض سے اس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ
گئی۔ جب وہ راہداری کے آخری سرے پر پہنچی تو اسے رکنا
پڑا۔ سامنے سے کمال رشید سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہا تھا۔
"واٹ از گوئنگ آن؟" کمال رشید نے ڈانٹ کر لڑکی سے
پوچھا۔ لڑکی نے جانے کیا جواب دیا۔ اسی دوران میں لڑکی
کے ساتھ کمرے سے نکلنے والا شخص بھی کمال رشید کے پاس
پہنچ گیا۔ اس شخص نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ ان تینوں
کے درمیان وہیں کھڑے کھڑے کچھ بحث ہوئی۔ الفاظ
ہمارے کانوں تک نہیں پہنچے لیکن بات تقریباً سمجھ میں آ رہی
تھی۔ اچانک بجلی سی چمکی۔ کمال رشید نے زنّاٹے کا تھپڑ
لڑکی کے منہ پر رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ اس
کے بال چہرے پر بکھر گئے تھے۔ کمال رشید نے اپنی انگلی
اٹھائی اور بڑے غصے سے کچھ کہا۔ یقیناً وہ لڑکی کو واپس
کمرے میں جانے کا حکم دے رہا تھا۔

لڑکی سر جھکائے واپس کمرے میں چلی گئی۔ جواں
سال عراقی بھی اس کے پیچھے ہی گیا، کمرے کا دروازہ بند
ہو گیا۔

یہ وہی گھناؤنا کھیل تھا جو ازل سے حوا کی بیٹی کے
ساتھ کھیلا جاتا رہا ہے۔ مقام اور کردار بدلتے رہتے ہیں
لیکن کہانی وہی رہتی ہے۔

میرا دم جیسے گھٹنے لگا۔ ابراہیم کے چہرے پر بھی
ناپسندیدگی کے آثار نظر آنے۔ میں نے امین سے کہا۔ "کیا
ہم کہیں اور نہیں بیٹھ سکتے؟"

"کیوں نہیں ہارون بھائی۔" امین نے مسکرا کر کہا اور
ہمارے ساتھ ایک ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا۔ بھدی سی پستہ
لڑکی بھی اب ہمارے قریب نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ "امین! یہ سب کیا ہو رہا ہے، لگتا ہے تم
کسی چکر میں پھنسے ہوئے ہو؟"

وہ پھر مسکرایا۔ "یہ ساری دنیا ہی ایک چکر ہے ہارون
بھائی! مگر پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کس چکر میں چھپی کے پیچھے
بھاگنا پڑا؟"

میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنائی اور
ابراہیم کا بھی تھوڑا سا تعارف کرایا۔ مسجد کے صحن سے ہم
دونوں کے بھاگنے کا ذکر سن کر وہ ہنسنے لگا۔ "ہارون بھائی! ویسے
تو تم سینے پیانے ہو لیکن لگتا ہے کہ پردیسی ہونے کی وجہ سے
تم بہت گھبرائے ہوئے ہو۔ تمہیں بھاگنے کی بھلا کیا ضرورت
تھی۔ تمہارے پاس پاسپورٹ ہے ویزا ہے ... اور ابراہیم
کے کاغذ بھی پورے ہیں۔ پولیس یہ چھاپے ان لوگوں کے لیے
مارتی ہے جو غیر قانونی طور پر یہاں پڑے رہتے ہیں۔"

"بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"میں اب بہت سی ٹھیک باتیں کہنے لگا ہوں۔" وہ
معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "اور بڑی بات یہ ہے کہ میں تم کو
بھی ایک دو ٹھیک باتیں بتانا چاہتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

اس سے پہلے کہ ہماری گفتگو آگے بڑھتی تنومند کمال
رشید واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ اب نارمل دکھائی دے رہا
تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جو کچھ بتایا، اس کا
مطلب یہ تھا کہ پولیس نے مسجد اور مزار کے قریب سے
تقریباً بیس ہندوستانی اور پاکستانیوں کو پکڑا ہے۔ اس کے
علاوہ خاص خبر یہ ہے کہ مزار شریف میں سے سینئر انچارج
عبدالغفور کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس پر غیر اخلاقی
سرگرمیوں کا الزام ہے۔ گرفتاری کے وقت مزاحمت کرنے
پر پولیس نے اسے بے تحاشا مارا بھی ہے۔

میری نگاہوں میں وہ سارا منظر گھوم گیا جب میں نے پوسٹ آفس کی طرف جاتے ہوئے بازار میں انڈین سلیمان کو دیکھا تھا اور اس نے مجھے عبدالغفور کی کارستانیاں بتائی تھیں۔ کیا پتا عالی مقام کی ناراضی ہی اسے لے ڈوبی ہو۔

وہ رات ہم نے بڑے آرام و آسائش میں ایک لگژری بیڈروم کے اندر گزاری۔ اکیلے میں امین نے مجھ سے کہا۔ ''ہارون بھائی! تم نے اس سعدی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ مہرو کی بات کر رہا ہے۔ میں نے اسے آگاہ کیا کہ تہران کی ایک مسجد میں اس کے وارث مل گئے تھے اور اب وہ خیر خیریت سے ان کے پاس ہے۔ بہرحال میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ بغداد میں ہی ہے اور نہ ہی یہ بتایا کہ یہ جو ابراہیم میرے ساتھ ہے، وہ مہرو کے لیے ہی مارا مارا یہاں پھر رہا ہے۔

گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے میں نے امین سے اس مقامی لڑکی کے بارے میں پوچھا جسے کمال رشید کا تھپڑ پڑا تھا اور وہ روتی ہوئی کمرے میں واپس چلی گئی تھی۔ امین بے پروائی سے بولا۔ ''کچھ نہیں ہارون بھائی! یہ کوئی اتنی شریف زادی نہیں ہے۔ پیسے کی خاطر سب کچھ کرتی ہے۔ بس نخرے دکھا رہی تھی۔ فرح نام ہے اس کا۔ کمال رشید نے یہی ایک دو لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مہمانوں کی آؤ بھگت کے لیے۔'' امین نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

''لیکن یار! کچھ بھی ہے۔ اس طرح سب کے سامنے کسی کی بے عزتی کرنا اچھی بات تو نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی عورت بھی بغیر مجبوری کے اس طرح کا پیشہ اختیار نہیں کرتی۔''

''ہارون بھائی! میں تمہیں کیا کیا بتاؤں، یہ عراق ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا دوست کمال رشید کرتا کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''اس ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر اس نے کچھ حصہ کرائے پر لیا ہوا ہے۔ وہاں ایک حمام کھولا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹا موٹا کام کرتا ہے۔''

''کیا چھوٹا موٹا کام؟''

''اچھا۔ صبح تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ اب سو جاتے ہیں۔''

اسی دوران میں ابراہیم بھی کمرے میں واپس آ گیا۔ ہمیں بات چیت روکنا پڑی۔

اگلی صبح بڑی کراری دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ امین نے مجھ سے کہا۔ ''ہارون بھائی! فریش ہونا ہے تو نیچے کمال رشید کے حمام میں جا کر نہا لو۔''

میں اور ابراہیم لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچے۔ حمام کے شاندار سلائڈنگ دروازے کے سامنے پہنچ کر ہمیں ٹھٹکنا پڑا۔ ایک طرف بسکٹ کی ایک چوڑی پلیٹ پر حمام کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ پتا چلا کہ ان باتھ رومز میں دو طرح کا غسل ہوتا ہے۔ ایک وہ جو بندہ خود کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو کوئی خوش اندام لڑکی اسے کراتی ہے۔ اس کے علاوہ بھاپ والا غسل بھی یہاں دستیاب تھا۔ سب کے علیحدہ علیحدہ ریٹ درج تھے۔ اسی دوران میں ہم نے دیکھا کہ سنجیدہ چہرے والی ''فرح'' بازو پر ایک بڑا تولیہ لٹکائے حمام سے نکلی اور ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہم دونوں نے یہاں سے جانے میں ہی عافیت سمجھی اور اوپر اپارٹمنٹ میں جا کر غسل کیا۔

فنی ابریویشن

Math

M:Mantle
A:Attack
T:To
H:Handsome
:StudentS

College

C:Come
O:On
L:Let
L:Love
E:Eachs
G:girl
E:Equally

LOVE

L:Loss of money
O:Out of mind
V:vaste of time
E:ends of life

مرسلہ: انفی احمد، ذوالفقار احمد اکرک

ایک پُرتکلف ناشتے کے بعد اشن کے ساتھ میری طویل گفتگو ہوئی۔ یہ علیحدہ کمرے میں دن نو دن ملاقات تھی۔ اشن نے بڑی رازداری کے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس نے یہاں پہنچتے ہی کرسٹی اور اس کے دو عراقی دوستوں کے ساتھ مل کر ایک نہایت منافع بخش کاروبار شروع کر دیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کویت پہنچنے میں لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کس طرح کی مدد!!''

''ہر طرح کی مدد۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس نے جو تفصیل بتائی اس سے پتا چلا کہ کرسٹی اور اس کے دو تین ساتھی بذریعہ لانچ مسافروں کو کویت کے ساحل تک پہنچاتے ہیں اور ان سے معقول معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور یہ پورا ایک نیٹ ورک ہے۔ اگر کبھی بھار چھ مہینے میں ایک بار کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو بھی جاتا ہے تو یہ لوگ ساحلی پولیس کو دے دلا کر معاملہ رفع دفع کرا لیتے ہیں۔ اشن نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ اور اس کا ساتھی کمال کامیابی سے کویت کے دو پھیرے لگا بھی آئے ہیں۔ یہ کام اتنا آسان ہے کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔

اشن نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ مجھے پیشکش کی کہ اگر میں بھی چاہوں تو اس نہایت آسان، دلچسپ اور منافع بخش کام میں اس کے ساتھ شریک ہو سکتا ہوں اور یوں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر سکتا ہوں۔

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بھئی۔ مجھے تو تم معاف ہی کرو۔ مجھے دن دوگنی رات چوگنی ترقی نہیں کرنی۔ میں سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ میری تو بس زیادہ سے زیادہ خواہش یہی ہے کہ میں کسی طرح محنت مزدوری کر کے چار پیسے کماؤں اور عزت سے گھر واپس جا سکوں اور وہ بھی تب جب میرے دل کو سکون مل جائے۔ ابھی تو میں اس طرح کی ذہنی الجھنوں میں جکڑا ہوا ہوں کہ بس اپنے آپ میں ہی قید ہو کر رہ گیا ہوں..... ابھی تو.....''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری بات کاٹی۔ ''ہارون بھائی! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پیسا روپیا ہر درد کی دوا ہے۔ جب پیسا ہوگا تو سارے معاملے خود بخود ہی سیدھے ہوتے چلے جائیں گے۔ تم دیکھ لینا۔''

''لیکن میں ایسا پیسا نہیں چاہتا جس میں ذرا سی بھی کوئی آلائش ہو۔''

''اس میں کوئی آلائش نہیں ہارون بھائی!'' اشن زور دے کر بولا۔ ''تم ایک بار یہ کام کر کے تو دیکھو..... تمہاری آنکھوں کے سامنے چاندنی ہو جائے گی..... اور میں تمہیں کام بھی ایسے کر دوں گا جس میں کسی طرح کا کوئی رسک ہوگا ہی نہیں۔''

اس دن میرے اور اشن کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ اس نے مجھے بڑے خوب صورت منظر دکھائے لیکن اس کی کوئی بات بھی میرے دل کو چھو نہیں سکی۔ آخر میں میں نے بس اتنا کہا۔ ''اگر تم میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو اتنا کرو کہ کسی طرح قانونی طریقے سے کویت پہنچنے میں میری مدد کر دو بلکہ..... ہو سکتا ہے کہ میرا ساتھی ابراہیم بھی میرے ساتھ جانا چاہے۔''

''قانونی طریقہ تو بہت لمبا ہے ہارون بھائی۔ سارا سال بھی لگے رہو گے تو کچھ نہیں بنے گا۔ بہرحال میں اس سلسلے میں کرسٹی سے بھی بات کرتا ہوں بلکہ آج ہی کرتا ہوں..... ویسے یہ ابراہیم تمہارا کچھ لگتا بھی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ دور نزدیک سے کوئی رشتہ وغیرہ؟''

''نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے یہ یہیں مجھے اتفاقاً مل گیا ہے لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں..... بس تمہاری شکل کچھ کچھ ابراہیم سے ملتی ہے بلکہ شکل بھی نہیں بس تمہارا ماتھا اور آنکھیں وغیرہ اور شاید جب تم ہنستے ہو تو اس وقت بھی کچھ کچھ ابراہیم کی طرح ہنستے لگتے ہو۔''

تھوڑی تھوڑی شکل ملنے والی بات اس سے پہلے ابوسیف نے بھی کہی تھی۔ اس وقت میں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی تو نہیں تھی لیکن میں جانتا تھا کہ میں قبول صورت ہوں۔ دوسری طرف ابراہیم بالکل عام شکل و صورت کا تھا اور اس کا رنگ بھی کچھ سانولا تھا۔ پھر بھی ہم دونوں کی صورتوں میں کوئی جھلک ایک دوسرے سے ملتی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق ہی تھا اور ایسے اتفاق نظر آتے رہتے ہیں..... بالکل اجنبی اور غیر متعلق لوگوں میں تھوڑی بہت مشابہت دکھائی دے جاتی ہے۔

روضے پر واپس جاتے ہوئے ڈر تو لگ رہا تھا لیکن ذرا گہرائی میں جا کر سوچا تو اندازہ ہوا کہ ایسا کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہمارے سفری کاغذات پورے تھے اور ہم نے کسی طرح کا کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا۔ اسی شام ہم روضے پر واپس آ گئے۔ اشن کا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ اب اس نے مجھے ایک فون نمبر بھی دے دیا تھا۔ وہ

چاہتا تھا کہ میں جلد از جلد ان سے رابطہ کروں۔

ابوسیاف اور دوسرے دیگر خدمت گار میرے لیے بہت پریشان تھے۔ مجھے صحیح سالم واپس دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ابوسیاف نے بھی یہی بتایا کہ ہمیں خواہ مخواہ ہی گرفتار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر پکڑے جاتے تو کسی نہ کسی شبہے میں جیل کی ہوا کھانا پڑتی۔ ابوسیاف نے بتایا کہ یہ بڑی سختی کا دور ہے۔ صدر صدام کی خفیہ پولیس لوگوں کو پکڑتی ہے اور پھر کبھی ان کا کھوج کھرا نہیں ملتا۔

ابوسیاف کو دیکھتے ہی عالی مقام سے ملنے کی تڑپ پھر میرے اندر بیدار ہوگئی۔ وہ سب کچھ پوری شدت سے یاد آگیا جو مرکزی پوسٹ آفس کے قریب میرے ساتھ ہوا تھا۔ مجھے کسی روحانی سہارے کی شدید ترین ضرورت تھی اور یہ سہارا، میرے قریب آکر مجھ سے دور چلا گیا تھا۔ میں نے ابوسیاف سے پوچھا۔ ''حضرت کا کچھ پتا چلا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لگتا ہے کہ وہ ابھی بغداد واپس ہی نہیں آئے لیکن جونہی وہ لوٹے ہمیں پتا چل جائے گا۔ میں نے ایک دو بندوں سے کہہ رکھا ہے۔''

پتا نہیں کیوں ابھی بھی مجھے لگتا تھا کہ حضرت مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں اپنے حالات کا مقابلہ خود ہی کروں۔ انہوں نے جو ایک چھوٹی سی چٹ میرے لیے لکھی تھی، وہ میں نے بڑی عقیدت سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ جب دل بہت پریشان ہوتا تو میں اس چھوٹے سے کاغذ کو نکال کر پڑھنے لگتا۔ اس پر عربی میں لکھے ہوئے الفاظ مجھے سہارا دیتے تھے۔

تیسرے روز ابراہیم کو روضے کے ساتھ والی مسجد میں چھوڑ کر میں پھر امین سے ملنے گیا۔ وہ ایک اچھے ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں اسی کرسٹی نامی لڑکی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ لڑکی اس کے لیے منہ بولی بیوی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ ناپسند تھا اور میں نے کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا لیکن لگتا تھا کہ امین نے میری باتوں سے کچھ خاص اثر نہیں لیا۔ بس مسکرا کر اتنا کہا۔ ''اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت ہوتی ہے ہارون بھائی۔''

میں نے پوچھا۔ ''میرے کام کا کیا بنا؟''

''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا ہارون بھائی! قانونی طریقے سے جانے والی بات تو دل سے نکال دو۔ ہاں باس سے بات ہوئی ہے اور میں نے تم دونوں کے لیے ان سے خاص رعایت بھی لے لی ہے۔ مجموعی کرائے میں 75 فیصد ڈسکاؤنٹ ہوگا لیکن اس کے لیے تھوڑا بہت کام تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''روضے میں اور آس پاس کے چھوٹے ہوٹلوں میں کئی ہندوستانی اور پاکستانی پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کویت جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں گے۔ تم کافی دنوں سے وہاں رہ رہے ہو۔ آسانی سے دو چار ایسے بندے ڈھونڈ سکتے ہو جو مناسب کرایہ دے کر کویت پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہوں بلکہ کوشش کرو تو زیادہ بندے بھی مل سکتے ہیں۔''

''لیکن مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

اس نے میرے انکار کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور مجھے قائل کرنے میں لگا رہا۔ وہ خاصا باتونی تھا اور بندے کو قائل کرنا بھی جانتا تھا۔ میری ذہنی کیفیت بھی کچھ عجیب تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ آدھ پون گھنٹے میں امین نے مجھے نیم رضامند کر لیا۔ اس نے مجھے باور کرا دیا کہ یہ بالکل محفوظ سفر ہے۔ روزانہ سیکڑوں لوگ اسی طرح سمندری راستے سے کویت میں آ جا رہے ہیں۔ گورنمنٹ بھی اس سلسلے میں زیادہ سختی نہیں کرتی۔

اس نے مجھے طریقہ کار بتایا کہ میں کس طرح کویت جانے کے خواہش مند افراد کا رابطہ کمال رشید سے کروا سکتا ہوں۔ یہ رابطہ کمال رشید سے نہیں در اصل اس کے ایک کارندے باقر احمد سے ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں ایک بات صاف بتا دوں۔ میں نے کسی کے لیے کسی طرح کی کوئی ذمے داری نہیں لینی ہے۔ اگر کوئی کویت جانے کا ارادہ رکھتا ہوگا تو میں اسے بتا دوں گا کہ وہ باقر احمد سے کس طرح مل سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دوں گا کہ اگر وہ جانے کا ارادہ کرے گا اور کرایہ وغیرہ دے گا تو اپنی ذمے داری پر دے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' امین نے کہا۔

میں شام سے ذرا پہلے روضے والی مسجد میں پہنچا تو ابراہیم وہاں موجود نہیں تھا۔ پتا نہیں آج کل کہاں کہاں پھرتا رہتا تھا۔ ایک دو بار میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بازار گیا ہوا تھا۔ ابراہیم اب میرے سفر کے حالات کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس سفر کے دوران میں چند روز ایسے بھی آئے تھے جب حمرا نساء یعنی صبرو میری ہمسفر رہی تھی۔ وہ یہ سب کچھ جان کر

مقام سے ملاقات کی ضرورت مجھے بے حد شدت سے محسوس ہونے لگی۔

اگلے روز دوپہر کے قریب میں خود ہی حضرت امام کاظم کے روضے کی طرف روانہ ہوگیا۔ ابوسیاف نے مجھے بتا رکھا تھا کہ حضرت عالی مقام بھی کبھی امام کاظم کے روضے کے پاس ایک جامع مسجد میں بھی نظر آتے ہیں۔ میرے لیے روضے پر جانے میں یوں بھی آسانی پیدا ہوئی کہ ہندوستانی زائرین کا ایک چھوٹا گروپ کیرنی ڈبے کے ذریعے امام کے روضے کی طرف جارہا تھا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانے پر تیار ہوگئے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم روضے پر پہنچے۔ روح پرور مناظر دیکھے۔ میں ایک شخص سے قریبی جامع مسجد کا پتا پوچھ رہا تھا جب میری نگاہ ایک تیرہ چودہ سالہ دبلی پتلی لڑکی پر پڑی اور میں بری طرح چونک گیا۔ میں اس لڑکی کو جعفر کے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ یہ ان کی ملازمہ تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ ایک جوان سال لڑکی بھی دکھائی دی۔ وہ ڈھیلے لبادے میں تھی اور آنکھوں کے سوا تمام چہرہ سیاہ حجاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر مجھے شک گزرا کہ یہ کوئی اور نہیں مہرو ہے۔

اگلے ایک دومنٹ میں یہ شک درست ثابت ہوا۔ یہ مہرو ہی تھی۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ مجھ سے کنی کترا کر نکل جانا چاہتی ہے لیکن میں اس کے بالکل سامنے پہنچ چکا تھا۔ وہ ایسا نہیں کرسکی۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک کشادہ چھت پر موجود تھے۔ یہاں بس اکا دکا نمازی ہی دکھائی دے رہے تھے۔ مہرو نے چھوٹی عمر کی لڑکی کو نیچے مزار کے احاطے میں ہی رہنے دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس لڑکی کی حیثیت مہرو کی ہمراز کی سی ہے اور وہ مہرو کی ہر بات مانتی ہے۔ چھت پر ایک جانب ایک پرانی تپائی پڑی تھی۔ میں نے مہرو سے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔ وہ لرز کر بولی۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے بابو سائیں۔ میں آپ سے اوپر کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔''

''بے وقوفی کی باتیں نہ کرو..... بیٹھو۔'' میں نے ذرا غصے سے کہا۔

''نہیں بابو سائیں! مجھے گناہ گار نہ کریں۔'' اس نے کہا اور جلدی سے چھت کے فرش پر بیٹھ گئی۔ میں ششدر رہ گیا۔ عجب نمونہ تھی۔ میں نے تپائی کو ایک طرف سرکایا اور خود بھی اس کے پاس گرد آلود فرش پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنا نقاب تھوڑا سا نیچے کھسکا دیا تھا۔ اس کی چاندنی کی تھمی چمک دکھانے لگی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی خوب صورت آنکھیں سرخ اور رم زدہ تھیں۔ صاف پتا چلتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے تک خوب روتی رہی ہے۔ میں نے کہا۔ ''مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں اس طرح ملاقات ہوجائے گی۔''

وہ بولی۔ ''بابو سائیں! اس دن آپ کھانا کھائے بغیر ہی ہمارے گھر سے چلے گئے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے آپ کے لیے بڑے شوق سے سندھی بریانی بنائی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہاری بنائی ہوئی بریانی میرے نصیب میں ہی نہیں ہے۔ چلو چھوڑو اس بات کو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا پاپا جعفر تمہاری شادی کب کررہا ہے؟''

شادی کے ذکر پر اس کے چہرے پر شرم اور اذیت کے سائے ایک ساتھ لہرا گئے۔ سنبھل کر بولی۔ ''ابھی تو شاید منگنی ہوگی۔ شادی کو سال کے قریب لگ جائے گا۔ پاپا نے لڑکے سے صاف کہہ دیا ہے کہ اولاد میں سے پہلے اپنا گھر بنانے۔''

وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ اپنی امی حبیبہ مائی کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ آج کل کچھ بیمار ہیں۔ چند دن پہلے جب میں مہرو کے گھر گیا تھا تو اس کی امی سے بھی مختصر بات ہوئی تھی۔ وہ پردہ کرتی تھیں اور الگ تھلگ رہنے کی عادی تھیں۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مہرو! مجھے لگتا ہے کہ تم تھوڑی دیر پہلے تک بہت روتی رہی ہو۔ تمہاری آنکھیں...''

وہ ذرا ٹھٹک کر بولی۔ ''ہاں جی... بس دعا مانگ رہی تھی۔''

''کس کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ گڑبڑا گئی۔ ''جی... جی...؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے مہرو تم کس کے لیے دعا مانگ رہی تھیں؟ تم ابراہیم کے لیے دعا مانگ رہی تھیں نا!''

اس کا رنگ ایک دم ہلدی ہوگیا۔ چاندنی کی قاش زرد ہوگئی۔ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آ..... آپ..... اسے جانتے ہیں؟''

''جانتا ہوں تو نام لے رہا ہوں نا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ یہاں بغداد میں موجود ہے... اور... اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے آخری الفاظ ذرا مسکراتے ہوئے کہے۔

وہ بہت نروس نظر آرہی تھی لیکن میرا رویہ دیکھ کر اسے سنبھلنے میں مدد ملی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھپک کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ میں دوست ہوں دشمن نہیں۔''

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور معصومیت سے بولی۔ ''آپ ...اور... کیا جانتے ہیں بابو سائیں؟''

''بہت کچھ۔'' میں نے پھر مسکرا کر کہا۔ ''مثلاً یہ کہ تم نے زہوان میں یہ کیوں کہا تھا کہ جب میں ہنستا ہوں تو تمہیں کوئی اپنا یاد آجاتا ہے۔''

''بج... جی... میں کچھ نہیں بابو سائیں۔''

''ابھی تم نے کہا تھا کہ میں ہنستے ہوئے کسی کی طرح لگتا ہوں۔ اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ میں کس کی طرح لگتا ہوں۔ تمہارے ابراہیم... یہی کہا ہے میں نے۔''

''تمہارے ابراہیم'' کے الفاظ نے مہرو کے چہرے پر ایک بار پھر شرم آمیز دکھ کے سائے لہرا دیے۔ یہ گہرا دکھ تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پلکیں جھکائیں اور بولی۔ ''اس کا نام نہ لیں بابو سائیں۔ وہ اب میری زندگی سے نکل چکا ہے۔ میں اپنے بچے سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں۔ اس کو کوئی دکھ نہیں دے سکتی۔ اگر... اگر وہ آپ سے ملتا ہے تو اس سے کہہ دیں کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ نہیں تو اسے بہت تکلیف ہوتا پڑے گا۔ میں اسے بالکل بھول چکی ہوں بابو سائیں... وہ بھی مجھ کو بھول جائے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بات میری طرف دیکھ کر کہو کہ اسے بالکل بھول چکی ہو۔ دیکھو... دیکھو میری طرف۔''

وہ اسی طرح گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے، پھر اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''مہرو! جھوٹی زندگی جینے سے بہتر ہے کہ دل بڑا کر کے سچ کا سامنا کرنا جائے اور تمہیں بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہاری کون سی ابھی شادی ہو رہی ہے۔ ایک سال سے زیادہ کا وقت ہے۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارا بھائی جعفر بس یہ چاہتا ہے کہ تمہاری شادی کسی برسر روزگار، کھاتے پیتے شخص سے ہو۔ کیا پتا کہ اس ایک ڈیڑھ سال میں ابراہیم ہی چار پیسے کمالے اور تمہارا ہاتھ مانگنے کے قابل ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری خاطر یہاں بغداد میں رہنے کے لیے بھی فوراً تیار ہو جائے گا۔''

مہرو نے اپنا سر بدستور گھٹنوں پر جھکایا ہوا تھا۔ اس نے سرگوشی میں حرکت دی اور اشکبار آواز میں بولی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا بابو سائیں... آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں... ہم... میں آپ کو سچ بتاتی ہوں۔ میری شادی کہیں بھی ہو جائے... ہم... میں خوش رہوں گی۔''

''تمہاری آواز تمہارا ساتھ نہیں دے رہی مہرو۔ یہ بات میری طرف دیکھ کر کہو۔''

وہ اسی طرح سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔

پتا نہیں، میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے مہرو سے کہا۔ ''تمہیں پتا ہے، میں اور ابراہیم کویت جا رہے ہیں۔ ایک کمپنی میں کچھ نوکریاں نکلی ہیں۔ امید ہے کہ اچھی ملازمت مل جائے گی۔''

اس نے اپنی تربتر آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں اور معصومیت سے بولی۔ ''یہ... کویت کہاں ہے؟''

''یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں بہت پیسا ہے۔ بندہ محنت کرنے والا ہو تو بڑی جلدی اس کے حالات بدل جاتے ہیں۔''

مہرو کے چہرے پر امید کی ایک کرن سی چمکی لیکن یہ صرف ایک لمحے کے لیے ہوا۔ اگلے ہی لمحے چہرے کو پھر مایوسی اور دکھ نے ڈھانپ لیا۔ اس نے ایک آہ بھر کر دائیں ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''بابو سائیں! اس سے کہہ دیں وہ میرے لیے اپنے آپ کو دربدر نہ کرے۔ اس کے گھر میں اس کی بیمار ماں کو اس کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی جو کام ہو ہی نہیں سکتا، اس کی آس نہیں رکھنی چاہیے۔''

''تم زیادہ سیانی نہ بنو۔'' میں نے ذرا جھڑک کر کہا۔ ''اللہ سے اچھے کی امید ضرور رکھنی چاہیے۔''

اس نے سر جھکا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے آنکھوں سے کچھ چند آنسو گر گئے۔

اسی دوران میں ایک عربی پہریدار اوپر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں عصا تھا۔ اس نے چھت پر موجود لوگوں کو نیچے جانے کے لیے کہا۔ میں اور مہرو بھی نیچے آگئے۔

☆☆☆

اس روز شام تک میں امام کاظم کے روضے اور اردگرد کی مساجد میں حضرت عالی مقام کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ آج کل بغداد سے باہر کسی تبلیغی دورے پر ہیں۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر کر کے میں بس کے ذریعے رات نو بجے غوث پاک حضرت عبدالقادر جیلانی کے روضے پر واپس پہنچا۔ یہاں ابراہیم بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے مہرو سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا... ہم ہمارے درمیان کویت جانے کے بارے میں

اس کے بعد میں چچا ابوسیاف کے حجرے میں چلا گیا۔ وہ کھانے کے بعد سویا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ قلم لیا اور بیٹھ گیا۔ اچانک میری نگاہ سامنے دیوار پر لگے ایک کھردرے سے آئینے پر پڑی۔ ابوسیاف سر اور داڑھی وغیرہ میں کنگھی کرنے کے لیے یہ آئینہ استعمال کرتا تھا۔ میں نے آئینے میں دیکھا اور دم بخود رہ گیا۔ حقیقت پسند لوگ میری بات پر شک کا اظہار کرسکتے ہیں یا پھر اسے میری دیوانگی قرار دے سکتے ہیں لیکن میں وہی لکھ رہا ہوں جو میں نے دیکھا۔ مجھے آئینے میں اپنے پیچھے کوئی کھڑا نظر آیا۔ حالانکہ وہاں میرے اور چچا ابوسیاف کے سوا اور کوئی نہیں تھا ... اس کا فاصلہ مجھ سے سات آٹھ فٹ رہا ہوگا۔ اس کا ایک شانہ اندھیرے میں تھا لیکن دوسرا احاطے میں تھا اور اس پر سفید کپڑے کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے دہشت زدہ نظروں سے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ بس ایک کھونٹی پر ابوسیاف کا براؤن تولیا لٹک رہا تھا۔ میں نے پھر آئینے میں دیکھا۔ عقب میں کوئی کھڑا تھا۔ واضح نہیں تھا لیکن یہ وہی سفید پوش ہیولا تھا۔ میں نے پتھرائی ہوئی نظروں سے پھر پیچھے دیکھا...... بس خالی دیوار اور براؤن تولیا...... میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایک مہیب لرزا دینے والی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ کم از کم ایک جوے کو تو کھانا کھلانا تھا۔

میں نہایت دہشت کے عالم میں اٹھا اور حجرے سے نکل آیا۔ مجھے لگا کہ میں رکا تو وہ مجھے دبوچ لے گا۔ میں ننگے پاؤں چلتا ہوا کسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں بہت سے لوگ موجود تھے اور کسی بات پر بحث مباحثہ کررہے تھے۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہورہی تھی۔

میرے شانے پر کسی نے عقب سے ہاتھ رکھا۔ میں اس بری طرح دہلا کہ پورا جسم سنسنا گیا۔ مڑ کر دیکھا۔ یہ جندل خاں تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا ہوا ہے؟ خیر تو ہے؟“

”ہاں...... ہاں ... کچھ نہیں۔“ میں نے بے ربط انداز میں کہا۔

”تو کسی سے جھگڑا وگڑا تو نہیں ہوا؟“

”نہیں خان! ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا اور روضے کی لائبریری کی طرف چلا گیا۔ چچا سیف نے ایک وظیفہ بتا رکھا تھا۔ میں اسے مسلسل پڑھنے لگا۔ پسینا میرے جسم کے ہر مسام سے نکل رہا تھا۔

اس رات بھی میں دیر تک جاگتا رہا۔ میرا دل اب گواہی دینے لگا تھا کہ میں کبھی اپنے گھر والوں سے رابطہ نہیں کر پاؤں گا۔ جب بھی ایسا سوچوں گا، میرے دل و دماغ میں قیامت برپا ہوجائے گی۔

کیوں ہو رہا تھا ایسا؟ کیا حل تھا اس کا؟ عالی مقام سے پھر ملاقات کیوں نہ ہوسکی تھی؟

اس رات ایک بار پھر اپنوں کی یاد بڑی شدت سے آئی۔ والد، والدہ، بڑے بھائی جان اسلم، چھوٹے بھائی جان فاروق، شعیب اور بہنیں اور ان کے ساتھ ساتھ عارف۔ سب کے چہرے ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آئے .... اور مجھے خون کے آنسو رلاتے رہے۔ مجھے لگا وہ سب کے سب ایک دھند میں گم ہوتے جارہے ہیں۔

اگلے روز میں آخری بار عطا صاحب کے پاس کام پر گیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں یہ کام چھوڑ رہا ہوں ... بہرحال میں نے انہیں ابھی کویت روانگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے زیادہ پوچھ گچھ بھی نہیں کی۔ بس یہی کہا کہ کبھی کبھی ملتے رہنا۔ میری جو محنت بنی تھی وہ انہوں نے اسی وقت مجھے نقد دے دی اور میں انہیں سلام کرکے اور ان کی دعائیں لے کر ان سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

دوسرے روز کمال رشید کا نمائندہ باقر خود روضے پر پہنچا۔ اس نے روضے کے سامنے واقع ایک قہوہ خانے میں خواہش مند حضرات سے ملاقات کی۔ تقریباً پندرہ افراد کے ساتھ معاملات طے ہوئے۔ ہر شخص نے فی کس تقریباً تین ہزار پاکستانی روپے دیے تھے اور بذریعہ لانچ کویت کے ساحل پر اترنا تھا۔ ان پندرہ افراد میں میرے اور ابراہیم کے علاوہ جندل خاں اور آفتاب گل بھی شامل تھے۔ آفتاب گل ایک طرح سے ہمارا لیڈر بن گیا تھا۔ باقر سے زیادہ تر بات چیت اسی نے کی۔ باقر کا تعلق پتا نہیں کس ملک سے تھا۔ بہرحال وہ اردو اور بنگالی بھی کسی حد تک جانتا تھا۔

اس روز شام کو ہم سب نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا اور اپنے اپنے پیسے باقر کو دے دیے۔ جیسا کہ امین نے مجھ سے وعدہ کیا تھا میرے اور ابراہیم سے رعایتی کرایہ لیا گیا۔ ہم دونوں نے فی کس تقریباً نوسو پاکستانی روپے دیے۔

باقر نے پورے گروپ کو تیاری کی ہدایت کی اور کہا کہ وہ ٹھیک چار دن بعد ہم سے پھر یہیں پر رابطہ کرے گا۔ باقر نے ہم دونوں سے بھی یہی کہا کہ ہم تیاری کریں، تاہم اس دوران میں کمال رشید صاحب یا امین سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی بات دو دن پہلے امین نے بھی مجھ

سے کمی تھی۔

اب ہمارا انتظار شروع ہوا جو بہت کٹھن تھا۔ دل میں کئی طرح کے وسوسے بھی ابھر رہے تھے۔ اگر کمال رشید اور باقر وغیرہ کہیں اوجھل ہو جاتے تو ہمارا کیا ہوتا؟ پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ آگے سفر میں پتا نہیں کس طرح کے حالات پیش آئیں گے۔ ان دیکھے حالات کی فکرمندی ہر وقت ہمیں گھیرے رہتی تھی۔ ہر شخص کے اپنے اپنے سپنے تھے۔ ایک شخص اپنی جواں سال بیوی کی زندگی بچانے کے لیے کویت میں محنت مزدوری کرنا چاہتا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر بہاری وہاں اپنی تین بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے گئے تھے۔ آفتاب گل اپنے خاندان اور قبیلے سے الگ ہو چکا تھا۔ وہ کویت جانا چاہتا تھا اور پھر وہاں سے کسی طرح سعودی عرب میں داخل ہو کر اپنی باقی زندگی خانۂ خدا میں گزارنے کا خواہش مند تھا۔ جندل خان کی زمین پندرہ بیس برس سے گروی پڑی تھی۔ وہ یہ زمین چھڑا کر اپنی غربت کا جال توڑنا چاہتا تھا... اپنے عزیز و اقارب کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی شادیاں کرے اور اپنی فاقہ زدہ بیوی کے چہرے پر کم از کم ایک بار تو خوش حالی کی چمک دیکھ سکے۔

ہاں... ہر شخص کے اپنے سپنے تھے اور ہر دل کے اپنے ارمان تھے، ہر نگاہ کویت پر ٹکی تھی اور ہر دل سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ وہ بخیریت کویت پہنچیں اور دولت و خوش حالی کی اس سرزمین پر ان کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہو۔

ابوسیاف کو پتا چل چکا تھا کہ ہم یہاں سے کویت جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ابوسیاف کے ذریعے روضے کے دیگر خدمت گاروں کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ ان میں سے کئی میرے بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ مجھ سے ایک بے نام ہمدردی رکھتے تھے اور میری بھلائی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ یہاں ہر اچھے برے وقت میں میرا سہارا بنے تھے۔ جن دنوں مجھے کوئی کام نہیں مل رہا تھا اور میری حالت بہت پتلی ہوتی جا رہی تھی، یہ لوگ میری ڈھارس بندھاتے تھے۔ لنگر سے میرے لیے باقاعدہ کھانا لے کر آتے تھے۔ مجھے مفید مشورے دیتے تھے۔ ان میں سے ایک مشورہ یہ بھی ہوتا تھا کہ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ میرے دل و دماغ نے میرے لیے واپس جانا کتنا مشکل بنا دیا ہے۔ جب میں روضے کے گرد و نواح میں کام ڈھونڈ رہا تھا، کچھ دن ایسے بھی آئے تھے جب مجھے اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔

مجھے وہ شب و روز بھی یاد تھے جب میرے جسم پر صرف ایک انڈرویئر ہوتا تھا اور میں نیم دیوانوں کی طرح روضے کے ارد گرد گھومتا رہتا تھا۔ ان دنوں میری حالت بھک منگوں کی سی ہو گئی تھی۔ کسی نے پتھر دیا تو کھا لیا ورنہ فاقہ کر لیا۔

بہرحال اب میں نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ ابوسیاف کا خیال تھا کہ کویت میں روزگار تو واقعی بہت اچھا مل سکتا ہے لیکن مجھے جو قدم اٹھا رہے ہو، سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ لوگ... کے ذریعے کویت پہنچ بھی جاتے ہیں لیکن بعض کو بہت مشکل بھی ہوتی ہے۔ دیگر دوستوں نے بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا مشورہ دیا۔ بہرحال اب تو فیصلہ ہو چکا تھا۔ ہم قدم اٹھا چکے تھے اور شدت سے باقر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ نماز کے بعد سب خشوع و خضوع سے دعا مانگتے۔ خاص طور سے جندل خان کو میں نے کئی بار دعا میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا۔ وہ پشتو میں گڑگڑاتا اور قدرت سے اپنے لیے "سویا" مانگتا۔

انتظار کی گھڑیاں بڑی کٹھن تھیں۔ کمال رشید کے نمائندے نے منگل کی صبح آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم سب روضے کے صحن میں اکٹھے ہو گئے اور فجر کی نماز کے بعد اس کا انتظار شروع کر دیا۔ ابوسیاف نے ٹھیک جانا تھا۔ میں نے کل شام کو ہی اسے خدا حافظ کہہ دیا تھا۔ دل میں جو سب سے بڑا دکھ تھا، وہ اس بات کا تھا کہ میں حضرت عالی مقام کو دوبارہ دیکھے بغیر یہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ کاش میں ان کو ایک بار پھر دیکھ سکتا۔ ان کی دید میرے... کے نجانے خوف کو شاید اتنا تکلیف دہ نہ ہونے دیتی۔ کسی وقت تو مجھے لگتا تھا کہ میں ہر وقت ایک نادیدہ موت کے گھیرے میں ہوں جو کسی بھی وقت مجھے دبوچ سکتی ہے۔ ابوسیاف کے حجرے میں آئینے کے اندر جو عکس میں نے دیکھا تھا اس کی یاد... دل کو خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزا دیتی تھی۔ میں اس دن کے بعد ابوسیاف کے حجرے میں گیا ہی نہیں تھا اور اب تو ویسے ہی اس جگہ کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ میرا وہم تھا، تصور تھا، نظر کا دھوکا تھا یا پھر حقیقت تھی... لیکن جو کچھ بھی تھا میں اسے دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں خود کو اکیلا نہیں رہنے دیتا تھا۔ کم از کم ابراہیم تو ہر وقت میرے ساتھ ہوتا تھا۔

ہم صحن میں بیٹھے رہے، میری نگاہ غوث پاک کے روضے پر جمی رہی۔ آنکھیں نم رہیں اور دل سے دعائیں نکلتی رہیں۔ اس وقت سب سے اہم دعا تو یہی تھی کہ باقر احمد کی صورت نظر آ جائے۔ سورج نکلا..... آٹھ بجے..... اور پھر

دن بج گئے۔ ہماری بے چینی عروج پر پہنچ گئی ا۔ پھر باقر دروازے پر نظر آیا۔ اس وقت وہ ہمیں رحمت کا فرشتہ ہی لگا۔ یہ فرشتہ ہمارے لیے آسانیاں اور خوشی مرتا ن کی طرف جانے والے راستے کھولنے والا تھا۔ ہم نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

اس نے عربی میں کہا۔ "آپ سب لوگ اپنا سامان اٹھائیں۔ ہم بس اڈے کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔"

ہمارے گروپ میں انسان نام کا ایک حافظ قرآن بھی تھا اور وہ تھوڑی بہت عربی جانتا تھا۔ اس نے ہمیں ترجمہ کر کے بتایا۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ ہم نے فوراً اپنا اپنا سامان اٹھایا اور باقر کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ہم حضرت خوشی پور کے آبائی قبرستان کے بیچ سے گزر رہے۔ مجھے وہ پچھلی رات یاد آئی اور وہ قبریں بھی دکھائی دیں جن کے درمیان سے کسی نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا تھا۔ دہشت کے مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

قریباً آدھ گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد ہم بس اڈے پر پہنچے۔ یہاں سے دو مسافر مزید ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ باقر نے ہمیں ایک بس میں بٹھایا جس نے پاکستان کے ایرانی ہوٹلوں میں چلنے والے کنڈکٹروں کی یاد تازہ کر دی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے۔ دن کے بارہ بجے تھے جب بس روانہ ہوئی۔ شہر سے نکلنے کے بعد تھوڑی دیر تک تو کہیں کہیں ہریالی نظر آتی رہی پھر ویران صحرائی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں ریت کے بگولے اڑتے پھرتے تھے اور گرم ہوائیں ہمارے جسم جھلسا رہی تھیں۔ سب پتھر کے مجسموں کی طرح خاموش بیٹھے اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ یہ کہنا چاہیے کہ اندیشوں میں گم تھے۔ ابراہیم نے کہا۔ "ساتھیو! ابھی سے ہمت نہ ہارو، ابھی آگے اور دھکے کھائیں گے یا اسی طرح چلا چلا کر بے ہوش کر دیں گے، دیکھو کیسے بیچ بچے ہیں۔"

ابھی ابراہیم کی بات منہ میں ہی تھی کہ بس ایک ویران صحرائی ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ ہم نے کھانا کھا کر ہم نے اپنے واٹر کولر میں پانی بھرا اور پھر کنڈکٹر بس میں آ بیٹھے۔ جلد ہی سورج نے غروب ہونے کی تیاری کر لی۔ آسمان پر ایک طرف کچھ گدلا پن سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے باقر احمد سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے عربی میں بڑے ٹھہراؤ سے ہم سے جواب دیا۔ اس کی بات کا ترجمہ کرتے ہوئے حافظ انسان نے بتایا۔ "باقر صاحب کہہ رہے ہیں کہ آندھی آسکتی ہے۔"

ٹھیک کوئی ایک گھنٹے بعد آندھی آگئی اور خوب آئی۔ یہ ریت کا وہ طوفان تھا جس نے ہمیں سر تا پیر ہلا دیا۔ ریت بس کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر آئی اور بچھوؤں کی طرح ہمارے جسم کے کھلے حصوں سے ٹکرانے لگی۔ بس رک گئی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ بس کبھی کبھی یوں لگ رہا تھا جیسے بس الٹ جائے گی۔

"باہر نکل جاؤ... سب باہر نکل جاؤ۔" ہمارے گروپ لیڈر آفتاب گل نے چلا کر کہا۔

ہم بس سے باہر نکل آئے اور ملہ سر پر لپیٹ کر اوندھے منہ ریت پر لیٹ گئے۔ ریت نے بڑی تیزی سے ہمیں ڈھانپنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے لگا کہ میں ریت میں زندہ دفن ہو رہا ہوں۔ چہرے کے نیچے ہمارا جسم ریت میں دب رہا تھا۔ میں نے اپنا سر بمشکل ریت میں سے باہر نکالا۔ لیکن چند ہی سیکنڈ بعد وہ پھر ریت میں دفن ہو گیا۔ ان لمحوں میں نہ جانے کیوں ابا جی کی نورانی داڑھی کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "ابا جی! آپ کو کیا پتا، میں کس مصیبت میں ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے معاف کر دینا، ہاں، اپنے جرم سب معاف کر دینا۔"

ایک قیامت تھی جو ہم پر گزر گئی۔ قریباً پون گھنٹے بعد طوفان کی شدت کم ہوئی اور ہم اٹھ کر بس میں بیٹھنے کے قابل ہوئے۔

قارئین! میرے ساتھ جو کچھ پیش آیا، میں وہ بیان کرتا چلا جا رہا ہوں... وہ منظر بڑے ہولناک تھے۔ بس کی باڈی کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے ایک بھاری بڑی طرح زخمی ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اس آفت کے سبب کے بے چند آواز میں "آلائیں" لے رہے تھے۔ ایک نوجوان لڑکا مسلسل روتا چلا جا رہا تھا۔ بس کے اندر بھی ریت بھری تھی اور لگتا تھا کہ "صحرا" بس کے اندر داخل ہو گیا ہے۔

ہم نے رات کا باقی حصہ بس کے اندر ہی گزارا۔ صبح چند گھنٹوں نے اذان دی۔ اب موسم پُرسکون تھا۔ ہم نے ایک ٹیلے کے دامن میں تیمم کرنے کے بعد نماز پڑھی۔ اسی دوران میں باقر احمد نے کچھ ٹی کی صحرائی بستی سے چند مزدور بلوائے اور انہوں نے بس کے اندر کی ریت صاف کی۔ روٹی وغیرہ کھانے کے بعد ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔

ریت سے اَٹی ہوئی سڑک پر آہستہ روی سے چلتے ہوئے ہم سہ پہر قریباً چار بجے بصرہ پہنچ گئے۔ اس قدیم شہر کے گلی کوچوں میں خستہ حال وسادہ لوح لوگ گھومتے پھرتے

نظر آرہے تھے۔ ہر در و دیوار پر بوسیدگی کی جھلک تھی۔ ہماری
جیپ جب بس اسٹینڈ پر رکی تو ہم پچیس مسافر وقار احمد کی
قیادت میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ کہیں کہیں سے
ہمیں سمندر کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے
ابراہیم سے کہا۔ ”ہم بچپن سے لاہور شہر کے گلی کوچوں میں
یہ آوازیں سنتے آئے ہیں..... ’بصرے کی کھجوریں‘ ... آج
ہم نے بصرہ بھی دیکھ لیا۔“

ابراہیم خاموش رہا۔ وہ سارا راستہ ہی تقریباً خاموش
رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں صرف اور
صرف میرا ہی خیال ہے۔

ہم سمندر کے کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک کشادہ
کوٹھی نما مکان میں پہنچے۔ پتا نہیں کیوں مجھے امید تھی کہ
یہاں امین سے ملاقات ہوگی۔ امین سے تو ملاقات نہیں
ہوئی لیکن ہم مسند خان رشید کا دیدار ضرور ہو گیا۔ وہ ایک
سائبان کے نیچے صرف ایک تکیہ بنیان پہنے دراز تھا اور ایک
لڑکی اس کی ٹانگوں کی مالش کر رہی تھی۔ لڑکی بھی ننگے سر
تھی۔ اس کے لمبے شہد رنگ بال آگے کی طرف جھول
رہے تھے۔ جب اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے بال پیچھے
ہٹائے تو میں حیران ہوا۔ یہ وہی خاموش آنکھوں والی فرح
تھی۔ بغداد کے ہوٹل میں اس کی بے عزتی کا منظر ابھی
تک بھولا نہیں تھا۔

مسند رشید نے بس ایک خاموش نظر ہم پر ڈالی اور
پھر دراز ہو گیا۔ باقر ہمیں مکان کے اندرونی حصے میں
لے آیا۔ یہ کافی کشادہ جگہ تھی۔ ہمیں تین کمروں میں ٹھہرایا
گیا۔ مکان کے ایک برآمدے میں ایک راشن بردار عراقی
بھی جھومتا نظر آیا۔ اس کی آٹومیٹک رائفل دیکھ کر ہم کچھ اور بھی
نروس ہو گئے۔

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد ہم سو گئے۔ دو ڈھائی گھنٹے
بعد اٹھے۔ باقر پاس سے گزرا تو میں نے پوچھا۔ ”باقر
صاحب! کیا امین بھی یہاں ہی ہے؟“

باقر تیوری چڑھا کر نہایت بے رخی سے بولا۔
”اپنے کام سے کام رکھو۔ فضول باتوں کے لیے وقت نہیں
ہے میرے پاس۔“

میں کٹ کر رہ گیا۔ آفتاب گل کا چہرہ انگارے کی
طرح دہک گیا۔ شاید وہ باقر سے کچھ کہتا لیکن جندل خان
نے اس کا بازو دبا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اس نے
ٹھیک ہی کیا۔ ہمیں کسی طرح کی بدمزگی پیدا نہیں کرنی
چاہیے تھی۔ ہم ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ ہمارے
سر تھے جو چاہے کر سکتے تھے۔ فی الوقت ان لوگوں کا رویہ
ہمارے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے مالک نوکروں سے اور
صاحب بہادر اپنے نوکروں سے۔

احاطے میں ایک طرف کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا۔ میں
اور جندل خان ان کھجوروں کے نیچے بیٹھے اور باتیں کرنے
لگے۔ میں نے جندل خان سے کہا۔ ”آفتاب گل [illegible]
تم نے اچھا کیا ورنہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔“

جندل خان بولا۔ ”یہ آفتاب بڑا غصے والا ہے۔ اس
غصے کی وجہ سے ہی تو اس کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

جندل خان کچھ دیر تذبذب میں رہا۔ پھر اس نے
مجھے آفتاب گل کی روداد سناتے ہوئے کہا۔ ”خوا جہان تم
ادھر جانتا ہے..... ہمارے علاقے میں آفتاب سے دو بندوں کا
قتل ہو گیا تھا۔ یہ دو تین سال پہلے کی بات ہے۔“

”ایسا کیوں ہوا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

جندل خان نے رازداری کے انداز میں آفتاب گل
کی کہانی سناتے ہوئے بتایا۔ ”آفتاب گل کا ایک ہی
بہن تھا۔ اس کا نام زرخونہ۔ وہ شادی شدہ تھا لیکن اپنے
سسرال میں خوش نہیں تھا۔ اس کا خاوند محنت مزدوری کے
لیے مسقط گیا ہوا تھا۔ سسرال والے زرخونہ کو بہت تنگ کرتا
تھا۔ خاص طور سے اس کا سسر۔ وہ بہت سخت طبیعت کا تھا۔
ایک روز اس نے زرخونہ کو دھکا دیا۔ وہ بری طرح گر گیا۔
اس کا حمل خراب ہو گیا۔ اس کو اسپتال لے جایا گیا لیکن
اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ بیچارہ لڑکی ختم ہو گیا۔ اس کی
موت کا اطلاع بڑا خوفناک تھا۔ یہ سنتے ہی آفتاب گل کا
دماغ کا بریک فیل ہو گیا۔ ایک طرح سے آفتاب گل کا دنیا
اندھیر ہو گیا..... بس ایک ہی تو چھوٹا سا سہارا تھا اس کا۔ وہ بھی
تھری ناٹ تھری رائفل لے کر بہن کے سسرال میں گھس گیا۔ اس نے
بہن کے سسر کو گولی مار دیں۔ بہن کا جیٹھانی سامنے آیا تو
آفتاب نے اسے بھی نہیں چھوڑا۔ یہی عورت زرخونہ کے
ساس سسر کے کان بھرتا تھا۔ وہ دونوں موقع پر ہی ختم
ہو گیا۔ آفتاب گل بھاگ گیا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں
تھا۔ دشمنوں نے غصہ اس کے مکان پر اور اس کی کھیتی باڑی کی
دکان پر اتارا۔ دونوں جگہوں کو آگ لگا دیا..... زبردست دشمنی
چل نکلا تھا۔ آفتاب کچھ دیر خیبر ایجنسی میں چھپا رہا۔ پھر کچھ
پیسہ کا بندوبست کیا اور وطن سے باہر نکل آیا۔“

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ آفتاب گل کی کہانی کچھ اس
سے ملتی جلتی ہوگی۔ جہاں جہاں دشمنی ہوتی ہے وہاں

وہاں خون بھی بہتا ہے۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چل رہا ہے اور کب تک چلتا رہے گا۔

اسی دوران میں اندر سے ابراہیم نے ہمیں پکارا اور کہا کہ ہم کھانا کھالیں۔ ایک ہال کمرے میں دو بڑی بڑی چٹائیاں بچھی تھیں اور انہی پر ہمارے لیے کھانا لگایا جارہا تھا۔ کھانا لگانے والوں میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے ایک وہی فرح نامی لڑکی تھی۔ ہمیں یہاں ایک دو اور لڑکیاں بھی نظر آئی تھیں۔ یقیناً وہ بھی فرح کی طرح "خدمت گار" ہی تھیں لیکن وہ مناسب لباس میں تھیں۔ صرف فرح ہی ایسی تھی جس کا لباس نازیبا تھا۔ اب بھی اس کے ولایتی جسم پر برائے نام لباس تھا۔ زیریں جسم پر جینز کی ایک نیکر تھی۔ وہ اسی لباس میں ہمارے سامنے کھانا سرو کر رہی تھی۔

آفتاب گل سے نہیں رہا گیا۔ وہ بولا۔ "یارو! ہم کو یہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔ ہمارا سر شرم سے جھک رہا ہے۔ آخر یہ لڑکی ٹھیک کپڑا کیوں نہیں پہنتا۔"

ابراہیم نے کہا۔ "ہوسکتا ہے کہ یہ اس کی اپنی مرضی سے کچھ مسئلہ ہو۔"

"کچھ بھی ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں۔" آفتاب نے کہا۔ "اس کو کم از کم ہمارے سامنے تو اس طرح نہیں آنا چاہیے۔"

آفتاب اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے اپنے کندھوں سے اپنی چادر اتاری اور لڑکی کے شانوں پر ڈال دی۔ بولا۔ "تم ہمارا بچی کی طرح ہے۔ ہم کو تم اس طرح اچھا نہیں لگتا۔"

لڑکی اردو نہیں جانتی تھی۔ بس حیرانی سے آفتاب گل کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی دوران میں ایک طرف سے باقر لپکتا ہوا آگیا۔ آفتاب سے مخاطب ہو کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ "کیا بات ہے سرخ آدمی؟" وہ آفتاب کو سرخ آدمی ہی کہتا تھا۔

آفتاب نے کہا۔ "یہ بچی ایسے کپڑوں میں کیوں پھرتا ہے، ہم کو یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

باقر نے چادر کو زور سے جھٹکا اور فرح کے کندھوں سے اتار پھینکا۔ پھنکار کر بولا۔ "یہ ایسے ہی رہے گی۔ یہ باس کا حکم ہے۔"

"کیوں اس نے ایسا کیا جرم کیا ہے؟" آفتاب نے پوچھا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو سرخ آدمی۔ یہ ایسے ہی کپڑوں میں رہتی ہے۔"

آفتاب کا چہرہ انگارے کی طرح دہکنے لگا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور ذرا دھیمے لہجے میں بولا۔ "تو پھر اس کو ہماری طرف نہ بھیجو۔ کسی اور کام پر لگاؤ۔"

باقر پھنکارا۔ "یہ ادھر ہی رہے گی۔ یہی کام کرے گی۔ تم اپنی یہ منحوس آنکھیں بند کرلو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے آفتاب کو گالی دے دی۔

آفتاب باقر کی طرف جھپٹا لیکن میں نے اسے راستے میں روک لیا۔ میں نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا اور گھسیٹ کر پیچھے لے گیا۔ ابراہیم نے آفتاب کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا تھا کہ کہیں وہ باقر کو جوابی گالی نہ دے۔ ہماری یہ تدبیر کامیاب رہی اور ہم نے صورت حال کو سنگین ہونے سے بچالیا۔ رانگل پیرا ملٹری بھی فوراً موقع پر پہنچ گیا تھا۔ بہرحال کچھ دیر گرجنے برسنے کے بعد باقر باہر چلا گیا۔ بعد میں جمال خان نے آفتاب کی طرف سے اس سے معافی مانگی اور اسے ٹھنڈا کیا۔ ہم سب نے آفتاب گل کو بھی سمجھایا کہ وہ تو ہمارا لیڈر ہے اگر وہ اس طرح غصے میں آئے گا تو پھر ہم سب کا بہت نقصان ہوجائے گا۔

وہ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ صبح ناشتا لانے والوں میں فرح شامل تھی اور پھر اسی لباس میں تھی۔ آفتاب گل منہ پھیرے بیٹھا رہا۔

نو بجے کے لگ بھگ ہمیں فربہ اندام کمال رشید کی صورت نظر آئی۔ اسے دیکھ کر ہم سب مؤدب کھڑے ہوگئے۔ اس نے روکھے سوکھے لہجے میں ہمیں کچھ ہدایات دیں جن کا ترجمہ حافظ احسان نے ہمیں کرکے سنایا۔ کمال رشید نے کہا تھا۔ "تم لوگوں کے پاس آج کا سارا دن ہے۔ شہر میں گھوم پھر لو۔ اور کچھ خریداری کرنی ہے تو وہ بھی کرلو لیکن کسی اجنبی سے کسی طرح کی کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم رات کسی وقت یہاں سے نکلیں گے۔"

کمال رشید نے شہر میں سیر کرنے کا کہا تھا لیکن سیر تو اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اطمینان اور خوشی ہو۔ ہم سب تو شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھے۔ پتا نہیں کہ آج رات کو کس طرح کے حالات پیش آنا تھے۔ ہم کو لانچ کے ذریعے سفر کرنا تھا۔ اب خبر نہیں کہ یہ کس حد تک قانونی تھا۔ کمال رشید وغیرہ کا رویہ بھی زیادہ تسلی بخش نہیں تھا۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ ابراہیم کو لے کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں لیکن یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے لیکن کیا ہونے والا ہے، اس کا اندازہ نہیں تھا۔

(جاری ہے)